بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

ترجمہ: ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے
تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟

معالم العرفان
فی
دروس القرآن

افادات

حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی دامت برکاتہم

خطیب جامع مسجد نور
بانی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

مرتب

الحاج لعل دین ایم اے (علوم اسلامیہ)

ناشر

مکتبہ دروس القرآن
فاروق گنج ۰ گوجرانوالہ

روزانہ درسِ قرآن پاک

تفسیر

(۱) سورۃ بنی اسرائیل
(۲) سورۃ کہف
(۳) سورۃ مریم

جلد ۱۲

افادات

حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی دامت برکاتہم
خطیب جامع مسجد نور
گوجرانوالہ پاکستان

انیسواں ایڈیشن

نام کتاب .... معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ بنی اسرائیل، کہف، مریم) جلد ۱۲

افادات .... حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتی رحمۃ اللہ علیہ

مرتب .... الحاج لعل دین رحمۃ اللہ علیہ ایم اے (علوم اسلامیہ) شالامار ٹاؤن لاہور

تعداد طباعت .... پانچ سو (۵۰۰)

سرورق .... سید الخطاطین حضرت شاہ نفیس الحسینی رحمۃ اللہ علیہ

کتابت .... محمد امان اللہ قادری، گوجرانوالہ

ناشر .... مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ

قیمت .... ۲۶۵/- (دو سو پینسٹھ روپے)

تاریخ طبع انیسواں ایڈیشن ـــــ شوال المعظم ۱۴۳۴ھ بمطابق اگست 2013ء

(۱) کتب خانہ صفدریہ 0300-4257988 لاہور

(۲) مکتبہ دروس القرآن، محلہ فاروق گنج گوجرانوالہ (۳) کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی

(۴) مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر اردو بازار لاہور (۵) کتب خانہ مجیدیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

(۶) مکتبہ قاسمیہ، الفضل مارکیٹ لاہور (۷) مکتبہ علمیہ نزد جامعہ بنوریہ سائٹ نمبر ۹ کراچی

(۸) مکتبہ سید احمد شہیدؒ، اردو بازار، لاہور (۹) اسلامیہ کتب خانہ اڈا کامی، ایبٹ آباد

(۱۰) مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ (۱۱) مکتبۃ العلم ۱۸ اردو بازار لاہور

فہرست مضامین معالم العرفان فی دروس القرآن جلد ۱۲

سورة
بنی اسرائیل
مکمل

درس اول ۱ — آیت ۱

سُوْرَةُ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ مَکِّیَّةٌ وَّهِیَ مِائَةٌ وَّاِحْدٰی عَشْرَةَ اٰیَةً وَّفِیْهَا اثْنَا عَشَرَ رُکُوْعًا

سورۃ بنی اسرائیل مکی ہے اور یہ ایک سو گیارہ ۱۱۱ آیات اور اس میں بارہ ۱۲ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ①

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد حرام سے دُور والی مسجد تک، وہ کہ برکتیں رکھی ہیں ہم نے اس کے اردگرد، تاکہ ہم دکھائیں اُس کو اپنی نشانیوں میں سے۔ بیشک وہ (اللہ تعالیٰ) سننے والا اور دیکھنے والا ہے ①

نام اور کوائف

اس کا نام سورۃ بنی اسرائیل ہے۔ اس میں بنی اسرائیل کا تھوڑا سا حال بیان ہوا ہے اور اسی مناسبت سے سورۃ کا یہ نام رکھا گیا ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی اس کی ایک سو گیارہ آیات اور بارہ رکوع ہیں۔ یہ سورۃ ۱۵۳۳ کلمات اور ۶۴۰۰ حروف پر مشتمل ہے

فضائل سورۃ

اس سورۃ مبارکہ کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ بخاری شریف میں حضرت عبداللہ ابن مسعود[رض] کا سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ کہف اور سورۃ مریم کے متعلق بیان ہے[۱] اِنَّهُنَّ مِنَ الْعِتَاقِ الْاُوَلِ یہ عمدہ سورتیں میرا پُرانا مال ہیں یعنی میں نے انہیں بہت پہلے یاد کر لیا تھا۔ ایک

---

[۱] بخاری صفحہ ... (فیاضی)

حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تقریباً ہر رات سورۃ زمر اور سورۃ بنی اسرائیل کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ بعض اور سورتوں کی تلاوت کا ذکر بھی ملتا ہے تاہم ان دو سورتوں کو خصوصیت حاصل ہے۔

مضامین سورۃ

دیگر مکی سورتوں کی طرح اس سورۃ مبارکہ میں بھی زیادہ تر بنیادی عقائد ہی کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اثبات اور شرک کی تردید، رسالت بطور جزو ایمان، قرآن پاک کی حقانیت و صداقت اور معاد یعنی قیامت کا ذکر اس سورۃ کے مضامین ہیں۔ اس سورۃ میں اخلاقی تعلیم کا ذکر بھی ہے جو کہ انسان کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ سورۃ ہذا کا ایک اہم مضمون واقعہ معراج ہے جس کا ذکر اس کی پہلی آیت میں کیا گیا ہے، اور پھر کچھ ضمناً تذکرہ ساٹھویں آیت میں ہے۔

اس سورۃ مبارکہ کی آیات بائیس تا چالیس میں اسلامی ریاست کا منشور (MANIFESTO یعنی مینی فیسٹو) پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ اسلامی ریاست کی داغ بیل تو مدنی زندگی میں جا کر پڑی، مگر یہ امر واقع ہے کہ حکومتیں یا جماعتیں اپنا منشور اقتدار میں آنے سے پہلے ہی شائع کر دیتی ہیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ ان کا آئندہ پروگرام کیا ہے اسی طریقے پر اسلامی سلطنت کا منشور بھی ریاست کے قیام سے پہلے ہی نازل کر دیا گیا۔

اس سورۃ کا ربط پہلی سورۃ کے ساتھ بھی ہے۔ سورۃ النحل کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو کفار کی ناپسندیدہ حرکات پر صبر کرنے کا درس دیا تھا، تو اب اس سورۃ مبارکہ میں حضور علیہ السلام کا واقعہ معراج بیان کر کے اللہ نے واضح فرمایا ہے کہ آپ کس قدر بلند مرتبت ہیں جو کہ صبر ہی کا نتیجہ ہے۔

زمانہ واقعہ معراج

واقعہ معراج یقیناً مکی زندگی میں پیش آیا مگر سنہ کے تعین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض مفسرین سنہ نبوی کا ذکر کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ واقعہ ہجرت سے ایک سال قبل پیش آیا۔ تاہم راجح بات یہ ہے کہ واقعہ معراج نبوت کے دسویں سال یا گیارہویں سال میں پیش آیا۔ اس لحاظ سے یہ واقعہ ہجرت سے تین سال قبل کا ہے۔

اس سال کئی دیگر اہم واقعات بھی پیش آئے مثلاً حضور علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ کی وفات اسی سال میں ہوئی۔ آپ کے چچا ابوطالب بھی اسی برس فوت ہوئے۔ اگرچہ وہ ایمان نہیں لائے مگر انہوں نے حضور کی ہمیشہ حمایت کی مشرکین کی طرف سے تکالیف حد سے بڑھ گئیں تو آپ کو طائف کا سفر بھی اسی سال اختیار کرنا پڑا۔ حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ چونکہ نماز پنجگانہ واقعہ معراج میں فرض ہوئیں، اس لیے حضرت خدیجہؓ پانچ نمازیں ادا نہیں کر سکیں، اس زمانے میں صرف تین نمازیں تھیں۔ رات کی نماز صرف حضور علیہ السلام پر فرض تھی اور باقی صرف دو نمازیں فجر اور عصر فرض تھیں جیسا کہ سورۃ طٰہٰ میں ہے۔ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا یعنی ایک طلوع سورج سے پہلے اور ایک سورج کے غروب ہونے سے پہلے

معراج کا واقعہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اہل سنت والجماعت کا یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ واقعہ معراج محض خواب کا واقعہ نہیں ہے روحانی معراج تسلیم کر لیا جائے بلکہ آپ کو یہ معراج روح اور جسم دونوں کے ساتھ ہوا خواب میں دیکھا جانے والا کوئی بھی واقعہ کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتا اور نہ اس پر کوئی اعتراض کرتا ہے مگر معراج النبی ایک ایسا حیرت انگیز واقعہ ہے جسے سن کر مشرکین نے فوراً اعتراضات شروع کر دیئے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک شخص رات کے تھوڑے سے حصے میں زمین و آسمان کے درمیان پچاس ہزار سال کی مسافت طے کر لے۔ اس زمانے میں بھی جسمانی معراج کا انکار کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ بعض لوگ ملحد ہیں جو کہ نافرمانوں کی بدتر قسم ہے۔ اور دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو غلط فہمی کی بنا پر جسمانی معراج کا انکار کرتے ہیں، اس کی بنیاد احادیث کے بعض الفاظ ہیں جن سے شبہ پیدا ہوتا ہے تاہم جمہور کے نزدیک یہ جسمانی اور روحانی مکمل معراج تھا جس کی تفصیلات خود حضور علیہ السلام نے مختلف اوقات میں بیان فرمائیں اس واقعے کے راوی چالیس پینتالیس صحابہ کرامؓ ہیں، جنہوں نے اس واقعے کے مختلف حصے بیان کئے ہیں، اور آپ

محدثین کرام نے تمام تفصیلات کو یکجا کر دیا ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، مسند احمد غرض ساری معتبر کتابوں میں اس واقعہ کا باب باندھا گیا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ یہ واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے

آغاز واقعہ معراج

جس رات واقعہ معراج پیش آیا۔ اُس رات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی چچا زاد بہن ام ہانی رضؓ کے ہاں مقیم تھے اُن کا مکان خانہ کعبہ کے بالکل قریب تھا۔ اور آپ اکثر وہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ چونکہ آپ کا گھر وہاں سے ذرا دور تھا۔ اس لیے آپ بعض اوقات اپنی بہن کے ہاں ٹھہر جاتے، تاکہ رات کو خانہ کعبہ میں عبادت کر سکیں۔ بعض روایات میں آپ کے اپنے گھر کا ذکر بھی آتا ہے کہ آپ وہاں مقیم تھے مگر محدثین کرام فرماتے ہیں کہ ام ہانی کے گھر والی روایت صحیح ہے، اور آپ نے چچا کے گھر کو اپنے ہی گھر پر محمول کیا ہے بعض روایات میں حطیم کے قیام کا ذکر بھی آتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کیونکہ آپ کے بیان کے مطابق فرشتے آپ کو ام ہانی کے گھر سے بیدار کر کے حطیم میں لے آئے تھے۔ وہیں شق صدر ہوا اور پھر وہیں سے آپ سفر معراج پر روانہ ہوئے۔

شق صدر

حضور علیہ السلام کا بیان ہے کہ فرشتوں نے ام ہانی کے مکان کی چھت پھاڑ کر مجھے وہاں سے نکالا اور پھر خانہ کعبہ کے حطیم والے حصہ میں لے آئے۔ پھر میرے سینہ کو چاک کیا، قلب مبارک کو نکالا، اسے سونے کے طشت میں رکھ کر آب زم زم سے دھویا، اسے علم و حکمت سے بھر دیا اور پھر اپنے ٹھکانے پر واپس رکھ دیا۔ مسلم شریف کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت آپ کا شق صدر کیا گیا اس وقت آپ زمین پر نہیں تھے بلکہ فرشتوں نے آپ کو ہاتھوں میں اٹھا رکھا تھا۔ ثُمَّ اُنْزِلْتُ پھر جب وہ اپنا کام مکمل کر چکے تو مجھے نیچے اتار دیا گیا

حضور علیہ السلام کی حیات مبارکہ میں شق صدر کا واقعہ چار دفعہ پیش آیا ہے

پہلا واقعہ چار یا پانچ سال کی عمر میں پیش آیا جب کہ آپ اپنی رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہؓ

کے ہاں زیر پرورش تھے ۔ اس عمر میں بچہ عام طور پر لہو ولعب کی طرف مائل ہوتا ہے مگر آپ کو چونکہ منصب نبوت عطا ہونے والا تھا ، اس لیے ابتدا ہی سے آپ کی تربیت مقصود تھی تاکہ آپ کھیل کود کی طرف زیادہ توجہ نہ دیں ۔ پھر دوسری دفعہ شق صدر اس وقت پیش آیا جب آپ کی عمر مبارک بارہ تیرہ سال کی تھی ۔ آغاز شباب میں اکثر نوجوانوں کے خیالات منتشر ہو جاتے ہیں مگر آپ علیہ السلام کو چونکہ ایک عظیم ذمہ داری سونپی جا رہی تھی ، لہذا شق صدر کے ذریعے آپ کے قلب مبارک سے وہ تمام چیزیں دور کر دی گئیں جن سے لغزش پیدا ہونے کا امکان ہو سکتا ہے ۔

منصب نبوت بڑا بوجھل معاملہ ہے ۔ اللہ نے سورۂ مزمل میں فرمایا ، إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ہم آپ پر ایک بوجھل بات ڈالنے والے ہیں یعنی وحی الٰہی کا بوجھ اتنا شدید ہوتا تھا کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کہتی ہیں کہ شدید سردی میں حضور کی پیشانی مبارک سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے ۔ تو اس بوجھ کو برداشت کرنے کے لیے آپ کا تیسری دفعہ سینہ چاک کیا گیا ۔ اور پھر چوتھا شق صدر سفر معراج پر روانہ ہونے سے قبل حطیم میں کیا گیا ۔ تاکہ آپ پیش آمدہ عجیب و غریب واقعات کو برداشت کر سکیں ۔

مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک

حضور علیہ السلام نے بیان فرمایا کہ شق صدر کے بعد میرے پاس حطیم کے مقام پر ایک جانور لایا گیا جو خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا تھا ۔ یہ سفید رنگ کا جانور اتنا تیز رفتار تھا کہ اس کا ایک ایک قدم حد نگاہ پر پڑتا تھا ۔ مجھے اس جانور پر سوار کرایا گیا ، جبرائیل علیہ السلام ہمراہ تھے ۔ ہمارا سفر مسجد اقصٰی کی طرف شروع ہوا جب مدینہ طیبہ کے مقام پر پہنچے تو مجھے سواری سے نیچے اترنے کا حکم ہوا ۔ چنانچہ جس جگہ اس وقت مسجد نبوی ہے ۔ وہاں میں نے دو رکعت نماز پڑھی ۔ پھر میرا گذر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر پر ہوا ۔ آپ کی قبر سرخ ٹیلے کے پاس ہے ۔ مجھے دکھایا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام قبر میں کھڑے ہو کر نماز ادا کر رہے ہیں ۔ حدیث[1] میں یہ الفاظ

---

[1] مسلم صفحہ ۲۶۵ جلد ۲ و نسائی صفحہ ۲۴۲ جلد ۱ و مسند احمد صفحہ ۱۴۸ جلد ۳ (فیاض)

آتے ہیں رَاَیْتُ مُوْسٰی قَآئِمًا یُصَلِّیْ فِیْ قَبْرِہٖ ۔ فرماتے ہیں کہ پھر میرا گذر طور کے مقام پر ہوا۔ جہاں اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے تکلم فرمایا تھا۔ میں نے وہاں بھی دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر مدین کا مقام آیا۔ جہاں پر موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے ڈر سے مصر سے نکل کر قیام کیا تھا۔ وہاں بھی دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے ولادت بیت اللحم پہنچے اور دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر بیت المقدس پہنچے اور میں نے جانور کو پتھر کے اس کڑے کے ساتھ باندھ دیا جہاں دیگر انبیاء اپنی سواری کے جانور باندھا کرتے تھے۔ اس مقام پر بھی میں نے دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کی۔

فرماتے ہیں کہ اس وقت وہاں مسجد کی شکل و صورت نہ تھی کیونکہ اصل مسجد اور ہیکل سلیمانی کو بخت نصر نے تباہ و برباد کر دیا تھا اور اب وہاں اجڑی ہوئی مسجد کے صرف کھنڈرات باقی تھے۔ فتنہ بخت نصر کے سو سال بعد بنی اسرائیل پھر وہاں پہنچے اور وہ جگہ آباد کی۔ اس کے بعد رومیوں نے اس مسجد کو تہس نہس کر دیا۔ مسجد کی تعمیر کی سہ بارہ کوشش کی گئی مگر کامیابی نہ ہوئی اور واقعہ معراج کے وقت عمارت کی بجائے محض ایک ٹیلہ سا باقی رہ گیا تھا۔ بیت اللہ شریف کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آتا رہا ہے۔ اس کی اصل عمارت کی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام اور شیث علیہ السلام کے زمانہ میں ہوئی۔ پھر ابراہیم علیہ السلام نے اس کی تجدید کی بہر حال مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں بیت المقدس کے اردگرد عمارات موجود تھیں مگر خود مسجد ویران ہو چکی تھی۔ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں فلسطین فتح ہوا تو ہیکل سلیمانی کی از سرِ نو تعمیر کی گئی۔ بیت اللہ کے قبلہ مقرر ہونے سے پہلے بیت المقدس ہی قبلہ تھا اور اسی کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی جاتی تھی۔

آسمانوں کی سیر

مسجد اقصیٰ میں کچھ دیر قیام کے بعد آسمانوں کا سفر شروع ہوا۔ پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ جبرائیل نے تعارف کرایا

کہ یہ آپ کے جدِ امجد ہیں۔ میں نے سلام کیا، انہوں نے مرحبا کہہ کر جواب دیا
پھر دوسرے آسمان پر پہنچے اور حضرت عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام سے ملاقات
ہوئی۔ تیسرے آسمان پر حضرت یوسف علیہ السلام اور چوتھے پر حضرت ادریس علیہ السلام
ملے۔ پھر پانچویں آسمان پر حضرت ہارون علیہ السلام اور چھٹے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام
سے ملاقات ہوئی اور آخر میں ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ ملے۔
تمام نبیوں کے ساتھ سلام و جواب کا تبادلہ ہوا۔ اور پھر وہیں مجھے بیت المعمور
بھی دکھایا گیا۔ جس طرح زمین پر انسانوں کے لیے خانہ کعبہ ہے۔ اسی طرح
آسمانوں پر فرشتوں کا قبلہ بیت المعمور ہے۔ وہاں ہر روز ستّر ہزار فرشتے
طواف کرتے ہیں مگر کسی فرشتے کو ایک سے زیادہ مرتبہ طواف کا موقع نہیں
ملتا۔ اس کے بعد حضور علیہ السلام کو سدرۃ المنتہیٰ کے مقام تک لے جایا گیا۔
جس کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ پھر اسی مقام پہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات
کا ظہور ہوا جسے رویت باری تعالیٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ علیہ السلام
نے جنت اور دوزخ کی سیر کی، جبرائیل علیہ السلام کو اپنی اصلی شکل میں دیکھا۔
اس کے علاوہ بھی ہزاروں خارقِ عادت واقعات پیش آئے۔

اسی مقام پہ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو تین خاص چیزیں عطا فرمائیں
حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر اور آپ کی امت
پر پچاس نمازیں فرض کیں مگر موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ سے آپ ان میں
تخفیف کی درخواست کرتے رہے اور پھر آخر میں پانچ نمازیں رہ گئیں۔ اس
کے متعلق کہا گیا ہے ذٰلِکَ خَمْسٌ وَّ ذٰلِکَ خَمْسُوْنَ یعنی ادا کرنے
میں تو پانچ نمازیں ہیں مگر درجے کے اعتبار سے پچاس ہی ہیں۔ بہرحال آپکو
پہلا تحفہ پانچ نمازوں کا ملا، دوسرا تحفہ سورۃ البقرہ کی آخری دو آیات "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ"
سے لیکر عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ تک اور تیسری خاص چیز اللہ کا یہ فرمان
ہے کہ حضور علیہ السلام کی امت کا جو شخص شرک میں ملوث نہیں ہوگا۔ میں اس

کی غلطیاں معاف فرما دوں گا۔

تعجب انگیز

اس تعجب انگیز واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات کے وقت لے گئی۔ ظاہر ہے کہ حضور علیہ السلام خود بخود تو معراج کے سفر پر نہیں گئے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور قدرت سے اس کا انتظام فرمایا۔ وہ تمام قوتوں کا مالک اور قادر مطلق ہے، تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ لہٰذا وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ اپنے بندے کو روح اور جسم دونوں کے ساتھ بلند سے بلند تر مقام تک لے جائے۔ اب منکرین اور ملحدین جو بھی تاویلیں کریں، اللہ تعالیٰ نے لفظ سبحان کے ذریعے سب کا قلع قمع کر دیا ہے۔ اتنا تیز رفتار جانور بھی اللہ تعالیٰ ہی مہیا کر سکتا ہے۔ اور پھر خاص بات یہ ہے کہ اتنے طویل سفر کے لیے لمبے چوڑے وقت کی ضرورت نہیں پڑی بلکہ فرمایا لَیْلًا یہ سب کچھ رات بھر میں ہو گیا اور لیلاً کو نکرہ لانے کا مطلب یہ ہے کہ پوری رات میں بھی نہیں، بلکہ رات کے تھوڑے سے حصے میں یہ سارا واقعہ پیش آیا۔ لفظ اسریٰ خود باب افعال سے جو متعدی ہے۔ پھر اس کے آگے ب لگا کر معیت کا معنی لیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو رات کے تھوڑے حصے میں لے گیا۔ مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ یعنی دور والی مسجد کی طرف اقصیٰ کا معنی دور ہوتا ہے۔ چونکہ بیت المقدس خطۂ عرب سے دور ہے اس لیے اسے مسجد اقصیٰ کا نام دیا گیا ہے۔

بابرکت ماحول

فرمایا مسجد اقصیٰ وہ مسجد ہے الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ جس کے ارد گرد ہم نے برکات رکھی ہیں اس میں ظاہری اور باطنی دو قسم کی برکات شامل ہیں۔ ظاہری طور پر یہ خطہ سرسبز و شاداب ہے۔ یہاں پر نہریں، چشمے اور باغات ہیں۔ نیز یہ مقام ہزاروں انبیاء کا قبلہ رہا ہے اور ان کی وہاں قبریں بھی موجود ہیں۔ یہاں پر خدا تعالیٰ کی خصوصی رحمتیں نازل ہوتی ہیں، لہٰذا یہ ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے بابرکت مقام ہے۔ مفسرین یہ نکتہ بھی

بیان کرتے ہیں کہ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لیجانے میں یہ حکمت بھی ہے کہ حشر کا میدان اسی مقام پر قائم ہوگا، اس لیے حضور علیہ السلام کو سب چیزوں سے متعارف کرا دیا گیا۔ پھر آپ کے توسط سے آپ کی امت کو بھی ان چیزوں سے آگاہ کیا گیا۔

اس واقعہ کو بیان کرنے کا ایک مقصد اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا تاکہ ہم اپنے نبی کو اپنی قدرت کی نشانیاں اور کمالات دکھائیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ نے آپ کو عالم بالا اور عالم ملکوت کی بہت سی جگہوں کی سیر کرائی اور اپنی قدرت کی عجیب و غریب نشانیاں دکھائیں۔ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ بیشک اللہ تعالیٰ ہر بات کو سنتا اور ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ اُس نے اس واقعہ کے ذریعے اپنے نبی کا مرتبہ بلند فرمایا، اور اس ایک آیت میں آپ کے فضائل حمیدہ کا تذکرہ کر دیا گیا۔ اگلی دو آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کا ذکر ہے اور پھر روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف ہو جاتا ہے۔

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِيْلًا ﴿۲﴾ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ﴿۳﴾

ترجمہ:- اور دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور بنایا ہم نے اُس کو ہدایت بنی اسرائیل کے لیے (اور ان کو حکم دیا) کہ نہ بناؤ میرے سوا کسی کو کارساز ② تم اولاد ہو اُن کی جن کو ہم نے اُٹھایا نوح علیہ السلام کے ساتھ۔ بیشک وہ اللہ کے شکرگزار بندے تھے ③

ربط آیات

جیسا کہ گذشتہ درس میں عرض کیا تھا اس سورۃ مبارکہ کی پہلی اور ساٹھویں آیات معراج نبوی سے متعلق ہیں اور اس واقعہ کا بعض حصہ سورۃ النجم میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ واقعہ معراج کی باقی تفصیلات صحیح احادیث میں مذکور ہیں۔ جن میں سے بعض کا ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو یہ فضیلت بخشی کہ آپ کو معراج کی بلندیوں تک لے گیا۔ اور مقصدِ معراج کے متعلق فرمایا تاکہ ہم اپنے پیغمبر کو اپنی قدرت کی بہت سی نشانیاں دکھائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس رات ایسی بہت سی نشانیاں دکھائیں جن میں آپ کی امت کے لیے تربیت کا پروگرام موجود ہے۔ آپ کو جنت اور دوزخ کی سیر کرائی گئی اور امت کی تعلیم کے لیے بعض احوال بتلائے گئے۔ جبرائیل علیہ السلام کو اپنی اصلی شکل میں دکھایا گیا۔ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مختلف آسمانوں پر ملاقات کرائی۔ خاص طور پر موسیٰ علیہ السلام سے دوبار ملاقات ہوئی۔ ایک دفعہ قبر میں نماز پڑھتے دکھایا گیا اور دوسری دفعہ نماز میں تخفیف کے سلسلہ میں آپ سے

بار بار گفتگو ہوئی۔

خادمہ فرعون کا مقام

امام ابن کثیرؒ نے ایک روایت بیان کی ہے کہ جنت کی سیر کے دوران حضور علیہ السلام کا گزر ایک ایسے مقام سے ہوا۔ جہاں بڑی زبردست خوشبو آرہی تھی۔ آپ علیہ السلام کے دریافت کرنے پر بتلایا گیا کہ یہ بنت فرعون کی خادمہ کا مقام ہے ایک موقع پر یہ خادمہ فرعون کی بیٹی کو کنگھی کر رہی تھی۔ کہ کنگھی اس کے ہاتھ سے گر پڑی جسے اس خادمہ نے بسم اللہ پڑھ کر اٹھا لیا۔ فرعون کی بیٹی بڑی حیران ہوئی کہ کیا اس کے باپ کے علاوہ کوئی اور بھی خدا ہے جس کا نام اس خادمہ نے لیا ہے بات فرعون تک پہنچی تو اس نے خادمہ کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم میرے علاوہ کسی اور کو بھی خدا تسلیم کرتی ہو۔ خادمہ نے جواب دیا کہ ہاں، ہم تو اس اللہ کو معبود مانتے ہیں جو ہمارا، تمہارا اور سب کا معبود ہے۔ فرعون، جو اس وقت تک بلا شرکت غیرے خدائی کا دعویدار تھا، خادمہ کی صاف گوئی پر سخت برہم ہوا، اور حکم دے دیا کہ اس کے سارے خاندان کو ہلاک کر دیا جائے۔ اس کا طریقہ یہ تجویز کیا کہ تانبے کے بنے ہوئے بیل کے مجسمہ کو خوب تپایا جائے اور پھر اس کے خاندان کے ایک ایک فرد کو اس کے پیٹ میں جھونک دیا جائے پہلے ایک شیر خوار بچے کو اس کی ماں کی آنکھوں کے سامنے اس آگ میں جھونکا گیا۔ پھر اس کی ماں کی باری آئی تو وہ ہچکچائی۔ اس پر اس بچے نے بول کر کہا کہ ماں! بلا تردد اس آگ میں داخل ہو جاؤ کہ تم حق پر ہو۔ اسی طرح خاندان کے تمام افراد کو آگ میں ڈال کر ہلاک کر دیا گیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے بتلایا گیا کہ یہ اس خاندان کا مقام ہے جہاں سے اتنی خوشبو آرہی ہے۔

امام الانبیاء کا اعزاز

پچھلے درس میں بیان ہو چکا ہے کہ حضور علیہ السلام نے مختلف آسمانوں پر مختلف انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کی۔ پھر جب آسمانوں کی سیر کے بعد واپس بیت المقدس پہنچے تو دیکھا کہ انبیاء علیہم السلام نماز پڑھ رہے ہیں۔

ابھی میں نے اتنا ہی خیال کیا تھا کہ ان کی امامت کون کرے گا تو جبرائیل علیہ السلام نے مجھے پکڑ کر آگے مصلے پر کھڑا کر دیا پھر میں نے تمام انبیاء کو نماز پڑھائی۔ حدیث کے الفاظ ہیں فَاَمَمْتُهُمْ یعنی میں نے ان کی امامت کرائی۔ یہ بھی حضور علیہ السلام کا بہت بڑا اعزاز ہے کہ آپ امام الانبیاء ہیں۔

موسیٰؑ کے لیے تورات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر تورات ملنے کا تذکرہ مختلف سورتوں میں کیا گیا ہے۔ یہاں بھی اس واقعہ کا مختصر ذکر ہے۔ واقعہ معراج سے اس کا ربط یوں ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو طور پر تورات عطا کی تھی۔ اسی طرح اللہ نے اپنے پیغمبر آخر الزماں کی عزت افزائی کے لیے معراج کے موقع پر بلند ترین مقام تک پہنچایا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر تورات کے نزول کا ذکر فرمایا ہے وَاٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تورات عطا فرمائی۔ تورات کا ذکر دراصل نزول قرآن کی تمہید ہے جس کا ذکر اسی رکوع کے آخر میں بایں الفاظ آرہا ہے اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ اللہ کی یہ آخری کتاب قرآن مجید بہترین راستہ کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ اسی طرح تورات کے متعلق بیان فرمایا ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی وَجَعَلْنٰهُ ھُدًی لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ذریعہ ہدایت بنایا۔

آسمانی کتب کا لب لباب

اور واضح کر دیا کہ اس کی تعلیمات کا لب لباب یہ ہے اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا کہ میرے سوا کسی کو کارساز نہ بنانا۔ قرآن پاک کی تعلیم بھی یہی ہے۔ ابتدائی زمانے کی سورۃ مزمل میں فرمایا لَآ اِلٰهَ اِلَّا ھُوَ فَاتَّخِذْهُ وَکِیْلًا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں لہٰذا کارساز بھی اسی کو پکڑو۔ گویا اللہ کی توحید ہی تمام کتب سماویہ کا نچوڑ ہے۔ خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو کارساز نہ سمجھا جائے۔ اس کے علاوہ کوئی کسی کی بگڑی نہیں بنا سکتا، نہ کوئی مافوق الاسباب تصرف کر سکتا ہے۔ کوئی نافع اور ضار نہیں۔ خدا کے سوا قادر مطلق اور عالم الغیب

بھی کوئی نہیں ۔ کوئی اس لائق نہیں کہ اُسے اپنی حاجات میں غائبانہ طور پر پکارا جائے ۔ تو تورات میں بنی اسرائیل کو یہی بات سمجھائی گئی ہے ۔ تحریف شدہ تورات میں اب بھی اس قسم کی آیات موجود ہیں کہ اے بنی اسرائیل میں تمہارا غیور خدا ہوں ، میرے ساتھ کسی کو عبادت میں شریک نہ بنانا ۔ اسی مسئلہ میں آکر اکثر لوگ پھسل جاتے ہیں ۔ اس وقت دنیا کی چار ارب آبادی کفر و شرک میں مبتلا ہے ۔ یاد رکھو ! خدا کا شریک بنانا سب سے بڑا گناہ ہے ۔ دنیا میں بمشکل پانچواں حصہ ایسا ہوگا جو توحید کو مانتا ہے مگر اس کے ماننے والوں کی اکثریت بھی کسی نہ کسی طرح شرک ایں ملوث ہے اور خالص توحید کو ماننے والے بہت ہی کم ہیں ۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ ۔

نوح علیہ السلام کی شکر گزاری

آگے اللہ تعالیٰ نے مشرکین عرب کی توجہ اس حقیقت کی طرف دلائی ہے ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ تم ان لوگوں کی اولاد ہو جن کو ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار کرایا تھا ۔ بنی اسرائیل کو خطاب ہے کہ تمہارے آباؤ اجداد نوح علیہ السلام پر ایمان لانے اور طوفان نوح سے بچ جانے والے لوگ ہیں ۔ اور نوح علیہ السلام إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا اللہ کے شکر گزار بندے تھے ۔ وہ اور آپ کے ماننے والے اسی شکر گزاری کی بنا پر بچ گئے اور پھر ان سے آگے نسل انسانی چلی اور جو لوگ مشرک اور ناشکر گزار تھے ، ان کو اللہ نے پانی میں غرق کر دیا ۔ لہٰذا اے بنی اسرائیل ! خبردار رہو کہ اگر تم نے بھی اللہ کی ناشکری کی تو تمہارا انجام بھی قوم نوح سے مختلف نہیں ہوگا ۔ لہٰذا شکر گزاری کو اپنا وطیرہ بنالو ۔ اس شکر گزاری کو پہلا فرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کیا جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا جائے نہ عبادت میں ، نہ پکار میں اور نہ نذر و نیاز میں شکر ایک ایسی چیز ہے جس کے متعلق ارشاد خداوندی ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ (ابراہیم) اگر میری نعمتوں کا شکر

ادا کرو گے تو میں مزید عطا کروں گا۔ اور اگر ناشکری کرو گے تو پھر عذاب بھی
بڑا سخت ہے۔ بہر حال شکر کی اولین شرط توحید باری تعالیٰ کو تسلیم کرنا ہے۔

نوح علیہ السلام کی شکر گزاری کا عالم یہ تھا کہ آپ کوئی چھوٹا یا بڑا کام اللہ
کے ذکر اور اس کی تعریف کے بغیر نہیں کرتے تھے۔ آپ نے لمبی عمر
پائی پھر تکالیف اٹھائیں مگر ہمیشہ صبر کا دامن تھامے رکھا اور اللہ تعالیٰ کا ہر حالت میں شکر
ادا کرتے رہے شفاعت والی حدیث میں آتا ہے کہ قیامت والے دن لوگ نوح علیہ السلام کے
پاس جائیں گے اور عرض کریں گے اَنْتَ اَوَّلُ الرُّسُلِ اِلٰی اَھْلِ الْاَرْضِ
آپ اہل زمین کی طرف مبعوث ہونے والے اولین رسول ہیں وَقَدْ سَمَّاكَ
اللّٰهُ عَبْدًا شَكُوْرًا اور اللہ نے آپ کا لقب شکر گزار بندہ رکھا ہے
لہٰذا آپ ہماری اللہ کے ہاں سفارش کریں مگر آپ کہیں گے کہ میں اس مقام
کا اہل نہیں ہوں اِذْهَبُوْا اِلٰی غَیْرِی کسی دوسرے کے پاس جاؤ۔ بہر حال
اللہ نے نوح علیہ السلام کو عبد شکور کہا ہے اور بنی اسرائیل کو یاد دلایا ہے۔ کہ
تم اس جلیل القدر نبی کی اولاد میں سے ہو۔ لہٰذا تمہیں عبرت حاصل ہونی چاہیئے،
کہ طوفان نوح میں صرف وہی لوگ بچ سکے جو اپنے نبی کے متبع اور شکر گزار تھے

شکر کی تعریف

جس طرح صبر، اللہ کا ذکر اور شعائر اللہ کی تعظیم اصول دین میں سے ہے
اسی طرح شکر بھی دین کا اہم جزو ہے جس کی بڑی تلقین کی گئی ہے۔ بزرگان دین
فرماتے ہیں کہ عام لوگوں کا شکر زبان سے ہوتا ہے۔ عابد لوگوں کا اعمال سے
اور عارف لوگوں کا شکر استقامت احوال سے ہوتا ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ
فرماتے ہیں کہ میں ابھی سات آٹھ سال کی عمر میں تھا کہ مجھے میرے استاد اور ماموں
حضرت سریؒ نے پوچھا بیٹا! شکر کیا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت استاد
کی صحبت سے اتنا فیض حاصل ہو چکا تھا کہ میں نے جواب دیا۔ حضرت!
شکر یہ ہے کہ اللہ کی کسی نعمت کو معصیت میں نہ لگایا جائے۔ سریؒ صاحب
نے فرمایا تمہیں یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی۔ کہنے لگے آپ کی مجلس میں بیٹھنے

سے۔ غرضیکہ خدا تعالیٰ کی کسی نعمت کو اگر معصیت کے کام میں لگا دیا تو یہ اس نعمت کی ناشکر گزاری ہوگی۔

ایک شخص نے حضرت سہلؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا حضرت! میرے ساتھ بدبخت بڑا سلوک ہوا۔ چور گھر میں داخل ہو کر سارا مال و متاع لوٹ کر لے گئے ہیں۔ آپ نے جواباً فرمایا، خدا کا شکر کرو کہ تمہارے مال کا ہی نقصان ہوا ہے، اگر شیطان تمہارے دل میں داخل ہو کر توحید ہی کو خراب کر دیتا، تو تم کیا کر سکتے؟ لہٰذا ایمان سلامت بچ جانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

ایک دفعہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدمت میں ایک وفد آیا۔ وفد میں سے ایک نوجوان نے گفتگو شروع کی تو آپ نے فرمایا، بھائی! کسی بڑے آدمی کو بولنے دو۔ وہ نوجوان کہنے لگا کہ اگر بات چیت کا دارومدار صرف بڑوں پر ہی ہے تو پھر آپ مسندِ خلافت پر کیسے متمکن ہیں جب کہ آپ سے بڑی عمر کے بہت سے لوگ موجود ہیں۔ اس پر آپ نے اسے گفتگو جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ وہ نوجوان بولا، ہم نہ تو کسی چیز کے حصول کے لیے آئے ہیں اور نہ ہی ہمیں کسی قسم کا خوف یہاں تک کھینچ لایا ہے۔ جہاں تک ہمارے حق کا تعلق ہے، وہ تو ہمیں ہمارے علاقے میں ہی مل جاتا ہے کیونکہ آپ کسی کا حق ضائع نہیں کرتے۔ اور خوف ہمیں اس لیے نہیں کہ آپ کے عدل نے اسے یقیناً بتا دیا ہے۔ ایک چیز سے آپ کے فضل نے ہمیں فائدہ پہنچایا ہے اور دوسری چیز عدل نے ہمیں مامون کیا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے پوچھا، پھر آئے کس لیے ہو؟ کہنے لگے کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ توفیق بخشی ہے کہ آپ خلیفہ عادل ہیں اور تمام مخلوق کی آرام و آسائش کو خیال رکھتے ہیں۔

اللہ کے شکر گزار بندے

بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کی کسی نعمت کا شکر ادا کبھی نہیں سکتا مگر اللہ تعالیٰ تھوڑے سے شکریہ پر ہی راضی ہو جاتا ہے۔ اللہ نے آلِ داؤد کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا "اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا ؕ وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ" (سبا) اے داؤد کے گھر والو اللہ کا شکر ادا کیا کرو کہ میرے بندوں میں شکر گزار بندے بہت قلیل تعداد میں ہیں۔ ترمذی شریف کی حدیث میں آتا ہے کہ شدید سردی میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرنے اور رات کی نماز میں طویل قیام کی وجہ سے حضور علیہ السلام کے پاؤں پھٹ جاتے تھے اور ان میں ورم آجاتا تھا۔ صحابہؓ نے عرض کیا، حضور اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت بڑی فضیلت عطا فرمائی ہے حتیٰ کہ سورۃ فتح میں آپ کی اگلی پچھلی تمام لغزشوں کی معافی کا اعلان فرما دیا ہے، پھر آپ اس قدر تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں کہ آپ کے پاؤں متورم ہو جاتے ہیں۔ آپ علیہ السلام کا جواب یہ تھا "اَفَلَآ اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا" کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار انعامات سے نوازا ہے۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو انسان کے ایک ایک بال کے ساتھ اس قدر نعمتیں ہیں کہ وہ عمر بھر ان کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ باقی نعمتوں کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ نے وجود بخشا ہے۔ جسمانی اور دماغی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں۔ مال و اسباب، زمین، مکان، دکان، ملازمت اور اولاد عطا کی ہے، مگر انسان نعمتوں کا شکریہ کیسے ادا کر سکتا ہے؟ ان نعمتوں کے شکریہ کی صورت یہ ہے کہ انسان ان نعمتوں کو اطاعت کے کاموں میں لگائے اور دل میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا پختہ یقین رکھے۔ شرک، کفر اور معاصی سے بیزار رہے۔

آثار میں آتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ اے پروردگار! میں تیرا شکریہ کسی طرح بھی ادا نہیں کر سکتا کیونکہ شکریہ ادا کرنا بھی

تیری ایک نعمت ہے۔ اور جب بھی میں شکر ادا کرتا ہوں تو ایک اور نعمت تلے دب جاتا ہوں۔ اللہ نے فرمایا مسلے داؤدؑ! اب تم نے مقامِ شکر کو پالیا ہے انسان کی طرف سے عجز و انکساری کا اظہار ہی بہت بڑا شکر ہے۔ اگر اور کچھ نہیں تو انسان کو زبان سے تو بہر حال اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ جب کوئی بندہ کھانا کھاتا ہے یا مشروب پیتا ہے اور پھر اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہہ کر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بندے سے راضی ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نے میرا شکریہ ادا کیا ہے۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ
فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴﴾ فَاِذَا
جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ
بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ﴿۵﴾
ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ
وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ﴿۶﴾ اِنْ اَحْسَنْتُمْ
اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَآءَ
وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ
كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ﴿۷﴾
عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَ
جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ﴿۸﴾

ترجمہ:۔ اور ہم نے وحی بھیجی بنی اسرائیل کی طرف کتاب میں (اور
اُن کو آگاہ کیا) کہ تم فساد کرو گے زمین میں دو دفعہ۔ اور تم
سرکشی اختیار کرو گے بہت بڑی سرکشی ﴿۴﴾ پس جب آیا ان
میں سے وعدے کا پہلا وقت تو ہم نے بھیجے تمہارے اُوپر
اپنے بندے سخت لڑائی والے۔ پھر وہ گھس گئے شہروں
کے درمیان اور تھا یہ وعدہ پورا کیا ہوا ﴿۵﴾ اور پھر ہم

نے پلٹا دی تمہارے لیے باری ان پر اور ہم نے مدد
دی تم کو مالوں کے ساتھ اور بیٹوں کے ساتھ اور بنایا ہم
نے تمہیں زیادہ تعداد میں ⑥ اور تمہیں خبردار کیا کہ اگر تم
اچھا کام کرو گے تو اچھا کام کرو گے اپنی جانوں کے لیے
اور اگر تم برا کرو گے تو وہ انہی پر پڑے گا۔ پس جب
آگیا دوسرا وعدہ تو وہ (بندے) بگاڑیں گے تمہارے چہروں
کو اور داخل ہوں گے مسجد میں جیسا کہ داخل ہوئے پہلی مرتبہ
اور تاکہ تباہ کر دیں اس چیز کو جس پر انہوں نے غلبہ پایا
تباہ کرنا ⑦ شاید تمہارا پروردگار رحم کرے تم پر، اور
اگر تم پلٹ کر کرو گے (وہی باتیں) تو ہم پلٹ کر (وہی سزا
دیں گے) اور بنایا ہے ہم نے جہنم کو کفر کرنے والوں کے
لیے، گھیرنے والا قید خانہ ⑧

ربط آیات

اس سورۃ مبارکہ کی پہلی آیت میں واقعہ معراج کا ذکر ہوا، پھر دوسری آیت میں حضرت
موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کرنے کا ذکر ہوا جسے اللہ نے بنی اسرائیل کے لیے سامان ہدایت
بنایا، پھر اللہ نے تمام کتب سماویہ مع تورات کی غرض و غایت یہ بیان فرمائی کہ میرے سوا
کسی کو کارساز نہ بنانا اور میرے ساتھ کسی طرح بھی شرک نہ کرنا۔ پھر بنی اسرائیل کو خدا تعالیٰ
نے اپنی نعمتیں یاد دلائیں اور فرمایا، دیکھو! تم ان لوگوں کی اولاد ہو جن کو ہم نے نوح علیہ السلام
کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا اور نوح علیہ السلام اللہ کے شکرگزار بندے تھے اللہ نے ان
کو شکرگزاری کی وجہ سے طوفان سے محفوظ رکھا اور تمام ناشکرگزاروں کو غرق کر دیا۔ اس طرح
گویا بنی اسرائیل کو آگاہ کیا اور دوسرے لوگوں کو متنبہ کیا کہ ناشکرگزاری کا نتیجہ بہت برا ہوتا ہے
لہٰذا اس سے بچنا چاہیے۔

اب آج کے درس میں اللہ نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ بنی اسرائیل کو بذریعہ

وحی آگاہ کر دیا گیا تھا کہ تم دنیا میں دو مرتبہ سخت سرکشی اختیار کرو گے اور دونوں مرتبہ تمہیں سزا دی جائے گی۔ چنانچہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بنی اسرائیل کا یہ حال اپنی امت کے سامنے بیان کر کے اپنی امت کو بھی خبردار کر دیا کہ اگر تم بھی بنی اسرائیل کے نقشِ قدم پر چلو گے تو انہی کے غلط عقیدے اور غلط رسوم اپناؤ گے، غلط اعمال انجام دو گے، تو پھر تمہارا حشر بھی اُن سے مختلف نہیں ہوگا۔

فساد اور سرکشی

ارشاد ہوتا ہے وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ قَضَيْنَا کا لغوی معنیٰ فیصلہ کرنا ہے۔ جب کہ مراد یہ ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو بذریعہ کتاب آگاہ کیا لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ کہ تم فساد کرو گے زمین میں دو دفعہ یعنی بڑے پیمانے پر بد امنی پیدا کرو گے وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا اور بہت بڑی سرکشی اختیار کرو گے۔ جس کے نتیجے میں دونوں مرتبہ تمہیں خدا کی جانب سے سخت سزا دی جائے گی۔ چنانچہ ان واقعات کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا ہے فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا پھر جب اُن دو میں سے پہلا وعدہ آگیا یعنی بنی اسرائیل کے فساد اور سرکشی کا وقت آگیا، اور وہ خدا تعالیٰ کے احکام کو ٹھکرانے لگے، اپنے انبیاء کی نافرمانی کر کے انہیں ایذا پہنچانے لگے حتیٰ کہ بعض انبیاء علیہم السلام کو ناحق قتل بھی کر دیا اور پھر جو لوگ انہیں حق کی بات بتانے کی کوشش کرتے، انہیں اچھی باتوں کا حکم کرتے اور بری باتوں سے منع کرتے، یہ اُن کو بھی برداشت نہ کرتے تھے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کی زمین پر نیکی مغلوب اور برائی غالب آگئی تو پہلے وعدے کا وقت آگیا، اور پھر اس کے نتیجے میں بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ ہم نے بھیجے تمہارے اوپر اپنے بندے جو سخت لڑائی والے تھے یعنی ہم نے تم پر تم سے بھی زیادہ سخت آدمی مسلط کر دیئے جن کے ذریعے تمہیں سخت ترین سزا دی۔ ان بندوں سے مراد کلدانی اور آشوری نسل کے لوگ ہیں جو بابل پر حکمران تھے اور جن کا سرغنہ بخت نصر

وغیرہ تھے - یہاں پر "عباد" کا لفظ تشریح طلب ہے۔ عبد کا لفظ عام طور پر فرمانبردار بندے پر بولا جاتا ہے جیسا کہ اسی سورۃ کی پہلی آیت میں گزر چکا ہے "اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ" اپنے بندے کو سیر کرائی - یا سورۃ فرقان کی ابتدا میں ہے "نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ" ہم نے قرآن پاک اپنے بندے پر نازل فرمایا تاہم بعض اوقات عبد کا اطلاق کافر اور نافرمان بندے پر بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی تو آخر اسی خالق کی مخلوق ہیں۔ تو یہاں پر جن سخت لڑائی والے بندوں کو بنی اسرائیل پر مسلط کرنے کا ذکر ہے - وہ اسی دوسری قسم کے نافرمان بندے تھے۔

بہرحال فرمایا کہ جب پہلی مرتبہ بنی اسرائیل نے زمین کی پُرامن فضا کو مکدر بنایا اللہ کے قوانین کو توڑا، برائی کا ارتکاب کیا، حلال و حرام کی تمیز ختم کر دی - جائز ناجائز کی پرواہ نہ کی، باطل رسوم کے پیچھے چلنے لگے، کفر و شرک اور بدعات کو اپنا لیا، جملہ معاصی، زنا، قتل، چوری، خیانت کا ارتکاب کر کے فساد فی الارض کا ذریعہ بنے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد تو یہ ہے "وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا" (الاعراف) پُرامن زمین کو فساد میں تبدیل نہ کرو، تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے بخت نصر جیسے جابر، ظالم اور مستبد بادشاہ کو بنی اسرائیل پر مسلط کر دیا کیونکہ اس کا عام قانون یہ ہے "وَكَذٰلِكَ نُوَلِّیْ بَعْضَ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضًا" (الانعام) اسی طرح ہم بعض ظالموں کو بعض پر مسلط کر دیتے ہیں۔ جو حاکم اپنی رعایا پر ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں ان کی سرکوبی کے لیے ان پر ان سے زیادہ جابر لوگ مسلط کر دیئے جاتے ہیں۔

بخت نصر کا کارروائی

اسی اصول کے تحت اللہ تعالیٰ نے بخت نصر جیسے ظالم بادشاہ کو بابل سے اٹھا کر شام و فلسطین میں بنی اسرائیل پر حملہ کرا دیا جس نے ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا ہے "فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ" بابلی فوجیں بنی اسرائیل کے شہروں میں گھس گئیں مگر ان کی مزاحمت کی کسی کو ہمت نہ پڑی۔ انہوں نے قتل و غارت گری کا ایسا بازار گرم کیا کہ گلیوں میں خون کی ندیاں

ہو گئیں۔ تاریخ میں چالیس ہزار یا ستر ہزار بنی اسرائیلیوں کے قتل کی روایات ملتی ہیں۔ انہوں نے نہ صرف انسانوں کو قتل کیا بلکہ بیت المقدس کو تباہ و برباد کر دیا اور وہاں کی کتابیں جلا دیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں بیت المقدس کی تعمیر جنات نے کی تھی اور اس میں قیمتی زر و جواہرات نصب کیے گئے تھے بخت نصر اور اس کے لشکری یہ تمام قیمتی چیزیں توڑ پھوڑ کر اپنے ساتھ لے گئے کہتے ہیں کہ یہ قیمتی سامان ایک لاکھ ستر ہزار بیل گاڑیوں پر لاد کر لے جایا گیا۔ پھر اسی پر بس نہیں کیا بلکہ قابل کار آدمیوں کو غلام اور بیشمار عورتوں کو لونڈیاں بنا کر لے گئے۔ بہر حال بنی اسرائیل کی سر زنش کا پہلا وعدہ پورا ہوا۔ اور ان پر انحطاط اور غلامی کا یہ دور تقریباً ستر سال تک قائم رہا۔ کہتے ہیں کہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر سے تقریباً چار سو سال بعد یہ واقعہ پیش آیا۔ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا۔ اور اس طرح اللہ کا وعدہ پورا ہو گیا۔

بنی اسرائیل کی آزادی

پھر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر ایک دفعہ پھر مہربانی فرمائی اور اس کا ذریعہ ایرانیوں کو بنایا۔ بعض ایرانی بادشاہ اٹھے اور انہوں نے بابلیوں کو شکست دے دی شام و فلسطین پر تسلط جمایا، اپنی قدرے انصاف پسندی کا ثبوت دیا اور نہ صرف بنی اسرائیل کو آزاد کر دیا۔ بلکہ ان کا بچا کھچا سامان بھی واپس کر دیا۔ اللہ نے اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ اے بنی اسرائیل! پھر ہم نے پلٹا دی تمہارے لیے باری ان پر یعنی تم پھر اپنی اصلی حالت میں آ گئے۔ وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ اور مال و دولت اور بیٹوں کے ساتھ تمہاری مدد کی تمہیں دوبارہ عروج حاصل ہو گیا مال و دولت کی فراوانی ہو گئی بیشمار لوگ قتل ہو چکے تھے ان کی کمی کو پورا کرنے کے لیے اللہ نے اولاد بھی کثرت سے عطا کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مال و جاہ کے علاوہ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ہم نے تمہاری تعداد میں بھی اضافہ کر دیا اور تمہاری قومی زندگی پوری طرح بحال ہو گئی۔ اللہ

نے انہیں ایک اور موقع فراہم کیا اور فرمایا اِنْ اَحْسَنْتُمْ اگر تم نیکی کا کام کرو گے اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ تم اپنے ہی لیے کرو گے یعنی اس کا فائدہ خود تمہیں ہی پہنچے گا وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا اور اگر تم کوئی برائی کا کام کرو گے تو اس کا وبال تمہی پر پڑے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اچھائی یا برائی کا نتیجہ تمہارے ہی حق میں اچھا یا برا نکلے گا۔ اللہ تعالیٰ کو نہ تمہاری نیکی کا کوئی فائدہ ہے اور نہ تمہاری برائی کا اس پر کوئی اثر ہے۔

ٹیٹس رومی کا حملہ

غرضیکہ بنی اسرائیل ایک دفعہ پھر خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگے مگر دنیا کے عیش و آرام میں پڑ کر خدا تعالیٰ اور اس کے احکام کو دوبارہ بھول گئے۔ خدا تعالیٰ کی اطاعت کی بجائے نافرمانی کرنے لگے، کفر، شرک اور معصیت میں مبتلا ہو گئے اور ایک دفعہ پھر ان کی وہی حالت ہو گئی جو پہلی سزا کے وقت تھی۔ بنی اسرائیل پر پہلا وعدہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد آیا تھا جب کہ اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کے ذریعے انہیں تباہ و برباد کیا۔ پھر دوسرا وعدہ مسیح علیہ السلام کے رفع الی السماء کے چالیس، ستر یا ایک سو ستر سال کے بعد رونما ہوا۔ اُس وقت تک بنی اسرائیل میں مسیحی بھی داخل ہو چکے تھے۔ یہودی تو پہلے ہی موجود تھے۔ انہوں نے حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کو نہایت بے دردی سے قتل کیا تھا کہ مسیح علیہ السلام کو بھی برداشت نہ کر سکے اور انہیں بھی سولی پر لٹکانے کی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچا لیا اور اپنی طرف آسمان پر اٹھا لیا۔

بہرحال اس دور میں بنی اسرائیل کی سرکشی ایک دفعہ پھر حد سے بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے اللہ کا غضب دوبارہ بھڑکا۔ اسی دور کے متعلق ارشاد ہوتا ہے فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ پھر جب دوسرا وعدہ آگیا لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ تو وہ بگاڑیں گے تمہارے چہروں کو وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ اور وہ مسجد میں داخل ہوں گے

جیسا کہ پہلی مرتبہ داخل ہوئے تھے وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا تاکہ وہ اس چیز کو تباہ و برباد کریں جس پر انہوں نے غلبہ پایا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل پر یہ دوسری تباہی ٹیٹس رومی کے ذریعے آئی۔ روم کا یہ بادشاہ نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی۔ جب اس نے دیکھا کہ بنی اسرائیل عیش و آرام میں پڑے ہوئے ہیں تو اُسے موقع مل گیا۔ اُس نے بیت المقدس پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بے شمار یہودی اور نصرانی قتل ہوئے اور اس طرح اللہ کا دوسرا وعدہ پورا ہو گیا۔ ٹیٹس رومی کے لشکری دوبارہ اسی طرح بیت المقدس میں داخل ہوئے۔ جس طرح پہلی مرتبہ بخت نصر کے سپاہی داخل ہوئے تھے اور اس پر قابض ہو گئے۔

عیسائیوں اور مسلمانوں کا قبضہ

ٹیٹس رومی کے حملے کے سو یا ڈیڑھ سو سال بعد نصرانیوں کے دن پھرے قسطنطین نے عیسائیت اختیار کر لی جس کی وجہ سے عیسائیت کو حوصلہ ملا۔ مگر یہودی اسی طرح ذلیل و خوار ہی رہے اور ہیکل مقدس بھی ویران ہی پڑا رہا۔ اس کے بعد خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطاب کے دورِ خلافت میں شام و فلسطین پر مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا۔ اس وقت تک بیت المقدس کی عمارت کھنڈر میں تبدیل ہو چکی تھی، تاہم اس مقام کو ہیکل مقدس ہی کہا جاتا تھا جس وقت واقعہ معراج پیش آیا، اس وقت بھی بیت المقدس ویران حالت میں ہی تھا۔ پھر جب مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو بیت المقدس کی دوبارہ تعمیر ہوئی اور تقریباً اسّی سال تک یہ مقدس مقام مسلمانوں کے قبضہ میں ہی رہا اور اس کے بعد پھر عیسائیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔

اب اس وقت بیت المقدس یہودیوں کے قبضہ میں ہے۔ چار بڑی طاقتوں نے ملی بھگت کے ذریعے فلسطین میں اسرائیلی ریاست قائم کر دی ہے اور فلسطینیوں کو وہاں سے نکال باہر کیا ہے۔ مسلمان بیت المقدس کی حفاظت نہیں کر سکے۔ اب ان کی بھی وہی حالت ہو چکی ہے جو کسی وقت

یہودیوں کی تھی۔ اب یہودی بیت المقدس کی جگہ پرانا ہیکل سلیمانی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا میں پچاس کے قریب مسلمان ریاستیں ہیں مگر ان کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ اپنے مقدس مقام کی حفاظت کرنے سے قاصر ہیں۔ بیت اللہ شریف کی حفاظت تو اللہ نے اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے لہذا وہاں کسی غیر مسلم کا قبضہ نہیں ہونے دیا مگر بیت المقدس کو یہ گارنٹی حاصل نہیں ہے، لہذا یہ بار بار بستا اور اجڑتا رہا ہے۔ یہودیوں کے دور میں بیت المقدس کی دو دفعہ بے حرمتی ہوئی اور اب مسلمان بھی اس کی حفاظت نہیں کر سکے۔

مسلمانوں کی حالت زار

حقیقت یہ ہے کہ اب مسلمانوں میں بھی یہودیوں والی بیماریاں پیدا ہو چکی ہیں۔ دعویٰ کچھ ہے اور عمل کچھ اور۔ عراق، شام، ایران، اردن وغیرہ نام تو اسلام کا لیتے ہیں مگر حقیقت کچھ نہیں۔ آج دنیا بھر کے مسلمان سرکشی اور فساد فی الارض کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ان کی اس سے بڑی ذلت کیا ہو گی کہ ان کے قبلہ اوّل کی تذلیل ان کی آنکھوں کے سامنے ہو رہی ہے۔ مسلمان دین کو چھوڑ کر عیاشی اور آرام طلبی میں مبتلا ہو چکے ہیں یہودی بھی اللہ کے نبیوں کی مخالفت کرتے تھے جب انہیں شرک، بدعت اور معاصی سے منع کیا جاتا تو مخالفت پر اتر آتے۔ آج مسلمانوں کو بھی نہی عن المنکر کیا جائے تو وہ بھی آمادۂ بر فساد ہوتے ہیں اور سرکشی اختیار کرتے ہیں۔ اللہ کے احکام کو پس پشت ڈال دیا ہے لہذا اپنی کثیر تعداد کے باوجود بیت المقدس کی حفاظت نہیں کر سکے حالانکہ یہ ان کی ذمہ داری تھی۔ اگرچہ ملّتِ ابراہیمیہ کا عظیم قبلہ تو بیت اللہ شریف ہی ہے مگر اللہ نے بیت المقدس کو بھی محترم قرار دیا ہے وہ سارے انبیاء کا قبلہ رہا ہے۔ وہاں پر ایک نماز پڑھنے کا اجر دوسری جگہ کی نسبت پچاس ہزار گنا زیادہ ہے مگر اب مسلمان اس سے محروم ہو چکے ہیں۔

سامانِ عبرت

بہر حال اللہ نے اشارتاً یہ بات سمجھا دی ہے کہ اے لوگو! اگر اب بھی

تم برائیوں سے باز آجاؤ۔ اللہ کے احکام کی تعمیل کرنے لگو تو پھر عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يَرْحَمَكُمْ شاید کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم فرمائے۔ تمہیں کھویا ہوا وقار پھر سے حاصل ہو جائے۔ یہودیوں کا حال تمہارے سامنے ہے۔ بخت نصر اور ٹیٹس رومی کے بعد اُن کی تیسری شامت اس وقت آئی جب اللہ نے اپنا آخری نبی مبعوث فرمایا۔ اُس وقت یہودیوں کی کثیر تعداد خطہ عرب خصوصاً مدینہ طیبہ کے اطراف میں آباد تھی انہوں نے نہ صرف پیغمبر آخر الزمان کا انکار کیا بلکہ ان کے ہر کاروائی کے خلاف سازشیں کیں۔ مشرکین عرب کا ساتھ دیا۔ مگر اللہ نے تیسری مرتبہ بھی ان کو ذلیل و خوار کیا۔ سرزمین عرب پر مسلمانوں کو تسلط حاصل ہوا تو کچھ یہودی مارے گئے اور باقی جلاوطن ہوئے۔ عرب سے باہر جا کر بھی ذلیل و خوار ہی ہوتے رہے۔ اللہ نے فرمایا کہ اگر اب بھی سابقہ واقعات سے عبرت حاصل کرنے کی بجائے وَإِنْ عُدْتُمْ عُدْنَا اگر تم پھر برائیوں کی طرف پلٹ آئے۔ اصلاح کی بجائے فساد فی الارض کے مرتکب ہوئے۔ اللہ کی آخری کتاب اور اس کے آخری نبی پر ایمان نہ لائے تو ہم بھی پلٹ کر تمہیں وہی سزا دیں گے جو پہلے دیتے رہے۔ چنانچہ ان کو تیسری مرتبہ مسلمانوں کے ہاتھوں سزا ملی۔ مگر آج مسلمانوں پر بھی یہودیوں والی حالت طاری ہو چکی ہے وہی مغلوبیت، وہی مظلومیت، وہی مذہب سے بیگانگی، لہو و لعب، اور عیش و آرام سے لگاؤ۔ اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ کچھ لوگ اب بھی ہدایت پر ہیں۔ مگر عربی کا مقولہ ہے اَلشَّاذُّ كَالْمَعْدُوْمِ یعنی نہ ہونے کے برابر ہے۔

فرمایا جو قوم راہِ راست پر نہیں آئے گی، کفر، شرک، معاصی اور فساد فی الارض کا ارتکاب کرتی رہے گی وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ہم نے کافروں کے لیے گھیرنے والا جہنم تیار کر رکھا ہے جس کا خاتمہ کفر پر ہوگا۔ خواہ یہودی ہو یا نصرانی یا کوئی دوسرا کافر ہو، وہ بہرحال جہنم میں جائے گا یہ آخرت کی سزا کی طرف اشارہ ہے کہ صرف دنیا کی سزا کافی نہیں بلکہ آخرت

کی دائمی سزا بھی کافروں کے لیے تیار ہے ۔ بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بیان کر کے
اللہ نے مسلمانوں کو بھی خبردار کر دیا ہے کہ جو کوئی یہودیوں والی خصلتیں اختیار
کریگا اس کا انجام بھی ویسا ہی ہوگا ۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات کے نزول کو بطور تمہید بیان کیا ہے
اب آگے اصل بات قرآن کریم کے بارے میں ہوگی ۔

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ﴿٩﴾ وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٠﴾ وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا ﴿١١﴾

ترجمہ:۔ بیشک یہ قرآن راہ دکھاتا ہے اس طریقے کی طرف جو سب سے زیادہ درست ہے، اور خوشخبری دیتا ہے ایمان والوں کو جو اچھے کام کرتے ہیں، بیشک ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے (۹) اور (خبردار کرتا ہے) کہ بیشک جو لوگ ایمان نہیں لاتے آخرت پر، ہم نے تیار کیا ہے ان کے لیے دردناک عذاب (۱۰) اور مانگتا ہے انسان برائی کو جیسا کہ وہ مانگتا ہے بھلائی کو، اور ہے انسان جلدباز (۱۱)

ربط آیات

سورۃ ہذا کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے معراج جیسی عظیم نعمت کا ذکر کیا جو اس نے اپنے مقرب بندے اور آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کی۔ پھر اللہ نے یہ احسان بھی جتلایا کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات جیسی عظیم کتاب عطا فرمائی۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام کی شکرگزاری کا ذکر کیا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والوں کو نجات دی۔ اللہ تعالیٰ نے نافرمانوں اور ناشکرگزاروں پر آنے والے مصائب و آلام کا تذکرہ بھی اشارۃً کیا۔ نوح علیہ السلام کی قوم انبیاء کی مخالفت، کفر و شرک پر اصرار

اور قیامت کے انکار کی وجہ سے ہلاک کی گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی سرکشی کا حال بیان فرمایا کہ انہوں نے دو دفعہ سرکشی اختیار کی تو اللہ نے انہیں دونوں دفعہ ان پر جابر حکمرانوں کو مسلط کر کے ذلیل و رسوا کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں بار بار سمجھاتا رہا کہ اگر سرکشی سے باز آجاؤ اور نیکی کا راستہ اختیار کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ ورنہ تمام کافروں، مشرکوں اور مجرموں کے لیے آخرت کا عذاب یعنی جہنم کا قید خانہ تو موجود ہے۔ درمیان میں ایمان والوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اگر تم بھی بنی اسرائیل کے راستے پر چلو گے تو تمہارا انجام بھی ان سے مختلف نہیں ہوگا۔

قرآن بطور راہِ ہدایت

گزشتہ سے پیوستہ درس میں بنی اسرائیل کو کتاب ہدایت عطا کرنے کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ وہاں میں نے عرض کر دیا تھا کہ یہ تذکرہ دراصل قرآن کریم کے متعلق آج کی آیت کی تمہید تھا۔ چنانچہ آج کے درس کی پہلی آیت میں قرآن پاک کے متعلق ارشاد ہوتا ہے إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ بیشک یہ قرآن راہنمائی کرتا ہے اس راستے کی طرف جو سب سے زیادہ سیدھا اور درست ہے۔ گویا قرآن حکیم تورات سے بھی زیادہ فضیلت والی کتاب ہے۔ تورات صرف بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے نازل ہوئی تھی جب کہ یہ کتاب اللہ نے تمام بنی نوع انسان کے لیے اتاری۔ یہ کتاب انسان کی فکر، اس کے اعضاء و جوارح اور تمام قویٰ کو ایسی شاہراہ پر لگاتی ہے جس پر چل کر انسان ہمیشہ کے لیے فلاح پا سکتے ہیں۔

أَقْوَمُ کا معنی درست اور سیدھی لہ ہے۔ لِلَّتِي کا صلہ راستہ بھی ہو سکتا ہے اور ملت بھی۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ قرآن راہ ہدایت ہے جو انسان کے ظاہر اور باطن کی درستگی کا سامان مہیا کرتا ہے یا یہ اس ملت کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ درست ہے اور وہ ملت ابراہیمی یا ملت اسلام ہے۔ ملت اسلامیہ ایسی ملت ہے جس کے مقابلے کی کوئی ملت، مذہب اور طریقہ نہیں ہے۔

اہل ایمان کے لیے بشارت

اب یہود و نصاریٰ کا فرض بھی یہ ہے کہ وہ اسی راستے کو اختیار کریں جس کے بغیر فلاح کی کوئی صورت نہیں۔ اس راستے پر چلنے والے مومنین کے متعلق فرمایا وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ قرآن حکیم اہل ایمان کو بشارت سناتا ہے۔ ترغیب ترہیب بھی دین کے اہم مقاصد میں سے ہے۔ جہاں قرآن پاک برائیوں کے انجام سے ڈراتا ہے وہاں نیکیوں کے انجام کی خوشخبری بھی سناتا ہے۔ تو یہ خوشی کی بات ہے کہ قرآن ایمان لانے والوں کو خوشخبری سناتا ہے۔ اور ایمان لانے والے کون ہیں الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ جو فکر کی درستگی کے بعد نیک اعمال انجام دے رہے ہیں۔ فکر تو انہوں نے ایمان لاکر درست کرلی۔ اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کیا۔ خدا کی صفات، انبیاء کی رسالت، ملائکہ اور کتب سماویہ پر ایمان لائے۔ اور صالحات میں ہر قسم کی نیکیاں شامل ہیں۔ بنیادی طور پر نماز روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد نیک اعمال ہیں ان کے علاوہ ہر وہ عمل جسے شریعت نے اچھا عمل تسلیم کیا ہے وہ بھی نیک عمل ہوگا۔ پھر یہ ہے کہ نیک اعمال قلوب سے بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسے کسی دوسرے کے بارے میں اچھی نیت رکھنا اور اس کے متعلق اچھا گمان کرنا نیکی میں داخل ہے۔ "قُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا" (البقرہ) یعنی زبان سے اچھی بات نکالنا بھی نیک عمل ہے۔ اس کے علاوہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نیکی میں داخل ہے۔ فرمایا ایمان لانے کے بعد جو نیک اعمال انجام دیتے ہیں أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا بیشک ان کے لیے اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے اس کے نتیجے میں وہ لوگ خوش کام اور خائز المرام ہوں گے قرآن اُن کو بشارت دیتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے کامیاب ہو جائیں گے

ترغیب کے بعد ترہیب

ترغیب کے بعد اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں ترہیب بھی بیان فرمائی ہے۔ اہل ایمان کی کامیابی کا ذکر کرکے نافرمانوں کی سزا کا ذکر بھی کیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے وَاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اور جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے، قرآن ان کو خبردار کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص آخرت کے محاسبے کو ہی تسلیم نہیں کرتا، وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔ تو ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یہ نہایت ہی خطرناک اور دکھ دینے والا عذاب ہے

غرضیکہ ترغیب و ترہیب کا کام صرف قرآن پاک نہیں دیتا بلکہ خود انبیائے کرام بھی یہ فریضہ ادا کرتے ہیں۔ خود قرآن پاک کا بیان ہے رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ" (النساء) ہم نے رسولوں کو خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا ہے تاکہ لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔

اپنے حق میں بدعا

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے ایک گوشے کو بے نقاب کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ اور مانگتا ہے انسان برائی کو جیسا کہ وہ مانگتا ہے بھلائی کو۔ بھلائی تو ہر آدمی چاہتا ہے اور ہر وقت اس کی طلب بھی کرتا رہتا ہے، مگر بعض اوقات اپنے منہ سے برائی بھی مانگ لیتا ہے۔ اس کی مثال خود قرآن پاک نے بھی پیش کی ہے مشرکین مکہ میں سے بعض ایسے بھی تھے جو کہتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ" (الانفال) اے اللہ اگر محمد کا لایا ہوا دین تیری طرف سے برحق ہے، تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا کوئی ہم پر دردناک عذاب بھیج دے۔ انسان کی بیوقوفی کا اندازہ لگائیں کہ ضد اور ہٹ دھرمی میں اس قدر دور نکل جاتے ہیں کہ خود اپنی زبان سے عذاب کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ کہتے تھے کہ توحید، رسالت اور معاد کے متعلق حضور علیہ السلام کا نظریہ درست ہے، تو ہم اسے ماننے کے لیے تیار نہیں، بلکہ تو ہمیں نیست و نابود ہی کیوں نہ کر دے اسی سورۃ میں آگے کفار کا بھی اسی قسم کا

بیان کر رہا ہے۔ وہ کہتے تھے اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا بیشک ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے، ہم اس دین کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ انسان کا بھلائی کی بجائے برائی کا طالب کرنا نہایت ہی قبیح بات ہے۔ اسی لیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ غصے کی حالت میں جلد بازی میں اپنے یا اپنے اہل و عیال یا اپنے مال کے لیے بددعا نہ کر بیٹھو۔ حدیث شریف کے الفاظ ہیں لَا تَدْعُوا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ وَلَا اَمْوَالِكُمْ وَلَا عَلٰى اَهْلِيْكُمْ (مسلم) بعض گھڑیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں دعا قبول ہو جاتی ہے اگر ایسے ہی وقت میں تمہاری زبان سے کوئی بددعا نکل گئی تو تمہیں نقصان پہنچ جائے گا اور پھر تم کفِ افسوس ملتے رہ گے، لہٰذا اپنے یا دوست احباب یا اولاد یا مال کے خلاف بددعا کرنے سے منع فرمایا گیا ہے کہ یہ چیز عجلت میں داخل ہے۔

حضور علیہ السلام کی خصوصیت

دُعا کے بارے میں صرف پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصیت حاصل ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ میں نے اپنے پروردگار سے یہ شرط طے کر رکھی ہے کہ میں بھی انسان ہوں کبھی غصہ بھی آجاتا ہے، لہٰذا اگر میں کسی کے حق میں بددعا کر دوں جس کا وہ مستحق نہ ہو، تو میری بددعا کو اس کے حق میں رحمت اور پاکیزگی بنا دے۔ تو حضور علیہ السلام کی دُعا صرف اُسی شخص کو لگے گی جو اس کا مستحق ہوگا۔ امام رازیؒ اور بعض دوسرے مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر حضور علیہ السلام نے ایک قیدی کو حضرت سودہؓ کے سپرد کیا۔ جب اس قیدی کو رسیوں سے جکڑا گیا تو وہ کراہنے لگا۔ حضرت سودہؓ کے دریافت کرنے پر قیدی نے بتایا کہ اس کی رسی سخت کسی ہوئی ہے جس کی وجہ سے اُسے تکلیف ہے۔ آپ نے اُس پر رحم کرتے ہوئے رسی کو ذرا ڈھیلا کر دیا۔ پھر یہ ہوا کہ جبھی اس قیدی نے موقع پایا رسی کاٹ کر بھاگ گیا اس بات کی خبر حضور علیہ السلام تک پہنچی تو آپ نے حضرت سودہؓ کو بلا کر دریافت

گیا۔ انہوں نے پوری بات بیان کر دی کہ میں نے اس پر رحم کرتے ہوئے
اس کی رسی ڈھیلی کر دی تھی جس کی وجہ سے قیدی بھاگ گیا۔ اس پر حضور علیہ السلام
کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا اَللّٰھُمَّ اقْطَعْ یَدَھَا۔ اے اللہ سودہؓ
کے ہاتھ کاٹ دے کہ اس نے قیدی کے ساتھ کیوں رعایت کی۔ یہ بددعا
سن کر حضرت سودہؓ سخت پریشان ہوئیں اپنے ہاتھوں کی طرف بار بار
دیکھتی تھیں کہ کہیں حضور کی بددعا کی زد میں تو نہیں آگئیں۔ آپ علیہ السلام
نے فرمایا: سودہ! یہ بددعا نہیں لگے گی کیونکہ میرا اللہ تعالیٰ سے عہد ہے۔ کہ
میری بددعا صرف اس کے مستحق کو ہی لگے گی۔ کوئی غیر مستحق شخص اس کی زد میں
نہیں آئے گا۔ اسی طرح ایک دفعہ حضور علیہ السلام نے امیر معاویہؓ کو طلب
فرمایا تو آپ کو بتایا گیا کہ وہ کھانا کھا رہے ہیں۔ دوبارہ بلایا تو پھر بھی یہی جواب
ملا کہ کھانا کھا رہے ہیں۔ حضور نے فرمایا: اَشْبَعَ اللّٰہُ بَطْنَہٗ۔ اللہ اس
کا پیٹ نہ بھرے۔ یہ بددعا بھی ان کو نہیں لگی کیونکہ وہ اس کے مستحق نہیں تھے
حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا
تھا۔ حضور نے فرمایا: اللہ کے بندے! دائیں سے کھاؤ۔ وہ کہنے لگا کہ میرا
دایاں ہاتھ اٹھتا ہی نہیں۔ اس نے تکبر سے یہ بات کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ اس کا دایاں ہاتھ ہمیشہ کے لیے شل ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ حضور نے بددعا فرمائی
تھی لَا رَفَعْتَھَا: اللہ تعالیٰ تیرے اس ہاتھ کو نہ ہی اٹھائے۔ یہ شخص تکبر
کی بنا پر بددعا کا مستحق ٹھہرا۔
حضور علیہ السلام نے نمازی کے آگے سے گزرنے کی سخت وعید فرمائی
ہے آپ کا ارشاد ہے کہ کوئی شخص چالیس سال تک اپنی جگہ کھڑا رہے
تو یہ نمازی کے آگے سے گزرنے سے بہتر ہے۔ بعض نے اسے چالیس
ہفتے یا چالیس ماہ پر بھی محمول کیا ہے، تاہم نمازی کی نماز میں خلل ڈالنا
سخت معیوب ہے۔ حضور علیہ السلام نماز ادا فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے
اسی طرح نماز میں خلل ڈالا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شخص ہمیشہ کے لیے معذور ہو گیا

انسان جلد باز ہے

بہر حال فرمایا کہ کسی شخص کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ غصے کی حالت میں جلد بازی کرتے ہوئے اپنے لیے، اہل وعیال یا مال کے متعلق بد دعا کرے۔ فرمایا کتنی بُری بات ہے کہ انسان اپنے لیے اسی طرح شر کو طلب کرتا ہے جس طرح کہ خیر کو مانگتا ہے وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا اور حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا جلد باز ہے۔ وہ جلد بازی میں بہت کچھ کر بیٹھتا ہے۔ کافر لوگ اسی جلد بازی کے نتیجے میں ہی اپنے لیے بد دعا کر بیٹھتے ہیں۔ قرآن پاک کا انکار جلد بازی کی وجہ سے ہی کرتے ہیں۔ واقعہ معراج کی تکذیب بھی جلد بازی کا نتیجہ تھا، لہٰذا انسان کی جلد بازی اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ⑫ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰۗىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ⑬ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ⑭ ۭ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ⑮

ترجمہ :- اور بنایا ہے ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں ۔ پس ہم نے دھیما کر دیا ہے رات کی نشانی کو اور بنایا ہے دن کی نشانی کو روشن تاکہ تلاش کرو تم فضل اپنے رب سے اور تاکہ تم جان لو گنتی سالوں کی اور حساب ۔ اور ہر ایک چیز ، ہم نے تفصیل کی ہے اس کی تفصیل کرنا (۱۲) اور ہر انسان ، ہم نے لازم کر دیا ہے اس کے ساتھ اس کا اعمال نامہ اس کی گردن میں ، اور نکالیں گے ہم اس کے سامنے قیامت

کے دن ایک نوشتہ جسے وہ کھلا ہوا پائے گا (۱۳) اور
اس سے کہا جائے گا کہ پڑھ اپنی کتاب، کافی ہے تیرا نفس
آج کے دن تجھ پر محاسبہ کرنے والا (۱۴) جس نفس نے راہ ہدایت
پائی پس بیشک وہ ہدایت پاتا ہے اپنے لیے اور جو گمراہ ہوا
پس بیشک وہ گمراہ ہوتا ہے اپنے ہی نقصان میں۔ اور نہیں
اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ۔ اور ہم نہیں
سزا دیتے یہاں تک کہ ہم بھیج دیں رسول (۱۵)

ربط آیات

گزشتہ درس میں قرآن پاک کی ہدایت اور راہنمائی کا ذکر ہوا کہ یہ سب سے سیدھے راستے اور سب سے درست ملت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ یہ قرآن اہل ایمان کو بشارت دیتا ہے اور جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کو عذاب کی وعید سناتا ہے پھر فرمایا انسان جلد بازی میں آکر شر کی دعا کرنے لگتا ہے حالانکہ یہ اس کے لیے مناسب نہیں۔ آج کے درس میں اللہ نے اپنی پہچان، توحید اور وقوع قیامت کے سلسلے میں اپنی قدرت کی نشانیوں کو بیان کیا ہے۔ اگر ان میں تھوڑا سا بھی غور کیا جائے تو انسان اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قدرت تامہ کو سمجھ سکتا ہے۔ انہی نشانیوں سے قیامت پر یقین بھی پختہ ہو سکتا ہے۔

لیل و نہار کا نظام

نشانات قدرت کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے رات اور دن کی دو نشانیوں کا ذکر کیا ہے ارشاد ہوتا ہے وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ اور بنایا ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں۔ ان نشانیوں کی دو خصوصیات یہ بیان فرمائیں فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ پھر ہم نے محو کر دیا، مٹا دیا، دھیما کر دیا رات کی نشانی کو یعنی رات کے وقت وہ آب و تاب نہیں ہوتی جو دن کے وقت ہوتی ہے۔ اور دن کی نشانی کے متعلق فرمایا وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً اور بنایا ہم نے دن کی نشانی کو روشن۔ دن کے وقت سورج کی روشنی خوب ہوتی ہے۔ رات کو دھیمی سی روشنی چاند اور ستاروں کی ہوتی ہے جب کہ دن کے وقت سورج دنیا کو منور کر دیتا ہے۔

رات اور دن کی مصروفیات بھی الگ الگ ہیں اور ان میں تفاوت ہی کاروبار کی تقسیم اور اوقاتِ کار کے تعین کا ذریعہ ہے۔ سورۃ الانعام میں ہے وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا رات انسانوں اور حیوانوں کے آرام کے لیے بنائی ہے تاکہ اس دوران میں وہ تھکاوٹ کو دور کر کے اپنے قویٰ کو بحال کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے رات کو اسی لیے ویسا بنایا ہے کہ آرام و سکون میں تیز روشنی موزوں نہیں ہوتی۔ اسی طرح دن کے متعلق سورۃ النبا میں فرمایا وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا اور ہم نے دن کو ذریعہ معاش بنایا۔ رات کے آرام کے بعد انسان دن کے وقت کاروبار میں مصروف ہو جاتے ہیں اور یہ کام سورج کی تیز روشنی میں ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ دوکانداری کرتے ہیں۔ کوئی مزدوری کرتا ہے ملازمت اختیار کرتا ہے یہ سب کچھ دن کے وقت ہوتا ہے۔ جس سے انسان روزی کماتے ہیں۔ جانور اور پرندے بھی اپنے اپنے ٹھکانوں سے روزی کی تلاش میں نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے رات اور دن کا یہ نظام انسانوں اور حیوانوں کی مصلحت اور ضروریات کے مطابق رکھا ہے۔

روحانی کمال اور زوال

جس طرح رات اور دن کا نظام مختلف اغراض و مقاصد کے لیے قائم ہے۔ اسی طرح اللہ نے روحانیت کا نظام بھی قائم کیا ہے۔ بعض ایسی چیزیں ہیں جن کو اختیار کرنے سے انسان کی روح میں روشنی پیدا ہوتی ہے جو اسے درجہ کمال تک پہنچاتی ہے۔ اور بعض چیزیں ایسی ہیں جو روحِ انسانی کو تاریک بنا دیتی ہیں اور انسان خسارے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایمان اور کفر اسی نظام کا حصہ ہیں۔ ایمان کی بدولت انسان میں روشنی پیدا ہوتی ہے اور اسے کمال حاصل ہوتا ہے جب کہ کفر اختیار کرنے سے تاریکی جنم لیتی ہے جس طرح رات کی تاریکی دن کی روشنی میں تبدیل ہوتی ہے تو انسان کو معیشت کے اسباب حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح کفر و شرک کی تاریکی میں اللہ تعالے

انبیاء کو مبعوث کر کے اور کتابیں نازل فرما کر روحانی روشنی کا بندوبست کرتا ہے
جو بنی نوع انسان کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

رزق حلال کی تلاش

فرمایا ہم نے دن کو روشن نشانی بنایا لِتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ
تاکہ تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرو۔ لفظ فضل اپنے اندر وسیع مفہوم
رکھتا ہے۔ اس میں رزق حلال بھی داخل ہے اور انسان کا ہر کمال فضل ہی کا حصہ
ہے۔ اس کے علاوہ عبادت، ریاضت، علم، اچھا اخلاق وغیرہ سب
اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جو دن کی روشنی میں حاصل ہوتا ہے اور اللہ نے دن کو
اپنی نشانی کے طور پر متعارف کرایا ہے۔

ماہ و سال کی گنتی

فرمایا دن رات کے تغیر و تبدل کا ایک مقصد یہ بھی ہے وَلِتَعْلَمُوْا
عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کر سکو ظاہر
ہے کہ ماہ و سال کی شناخت دن رات کے تغیر و تبدل سے ہی ہوتی ہے
پہلے ایک دن بنتا ہے، پھر ہفتہ، پھر مہینہ اور پھر سال۔ مختلف امور کی انجام
دہی کے لیے اللہ نے جو نظام الاوقات مقرر کیا ہے وہ سورج کے حساب
سے ہوگا یا چاند کے حساب سے اور پھر اس کے مطابق روزانہ، ماہانہ اور سالانہ
امور انجام دیے جاتے ہیں۔ گویا دن رات کا ایک مقصد ماہ و سال کی گنتی کا حساب
قائم کرنا بھی ہے۔

اس کے ساتھ اللہ نے یہ بھی فرمایا وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا
اور ہم نے ہر چیز کی تفصیل کھول کر بیان کر دی تاکہ انسان اللہ کی قدرت کی
نشانیوں کو دیکھ کر اور سمجھ کر حقیقت کو معلوم کر سکیں۔ ایمان کی دولت حاصل
کر سکیں اور نیکیاں کما سکیں۔ پس دن رات کا جو وقفہ انسان کو مل رہا ہے۔ اسے
اس کو ضائع نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ سورۃ
الفرقان میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ
خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا جو شخص نصیحت

حاصل کرنا چاہتا ہے یا اللہ کا شکر گزار بندہ بننا چاہتا ہے اس کے لیے اللہ نے رات اور دن کو آگے پیچھے آنے والا بنا دیا ہے دن رات کا تغیر و تبدل عقلمندوں کے لیے بہت بڑا موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ ان میں غور و فکر کر کے صحیح نتیجے پر پہنچ جائے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان بھی ہے کہ رات کے وقت میں کوتاہی کرنے والوں کے لیے دن کے وقت موقع ہوتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کر لیں۔ اسی طرح دن میں کوتاہی کرنے والوں کے لیے رات کو معافی مانگنے اور تلافی کرنے کا موقع ہوتا ہے اور اس طرح انسان اپنی حالت کو درست کر سکتا ہے۔

دن رات کی نشانیوں کے تذکرے اور ان سے نصیحت حاصل کرنے کے بیان کے بعد اللہ نے انسان کی توجہ اس کی آخرت کی طرف دلائی ہے اور بتا دیا ہے کہ دنیا کی کارگزاری یہیں پر ختم نہیں ہو جائے گی، بلکہ اس کا حتمی نتیجہ آخرت میں نکلنے والا ہے۔ اس دنیا میں انجام دیا جانے والا ہر اچھا یا برا عمل محفوظ کیا جا رہا ہے اور اس کی صورت یہ ہے وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ ہم نے ہر انسان کے ساتھ اس کا طائر یعنی اعمال نامہ اس کی گردن میں لازم کر دیا ہے۔ لغوی طور پر طائر کا معنیٰ پرندہ اور شگون بھی ہوتا ہے، تاہم یہاں پر اس سے مراد ہر انسان کا نامہ اعمال ہے جو اس کی زندگی بھر مرتب ہوتا ہے اور پھر موت کے وقت اس کی گردن میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا جسے ہم قیامت کے دن ایک نوشتے کی صورت میں نکالیں گے يَلْقَاهُ مَنشُورًا جسے وہ کھلا ہوا پائے گا۔ اس کتاب میں ہر انسان اپنی سعادت یا شقاوت کی ہر چیز موجود پائے گا۔ یہ اس کے اعمال کا نتیجہ ہے یا اس کی شومیٔ قسمت کہ اس کا ہر عمل اس کے گلے کا ہار بن چکا ہوگا اور پھر عجیب بات یہ ہے

کہ اس وقت ہر خواندہ اور ناخواندہ آدمی اس کو خود پڑھ سکے گا اور پھر حیرت
کے ساتھ کہے گا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا
كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا (الکہف) یہ عجیب کتاب ہے جس نے ہر
چھوٹی بڑی چیز کو شمار کر رکھا ہے۔ حدیث شریف میں بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ
اس وقت فرمائے گا، اے ابن آدم! اِنَّمَا هِيَ اَعْمَالُكُمْ
اُحْصِيْهَا لَكُمْ یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جنہیں میں نے تمہارے لیے شمار
اور محفوظ کر کے رکھا ہوا ہے۔ اگر اس نامہ اعمال کو اچھا پاؤ تو خدا تعالیٰ کا
شکر ادا کرو اور اگر اسے اپنے خلاف پاؤ تو اپنے آپ کو ملامت کرو کہ یہ
تمہاری اپنی ہی کمائی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انسان
کا ہر عمل نکلتا بھی اس کے نفس سے ہی ہے اور پھر لوٹ کر نفس کی طرف
ہی چلا جاتا ہے اور پھر اس کو شمار کر کے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔

بہر حال قیامت کے دن جب انسان کا نامۂ اعمال اس کی گردن سے
نکال کر اس کے سامنے کیا جائے گا تو حکم ہوگا۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ اپنا نوشتہ
خود پڑھ لو كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا آج کے دن تمہارا
اپنا نفس ہی تمہارے محاسبے کے لیے کافی ہے۔ اس اعمالنامہ کو پڑھنے
کے لیے کسی منشی کی ضرورت نہیں تم خود اسے پڑھو۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب دجال کا ظہور ہوگا تو اس کی پیشانی
پر لفظ "کافر" لکھا ہوگا۔ ہر ایماندار اس کو پڑھ لے گا مگر کوئی بے ایمان
کافر، مشرک اسے نہیں پڑھ سکے گا۔ اسی طرح ہر آدمی اپنا اعمالنامہ خود پڑھے
گا جس میں اس کا ہر نیک و بد عمل درج ہوگا۔ اور وہ اسی سے اپنی جزا یا
سزا کو معلوم کر سکے گا۔

فرمایا، ہمارا اصول یہ ہے مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ
لِنَفْسِهٖ جس نے ہدایت پائی تو اسنے اپنے ہی نفس کے لیے ہدایت

پائی، اس سے اسی کو فائدہ ہوگا۔ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ
عَلَيْهَا اور جو کوئی گمراہ ہوا تو اس کی گمراہی اسی کے نفس پر پڑتی ہے، اس
کا نقصان خود اسی کو ہوتا ہے۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى
اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، نیکی یا بدی جو
بھی کی ہے اس کا بوجھ خود ہی اپنی گردن پر اٹھانا پڑے گا، اس وقت
نہ کوئی رشتہ دار مدد کر سکیگا نہ کوئی مزدور ہوگا جو کسی کا بوجھ اٹھالے۔

اتمام حجت

اللہ نے ایک اور بھی اہم بات یہاں بیان فرمائی ہے وَمَا كُنَّا
مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ ہم کسی قوم کو سزا نہیں دیتے
جب تک کہ ہم رسول نہ بھیج دیں۔ کسی مجرم کو سزا دینے سے پہلے اتمام حجت
ضروری ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی طرف اپنے پیغمبر بھیجے، کتابیں
نازل فرمائیں اور پھر مبلغین کے ذریعے اپنا پیغام تمام لوگوں تک پہنچایا۔ اگر اب
بھی کوئی شخص ایمان کی بجائے کفر اور نیکی کی بجائے برائی کا مرتکب ہوتا ہے
تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔ اس پر حجت تمام ہو چکی ہے۔ سورۃ النساء میں
اللہ کا فرمان موجود ہے۔ کہ ہم نے بشارت دینے والے اور ڈر سنانے والے
رسول مبعوث فرمائے "لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ
بَعْدَ الرُّسُلِ" کہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی
حجت باقی نہ رہے۔ رسول کے آنے کے بعد عذر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی
فرمایا کل کو کوئی یہ نہ کہے "مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ" (المائدہ)
کہ ہمارے پاس بشارت دینے والا اور ڈرانے والا کوئی نہیں آیا۔ اللہ نے
فرمایا "فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ" (المائدہ) تمہارے
پاس بشیر اور نذیر آچکے ہیں۔ اگر اب بھی کفر، شرک، معاصی سے باز نہیں
آؤ گے تو پھر کوئی عذر قابل قبول اور مسموع نہیں ہوگا۔

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی صورت نوعیہ کا تقاضا ہے

کہ اس کو ہر نیکی اور بدی کی جزا یا سزا ملے۔ اس کے علاوہ فرشتوں کی دعا یا بددعا بھی انسان کے حق میں موثر ہوتی ہے کیونکہ فرشتے نیکی کرنے والے کے لیے دعا اور برائی کے مرتکب کے لیے لعنت بھیجتے ہیں۔
نیک عمل کرنے والوں کے حق میں قرآن بھی شہادت دیتا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولوں کی بعثت اور شرائع کے نزول کے بعد حجت تمام ہو گئی ہے، لہذا اب ہر شخص کو جزا یا سزا ضرور ملے گی۔

مکلف کی بحث

مفسرین کرام اس بارے میں بحث کرتے ہیں کہ جو لوگ فترت کے زمانے میں فوت ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ زمانہ جب کوئی رسول نہیں آیا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور علیہ السلام کا درمیانی زمانہ۔ اسی طرح کافروں اور مشرکوں کے فوت ہونے والے چھوٹے بچوں کے متعلق کیا حکم ہے کہ ان کی گرفت ہو گی یا نہیں۔ اگرچہ اس ضمن میں اختلاف پایا جاتا ہے تاہم صحیح بات یہی ہے کہ رسول سے مراد ایک تو باہر کا رسول ہے۔ جو اللہ کی طرف سے مبعوث ہوتا ہے اور اس پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے اور ایک انسان کے اندر کا رسول اس کی عقل ہے۔ اگر کسی قوم یا فرد کے پاس باہر کا رسول نہیں تو اس کے پاس اندر کا رسول یعنی عقل تو موجود ہے جسے بروئے کار لا کر نیکی و بدی اور حق و باطل میں تمیز کی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص عقلمند ہے تو وہ مکلف ہے اور نیکی یا بدی کی جزا یا سزا کا مستحق ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص عقل و شعور سے ہی محروم ہے تو وہ مکلف نہیں۔ چنانچہ دیوانے، احمق اور بے عقل آدمی عذاب کے مستحق نہیں۔ چھوٹے بچے جو سن شعور کو پہنچنے سے پہلے فوت ہو جاتے ہیں، وہ بھی غیر مکلف ہیں اور سزا کے حقدار نہیں ہیں۔
بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ قیامت والے

دن اللہ کی بارگاہ میں عذر پیش کریں گے ۔ مثلاً بہرہ آدمی کہے گا مولا کریم! تو نے مجھے سماعت کی نعمت سے محروم رکھا۔ تیرے انبیاء اور کتابیں آئیں مگر بہرہ ہونے کی وجہ سے ان کی بات سے کچھ فائدہ نہ اٹھا سکا۔ لہٰذا اس مجبوری کی بناء پر مجھے سزا نہیں ملنی چاہیئے ۔ دیوانہ آدمی عذر پیش کرے گا کہ مولا کریم! تیرا دین آیا مگر میری حالت یہ تھی کہ لوگ مجھے پتھر مارتے تھے ۔ میں شعور سے خالی تھا۔ بوڑھا آدمی کہے گا کہ میرے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے اور میں تیرے احکام پر عمل کرنے سے قاصر تھا۔ فترت کے زمانے کے لوگ کہیں گے کہ ہمارے پاس کوئی رسول آیا ہی نہیں لہٰذا ہمیں راہِ ہدایت کیسے معلوم ہوتی ۔ روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اسی وقت آزمائش کرے گا اور فرمائے گا کہ میں تمہارے پاس ایک فرشتہ بطور رسول بھیجتا ہوں ۔ پھر ایک فرشتہ آ کر ان کو کہے گا کہ میں خدا کی جانب سے تمہارے پاس قاصد آیا ہوں ۔ تمہارے لیے حکم یہ ہے کہ تم اس جہنم میں چھلانگ لگا دو ۔ پھر جو شخص اس حکم کی تعمیل میں جہنم میں کود جائے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے جہنم کو ٹھنڈا اور سلامتی والا بنا دے گا ۔ اور جو حکم کی تعمیل نہیں کرے گا ۔ وہ ناکام و نامراد ٹھہرے گا ۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ایک عاقل بالغ شخص کسی ایسی جگہ پر ہے جہاں کوئی دوسرا انسان نہیں پہنچ سکا ۔ کسی پہاڑ کی چوٹی ہے یا صحرا کا کوئی گوشہ ہے جہاں اس کی ہدایت کے لیے کوئی سامان نہیں پہنچا تو فرماتے ہیں کہ اگر ایسا شخص کفر یا شرک کا ارتکاب کریگا تو ماخوذ ہو کر جہنم رسید ہوگا ۔ کیونکہ اللہ نے اسے عقل و شعور جیسی نعمت عطا کی ہے ۔ وہ قدرت کی نشانیاں دیکھ کر اس کی وحدانیت کو پہچان سکتا ہے ۔ لہٰذا اس کا کفر و شرک قابلِ مواخذہ ہوگا ۔ البتہ حلال و حرام کی تمیز میں یا نماز ، روزہ ، حج ، زکوٰۃ وغیرہ کی عدم ادائیگی میں وہ قابلِ مواخذہ نہیں ہوگا کیونکہ یہ چیزیں بتانے والا اس کے پاس کوئی نہیں پہنچ سکا ۔ مطلب یہ کہ عقل و شعور بھی انسان کو مکلف بنانے کے لیے کافی ہے ۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ

جب اللہ نے عقل کو پیدا کیا تو فرمایا، آگے آؤ۔ وہ آگے آگئی۔ پھر فرمایا پیچھے ہٹ جاؤ تو وہ پیچھے ہٹ گئی اللہ نے فرمایا بِكَ اُخْذُ وَبِكَ اُمْنَعُ میں تیری وجہ سے مؤاخذہ کروں گا۔ اور تیری وجہ سے رد کروں گا۔ گویا جس شخص میں عقل نہیں وہ ناقابلِ مؤاخذہ ہے۔ چھوٹے بچوں کا بھی یہی معاملہ ہے شعور کے تین درجے ہوتے ہیں، سات سال، دس سال اور پھر بارہ چودہ سال۔ لیکن جب تک اس میں پوری عقل نہیں آتی۔ وہ قابلِ مؤاخذہ نہیں ہوتا۔ ایسے سے مؤاخذہ کرنا اللہ تعالیٰ کے قانونِ عدل کے خلاف ہے کیونکہ وہ ابھی تک مؤاخذے والی شرط پوری نہیں کرتے۔ غرضیکہ جب دنیا میں رسولوں کے ذریعے حجت تمام ہو جائے اور انسان کے داخلی نظام میں عقل بھی مکمل ہو تو پھر انسان قابل مؤاخذہ ہو جاتا ہے۔ اور اسی بات کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم اُس وقت تک کسی کو سزا نہیں دیتے۔ جب تک رسول مبعوث کر کے اپنی حجت تمام نہیں کر لیتے۔

وَاِذَآ اَرَدۡنَآ اَنۡ نُّهۡلِكَ قَرۡيَةً اَمَرۡنَا مُتۡرَفِيۡهَا فَفَسَقُوۡا فِيۡهَا فَحَقَّ عَلَيۡهَا الۡقَوۡلُ فَدَمَّرۡنٰهَا تَدۡمِيۡرًا ۝۱۶ وَكَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنَ الۡقُرُوۡنِ مِنۡۢ بَعۡدِ نُوۡحٍ‌ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوۡبِ عِبَادِهٖ خَبِيۡرًۢا بَصِيۡرًا ۝۱۷

ترجمہ:۔ اور جب ہم چاہتے ہیں کہ ہلاک کریں کسی بستی کو ، تو حکم دیتے ہیں اس کے آسودہ حال لوگوں کو ، پس وہ فسق کرتے ہیں اس میں ، پس ثابت ہو جاتی ہے اس پر بات ۔ پس ہم اکھاڑ دیتے ہیں اس کی جڑ بنیاد کو اور اس کو ملیا میٹ کر دیتے ہیں ۱۶ اور کتنی ہی قومیں ہم نے ہلاک کی ہیں نوح علیہ السلام کے بعد ۔ اور کافی ہے تیرا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھنے والا اور دیکھنے والا ۱۷

ربط آیات گذشتہ آیات میں اللہ کے نیک بندوں پر انعامات اور نافرمانوں کی گرفت کا ذکر ہوا ۔ پھر اللہ نے ہر انسان کے لیے تیار کیے جانے والے اعمال نامے اور قیامت کے دن اُن کے ظہور کا تذکرہ فرمایا ۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ ہدایت یا گمراہی انسان کے اپنے ہی فائدے یا نقصان کے لیے ہے ۔ ہر شخص کو اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا پڑے گا اور کوئی دوسرا شخص کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا ۔ اللہ نے ایک اصولی بات یہ بھی بیان فرمائی کہ ہم کسی فرد یا قوم کو اُس وقت تک سزا نہیں دیتے جب تک اُن کے پاس اپنا رسول بھیج کر اتمامِ حجت نہ کر دیں ۔ اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے سزا سے متعلق اپنی سنت

بیان کی ہے اس سلسلے میں بعض واقعات کی طرف اشارہ بھی ہے اور مشرکین عرب اور بعد میں آنے والوں کے لیے وعید بھی ہے کہ اگر وہ بھی کفر، شرک اور برائی سے باز نہ آئے تو ان کا حشر بھی پہلی نافرمان قوموں سے مختلف نہیں ہوگا

ہلاکت کا فلسفہ

اب اللہ تعالیٰ نے انسان کی بداعمالیوں پر اس کی ہلاکت کا فلسفہ بیان فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً جب ہم کسی بستی، شہر، علاقے یا ملک کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا تو ہم اس بستی کے آسودہ اور خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ناز و نعمت میں پرورش پاتے ہیں، انہیں تمام سہولتیں بافراط میسر ہوتی ہیں اور عیش و آرام میں زندگی گزار رہے ہوتے ہیں، ہم اُن کو حکم دیتے ہیں۔ فَفَسَقُوْا فِيْهَا اور وہ اس بستی میں فسق کرتے ہیں فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ پھر اُس پر بات ثابت ہو جاتی ہے۔ خدا کی گرفت آتی ہے اور وہ ہلاک ہو جاتے ہیں۔

اس آیت کریمہ کے ظاہری الفاظ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود خوشحال لوگوں کو فسق کا حکم دیتے ہیں۔ پھر جب وہ ایسا کرنے لگتے ہیں تو ان پر جرم ثابت ہو جاتا ہے اور وہ سزا میں مبتلا کر دیئے جاتے ہیں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ایسی بات نہیں ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کسی کو فسق کا حکم دیتے ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ (الاعراف) کہ وہ کبھی بھی بےحیائی کا حکم نہیں دیتے۔ مفسرین اس کی توجیہ یوں بیان کرتے ہیں کہ حکم دو قسم کا ہوتا ہے، ایک تشریعی اور دوسرا تکوینی۔ تشریعی حکم ہمیشہ شریعت اور قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اور نیکی کرنے اور بُرائی سے بچنے کا حکم ہوتا ہے نہ کہ بُرائی کے ارتکاب کا۔ اور تکوینی حکم کائنات میں طبعی طور پر جاری ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نیکی یا برائی کا ارتکاب اللہ نے بندے کے اختیار میں دے دیا ہے، لہٰذا کوئی انسان جب بھی کسی اچھائی یا برائی کا ارادہ

کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالتا بلکہ اس کی مرضی
کے مطابق کام کرنے کی توفیق عطا کر دیتا ہے ۔ یہی تکوینی حکم ہے ۔ جو بندہ خود
اپنے ارادے اور اختیار سے انجام دیتا ہے اور اللہ اس کی توفیق کو سلب نہیں
کرتا ۔ سورۃ النساء میں موجود ہے نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى کوئی شخص جدھر جانا چاہتا
ہے ہم اسی طرف اُس کا رُخ موڑ دیتے ہیں ۔ حالانکہ ہم چاہیں تو اس سے
برائی کرنے کی توفیق ہی سلب کر لیں ۔ مگر ہم ایسا نہیں کرتے بلکہ اُسے اپنی
مرضی کے مطابق کام کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں گویا اللہ تعالیٰ تکوینی حکم
کے ذریعے انسان کو آزماتا ہے کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ
انسان کو کھلی چھٹی دے دیتا ہے ۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ
فَلْيَكْفُرْ (الکہف) اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا
جی چاہے کفر کا راستہ اختیار کرے ۔ البتہ فرمایا کہ جو شخص کفر کا طریقہ اپنائے
گا تو اس کے لیے آگے جہنم بھی تیار ہے غرضیکہ یہاں پر اَمَرْنَا اور
فَفَسَقُوْا کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص یا قوم نافرمانی کا راستہ اختیار کرنا چاہے
تو اللہ تعالیٰ اس کی توفیق کو سلب نہیں کرتے بلکہ اُسے اپنی مرضی کے مطابق
چلنے دیتے ہیں ۔

بعض مفسرین اس کا دوسرا معنی بھی کرتے ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ جب
ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے دولت مند لوگوں کو اطاعت
کا حکم دیتے ہیں ۔ ہم ان کی طرف اپنے نبی بھیجتے ہیں ، ان کے نائبین اور
مبلغین اُن کے پاس پہنچ کر انہیں اطاعت اور نیکی کرنے کی ترغیب دیتے
ہیں ۔ اس کے باوجود جب وہ قوم یا بستی کے لوگ نافرمانی کرتے ہیں ، اللہ
کی اطاعت کی طرف نہیں آتے فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا تو پھر ہم اس
بستی کو ملیامیٹ کر دیتے ہیں ۔ اُسے جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیتے ہیں ، اور اس
طرح انہیں نافرمانی کی سزا مل جاتی ہے ۔

آسودہ حالی اور مخالفت اسلام

اِس آیت کریمہ میں آسودہ حال لوگوں کا ذکر فرمایا گیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے تشریعی اور تکوینی احکام ہر قسم کے لوگوں پر نافذ العمل ہوتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر خوشحال لوگوں کا تذکرہ اس لیے کیا گیا ہے کہ دین کی مخالفت میں عام طور پر یہی لوگ پیش پیش ہوتے ہیں اور پھر ان کی اقتدا میں دیگر لوگ بھی اسی راستے پر چل نکلتے ہیں۔ عربی محاورہ ہے کہ اگر حاکم کی اصلاح ہو جائے تو رعیت خود بخود سدھر جائے گی اور اگر کسی قوم یا ملک کا سرپرست ہی بگڑ جائے تو سارے لوگ ہی ایسے ہو جائیں گے۔ بات تو بڑے لوگوں کی چلتی ہے اور باقی ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے ہوتے ہیں۔ فساد فی الارض کی ابتدا ہمیشہ رؤسا کی طرف سے ہوتی ہے۔ تاریخ انبیاء علیہم السلام اٹھا کر دیکھ لیں کہ کمزور لوگ تو اکثر ایمان لاتے ہیں مگر مخالفت بڑوں نے ہی کی۔ یہ لوگ خدا اور رسول کی اطاعت کو اپنی چودھراہٹ کے منافی سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے دین کی اطاعت شروع ہو جائے گی تو پھر چودھریوں کی بات کون سنے گا۔ تو جب بھی ان آسودہ حال لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا جاتا ہے تو یہ مخالفت پر اتر آتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی وعید سنائی جائے تو کہتے ہیں۔ نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا (سبا - ۳۵) ہمارے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے۔ ہماری کثیر اولاد ہے، ہمیں کس بات کا ڈر ہے۔ ہم کسی قیامت اور محاسبے کے عمل کو تسلیم نہیں کرتے وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (الشعراء) ہمیں کون سزا دیگا۔ فرمایا ایسے ہی لوگوں کو ہم اطاعت و فرمانبرداری کا حکم دیتے ہیں، تو وہ فسق کا راستہ اختیار کرتے ہیں، خروج عن الطاعۃ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ فسق کا اطلاق نافرمانی کے علاوہ کفر، نفاق اور معصیت پر بھی ہوتا ہے۔ احکام شریعت کے خلاف چلنے والا شخص فاسق کہلاتا ہے پھر جب فسق کی بات ثابت ہو جاتی ہے تو ایسے لوگوں کو ملیامیٹ کر دیا جاتا ہے

امّرؔ کے دیگر معانی

بعض مفسرین اَمَرْنَا کی بجائے اَمَّرْنَا قرأت کرتے ہیں جس کا معنے حاکم بنانا ہے۔ اگر اس قرأت کو پیش نظر رکھا جائے تو آیت کا معنیٰ یہ ہوگا کہ جب ہم کسی بستی کے آسودہ حال لوگوں کو وہاں کا امیر یا حاکم بنا دیتے ہیں، تو وہ اطاعت کا راستہ پکڑنے کی بجائے عیاشی، فحاشی اور بدکاری کے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ان پر خدا کی طرف سے عذاب آتا ہے۔ یہ لوگ عام طور پر معاصی کی سکیمیں بناتے ہیں اور نیکی کے کام نہیں کرتے۔

چوتھی تفسیر کے مطابق اٰمَرَ یا اَمَّرَ کا معنیٰ زیادہ کرنا بھی ہوتا ہے۔ یعنی ہم جس بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ وہاں کے آسودہ حال لوگوں کی تعداد میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں مکے والوں کا حال دیکھ لیں۔ قوم عاد، قوم ثمود، قوم فرعون، قوم لوط، قوم تبع اور سبا والوں کا حال دیکھ لیں۔ یہ سب خوشحال اور آسودہ حال لوگ تھے۔ بڑی بڑی عمارات اور بڑے بڑے باغات کے مالک تھے۔ اُن کی تہذیبوں کے نشانات آج بھی ٹیکسلا، مہنجو دھاڑو، ایجنٹا اور الورا میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے بارے میں سورۃ العنکبوت میں فرمایا ہے کہ شیطان نے ان کے اعمال کو مزین کر کے دکھایا اور انہیں صراط مستقیم سے روک دیا وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِيْنَ دنیا کے معاملات میں بڑے ہوشیار تھے، اپنے فن میں بڑے ماہر تھے۔ مگر معاد کے معاملہ میں فرمایا "اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ" (الاعراف) بالکل اندھے تھے۔

ذہانیت بالغہ

فرمایا جب ان کی ہلاکت کا وقت آتا ہے تو ہم ان کو زیادہ کر دیتے ہیں۔ پھر وہ کھیل کود، رسم و رواج، گانے بجانے اور عیش و عشرت میں مبتلا ہو کر رہ جاتے ہیں اور پھر ان پر تباہی مسلط کر دی جاتی ہے۔ پرانی قومیں اسی اصول کے تحت نیست و نابود ہوئیں اور پھر آخر میں مکے والوں کا زمانہ آیا۔ ان کو یاد دلایا گیا کہ پہلی قوموں کے مقابلے میں تم عشر عشیر کے حامل بھی نہیں ہو۔ جب وہ نہ بچے تو تم کیسے بچ سکتے ہو۔ تم اپنی معمولی طاقت پر کیوں اتراتے ہو

اور اللہ کی نافرمانی کیوں کرتے ہو۔ بہر حال اللہ نے دولت مندوں کو مترف کہا ہے قرآن میں اتراف کی مذمت بیان کی گئی ہے اور سابقہ قوموں کا حال بیان کر کے مکے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اپنی آسودہ حالی کا غلط مطلب نہ لیں سورۃ الواقعہ میں اللہ نے واضح فرمایا ہے اِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۝ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ اس سے پہلے یہ لوگ آسودہ حال تھے مگر گناہ عظیم پر اڑے ہوئے تھے۔ اسلامی نظام میں انتہائی آسودہ حالی کو رفاہیت بالغہ کا نام دیا گیا ہے۔ اسلام افراط و تفریط سے ہٹ کر میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ نہ تو بالکل بیوست والی اور نہ تکلف والی حالت اختیار کرنے کی اجازت ہے۔ بہترین مکان بہترین لباس اور بہترین غذا رفاہیت بالغہ کی تعریف میں آتا ہے جو کہ اتراف کا نتیجہ ہے۔ اس کی بجائے عام نوعیت کی چیزیں استعمال کرنی چاہئیں جن سے نہ تو فقر ظاہر ہوتا ہو اور نہ غرور و تکبر جھلکتا ہو۔ امام شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں باب باندھ کر فارسیوں اور رومیوں کا ذکر فرمایا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے پاس محلات باغات، اچھی سواریاں اور نوکر چاکر ہوں۔ پھر اس مقصد کے حصول کے لیے انہیں ٹیکس لگانے پڑتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ایک طبقہ امراء کا وجود میں آتا اور دوسرا طبقہ گدھوں کی طرح بن کر رہ جاتا جنہیں کام کے علاوہ عبادت و ریاضت کا وقت بھی نہیں ملتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے رومیوں اور ایرانیوں کی جڑ بنیاد ہی اکھاڑ دی اور پیغمبر نبی بھیج کر دونوں تہذیبوں کو ختم کر دیا اور انبیاء کی وساطت سے اسلامی تہذیب کو پیش کیا۔ تو فرمایا کہ جب ان پر فسق ثابت ہو جاتا ہے، تو ہم انہیں جڑ سے اکھاڑ دیتے ہیں۔

سامان عبرت

سابقہ اقوام کا ذکر کر کے اللہ نے خلاصہ یہ بیان فرمایا وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ بَعْدِ نُوْحٍ ہم نے نوح علیہ السلام

کے بعد کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا۔ قرون۔ قرن کی جمع ہے جس کا اطلاق دس، چالیس، ساٹھ، اسی، سو اور ایک سو بیس پر بھی ہوتا ہے۔ قرن سے مراد ایک زمانے اور ایک تہذیب کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ تو فرمایا ہم نے نوح علیہ السلام کے بعد عاد و ثمود جیسی کتنی ہی تہذیبوں کو ہلاک کر دیا۔ تمہیں ان کے حالات سے عبرت پکڑنی چاہیئے۔ جب وہ اپنے رسولوں کی تکذیب کر کے سزا سے نہیں بچ سکے تو تم اللہ کی گرفت سے کیسے بچ سکتے ہو؟ اللہ کا آخری رسول آگیا ہے اب حجت تمام ہو چکی ہے۔ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهٖ خَبِيرًا بَصِيرًا تیرا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھنے والا اور دیکھنے والا ہے۔ اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ ہر شخص کا عقیدہ، عمل اور اخلاص اس کے سامنے ہے اور وہ ہر ایک کا محاسبہ کریگا لوگوں کو تباہ حال اقوام کے حالات سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ
لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا
مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى
لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ
مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ
عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾
اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ
اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾ لَا تَجْعَلْ
مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾

ترجمہ:- جو شخص چاہتا ہے جلدی کی زندگی (کا فائدہ) ہم جلدی
کرتے ہیں اُس کے لیے اُس میں جو ہم چاہیں اور جس کے
لیے چاہیں - پھر ہم بناتے ہیں اُس کے لیے جہنم - داخل ہو
گا اس میں مذمت کیا ہوا اور دھکیلا ہوا (۱۸) اور جو شخص ارادہ
کرتا ہے آخرت کا ، اور وہ کوشش کرتا ہے اس کے لیے
(شایانِ شان) کوشش ، اس حال میں کہ وہ ایماندار ہے پس
یہی لوگ ہیں کہ جن کی کوشش مشکور ہو گی (ٹھکانے لگے گی) (۱۹)
ہم ہر ایک کو فائدہ پہنچاتے ہیں ، اِن کو بھی اور ان کو بھی - یہ

تیرے رب کی بخشش سے ہے ، اور نہیں ہے تیرے رب
کی بخشش روکی ہوئی ⑳ دیکھو ! کس طرح ہم نے فضیلت
بخشی ہے بعض کو بعض پر اور البتہ آخرت بہت بڑی ہے
فضیلت کے اعتبار سے ㉑ نہ ٹھہرائیں اللہ کے ساتھ کسی
دوسرے کو الٰہ ۔ پس بیٹھ جائیں گے آپ مذمت کیے ہوئے
اور رسوا کیے ہوئے ㉒

ربط آیات

گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے قوموں کی ہلاکت کا فلسفہ بیان فرمایا ۔ کہ پہلے ہم اُن کی طرف رسول بھیج کر حجت تمام کرتے ہیں ۔ پھر جس بستی کو ہلاک کرنا مقصود ہوتا ہے اُن کی طرف اپنا حکم بھیجتے ہیں ۔ جب وہ احکامِ الٰہی کا انکار کرتے ہیں ۔ تو اُن پر بات ثابت ہو جاتی ہے تو وہ ہلاک کر دیے جاتے ہیں ۔ اللہ نے بطور مثال فرمایا کہ ہم نے نوح علیہ السلام کے بعد بہت سی قوموں کو ہلاک کیا ، وہ کفر ، شرک اور معاصی کا شکار ہو چکے تھے ، انبیاء کی تکذیب کرتے تھے ۔ اُن کے اس فسق کی وجہ سے اللہ نے انہیں سزا دی ۔ فرمایا تمہیں سابقہ اقوام کے حالات سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے ۔ ۵

دنیا طلبی

اللہ تعالیٰ کا عام قانون یہ ہے کہ وہ کسی مجرم قوم کو فوراً ہلاک نہیں کرتا بلکہ اس کی اصلاح کے لیے ایسے حالات اور اسباب پیدا کرتا ہے جن میں غور و فکر کر کے لوگ برائی کا راستہ چھوڑ کر نیکی کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں ، گویا اللہ تعالیٰ جلد بازی سے کام نہیں لیتا ۔ اس کے برخلاف انسان عام طور پر جلد باز واقع ہوا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اُس کی فرمائش فوراً ہی پوری کر دی جائے ۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قانون بیان فرمایا ہے ۔ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ جو شخص جلدی کی زندگی کا فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے خود دنیا کو بھی عاجلہ کہا گیا ہے ۔ تو مطلب یہ ہے کہ جو آدمی اسی دنیا میں مفاد حاصل کرنا چاہتا ہے حالانکہ اس دُنیا کی زندگی تو بالکل عارضی ہے ۔ اور اگر کوئی شخص اپنے لیے پوری دنیا بھی سمیٹ لیتا ہے تو آخرت کی دائمی زندگی کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ، اسی بات

کو سورۃ الاعلیٰ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے "بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا"
تم تو دنیا کی زندگی کے پیچھے بھاگ رہے ہو، مگر حقیقت یہ ہے "وَالْاٰخِرَۃُ
خَیْرٌ وَّاَبْقٰی" کہ آخرت ہی بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ سورۃ الدھر میں
ارشاد ہوا ہے "اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ یُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَیَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ
یَوْمًا ثَقِیْلًا" یہ لوگ جلدی کی زندگی یعنی اس دنیا کے مال و متاع کو پسند
کرتے ہیں اور قیامت کے بھاری دن کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔
تو فرمایا جو شخص اس جلدی والے گھر کو پسند کرتا ہے "عَجَّلْنَا لَهٗ فِیْهَا
مَا نَشَآءُ" تو ہم اس کے لیے اس میں جلدی کرتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں۔
مطلب یہ ہے کہ جب کوئی دنیا طلب کرتا ہے تو ہم اپنی منشا کے مطابق
مطلوبہ چیز میں سے دے دیتے ہیں۔ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ہم ہر طلب گار کو عطا
نہیں کر دیتے بلکہ "لِمَنْ نُّرِیْدُ" جسے عطا کرتے ہیں جسے ہم چاہتے ہیں
مطلب یہ کہ دنیا کے طالبین میں سے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اور جتنا
چاہتا ہے اتنا عطا کر دیتا ہے۔ ہر شخص کی ہر فرمائش پوری کرنا اللہ تعالیٰ
کے لیے ضروری نہیں۔ اسی سلسلہ میں عربی شاعر کہتا ہے ؎

مَا اَحْسَنَ الدِّیْنُ وَالدُّنْیَا اِذَا اجْتَمَعَا
وَاَقْبَحَ الْکُفْرُ وَالْاِفْلَاسُ بِالرَّجُلِ

یہ کتنی اچھی بات ہے کہ کسی شخص کو دین اور دنیا دونوں کی سعادت
حاصل ہو جائے۔ اور کتنی بری بات ہے کہ انسان کفر اور تنگدستی میں مبتلا ہو جائے
ظاہر ہے کہ دین تو تبھی حاصل ہو گا جب وہ پورے حقوق ادا کرے گا، اور
اگر اس کے ساتھ دنیا میں بھی کشادگی حاصل ہو جائے تو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے

تقسیم بمشیت خداوندی

مگر دنیا میں رزق کی تقسیم کسی کی طلب پر موقوف نہیں، بلکہ یہ مصلحت
خداوندی کے تابع ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے "وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ
لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَلٰکِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ"

اگر اللہ تعالیٰ روزی کے دروازے سب کے لیے یکساں کشادہ کر دیتا تو سب کے سب بغاوت پر اتر آتے، بلکہ اللہ تعالیٰ رزق کا نزول ایک خاص انداز سے اور مصلحت کے مطابق کرتا ہے۔ بعض اوقات خواہش کے مطابق یا اس سے زیادہ بھی مل سکتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے بلکہ اس کی حکمت کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کو دینا ہے اور کتنا دینا ہے۔

فرمایا جو شخص صرف دنیا کا طالب ہے۔ اُسے یہاں تو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ پھر ہم اس کے لیے جہنم تیار کرتے ہیں يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا جس میں داخل ہو گا اس حالت میں کہ مذمت کیا ہوا اور دھکیلا ہوا ہو گا۔ اسے نہایت ذلت و رسوائی کے ساتھ گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

آخرت طلبی

دنیا کے طالبین کا حال بیان کرنے کے بعد فرمایا وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ اور جو کوئی آخرت کا ارادہ رکھتا ہے یعنی آخرت میں بہتری چاہتا ہے۔ اور وہ محض خواہش کا اظہار کر کے ہی نہیں بیٹھ جاتا بلکہ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا آخرت کے حصول کے لیے حتی الامکان کوشش بھی کرتا ہے۔ اور تیسری بات یہ کہ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وہ ہے بھی ایماندار۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یقین رکھتا ہے۔ اس کے رسولوں اور کتابوں کو تسلیم کرتا ہے اور معاد پر اس کی نظر ہے تو ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا کہ اُن کی سعی ضرور ٹھکانے لگے گی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اِن کی کوشش کو ضائع نہیں ہونے دیں گے۔

امام ابوبکر جصاص محمد ابن عجلان راوی سے حدیث نقل کرتے ہیں کہ ایک موقع پر آپ نے ذکر کیا کہ جس میں یہ تین باتیں نہ ہوں وہ جنت کا مستحق نہیں ہو گا۔ پہلی چیز نیت صحیح ہے دوسری چیز ایمان صادق ہے اور تیسری چیز عمل مصیب یعنی درست عمل ہے۔ اور درست عمل وہی ہو گا جو سنت کے مطابق ہو گا۔

اگر کوئی اچھا عمل بھی بدعت کے طریقے پر انجام دیا گیا تو وہ مفید نہیں ہوگا۔ بلکہ الٹا وبالِ جان بن جائے گا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا میں یہ بات بھی داخل ہے کہ آخرت کے حصول کے لیے ایسی کوشش کرے جو اس کی شایانِ شان ہے تو پہلی شرط نیت صحیح ہے کیونکہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ تمام اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔ اگر نیت درست ہے تو عمل کا فائدہ ہوگا ورنہ نہیں۔ وہاں پر صرف سچا ایمان قبول ہوگا، جہاں کفر، شرک، نفاق، شک کی آمیزش ہوگی، وہ ایمان صادق نہیں ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (الانعام) خدا کے عذاب سے امن ان لوگوں کو حاصل ہوگا اور ہدایت یافتہ وہ تصور کیے جائیں گے جو ایمان لائے اور پھر اس ایمان میں کفر و شرک کی ملاوٹ نہ ہونے دی۔ اسی طرح درست عمل وہ ہے۔ جو سنت کے مطابق ہے حضور علیہ السلام کا فرمان ہے مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ[1] یعنی جس نے کوئی ایسا کام کیا جو ہمارے طریقے کے مطابق نہیں ہے تو وہ ناقابل قبول ہے۔ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں آتا ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اَلدُّنْيَا دَارُ مَنْ لَّا دَارَ لَهٗ یہ دنیا تو اس شخص کا گھر ہے جس کا حقیقت میں کوئی گھر نہیں، انسان کی زندگی کب تک چلے گی آخر ختم ہو جائے گی اور اس کے ساتھ اس کا یہ گھر بھی ختم ہو جائے گا۔ پھر فرمایا وَمَالُ مَنْ لَّا مَالَ لَهٗ اور دنیا کا مال صرف اسی شخص کا ہے جس کا حقیقت میں کوئی مال نہیں وَيَجْمَعُ مَنْ لَّا عَقْلَ لَهٗ اور دنیا کی خاطر صرف وہ آدمی مال جمع کرتا ہے جو عقل سے خالی ہے آج کے دور کی تمام ترقی یافتہ اقوام کا منتہائے مقصود صرف دنیا ہے ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ان کا مبلغ علم صرف دنیا تک محدود ہے۔ انہیں برزخ یا آخرت کا کچھ خیال نہیں، نہ خدا کی رضا مطلوب ہے نہ شرائع الٰہیہ

---

[1] بخاری جلد ۱ صـ۲، مسلم صـ۱۴۰ ج۲ (ریاض)

کے اتباع کی خواہش۔ ان کی ساری تگ و دو دنیوی زندگی کے لیے ہوتی ہے۔ بہر حال فرمایا جو آخرت کا ارادہ کرتا ہے اس کے لیے کما حقہ کوشش کرتا ہے اور ہے بھی ایماندار تو اس کی کوشش کی قدردانی کی جائے گی۔

عطائے الٰہی

فرمایا کُلًّا نُّمِدُّ ہم سب کو دیتے ہیں ھٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ ان کو بھی اور ان کو بھی۔ عطائے خداوندی سب کے لیے ہے۔ اس سے نہ ایماندار محروم ہیں اور نہ کافر۔ اللہ تعالیٰ اچھے لوگوں کی ضروریات بھی پوری کرتا ہے اور برے لوگوں کی بھی۔ اور دیتا اتنا ہے جتنا مناسب سمجھتا ہے اور جو اس کی مصلحت کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ تیرے پروردگار کی بخشش ہے وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا۔ اور تیرے رب کی بخشش رکی ہوئی نہیں ہے، بلکہ وہ ہر وقت جاری و ساری ہے۔ وہ دیتا رہتا ہے مگر ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ محض دنیا کے طالبین کے لیے آگے جہنم بھی تیار ہے اور جو کوئی آخرت کے لیے سعی کرے گا تو اس کی کوشش ضرور ٹھکانے لگے گی۔

ایک دوسرے پر فضیلت

ارشاد ہوتا ہے اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ دیکھو! ہم نے کس طرح ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے۔ دنیا کی نعمتوں کے معاملے میں تو ایک دوسرے پر برتری حاصل ہے، مال و دولت، زمین، مکان، کارخانے وغیرہ ہر ایک کے پاس یکساں نہیں۔ البتہ بعض چیزیں سب کو برابر مل رہی ہیں۔ سورج، چاند، ہوا، پانی، گرمی۔ سبزی نباتات ہر نیک و بد کو یکساں میسر ہیں۔ مگر ابدی نعمتیں صرف ایمان والوں کو حاصل ہوں گی۔ اور یہ نعمتیں نیت صالحہ، ایمان صادق اور سعی صحیحہ کے ساتھ مشروط ہیں۔

دنیا کے معاملہ میں حالات بالکل متفاوت ہیں۔ اللہ نے بعض کو بعض پر برتری عطا فرمائی ہے۔ مال و دولت، جاہ و حشمت کے اعتبار سے ایک کو حاکم اور دوسرے کو محکوم بنایا ہے۔ کوئی بڑا ہے کوئی چھوٹا ہے۔ کوئی غنی ہے

اور کوئی محتاج ہے۔ کوئی صحت مند ہے اور کوئی بیمار ہے کوئی باوسائل ہے اور کوئی بے وسیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مختلف طریقوں سے اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔ بہرحال دنیا کا یہ اونچ نیچ تو عارضی ہے وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ اور آخرت کے درجے تو بہت بڑے ہیں۔ دنیا میں تو زیادہ تفاوت نہیں ہے، البتہ آخرت میں درجات و مراتب کے لحاظ سے بہت فرق ہوگا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ درجات العلیٰ یعنی بلند درجوں والے علیین والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے زمین پر کھڑا ہو کر افق سے گزرتے ہوئے بلند ترین ستارے کو دیکھا جاتا ہے حالانکہ وہ بھی بڑے اونچے درجوں میں ہوں گے۔ اسی طرح پستی والوں کے حال میں بھی بڑا تفاوت ہوگا۔ لیکن جو لوگ جنت میں پہنچ جائیں گے، اللہ ان سب کو ایسا مطمئن کر دے گا کہ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ اس سے بہتر اور کوئی نہیں۔

فرمایا درجات کے اعتبار سے بہت بڑی ہے وَاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا اور فضیلت کے اعتبار سے بہت بڑی ہے۔ اصل ایمان، اعمال صالحہ، اور اخلاق کے نتیجے تو وہیں چل کر ظاہر ہوں گے کہ کس شخص میں کس درجہ کا ایمان، نیکی اور صلاحیت تھی۔ دنیا کا تفاوت تو ہم دیکھ رہے ہیں۔ مگر اس کے مقابلے میں آخرت کا تفاوت بہت بڑا ہوگا۔ بہرحال آخرت بڑے درجوں اور فضیلت والی ہے۔

شرک سے بچاؤ

آخرت کے اعلیٰ درجات کی بات بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اس کا انحصار توحید خالص پر ہے لہٰذا لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود نہ ٹھہراؤ۔ الٰہ وہ ہوتا ہے جو نافع اور ضار ہو۔ تمام مافوق الاسباب پر تصرف رکھتا ہو، علیم کل، قادر مطلق، ہمہ دان، ہمہ بین اور ہمہ توان ہو۔ چونکہ یہ صفات اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسری ذات میں نہیں پائی جاتیں اس لیے اس کے سوا کوئی معبود بھی نہیں ہے اگر تم کسی دوسرے کو بھی معبود تسلیم کرو گے فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا تو تم بیٹھ جاؤ گے مذمت کیے ہوئے

اور رسول کیسے ہوئے۔ خدا کا شریک ٹھہرانے سے مجرم بن جاؤ گے۔ اگر اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھو گے۔ اُسے مافوق الاسباب پکارو گے، اُس کے نام کی نذر و نیاز دو گے، اُس کی بھی ایسی ہی تعظیم کرو گے جیسی اللہ کی تعظیم ہے، تو پھر تمہارا حشر بھی سابقہ کافر و مشرک قوموں سے مختلف نہیں ہوگا۔ یہ آیت اگلے مضمون کی تمہید ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی عبادت کا حکم دے کر توحید کو واضح فرمایا ہے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾

ترجمہ:- اور فیصلہ کیا ہے تیرے پروردگار نے اس بات کا کہ نہ عبادت کرو تم سوائے اُس کے کسی کی ۔ اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو ۔ اگر پہنچ جائیں تمہارے پاس بڑھاپے کو ان میں سے ایک یا دونوں ، پس نہ کہو ان کے لیے اُف اور نہ ڈانٹو اُن کو ۔ اور کہو اُن کے سامنے بات ادب سے ﴿۲۳﴾ اور جھکا دو اُن کے سامنے بازو عاجزی کا نیاز مندی سے، اور کہو اے پروردگار ! ان پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے میری تربیت کی ہے بچپن میں ﴿۲۴﴾ تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے اُن باتوں کو جو تمہارے نفسوں میں ہیں ۔ اگر ہو گے تم نیکی والے تو بیشک وہ (اللہ تعالیٰ) ہے رجوع کرنے والوں کے لیے بہت بخشنے والا ﴿۲۵﴾

ربط آیات

دیگر مکی سورتوں کی طرح سورۃ بنی اسرائیل میں بھی بنیادی طور پر چار بنیادی باتیں بیان کی گئی ہیں یعنی قرآن پاک کی صداقت وحقانیت، توحید باری تعالیٰ، رسالت اور وقوع قیامت۔ ان مضامین کے علاوہ سورۃ ہذا کی ابتدائی آیت میں معراج کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ چونکہ یہ سورۃ واقعہ معراج کے بعد نازل ہوئی، اس لیے اس میں آگے چل کر ہجرت سے متعلق بھی ذکر آتا ہے۔ توحید باری تعالیٰ کا تذکرہ گزشتہ آیت میں بھی آچکا ہے "لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ" کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود نہ بناؤ۔ اب یہاں سے شروع کر کے پورے دو رکوع میں سورۃ کا مرکزی مضمون بیان ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پہ پندرہ اصول بیان فرمائے ہیں۔ جو اسلامی معاشرہ کی بنیاد ہیں۔ ان اصولوں پر کاربند ہو کر اسلام کا اجتماعی نظام ٹھیک طور پر قائم ہو سکتا ہے۔ اسلامی نظام خلافت کے لیے یہ اصول منشور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اصولوں کی پابندی کے بغیر صحیح اسلامی معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا اور نہ لوگوں کو ظلم و تعدی اور برائیوں سے روکا جا سکتا ہے

قرآن کی بعض سورتوں میں اسلام کے معاشرتی نظام کو خاص طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ نور میں نظام عفت و عصمت سمجھایا گیا ہے اور سورۃ حجرات میں مسلمانوں کی معاشرتی تنظیم کے موٹے موٹے اصول بیان کیے گئے ہیں وہاں پہ اللہ تعالیٰ نے بارہ اصول بیان کیے ہیں جن پر عمل درآمد سے آپس کے حالات درست رہ سکتے ہیں۔ پھر سات حوامیم سورتیں ہیں جن میں اللہ نے مسلمانوں کا اعتقادی نظام سمجھایا ہے۔ ان سورتوں کو لباب القرآن بھی کہا جاتا ہے۔ تو اس سورۃ میں اللہ نے وہ پندرہ اصول بیان فرمائے ہیں۔ جو اسلامی ریاست کا منشور ہیں اور جن پہ ہمارے نظام خلافت کی بنیاد ہے۔

(۱) توحید فی العبادۃ

ان میں پہلا اصول توحید فی العبادت ہے۔ یہ مضمون اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مختلف عنوانات کے تحت بیان فرمایا ہے۔ یہاں پہ ارشاد ہوتا ہے

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ "اور تیرے پروردگار نے فیصلہ کیا
ہے کہ تم اُس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اگر توحید کو عبادت میں تسلیم کر
لیا جائے تو پھر باقی باتوں میں بھی اُسے مان لیا جائے گا۔ جو شخص عبادت صرف
اللہ تعالیٰ کی کرے گا، وہ شرک کی جملہ اقسام سے محفوظ رہے گا۔ جن کا تذکرہ
اللہ نے سورۂ انعام میں فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو شرک ہرگز پسند نہیں اس لیے
اللہ نے پہلا اصول یہی بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کیا جائے
اور صرف اُسی کی عبادت کی جائے۔ سورۂ بینہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "وَمَآ
اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" اور اُن کو تو
صرف یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں اور اطاعت کو
صرف اُسی کے لیے خاص کرنے والے ہوں۔ اُسی کی غلامی اختیار کریں۔ یہ
اٹل اصول ہے جو تمام اقوام و ملل میں یکساں رہا ہے۔ سابقہ قوموں کے لیے
بھی یہی قانون تھا اور اب حنیفی اقوام بھی اسی قانون کی پابند ہیں۔ جب یہ اصول
تمام اقوامِ عالم کے لیے ہے تو پھر یہود و نصاریٰ اس سے کیوں بچ سکتے ہیں
انہیں بھی توحید فی العبادت کو بلا چون و چرا تسلیم کر لینا چاہیئے۔ قرآن پاک
کی اکثر سورتوں میں یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ مستحقِ عبادت صرف اللہ کی ذات
ہے کیونکہ الوہیت کی صفات اُس کے سوا کسی دوسری ذات میں نہیں
پائی جاتیں۔ اسی لیے ہم ہر نماز کی ہر رکعت میں اقرار کرتے ہیں کہ اے پروردگار
"اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں
اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ جب خالق، مالک، پروردگار، علیم کل، مختار مطلق
نافع، ضار اور مافوق الاسباب متصرف اللہ کے سوا کوئی نہیں تو پھر عبادت
کے لائق بھی صرف وہی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں خالقیت
الوہیت اور تصرف کی صفات کا ذکر کرنے کے بعد الوہیت کا مسئلہ
سمجھایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ ایسا کرنا بغاوت ہوگی،

ظلم اور کفر ہے۔

عبادت انتہائی درجے کی تعظیم کو کہا جاتا ہے جو اس اعتقاد پر مبنی ہو کہ جس ذات کی تعظیم کر رہا ہوں وہ نفع و نقصان کی مالک ہے اور اُس کے پاس تصرف ہے۔ یہ تعظیم رکوع و سجود کی شکل میں ہوتی ہے یا نذر و نیاز کی صورت میں یا محض مافوق الاسباب پکارنے کی صورت میں ہوا لانکہ اللہ تعالے کا حکم یہ ہے "فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا" (الجن) اللہ کے سوا کسی کو (مافوق الاسباب) نہ پکارو۔ فَادْعُوا اللّٰهَ صرف اللہ ہی کو پکارا۔ سورۃ النمل میں ہے "اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ" کون ہے جو مضطرب کی دعا کو سنتا ہے "ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ" کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی الٰہ ہے۔ غرضیکہ اللہ نے اسلامی ریاست کے منشور کی پہلی شق یہی بیان فرمائی کہ عبادت صرف اللہ کی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی صفت مختصہ میں کسی کو شریک نہ بناؤ۔ یہود و نصاریٰ حلت و حرمت کے معاملے میں شرک میں مبتلا ہوئے۔ انہوں نے اپنی طرف سے بعض چیزوں کو حلال اور بعض کو حرام ٹھہرایا حالانکہ یہ منصب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کا ہے مگر انہوں نے یہ منصب انسانوں کو سونپ دیا۔ الغرض! اللہ نے پہلی بات یہ بیان فرمائی ہے کہ اُس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔

(۲)
والدین سے حسن سلوک

توحید فی العبادت کے بعد اللہ نے دوسرا اصول یہ بیان فرمایا ہے۔ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا اور اپنے والدین کے ساتھ احسان کرو۔ اسمیں فعل محذوف ہے اور دراصل پورا جملہ یوں ہے وَاَحْسِنُوْا بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا یعنی احسان کرو اپنے ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا۔ انسان کو اولین قرب والدین سے ہوتا ہے، ان کی گود میں پرورش پاتا ہے وہی اس کی تربیت کرتے ہیں، لہٰذا انسانی معاشرے میں حقوق کا سلسلہ والدین سے

شروع ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے یہ قانون بنی اسرائیل بیت تمام شرائع میں مشترک رہا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔ سورۃ بقرہ میں بھی یہی الفاظ آتے ہیں کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔ احسان کا مطلب یہ ہے کہ قولی، فعلی کسی طریقے سے بھی ایذا نہ پہنچائی جائے کہ یہ جرم ہے۔ اگر والدین محتاج ہیں تو ان کی مالی معاونت کی جائے۔ اگر محتاج نہیں تو ان کا ادب واحترام اور دیگر خدمت انجام دی جائے۔ کسی جائز کام میں اُن کی مخالفت نہ کی جائے۔ آگے اللہ تعالیٰ نے بعض حدود و قیود بھی بیان فرمائے ہیں کہ اگر والدین کفر، شرک یا بدعت پر لگاتے ہیں، یا شریعت کے خلاف کسی کام کا حکم دیں تو ان کی بات نہ مانیں وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (لقمان) البتہ دنیا میں رہ کر اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔

والدین سے نیک سلوک کرنے کے سلسلے میں اُن کا مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بڑی صاحبزادی حضرت اسماءؓ کی والدہ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں مدینہ منورہ آئیں۔ اُس وقت حضرت صدیقؓ اُسے طلاق دے چکے تھے اور وہ شرک پر ہی قائم تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا کہ میری ماں آئی ہے اور وہ مشرکہ ہے تو کیا اس حالت میں میں اُس کے ساتھ صلہ رحمی کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا صِلِي أُمَّكِ اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔ اُس کی خدمت تواضع کرو، کپڑے دو، کرائے کے پیسے دو وغیرہ وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے مشرک والدین کے ساتھ بھی نیک سلوک کرنے کا حکم ہے۔

فرمایا اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلٰهُمَا اگر پہنچ جائیں تمہارے سامنے وہ بڑھاپے کو ایک یا دونوں فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ تو ان کو اُف تک بھی نہ کہو۔ ہماری زبان میں اسے لفظ ہوں پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ادنیٰ درجے کا لفظ ہے اور اس سے بے ادبی کا پہلو نکلتا ہے۔ لہٰذا اتنا بھی نہ کہو وَلَا تَنْهَرْهُمَا اور ان دونوں یعنی والدین کو ڈانٹو بھی نہ۔ ان سے گستاخی کی کوئی بات نہ کرو بلکہ وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ان کے ساتھ نہایت ہی ادب سے بات کرو۔ اگر والدین غصے میں بھی ہوں، ناراض ہو رہے ہوں، تب بھی ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ ہمارے ملک میں بعض بدبخت ایسے بھی ہیں جو والدین کو گالیاں دینے کے علاوہ مار پیٹ سے بھی گریز نہیں کرتے۔ بعض والدین کو قتل بھی کر دیتے ہیں۔ ایک شخص نے اپنی سوتیلی ماں کو گنگا شاہ کے میلے میں آٹھ سو روپے میں بیچ ڈالا۔ بڑے بڑے خاندانوں کی عورتیں شکایت کرتی ہیں کہ بیٹا لندن سے پڑھ کر آیا ہے تو بیوی کی بات ہی چلتی ہے۔ ہمیں پوچھتا ہی نہیں حتیٰ کہ کھانے پینے تک کے لیے نہیں پوچھتا۔ بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے والدین کو گھر سے نکال دیا۔ بعض نے صرف زمین کی خاطر باپ کو قتل کر دیا۔ باپ نے دوسری بیوی کی، تو بیٹا ناراض ہو گیا کہ اب جائداد میں اور بھی حصے دار بن جائیں گے۔ حالانکہ شریعت نے تو نکاح ثانی کی ترغیب دی ہے جب کہ آدمی خرچہ اٹھا سکتا ہو۔ مگر اولاد کی ناہنجاری ہے جو والدین کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی والدہ آخر تک ہندو مت پر رہیں۔ آپ دیوبند سے فارغ ہو کر آئے تو ماں کو اپنے پاس بلا لیا۔ ان کی پوری پوری خدمت کرتے۔ ناراض بھی ہو جاتی تو خدمت گزاری میں فرق نہ آتا۔ اگر ماں آپ کو جوتے بھی مارتی تو آپ اُف نہ کرتے۔ یہ اسلامی تعلیمات کی برکات ہیں۔ جب ماں دین پور میں فوت ہوئی تو مولانا اس وقت کابل میں تھے۔ ایک دفعہ ماں نے کہا کہ میں

نے دان میں گائے دینی ہے تو آپ نے اُسے گائے بھی خرید کر دی تاکہ وہ اپنی رسم پوری کرلے۔ غیر مسلم ہونے کے باوجود آپ نے ماں کی اتنی خدمت کی۔ یہ سعادت مند لوگوں کی نشانی ہوتی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ماں باپ بوڑھے ہو جائیں تو ان کا زیادہ خیال رکھو۔ بعض اوقات طبیعت میں چڑچڑا پن آجاتا ہے اس کو برداشت کرتے ہوئے اُن سے نیک سلوک کرو۔

والدین کے لیے دعا

والدین کے متعلق مزید فرمایا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ اور ان کے سامنے عاجزی کا بازو جھکا دو نیازمندی سے گویا ماں باپ کے ادب واحترام کو ہر طریقے سے ملحوظ رکھو۔ اور صرف اتنا ہی نہیں۔ بلکہ اُن کے لیے بارگاہ رب العزت میں دُعا بھی کرو وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا اے پروردگار! میرے ماں باپ پر اس طرح رحم فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی تھی اور مجھ پر مہربانی کرتے رہے۔ اولاد کے لیے والدین کی شفقت میں ماں کا حق فائق ہے ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ کسی نے دریافت کیا۔ حضور! میں والدین میں سے کس کے ساتھ نیک سلوک کروں تو آپ نے فرمایا، ماں کے ساتھ۔ اُس شخص نے دوبارہ اور سہ بارہ دریافت کیا تو حضور علیہ السلام نے یہی جواب دیا کہ ماں کے ساتھ پھر چوتھی دفعہ فرمایا: باپ کے ساتھ۔ باپ کے مقابلے میں ماں زیادہ عاجز اور زیادہ شفیق ہوتی ہے۔ وہ بچے کی پرورش میں زیادہ تکلیف اٹھاتی ہے اس لیے حسن سلوک میں اُس کو اولیت دی گئی ہے۔ اس کے بعد دوسرے قرابتداروں کی باری آتی ہے کہ ان سے بھی حسن سلوک کیا جائے۔

رجوع الی اللہ

رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ اور تمہارا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تمہارے نفسوں میں ہے تمہاری نیکی اور صلاحیت تمہارا اخلاص اور نفاق، تمہاری فرمانبرداری اور نافرمانی، اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے ارشاد ہوتا ہے إِنْ تَكُونُوا صَالِحِينَ یعنی اگر تم

صلاحیت اور نیکی کے حامل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں شامل حال ہوں گی
فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا کیونکہ اللہ تعالیٰ رجوع رکھنے والوں کے
لیے بہت بخشنے والا ہے۔ اللہ کی طرف رجوع کرنا انبیاء کی صفات میں سے
ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا إِنَّهُ أَوَّابٌ (ص) حضرت
ایوب علیہ السلام کے متعلق بھی فرمایا نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ (ص)
وہ بہت اچھے بندے اور اللہ کی طرف رجوع رکھنے والے تھے۔ حضرت ابراہیم
علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ
مُّنِيبٌ (ہود) بیشک آپ بردبار نرم دل اور رجوع الی اللہ والے تھے۔

صلوٰۃ الاوابین

حضور علیہ السلام نے بعض لوگوں کو چاشت کے وقت نماز پڑھتے
دیکھا تو فرمایا تِلْكَ صَلٰوةُ الْاَوَّابِيْنَ حِيْنَ تَرْمَضُ الْفِصَالُ
یہ رجوع الی اللہ رکھنے والوں کی نماز ہے اور یہ اس وقت ادا کی جاتی ہے جب
اونٹوں کے بچوں کے پاؤں ریت میں گرم ہونے لگتے ہیں یعنی اس نماز
کا وقت نو دس بجے دن ہے۔ اس نماز کی کم از کم دو اور زیادہ آٹھ یا بارہ
رکعت بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔ حضور علیہ السلام اکثر چار رکعت ادا فرماتے تھے۔
فتح مکہ والے دن آپ نے آٹھ رکعت ادا فرمائیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ
کا قول ہے کہ جو لوگ مغرب کے بعد نماز پڑھتے ہیں۔ فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں۔
یہ بھی اوابین کی نماز ہے مگر حدیث میں یہ خطاب چاشت کی نماز کو دیا گیا ہے۔
بہر حال اللہ نے یہ دوسرا اصول بیان فرمایا کہ والدین کے ساتھ اچھا سلوک
کرو۔ اجتماعی منشور کا پہلا اصول توحید فی العبادت تھا، اب دوسرا اصول والدین
سے حسن سلوک ٹھہرا۔

[illegible] (نیاض)

درس نہم ۹ — آیت ۲۶ تا ۲۷

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾

ترجمہ:- اور دے دو قرابت والے کو اس کا حق ، اور مسکین اور مسافر کو - اور مت اڑاؤ مال کو بیجا ﴿۲۶﴾ بیشک بیجا اڑانے والے لوگ شیطانوں کے بھائی ہیں - اور شیطان اپنے رب کا بہت ناشکرا ہے ﴿۲۷﴾

ربط آیات

اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو اپنی اجتماعی زندگی جن اصولوں پر گزارنے کی تلقین فرمائی ہے ، اُن میں سے پہلے دو اصول گزشتہ درس میں بیان ہو چکے ہیں یعنی عبادت صرف اللہ کی اور والدین سے حسن سلوک - اب آج کے درس میں تیسرا اور چوتھا اصول آرہا ہے تیسرا اصول اللہ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ قرابتداروں ، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرو ، اور چوتھا یہ کہ فضول خرچی سے اجتناب کرو -

قرابتداروں کا حق

ارشاد ہوتا ہے وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ اور قرابت والے کو اس کا حق دے دو - والدین کے حقوق کے بعد اللہ تعالیٰ نے قرابتداروں کے حق کو ثانی رکھا ہے - قرابتداروں میں قریبی عزیز بھی ہیں جیسے بھائی ، بہن ، چچا ، ماموں ، خالہ ، بھانجا وغیرہ اور دور کے قرابتدار بھی چھوٹے بچوں کی پرورش کے قانون میں اللہ نے فرمایا ہے وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ (البقرہ - ۲۳۳) یتیم بچے کی پرورش کی ذمہ داری اللہ نے متوفی کے وارث پر ڈالی ہے کہ وہ قریبی عزیز ہے - بعض مفسرین نے یہ بھی فرمایا ہے یہاں پر قرابت والے سے مراد حضور علیہ السلام کے قرابتدار ہیں - یہ بات قرین قیاس نہیں کیونکہ حضور علیہ السلام کے قرابتداروں کے لیے اللہ نے خمس میں حصہ مقرر کر دیا تھا - " فَاَنَّ

لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی الخ" الآیۃ الانفال۔۴۱)
آپ کے قرابتداروں کی اعانت ضروری تھی کیونکہ وہ آپ کے معاون ہوتے
تھے حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد آپ کے اقربا کا تعاون تو ختم ہو گیا
تاہم بطور مسکین اور محتاج اُن کا حصہ بدستور موجود ہے البتہ اس مقام پر قرابتداروں
سے مراد عام مسلمانوں کے قریبی عزیز ہیں اور آیت زیر درس کا حکم بھی ہر مومن کے
لیے ہے کہ وہ قرابتداروں کا حق ادا کرے۔

اخلاقی یا وجوبی حق

عام آئمہ کرام اور مفسرین عظام فرماتے ہیں کہ یہاں پر جس حق کی ادائیگی کا
حکم دیا گیا ہے، یہ اخلاقی حق ہے اور اس کی حیثیت نفل کی ہے۔ کیونکہ فرضی حق
زکوٰۃ کی صورت میں ادا ہو جاتا ہے۔ تاہم امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ قرابتداروں کا
یہ حق وجوبی حق ہے۔ اگر کسی صاحب استطاعت مومن کے اقربا روزمرہ کے
نان و نفقہ سے بھی محتاج ہیں تو اس شخص پر اپنے اقربا کا نفقہ اٹھانا واجب
ہو جاتا ہے جب تک کہ وہ خود مکتفی نہ ہو جائیں۔ اسی طرح اگر نابالغ بچے زیر
کفالت ہیں تو ان کے سن بلوغت تک پہنچنے تک اُن کی اعانت ضروری
ہے۔ یا اگر لڑکی ہے تو اس کی شادی ہونے تک اس کے اخراجات
برداشت کیے جائیں۔ اگر کوئی عزیز نابینا ہے، لنگڑا ہے، خود کمانے کے قابل
نہیں ہے، اس کی کوئی جائیداد بھی نہیں ہے تو اس کی کفالت بھی صاحب
حیثیت عزیز کے ذمہ واجب ہوگی۔ اس نفقہ میں روٹی، کپڑا، رہائش اور دیگر
ضروریاتِ زندگی شامل ہیں۔

زکوٰۃ کے علاوہ حقوق

قرآن پاک سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے مستحقین کے لیے
زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ حقوق رکھے ہیں۔ مثلاً سورۃ المعارج میں ہے "وَالَّذِیْنَ
فِیْٓ اَمْوَالِہِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ"
دولت مند مسلمانوں کے مال میں اللہ نے اُن محتاجوں اور محروموں کا حق بھی رکھا ہے
جو وسائل معیشت سے محروم ہیں۔ اللہ کا یہ بھی فرمان ہے "وَاٰتَی الْمَالَ

عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ (البقرہ - ۱۷۷) ایماندار لوگوں کا شیوہ یہ ہے کہ وہ اپنے مال کو خوشی سے اقربا، یتامیٰ، مساکین، مسافروں، سائلین اور قیدیوں پر خرچ کرتے ہیں۔ یہ خرچ زکوٰۃ کے علاوہ ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم اس سے متصل علیحدہ دیا گیا ہے۔ "وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ" کہ ایماندار لوگ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں بہر حال یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے اِنَّ فِى الْمَالِ حَقًّا سِوَى الزَّكٰوةِ کہ اللہ نے زکوٰۃ کے علاوہ بھی محتاجوں کے حقوق رکھے ہیں

بہر حال یہ نفلی یا اخلاقی حقوق ہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ اونٹوں کی زکوٰۃ ادا کرو۔ جو ایسا نہیں کرے گا قیامت والے دن یہی اونٹ اس کو روندیں گے اور اس کو کاٹیں گے۔ اس کے علاوہ آپ نے یہ بھی فرمایا وَمِنْ حَقِّهَا حَلَبُهَا يَوْمَ وِرْدِهَا یعنی اونٹوں میں ایک حق یہ بھی ہے کہ جس دن تم انہیں پانی پلانے کے لیے گھاٹ پر لے جاؤ تو وہاں پر موجود غربا و مساکین کو اونٹنیوں کا دودھ دوھ کر پلاؤ۔ عرب میں عام طور پر پانچویں دن جانوروں کو پانی پلانے کے لیے لے جایا جاتا تھا اور اس موقع پر غریب لوگ بھی جمع ہوتے تھے۔ فرمایا ان کا حق بھی ادا کرو جو کہ زکوٰۃ کے علاوہ ہے۔ اس طرح اگر کسی کے پاس سواری کے لیے گھوڑا، گدھا یا خچر ہے تو حضور نے فرمایا کہ ان کی پشت میں بھی اللہ نے مستحقین کا حق رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ بوقت ضرورت کسی محتاج کو سواری کے لیے دے دیا جائے سواری کے جانوروں کا دوسرا حق ان کی گردن پر ہے اور اس سے مراد زکوٰۃ ہے۔ جو نصاب کے مطابق ادا کی جائیگی۔ سواری کے جانوروں پر قیاس کرتے ہوئے سواری کی دوسری اشیا سائیکل، موٹر سائیکل، گاڑی وغیرہ بھی اس مد میں آتی ہیں۔ ان میں بھی اللہ نے یہ رکھا ہے کہ کسی ضرورت مند کو سواری کے لیے دی جائے

مساکین اور مسافروں کا حق

اللہ نے پہلا حق قرابتداروں کا بیان فرمایا۔ دوسرے نمبر پر فرمایا وَالْمَسٰکِیْنَ مسکینوں کو بھی اُن کا حق ادا کرو۔ مسکین اور فقیر میں تھوڑا سا فرق ہے۔ مسکین وہ شخص ہے کہ جس کے پاس کچھ نہ کچھ موجود ہو مگر اُس سے اُس کی جائز ضروریات بھی پوری نہ ہوتی ہوں۔ مثلاً کوئی شخص کثیر العیال ہے۔ محنت مزدوری کرتا ہے مگر اس سے بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں ہوتیں، مکان کا کرایہ ادا کرنا مشکل ہوتا ہے یا بچوں کو دودھ میسر نہیں، بچے تعلیم کے قابل ہیں مگر اس کے لیے کم از کم اخراجات کا تحمل بھی نہیں ہو سکتا۔ ایسے آدمی کی اعانت بھی ضروری ہے فرمایا وَابْنَ السَّبِيْلِ اور مسافروں کو بھی اُس کا حق ادا کرو جو آدمی سفر کے دوران کسی مشکل میں پھنس جاتا ہے، وہ اگرچہ مسکین نہیں مگر حالات کی مجبوری کی وجہ سے اس کی معاونت بھی ضروری ہے۔ یہ اتنا ضروری ہے کہ اللہ نے مسافر کے لیے زکوٰۃ میں بھی حصہ رکھا ہے کہ بوقت ضرورت اس کی مدد زکوٰۃ کے مال سے بھی کی جا سکتی ہے۔ اگر یہ تمام حقوق ادا کیے جائیں تو معاشرے میں خرابی پیدا نہ ہو۔ عدم ادائیگی حقوق ہی فتنوں کی بنیاد بنتی ہے۔ اس کی وجہ سے حسد، بغاوت اور اشتراکیت جنم لیتی ہے جب صاحب مال اپنے مال کے حقوق ادا نہیں کرتے تو مستحقین کو سخت تکلیف اٹھانا پڑتی ہے جس کی وجہ سے ان میں بُرے اخلاق جنم لیتے ہیں۔ ان میں حسد کی آگ اس حد تک بھڑک اٹھتی ہے کہ اگر ہمارے پاس کچھ نہیں تو اُن کے پاس بھی کچھ نہیں رہنا چاہیے۔ جس کا نتیجہ اشتراکیت کے حق میں نکلتا ہے ایجی ٹیشن شروع ہو جاتے ہیں اور دنیا میں انقلاب انقلاب کی نعرہ بازی شروع ہو جاتی ہے۔ اگرچہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی دونوں نظام اسلامی نظام معیشت سے متصادم ہیں مگر وقتی طور پر لوگوں کا رجحان کسی ایک طرف ہو جاتا ہے اور پھر جب اس کی قباحتیں نظر آتی ہیں تو دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیتے ہیں اصل بات حقوق کی ادائیگی ہے۔ جو اسلام پیش کرتا ہے۔ اگر ہر حقدار کو اُس کا حق

ملتا ہے تو امیر و غریب کی خلیج کبھی وسیع نہ ہو۔ بلکہ ہر شخص مطمئن ہو اور اپنے اپنے دائرہ کار میں محنت کر کے روزی کمائے۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی ادائیگی دو طرح سے مفید ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہر سال زکوٰۃ ادا کرنے سے انسان کے دل سے بخل کا مادہ دور ہوتا ہے اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ محتاجوں کی ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں۔

(۴) اسراف و تبذیر

قرابتداروں، مسکینوں اور مسافروں کے حقوق کی ادائیگی تیسرا اصول تھا اب چوتھا اصول یہ بیان فرمایا وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا اور مال کو بیجا مت اڑاؤ۔ فضول خرچی نہ کرو، کیونکہ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔ قرآن پاک میں فضول خرچی کے لیے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ایک اسراف اور دوسرا تبذیر۔ بعض مفسرین دونوں الفاظ کو بالکل ہم معنی قرار دیتے ہیں جبکہ بعض ان میں معمولی سا فرق بتاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ کسی جائز ضرورت پر ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف ہے جیسے فرمایا كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا (الاعراف۔ ۳۱) کھاؤ پیو، مگر اسراف نہ کرو۔ ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف اور مکروہ تحریمی ہے حدیث شریف میں لباس کے متعلق بھی آتا ہے اِلْبَسُوْا مَا شِئْتُمْ مَا لَمْ يَكُنْ مَخِيْلَةً وَلَا سَرَفًا جس قسم کا لباس چاہو پہنو، مگر اس میں نہ تو تکبر کا اظہار ہو اور نہ اسراف ہو۔ شاہ عبدالقادرؒ اس کی مثال یہ دیتے ہیں کہ مرد ریشمی لباس پہننے لگے یا ایسی وضع قطع کا لباس ہو جو تقویٰ اور پیشے کے اعتبار سے نامعقول ہو۔

دوسری چیز تبذیر ہے یعنی بالکل بے محل خرچ کرنا جس کا کوئی جواز نہ ہو۔ جوا، شراب، بدکاری، لہو لعب، فوٹو گرافی، قبروں پر گنبد بنانا، ان کو پختہ کرنا، ان پر چراغاں کرنا، بعض مواقع پر آتش بازی کرنا سب تبذیر میں

شامل ہیں اسی طرح مذہبی تقریبات کے نام پہ قبروں پر عرس منانا، چادریں چڑھانا، نذر و نیاز دینا، میلاد کی جھنڈیاں لگانا، گیٹ بنانا، قمقمے روشن کرنا بالکل بے محل اخراجات ہیں اور تبذیر میں داخل ہیں۔ عام شہری زندگی میں امیروں، وزیروں کی آمد پر استقبالیہ محرابیں بنانا، بڑے بڑے اسٹیج تیار کرنا، بینڈ باجے کا انتظام کرنا، پرتکلف دعوتیں دینا قطعاً جائز نہیں اور یہی تبذیر ہے۔ مذہبی اور غیر مذہبی رسومات باطلہ کے رد میں حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی ؒ نے "اصلاح الرسوم" کے نام سے کتاب لکھی تھی جس میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ ہمارے ملک میں کن کن تباہ کن رسومات کو پورا کیا جاتا ہے۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جو اسلامی تعلیمات قرآن و سنت، صحابہ کرام ؓ اور سلف صالحین کے طریقے سے بالکل خلاف ہیں، فقہائے کرام انہیں مکروہ تحریمی میں شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت مولانا شیخ الحدیث کی کتاب "راہ سنت" بھی ہمارے دور کی بہترین کتاب ہے جس میں شادی اور غمی کی رسومات باطلہ کی تردید کی گئی ہے ان میں سے بعض اخراجات اسراف کی مد میں آتے ہیں اور بعض تبذیر میں مگر ہیں سارے کے سارے ناجائز اور حرام۔

شریعت نے آمد و خرچ دونوں چیزوں پہ پابندی عاید کی ہے۔ حلال اور جائز طریقے سے کماؤ اور حلال اور جائز طریقے پر خرچ کرو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "کُلُوا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلاً طَیِّبًا" (البقرہ - ۱۶۸) زمین میں سے حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ، نہ حرام کی کمائی کرو اور نہ اسے استعمال کرو۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا "وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ" (البقرہ - ۱۸۸) باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال مت کھاؤ۔ حلال راستے سے کماؤ اور صرف کرتے وقت اس کے فرضی، واجبی اور نفلی حقوق ادا کرو۔ اقربا، پڑوسیوں، غربا، مساکین اور یتیموں کا حق ادا کرو۔ کسی ناجائز کام میں مال خرچ نہ کرو۔ کسی باطل رسم و رواج میں مال خرچ کرنا حرام ہے۔ اگر مستحقین کے

حقوق ادا کرنے کی بجائے رسومات باطلہ پر بے دریغ روپیہ صرف کرو گے تو نچلے طبقے عسرت میں چلے جائیں گے اور یہ تمہارے لیے وبالِ جان ہوگا۔ ولیمہ ایک سنت ہے۔ مگر یہ بھی حسبِ استطاعت ہونا چاہیئے۔ نہ تو اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرے اور نہ ہی نام و نمود کی خاطر بڑھ چڑھ کر اسراف کرے۔ سلف صالحین یہ سنت سادہ طریقے سے انجام دیتے رہے مگر اب تو اس کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر نام پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس طرح کم حیثیت لوگوں کے لیے مشکلات پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ آج کے دور میں سب سے بڑی لعنت کھڑے ہو کر کھانا ہے جو کہ اب وبا کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس کی بجائے جائز امور میں خرچ کرو۔ غریبوں محتاجوں کی اعانت کرو۔ ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دو۔ تبلیغِ دین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لو۔ کرنے کے کام تو یہ ہیں۔ نہ کہ برادری کی خاطر اپنی عاقبت کو تباہ کر لو۔

فرمایا بے جا مال مت اڑاؤ کیونکہ فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں۔ امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ فضول خرچ دو طرح سے شیاطین کے بھائی ہیں۔ اول یہ ہے کہ وہ شیطان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ وہ اپنے مال کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے برخلاف شیاطین کی مرضیات پر خرچ کرتے ہیں۔ لہٰذا شیطان کے بھائی ہیں اور بھائی بندی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جب حشر کے عمل کا وقت آئے گا تو فضول خرچ لوگوں کو رسیوں سے باندھ کر شیطانوں کے ساتھ ہی جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ اور اس بات میں تو کوئی شک نہیں وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا کہ شیطان اپنے پروردگار کا ناشکرا ہے۔ اللہ نے اس کو طاقت عطا کی مگر اس نے اس طاقت کو اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کی بجائے غلط طریقے سے استعمال کیا اور اس طرح خدا تعالیٰ کی اس نعمت کی ناقدری کی۔ اور ناشکر گزار بن گیا۔ بے جا مال

اڑانے والوں نے بھی اللہ کی اس نعمت کی قدر نہ کی اور مال کو فضول کاموں میں اڑا دیا، لہذا یہ بھی شیطان کے بھائی ہیں جس کا راستہ انہوں نے اختیار کیا۔ بہر حال خدا تعالیٰ کے عطا کردہ مال کو ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا یا بے محل خرچ کرنا اسراف و تبذیر ہے اور یہ شیطان کے نقش قدم پر چل کر اس کا بھائی بننا ہے۔

وَاِمَّا تُعۡرِضَنَّ عَنۡهُمُ ابۡتِغَآءَ رَحۡمَةٍ مِّنۡ رَّبِّكَ تَرۡجُوۡهَا فَقُلۡ لَّهُمۡ قَوۡلًا مَّيۡسُوۡرًا ﴿۲۸﴾ وَلَا تَجۡعَلۡ يَدَكَ مَغۡلُوۡلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبۡسُطۡهَا كُلَّ الۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُوۡمًا مَّحۡسُوۡرًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَقۡدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيۡرًۢا بَصِيۡرًا ﴿۳۰﴾

ترجمہ:- اور اگر آپ کبھی اعراض کریں اُن سے چاہتے ہوئے رب کی رحمت کو تلاش کرتے ہوئے جس کی آپ اُمید رکھتے ہیں۔ تو اُن کے لیے نرمی سے بات کہہ دیں (۲۸) اور نہ کریں اپنے ہاتھ کو جکڑا ہوا اپنی گردن کے ساتھ، اور نہ کشادہ کریں اُسے پورے طریقے سے کشادہ کرنا۔ پس آپ بیٹھ جائیں گے ملامت کیے ہوئے اور تھکے ہارے ہوئے (۲۹) بیشک تیرا پروردگار کشادہ کرتا ہے روزی کو جس کے لیے چاہے اور تنگ کرتا ہے (جس کے لیے مناسب سمجھے) بیشک وہ اپنے بندوں کے ساتھ خبر رکھنے والا، اور (اُن کے تمام حالات کو) نگاہ میں رکھنے والا ہے (۳۰)

ربطِ آیات

اِس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے وہ پندرہ اصول بیان فرمائے ہیں جن پر اسلامی معاشرہ احسن طریقے سے چل سکتا ہے [illegible] اسلامی ریاست [illegible] ہے۔

اللہ نے پہلا اصول یہ بیان فرمایا کہ اس کی وحدانیت کو مانو اور اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو اور ان کے ساتھ نرمی، عاجزی اور تواضع سے پیش آؤ۔ اور بڑھاپے کی حالت میں ان کے ساتھ خاص طور پر احسان کرو۔ اگرچہ ان کے مزاج میں درشتگی بھی آجائے تو انہیں اُف تک نہ کہو۔ پھر فرمایا کہ ماں باپ کے لیے نہایت عاجزی سے دُعا بھی کریں کہ اے اللہ! اُن پر اسی طرح رحم فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی تھی۔

اللہ نے تیسرا اصول یہ بیان فرمایا کہ قرابتداروں، مسکینوں اور مسافروں کے حقوق ادا کرو۔ ان میں فرضی، واجبی اور نفلی تمام حقوق شامل ہیں۔ پھر چوتھا اصول یہ بیان فرمایا کہ فضول خرچی نہ کرو۔ معاصی کے امور میں ہرگز خرچ نہ کرو۔ رسومات باطلہ اور بدعات کے راستے میں فضول خرچی کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں۔ اور شیطان اپنے پروردگار کا سخت ناشکرگزار ہے۔ خدا نے اُسے طاقت اور موقع دیا مگر اس نے اللہ کو ناراض کیا اور ہمیشہ کے لیے ملعون و مردود ٹھہرا۔

اسلامی معاشرے کے تیسرے اصول میں اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کے مالی حقوق ادا کرنے کا حکم دیا تھا۔ اب اس حکم کا دوسرا پہلو بھی بیان کیا ہے کہ اگر کسی وقت آپ اتنے صاحب استطاعت نہ ہوں کہ قرابتداروں، مسکینوں اور مسافروں کے حقوق ادا کر سکیں تو پھر ان مستحقین سے کیسا سلوک کرنا چاہیئے۔ ارشاد ہوتا ہے وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ اور اگر آپ کسی وقت اُن حقداروں سے اعراض کریں۔ آپ کے پاس ادا کرنے کے لیے مال موجود نہیں ہے۔ فَقُل لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا تو آپ اُن کے لیے نرمی سے بات کریں اور معذرت کرلیں کہ وہ مالی اعانت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جب ہوں گے تو پھر اُن کی خدمت بجا لائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ سائلین سے سختی سے پیش نہ آئیں۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی نے اس طرز تکلم کو [illegible]

سے تعبیر کیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے اجتماعی نظام میں پانچویں اصول کے طور پر متعارف کرایا ہے۔ درمیان میں اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ آپ ان مستحقین سے اعراض کریں۔ اس حالت میں اِبْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی تلاش میں ہیں یعنی مال کے حصول کی کوشش میں ہیں اور اس کی اُمید بھی رکھتے ہیں تو اُن لوگوں سے نہایت نرمی سے گفتگو کریں کہ اگر اللہ نے مال دیا تو ضرور اُن کا حق ادا کریں گے۔

محتاجوں کے ساتھ سختی سے پیش آنے کی قطعاً اجازت نہیں دی گئی۔ سورۃ البقرہ میں جہاں اللہ تعالیٰ نے صدقہ و خیرات کا قانون بیان فرمایا ہے وہاں ارشاد ہوتا ہے "قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى" (البقرہ - ۲۶۳) اچھی اور مغفرت کی بات کہہ کر خوش اسلوبی سے ٹال دینا اُس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد سائل کو قولی یا فعلی طور پر ایذا پہنچائی جائے، اور یہی ردِ عمل ہے۔

حضور علیہ السلام کا اسوہ حسنہ

ایک موقع پر حضور علیہ السلام کے پاس ایک محتاج آیا، اُس نے سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس وقت تو میرے پاس کوئی چیز موجود نہیں ہے لہٰذا تم میرے حوالے سے فلاں شخص سے جا کر لے لو، میں بعد میں اس کو ادا کر دونگا حضرت عمرؓ پاس بیٹھے تھے، عرض کیا حضور! جو چیز آپ کے پاس موجود نہیں ہے اُس کی ادائیگی کے لیے تو آپ مکلف نہیں ہیں، پھر اتنا تکلف کیوں کرتے ہیں۔ اس بات پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ وہیں ایک انصاری نوجوان بھی بیٹھا تھا، اُس نے عرض کیا اَنْفِقْ وَلَا تَخَفْ مِنْ ذِی الْعَرْشِ اِقْلَالًا "حضور! آپ خرچ کریں اور رب العرش سے کسی کمی کا خطرہ محسوس نہ کریں، وہ اپنی رحمت سے بھیجتا رہے گا اور آپ خرچ کرتے رہیں گے۔ یہ بات سن کر حضور علیہ السلام کی ناراضگی دور ہو گئی اور آپ خوش ہو گئے۔

حضور علیہ السلام کے خلقِ عظیم کا تقاضا تھا کہ آپ کبھی کسی سائل کو ردّ نہیں کرتے تھے۔ یا تو کچھ دے دیتے تھے اور یا کسی دوسرے کے حوالے کر دیتے تھے۔ بعض اوقات آپ یہ بھی فرماتے کہ بھائی! فلاں وقت آنا۔ غرضیکہ آپ کسی سائل کو نفی میں جواب نہیں دیتے تھے عام لوگوں کے لیے بھی یہی قانون ہے کہ اگر کسی وقت پاس کچھ نہیں ہے تو رحمِ جمیل سے کام لیتے ہوئے اچھے طریقے سے جواب دیں۔

(۶) خرچ میں میانہ روی

اب چھٹا اصول یہ بیان کیا جا رہا ہے وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ خرچ کرنے کے معاملہ میں اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کے ساتھ نہ جکڑ لیں یعنی بخل نہ کریں۔ جو شخص مال کی موجودگی میں خرچ نہیں کرتا اس کا ہاتھ گویا اس کی گردن کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ بخل پرلے درجے کی بداخلاقی اور تباہ کن معاشرتی بیماری ہے۔ قرآن میں اس کو فحش بھی کہا گیا ہے غرضیکہ پہلی بات یہ ہے کہ بخل سے کام نہ لیں اور دوسری بات یہ کہ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ اور اپنے ہاتھ کو پوری طرح پھیلا کر بھی نہ رکھیں کہ جو کچھ پاس ہے سب دے دیا اور پھر نادار ہو کر بیٹھ گئے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بھی پسند نہیں بلکہ میانہ روی پسند ہے کہ خرچ بھی کرو اور اپنی ضروریات کے لیے پاس بھی رکھو۔ یہ عام لوگوں کے لیے قانون ہے۔

حضور کے لیے استثناء

امام ابوبکر حصاصؒ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی ذاتِ مبارکہ اس قانون سے مستثنیٰ ہے۔ آپ کی عادتِ مبارکہ یہ تھی كَانَ لَا يَدَّخِرُ لِغَدٍ کہ آپ کل کے لیے کوئی چیز ذخیرہ نہیں کرتے تھے بلکہ جو کچھ آتا سب خرچ کر دیتے۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر میرے پاس احد پہاڑ جتنا سونا بھی ہو تو میں ایک یا تین دینار جو کہ ادائے قرض کے سوا اس میں سے ایک درہم بھی نہ روکوں بلکہ رات سے پہلے سارا تقسیم کر دوں۔ تمام مال مستحقین کو ادا کر دوں گی۔ آپ کی اتباع میں بعض خواص

بھی آپ کی سنت پر عمل کرتے تھے اور آپ قبول فرما لیتے تھے حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنا سارا اثاثہ بھی پیش کر کے مطمئن رہتے تھے اور حضورؐ اسے قبول کرتے تھے البتہ عام لوگوں کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انڈے کے برابر سونے کی ڈلی پیش کی کہ یہ صدقہ ہے اور کہا کہ بخدا میں اس کے علاوہ کسی چیز کا مالک نہیں۔ آپ نے وہی ڈلی زور سے اس شخص کی طرف واپس پھینکی کہ اگر اس کو لگ جاتی تو زخمی ہو جاتا۔ فرمایا تم میں سے کوئی شخص اپنا سارا اثاثہ لے کر آجاتا ہے اور پھر پریشان ہو کر دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے لگتا ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ پہلے اپنی ضروریات پوری کرو اور پھر صدقہ کرو۔

ایک دفعہ ایک پھٹے پرانے کپڑوں والا خستہ حال آدمی حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے لوگوں کو ترغیب دلائی تو اس کے لیے کپڑے جمع ہو گئے۔ حضور علیہ السلام نے اس کی حالت کے پیش نظر اس شخص کو دو کپڑے عطا فرمائے۔ آپ نے لوگوں کو پھر صدقہ کی ترغیب دلائی اس پر وہی شخص اٹھا اور دو میں سے ایک کپڑا صدقہ میں پیش کر دیا۔ حضور علیہ السلام اس پر بھی ناراض ہوئے اور فرمایا کہ اس شخص کی خاطر میں نے لوگوں کو صدقہ کی ترغیب دلائی، لوگوں نے اس کے لیے کپڑے دیے اور اس نے ان میں سے ایک پھر واپس کر دیا ہے۔ یہ کیسے درست ہو سکتا ہے۔ اس کی اعانت کے لیے تو یہ ساری کارروائی ہوئی اور اس نے پھر احتیاج کی طرف قدم بڑھایا۔

بہر حال عام لوگوں کے لیے یہی قانون ہے کہ نہ تو بخل سے کام لیں اور نہ سب کچھ خرچ کر کے خود محتاج ہو جائیں۔ اس کی بجائے درمیانہ راستہ اختیار کریں جسے اقتصاد کہا جاتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے اَلْاِقْتِصَادُ

نِصْفُ الْمَعِيْشَةِ یعنی میانہ روی آدھی معیشت ہوتی ہے آپ علیہ السلام کا یہ فرمان بھی ہے مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ جس نے میانہ روی اختیار کی وہ کبھی محتاج نہیں ہوگا، ساری خرابی افراط و تفریط کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جس سے اجتناب کرکے میانہ روی اختیار کرلی جانی چاہیئے۔

منفق اور ممسک

حدیث شریف میں آتا ہے کہ منفق (خرچ کرنے والے) اور ممسک (بخیل) کی مثال ایسی ہے جیسے دو آدمیوں کے گلے سے لے کر ہنسلی کی ہڈی تک دو جبّے ہوں۔ خرچ کرنے والے آدمی کا جبّہ پھیلتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پاؤں بھی اس میں ڈھک جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف بخیل آدمی کا جبّہ کوشش کے باوجود پھیلتا نہیں بلکہ اسکی کڑیاں مزید مضبوط ہوکر جبّہ سکڑ جاتا ہے۔

حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ (حضرت زبیرؓ کی بیوی) نے عرض کیا حضور! ہمارے پاس مال جمع تو ہوتا نہیں، خاوند جو کچھ کما کر لاتا ہے اس سے بمشکل گزر بسر ہوتی ہے۔ بعض اوقات دروازے پر محتاج بھی آجاتے ہیں، تو کیا میں اُس معمولی مال میں سے کچھ خرچ کرسکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا، ہاں، تم عرف کے مطابق بغیر اجازت خاوند خرچ کرسکتی ہو لیکن شرط یہ ہے کہ غَيْرَ مُفْسِدَةٍ اپنے خاوند کے مال کو بگاڑنے والی نہ ہو۔ معقول طریقے سے محتاجوں کی خدمت کرو کسی کو کھانا کھلا دیا، کسی پڑوسی کو ہدیہ بھیج دیا وغیرہ وغیرہ۔ فرمایا اگر تم ہاتھ روک لوگی تو اللہ تعالیٰ بھی ہاتھ روک لے گا، اور اگر سمیٹ سمیٹ کر رکھو گی تو اللہ تنگی ڈال دے گا۔

حدیث میں آتا ہے کہ رات گزار کر ہر صبح جب بندے صحت و سلامتی کے ساتھ بیدار ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ایک فرشتہ دعا کرتا ہے اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا۔ اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کے خرچ کا بدلہ عطا کر یعنی اسکی جگہ مزید عطا فرما اور دوسرا فرشتہ کہتا ہے اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا اے اللہ! بخیل کے مال کو تلف کر دے امام ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ اسکا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو خرچ کرنیکی توفیق عطا فرما۔

قرابت داروں، محتاجوں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرنا بڑا نیکی کا کام ہے تو حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے مَا يُخْرِجُ رَجُلٌ شَيْئًا مِّنَ الصَّدَقَةِ حَتّٰى يَفُكَّ لَحْيَيْ سَبْعِيْنَ شَيْطَانًا (مستدرک حاکم و مسند احمد) کوئی شخص صدقہ نہیں نکالتا، جب تک کہ ستر شیطانوں کے جبڑے نہ توڑ جائیں۔ شیطان چاہتا ہے کہ کوئی شخص فی سبیل اللہ خرچ نہ کرے پھر جب خرچ کرنے والا خرچ کرتا ہے تو گویا وہ شیطانوں کے جبڑے توڑ کر ایسا کرتا ہے۔

بہر حال قانون یہ بیان فرمایا کہ اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کے ساتھ جکڑ کر نہ رکھو یعنی بخل نہ کرو، اور نہ ہی ہاتھ کو اتنا کشادہ کر دو کہ سب کچھ خرچ کر دینے کے بعد خود محتاج ہو کر بیٹھ جاؤ۔ فرمایا فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا پھر بیٹھ جاؤ گے ملامت کیے ہوئے اور تھکے ہارے ہوئے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مَلُوْمًا کا تعلق پہلے حصے یعنی بخل کے ساتھ ہے کہ اگر بخل کرو گے تو تم پر ملامت آئے گی کہ کتنا بخیل آدمی ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک[1] بھی ہے۔ اَیُّ دَاءٍ اَدْوَءُ مِنَ الْبُخْلِ بخل سے بڑھ کر کون سی روحانی بیماری ہو سکتی ہے۔ زہیر بن ابی سلمٰی شاعر بھی کہتا ہے۔

وَمَنْ یَّكُ ذَا فَضْلٍ فَیَبْخَلْ بِفَضْلِهٖ
عَلٰی قَوْمِهٖ یُسْتَغْنَ عَنْهُ وَیُذْمَمِ

جو آدمی صاحب مال ہونے کے باوجود اپنی قوم کے مستحقین پر خرچ نہیں کرتا، اس سے استغنا برتا جائیگا اور وہ لوگوں کی نگاہ میں ذلیل ہو کر رہ جائے گا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مَحْسُوْرًا کا تعلق وَلَا تَبْسُطْهَا سے ہے یعنی اگر ہاتھ کو زیادہ کشادہ کر دو گے اور سب کچھ دے بیٹھو گے تو پھر تمہاری حالت تھکے ہوئے آدمی جیسی ہو جائے گی جو بے بس ہو کر رہ جاتا ہے لہٰذا خرچ بھی کرو اور اپنی جائز ضروریات کا بھی خیال رکھو۔ شاہ عبدالقادر لکھتے

[1] مسند احمد ص ۲۸ ج ۳ و کنز العمال ص ۲۵۷ ج ۱ (فیاض)

دیں کہ کسی محتاج کو دیکھ کر بے تاب نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ اس کی حاجت روائی تیرے ذمے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ مگر یہ باتیں اللہ نے اپنے پیغمبر کو فرمائی ہیں۔ جو بے حد سخی واقع ہوئے تھے۔ البتہ جس شخص سے مال نہ نکل سکے اس کو دینے کا پابند کیا ہے۔ بخیل آدمی کی مذمت کی گئی ہے اور اس کو خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس طرح کوئی طبیب مریض کی حالت کے مطابق گرم طبیعت والے کو سرد اور سرد طبیعت والے کو گرم دوائی دیتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ بخیل کو خرچ کرنے اور کشادہ ہاتھ کو سنبھل کر چلنے کی نصیحت کرتا ہے

مصلحت خداوندی

فرمایا اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ بیشک تیرا پروردگار کشادہ کرتا ہے روزی جس کی چاہے اور تنگ کرتا ہے جس کی چاہے۔ اس کی مصلحت کو وہ خود ہی جانتا ہے کوئی دوسرا اس سے واقف نہیں ہوتا۔ حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا یہ فرمان بھی ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ میرے بعض بندے ہیں کہ ان کے ساتھ مالداری ہی زیادہ مناسب ہوتی ہے اگر میں ان کو مال نہ عطا کروں تو ان کا دین ہی بگڑ جائے۔ فرمایا بعض آدمیوں کے ساتھ ناداری ہی زیادہ مناسب ہوتی ہے۔ اگر میں ان کو مال دے دوں تو ان کا دین ہی بگڑ جائے لہذا میں اپنی حکمت سے کسی کو زیادہ دیتا ہوں اور کسی کو کم۔ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا بیشک وہ اپنے بندوں کی خوب خبر رکھنے والا اور ہر ایک کی کیفیت، نیت، عمل اور ارادے پر نگاہ رکھنے والا ہے۔ وہ ہر ایک کے حال کو بہتر سمجھتا ہے۔ تنگی اور کشادگی اسی کے ہاتھ میں ہے اور اس کی حکمت کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تمہارا فرض ہے کہ اس کے قوانین کی پابندی کرو کہ تمہاری بہتری اسی میں ہے۔ اللہ نے مال دیا ہے تو بخل نہ کرو اور نہ اتنا خرچ کرو کہ خود نادار ہو جاؤ۔ میانہ روی ہی تمہارے لیے دنیا و آخرت میں بہتر ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾

ترجمہ :- اور نہ قتل کرو اپنی اولادوں کو فقر کے خوف سے ہم انھیں روزی دیتے ہیں اور تمہیں بھی ۔ بیشک اُن کا قتل کرنا بڑی خطا ہے ﴿۳۱﴾ اور نہ قریب جاؤ زنا کے ، بیشک یہ بے حیائی کی بات ہے اور بُرا راستہ ہے ﴿۳۲﴾ اور نہ قتل کرو کسی نفس کو ، جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے ، مگر حق کے ساتھ ۔ اور جو شخص قتل کیا گیا مظلوم ، پس بیشک ہم نے بنایا ہے اُس کے سرپرست کے لیے غلبہ ۔ پس وہ نہ اسراف کریں قتل میں ۔ بیشک وہ ہے مدد کیا گیا ﴿۳۳﴾

ربطِ آیات

اس سے پیشتر اسلامی نظامِ معاشرت کے چھ اصول بیان ہو چکے ہیں ۔ یعنی خدا تعالیٰ کی وحدانیت پر استقامت ، ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک ، قرابتداروں ، مسکینوں اور مسافروں کے حق کی ادائیگی ، فضول خرچی سے اجتناب اور اگر کسی وقت مالی حالت کمزور ہو تو مستحقین کو نرمی سے جواب دیں ۔ بخل سے اجتناب اور اخراجات میں میانہ روی

کر اپنانا۔ سب کچھ یک وقت خرچ کرنے کو بھی غیر مستحسن فرمایا کہ ایسا کرنے سے بعد میں پریشانی لاحق ہوتی ہے۔

(۷) قتل اولاد کی ممانعت

اب آگے کچھ منہیات آ رہی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ساتویں اصول کے طور پر مفلسی کے خوف سے قتل اولاد سے منع فرمایا گیا ہے۔ قرآن کریم میں اولاد کا قتل دو وجوہ کی بنا پر بیان کیا گیا ہے۔ گذشتہ سورۃ النحل میں لڑکیوں کے قتل کا ذکر ہو چکا ہے وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ عرب کے بعض قبائل میں یہ رواج تھا کہ جب انہیں بچی کی پیدائش کی خبر سنائی جاتی تو نام نہاد غیرت کی وجہ سے ان کے چہرے سیاہ ہو جاتے اور وہ سوچنے لگتے کہ اس کو کس موقع پر اور کس طریقے سے قتل کر دیا جائے تاکہ شادی کے قابل ہو کر ہمارے لیے باعث ننگ نہ بنے۔ چنانچہ بعض تو پیدا ہوتے ہی دائی کے ذریعے اُسے زندہ دفن کرا دیتے یا کچھ بڑی ہونے پر خود گڑھا کھود کر اُس میں دھکا دیتے یا کسی اونچی جگہ سے گرا کر ہلاک کر دیتے۔ اللہ کا فرمان ہے کہ قیامت کے دن وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ (التکویر) زندہ درگور ہونے والی بچیوں سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا۔ اُس وقت اس قبیح فعل کے مرتکبین کا حشر قابل دید ہو گا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بھی ارشاد مبارک ہے اَلْوَائِدَةُ وَالْمَوْءُودَةُ فِي النَّارِ یعنی بچی کو جن کر قتل کروانے والی ماں اور قتل کرنے والی دائی دونوں جہنمی ہیں۔

قتل اولاد کی دوسری وجہ جو یہاں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے وسائل محدود ہیں۔ ذرائع آمدنی مخدوش ہیں تو ایسے میں اولاد (لڑکا یا لڑکی) کی پرورش کیسے ہو گی، اِن کی ضروریات زندگی کون بہم پہنچائے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ انہیں پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جائے۔ اللہ نے اسی فعل سے منع فرمایا ہے وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ اپنی اولادوں

کو مفلسی اور تنگدستی کی وجہ سے قتل نہ کرو، روزی کی بہم رسانی تمہاری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ ہر نومولود بچے کو روزی ہم پہنچاتے ہیں نہ صرف انہیں بلکہ وَاِیَّاکُمْ تمہاری روزی بھی ہمارے ذمہ ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ اپنی روزی خود کماتے ہو۔ نہیں، بلکہ تمام وسائل رزق تو اللہ تعالیٰ کے کنٹرول میں ہیں، وہ وسائل مہیا کرتا ہے تو تمہاری روزی کا انتظام ہوتا ہے۔ اگر وہ تمہیں کچھ نہ دینا چاہے تو تمہاری تمام تر محنت اور تگ و دو کے باوجود تمہیں کچھ نہیں مل سکتا۔ اللہ تعالیٰ نہ صرف تمام انسانوں کا روزی رساں ہے۔ بلکہ ہر جانور، چرند، پرند، کیڑے مکوڑے، مچھلیوں اور چیونٹیوں تک کا سامان تربیت وہی بہم پہنچاتا ہے، ارشاد ہوتا ہے وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ (العنکبوت) کتنے ہی جانور ہیں جو اپنی روزی اپنی پشت پر نہیں لادے پھرتے، بلکہ اللہ ان کو بھی روزی دیتا ہے اور تمہیں بھی۔ اللہ تعالیٰ کو جب تک کسی جاندار کی زندگی منظور ہوتی ہے، وہ اس کی روزی کا بندوبست کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا تم اپنی اولاد کو فقر کے ڈر سے قتل نہ کیا کرو۔

صحیحین کی روایت میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ انہوں نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا اَیُّ ذَنْبٍ اَعْظَمُ حضرت سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا اَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَّهُوَ خَلَقَكَ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تم اللہ کا شریک بناؤ حالانکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ ابن مسعودؓ نے پھر عرض کیا حضور! اس کے بعد بڑا گناہ کونسا ہے؟ تو آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ خَافَةَ مَنْ يَّطْعَمُ کہ تو اپنی اولاد کو اس ڈر سے قتل کرے کہ اس کی خوراک کا بندوبست کون کرے گا۔ گویا شرک کے بعد دوسرے نمبر پر قتل اولاد کا جرم ہے۔ انہوں نے تیسری مرتبہ عرض کیا حضرت!

اس کے بعد کون سا گناہ ہے تو رحمت عالم نے فرمایا اَنْ تُزَانِيَ حَلِيْلَةَ جَارِكَ کہ تو اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے۔ بدکاری تو ویسے بھی بہت بُری حرکت ہے مگر پڑوسی کے حق پہ ڈاکہ ڈالنا تو بہت ہی معیوب ہے کیونکہ اللہ نے ہمسایہ کے بڑے حقوق رکھے ہیں۔

فرمایا ہم ان نومولودوں کو بھی روزی پہنچاتے ہیں اور تمہیں بھی یاد رکھو اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيْرًا بیشک قتل اولاد تو بہت بڑا جرم ہے اللہ تعالیٰ نے یہ ساتواں اصول بیان کر دیا کہ تنگدستی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔

برتھ کنٹرول

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن پاک نے قتل اولاد کی دو صورتیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک بچیوں کا قتل تاکہ اُن کا کوئی داماد نہ بن سکے اور دوسرا تنگدستی کے ڈر سے عام قتل۔ اب آج کے زمانے میں نسل کشی کے کچھ دیگر ذرائع بھی معرض وجود میں آ چکے ہیں جنہیں استعمال کیا جا رہا ہے۔ ان میں مانع حمل ادویات یا اسقاط حمل ادویات شامل ہیں عورتوں کے رحم کا آپریشن بھی کرا دیا جاتا ہے تاکہ حمل ٹھہرنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جائے۔ برتھ کنٹرول کی یہ ساری قسمیں شریعت کے نزدیک جرم ہیں۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت تو یہ ہے کہ نسل انسانی کو نکاح کے ذریعے زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے۔ جو کوئی اللہ کی اس مصلحت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انسانی آبادی کو محدود کرنا چاہتا ہے، وہ ملعون ہے اُس پہ خدا تعالیٰ اور ملاء اعلیٰ کی لعنت برستی رہے گی۔ اس خلاف فطرت کارروائی کے حق میں آج بھی یہی دلیل پیش کی جاتی ہے کہ دنیا کی آبادی وسائل رزق کی نسبت زیادہ بڑھ رہی ہے اگر یہ اسی طرح بڑھتی رہی تو ان کی خوراک اور دیگر ضروریات زندگی کیسے مہیا ہوں گی۔ چنانچہ خاندانی منصوبہ بندی کا کام کسی ایک ملک میں نہیں بلکہ اقوام متحدہ کے تحت پوری دنیا میں ہو رہا ہے۔

جس کے لیے یہ عالمی ادارہ امداد بھی مہیا کرتا ہے۔ دراصل اس قسم کی منصوبہ بندی میں
شرک کا پہلو بھی نکلتا ہے کہ لوگ خدا تعالیٰ کی صفت رزاقیت کو اپنے قبضے میں
لینا چاہتے ہیں۔ ان بیوقوفوں سے کوئی پوچھے، کیا روزی تمہاری منصوبہ بندی
سے حاصل ہوتی ہے؟ وسائل رزق تو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ
میں ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُوالْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ (الذٰریٰت)
رزاق تو وہ رب العزت ہے جو زور آور اور مضبوط ہے۔ دنیا بھر میں خوراک
کی کمی کا تعلق آبادی کی کثرت سے نہیں بلکہ وسائل رزق کے غلط استعمال سے ہے
وسائل خود غلط استعمال کرتے ہیں مگر دعویٰ یہ ہے کہ ہماری پلاننگ سے
لوگوں کو معیشت حاصل ہوتی ہے۔

(۸) زنا کی ممانعت

اب اللہ نے آٹھواں اصول یہ بیان فرمایا ہے وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی
زنا کا ارتکاب تو بڑی بات ہے، اس کے قریب بھی نہ جاؤ یعنی زنا کے جملہ
لوازمات سے بھی دور رہو تاکہ اس قبیح فعل کی نوبت ہی نہ آئے۔ فرمایا یہ اس
لیے اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً کہ یہ بڑی بے حیائی کی بات ہے وَسَآءَ
سَبِیْلًا اور بہت برا راستہ ہے۔ اس کے ارتکاب سے نسب، اخلاق
اور دین سب تباہ ہو جاتے ہیں۔ شاہ عبد القادرؒ فرماتے ہیں کہ برے راستے
مراد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے کی عورت پر غلط نگاہ ڈالے گا تو کوئی دوسرا
اس کی عورت کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گا، اور اس طرح یہ ایک غلط روش
چل نکلے گی، جس کا نتیجہ بہت ہی برا برآمد ہوگا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ قبیلہ ہذیل کے ایک شخص نے حضور علیہ السلام
کی خدمت میں حاضر ہو کر زنا کی اجازت طلب کی، ایک شاعر نے اسے اس طرح بیان کیا ہے
ضَلَّتْ ھُذَیْلٌ بِمَا سَاَلَتْ ۔ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاحِشَۃً
یعنی ہذیل گمراہ ہو گیا کہ اس نے حضور علیہ السلام سے فحش بات کی اجازت
طلب کی۔ صحابہ کرامؓ نے نہایت سختی کے ساتھ اس شخص کو خاموش کرانا چاہا۔

نبی رحمت علیہ السلام نے اُس شخص کو شفقت کے ساتھ اپنے پاس بٹھا کر فرمایا، کیا تم یہ حرکت اپنی ماں، بیٹی، بہن، خالہ یا پھوپھی کے ساتھ واقع ہونا پسند کرتے ہو، اُس نے عرض کیا حضور! یہ تو میں ہرگز پسند نہیں کرتا۔ آپ نے فرمایا کہ اسی طرح دوسرے لوگ بھی اپنی کسی عزیزہ کے ساتھ یہ قبیح حرکت پسند نہیں کرتے، تو تم اس پہ کیوں اصرار کرتے ہو! وہ شخص سمجھ گیا اور اپنا مطالبہ واپس لے لیا۔ پھر حضور علیہ السلام نے اُس شخص کے لیے دُعا فرمائی کہ اے اللہ! اس کے گناہ کو معاف کر دے اور اس کے اعضائے مستورہ کی حفاظت فرما۔ کہتے ہیں کہ وہ شخص اس کے بعد ہمیشہ کے لیے حیادار بن گیا۔ حضور کی دُعا اور نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ وہ اپنی نگاہ ہمیشہ نیچی رکھتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے قضائے شہوت کے لیے جائز ذرائع یعنی نکاح کو اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے اور ساتھ وعید بھی کر دی ہے "فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ" (المعارج) جو شخص اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ تلاش کرے گا تو پھر تعدی کرنے والے بن جاؤ گے ہر چیز بگڑ جائے گی۔ اللہ کے نزدیک بھی ذلت ہوگی اور قانون کی نگاہ میں بھی مجرم ہوں گے۔ حضرت بریدہؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں زناکار پر لعنت بھیجتے ہیں۔ خاص طور پر الشیخ الزانی (معمر زناکار) کے متعلق فرمایا کہ ان لوگوں کی شرمگاہوں سے ایسی سخت بدبو اُٹھے گی جس سے اہلِ دوزخ بھی پناہ مانگیں گے۔ حضرت انسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور نبی کریمؐ نے فرمایا کہ جو شخص زنا کا ارتکاب اور اس پر اصرار کرتا ہے، وہ شخص ایسا ہے کہ عابدِ وثن جیسے بت پرست ہو۔ گویا زنا کا جرم بت پرستی جیسا بڑا جرم ہے تا وقتیکہ کوئی شخص اس سے تائب نہ ہو جائے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آتا ہے کہ جب کوئی آدمی اس فعل کا ارتکاب کرتا ہے تو ایمان اُس کے جسم سے نکل کر اُس کے اُوپر سائبان

کی طرح لٹکتا رہتا ہے۔ پھر جب وہ اس فعل سے الگ ہو جاتا ہے۔ تو ایمان واپس آجاتا ہے۔ غرضیکہ آٹھویں اصول میں اللہ تعالیٰ نے زنا کے قریب بھی جانے سے منع فرمایا۔

(۹) قتل ناحق کی ممانعت

اب نواں اصول اللہ نے یہ بیان فرمایا ہے وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ خدا تعالیٰ کی حرام کردہ کسی جان کو قتل نہ کرو سوائے حق کے۔ قتل ناحق بھی اکبر الکبائر یعنی بڑے بڑے گناہوں میں سے ہے دنیا میں اس کے بہت برے اثرات پھیلتے ہیں۔ بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں۔ بادسائل لوگ بے وسیلہ ہو جاتے ہیں اور معاشرے میں قسم قسم کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ قرآن و حدیث نے اس کی سخت مذمت بیان فرمائی ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ کسی کلمہ گو آدمی کا قتل جائز نہیں ماسوائے اس کے کہ وہ شادی شدہ زانی ہو، مرتد ہو جائے یا قصاص میں قتل کر دیا جائے شریعت نے شادی شدہ زانی کی سنگساری مقرر کی ہے۔ ارتداد کے متعلق سورۃ مائدہ میں ہے وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ "اپنے دین سے مت پھرو ورنہ سخت نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے حضور علیہ السلام کا فرمان ہے التَّارِكُ لِدِينِهِ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَةِ جو دین کو چھوڑ کر مرتد ہو جاتا ہے۔ وہ جماعت المسلمین سے الگ ہو جاتا ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ جس نے اپنا دین تبدیل کر لیا اس کو قتل کر دو۔ اور پھر قصاص میں قتل کیے جانے کا قانون تو واضح ہے أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ (المائدہ - ۴۵) کہ جان کے بدلے جان ہے۔ بہرحال اللہ نے ان تین قسم کے قتل حق کے علاوہ ناحق قتل سے منع فرما دیا ہے۔

قتل حق کی بعض دوسری صورتیں بھی شریعت مطہرہ نے بیان فرمائی ہیں مثلاً سرکش، باغی اور ڈاکو کے متعلق فرمایا "إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ

اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْا ...الآیۃ
جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ برسرپیکار ہوتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں انہیں قتل کیا جائے یا سولی چڑھا جائے اور ان کے ہاتھ پاؤں الٹے کاٹ دیے جائیں۔ اسی طرح جنگ کے دوران کفار کو قتل کرنا بھی روا ہے بعض ائمہ مجتہدین کے نزدیک بلا عذر تارک نماز کو تعزیری طور پر قتل کیا جائیگا۔ البتہ امام ابوحنیفہؒ ایسے شخص کے لیے قید کی سزا کے قائل ہیں۔ اسی طرح اغلام باز کو بھی سزائے موت دی جا سکتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جادو کے ذریعے لوگوں کو نقصان پہنچانے والا آدمی بھی واجب القتل ہے ترمذی شریف کی روایت[۱] میں یہ الفاظ آتے ہیں حَدُّ السَّاحِرِ ضَرْبَۃٌ بِالسَّیْفِ جادوگر کی تعزیر یہ ہے کہ تلوار کے ساتھ اس کا سر قلم کر دیا جائے۔ کسی جانور کے ساتھ بدفعلی کرنے والے کو بھی تعزیرًا قتل کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب تعزیری قتل بھی قتل حق کا حصہ ہیں۔ البتہ اس کے علاوہ کسی جان کو تلف کرنا قتل ناحق ہوگا۔

قتل ناحق پر وعید

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے لَزَوَالُ الدُّنْیَا اَھْوَنُ عَلَی اللّٰہِ مِنْ قَتْلِ رَجُلٍ مُّسْلِمٍ (ترمذی صفحہ ۲۵۹ ج ۱ کتاب الدیات) یعنی پوری دنیا کی تباہی ایک طرف اور ایک مومن کا قتل ناحق ایک طرف ہے گویا ساری دنیا کی تباہی ایک قتل ناحق کے برابر ہے۔ ابن ماجہ، ترمذی، نسائی شریف کی روایت میں آتا ہے لَوْ اَنَّ اَھْلَ السَّمٰوٰتِ وَاَھْلَ الْاَرْضِ اگر تمام آسمانوں اور زمین والے مل کر کسی ایک مومن کے قتل میں شریک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ سب کو جہنم میں اوندھے منہ گرائے گا۔ ایک قتل ناحق کے بدلے تمام روئے زمین و آسمان کے بسنے والوں کو ماخوذ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فرمان بھی آتا ہے کہ ابلیس ہر صبح اپنے لشکر کو مختلف اطراف میں روانہ کر کے

[۱] ترمذی ص ۱۷۳ (فیاض)

کہتا ہے کہ جو شخص کارہائے نمایاں انجام دیگا، میں اُسے تاج پہناؤں گا اور اس کی عزت افزائی کروں گا۔ سب شیطان چلے جاتے ہیں۔ پھر واپس آکر ان میں سے ایک کہتا ہے کہ میں ایک مسلمان کو گمراہ کرتا رہا حتیٰ کہ اُس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ بڑا شیطان کہتا ہے کہ تم نے بڑا اچھا کام کیا مگر ہوسکتا ہے کہ یہ پھر نکاح کرلے، لہٰذا یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ پھر دوسرا شیطان آکر کہتا ہے کہ میں فلاں شخص کی برابر وسوسہ اندازی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ شخص اپنے والدین کا نافرمان ہوگیا۔ بڑا شیطان کہتا ہے کہ ہوسکتا ہے وہ شخص تائب ہوکر پھر والدین کا فرمانبردار بن جائے، لہٰذا یہ بھی کوئی بڑا کام نہیں ہے۔ ایک اور شیطان یہ رپورٹ پیش کرتا ہے کہ وہ فلاں شخص کے پیچھے متواتر لگا رہا، اُس کو گمراہ کرتا رہا حتیٰ کہ اس نے شرک کا ارتکاب کیا۔ بڑا شیطان خوش ہوکر کہتا ہے نعم انت تم نے بہت اچھا کام کیا، اور اس کے سر پر تاج رکھ دیتا ہے۔ پھر ایک اور شیطان آکر کہتا ہے کہ میں نے فلاں شخص کو ورغلایا، اس کو گمراہ کیا حتیٰ کہ اُس نے ناحق قتل کردیا۔ سردار شیطان اس پر بھی بڑا خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے نعم انت تم بڑے قابل ہو۔ شیطان اُس کو بھی تاج پہنا دیتا ہے۔ غرضیکہ یہ دو جرم شرک باللہ اور قتل ناحق شیطان کو بہت پسند ہیں کیونکہ ان میں بنیادی خرابیاں پائی جاتی ہیں جن کا اثر سارے معاشرہ پر پڑتا ہے۔

جب باغیوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا گھیراؤ کرلیا، تو انہوں نے مکان کی چھت سے اُن لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے تین قتل جائز قرار دیئے تھے یعنی شادی شدہ زانی، مرتد اور ناحق قاتل۔ لوگو! تم جانتے ہو کہ میں ان میں سے کسی جرم میں ملوث نہیں، پھر تم کیوں میرے قتل کے درپے ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ نے ان میں سے کوئی جرم نہیں کیا مگر آپ کو چھوڑیں گے نہیں۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ پھر تم گمراہ ہو جاؤ گے کہ تم

سے مجھے ناحق قتل کرنا چاہتے ہو۔ بہرحال اللہ نے فرمایا کہ اس کی حرام کردہ کسی جان کو مت قتل کرو۔

موجودہ دور میں قتل عام

ہمارے دور میں قتل ناحق ایک معمول بن چکا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں حتیٰ کہ ایک آنے کے تنازعہ پر بھی قتل ہو جاتا ہے۔ جائیداد کے مسئلہ میں بیٹے کے ہاتھوں باپ کا قتل بھی واقع ہوا ہے۔ ایوب کے زمانے میں اسمبلی میں جرائم کی رپورٹ پیش ہوئی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ تین سال کے عرصہ میں پورے ملک میں سولہ ہزار قتل ہوئے۔ یہ بھی کہ ایک سال میں ایک ضلع میں ایک ہزار قتل ہوئے۔ ان حالات میں معاشرہ میں امن و امان کیسے قائم رہ سکتا ہے؟ قتل کو روکنے کا صحیح طریقہ قانون قصاص ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يٰاُولِي الْاَلْبَابِ (البقرہ - ۱۷۹) اے صاحب عقل لوگو! قصاص میں ہی تمہارے لیے زندگی ہے۔ اگر قاتل پر شرعی تعزیر جاری ہوگی۔ چوری اور زنا کی حد جاری ہوگی تو ان جرائم کا لامحالہ خاتمہ ہو جائے گا اور لوگوں کو امن و سکون کی زندگی میسر آسکے گی

(۱) اسراف فی القتل

ارشاد ہوتا ہے وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا جو آدمی مظلومیت کی حالت میں قتل کیا گیا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا پس بیشک ہم نے اس کے سرپرست کے لیے غلبہ بنایا ہے۔ فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ پس وہ قتل میں اسراف نہ کریں۔ مطلب یہ کہ اگر ایک آدمی قتل ہوا ہے تو اس کے بدلے میں دو یا زیادہ آدمی قتل نہ کیے جائیں۔ بلکہ قاتل کو ہی قتل کیا جائے۔ بغیر مستحق کو سزا دینا کبیرہ گناہ ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا بیشک مظلوم مدد کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے مقتول کے ورثاء کو قصاص کا حق دیا ہے۔ اور اگر قصاص ممکن نہ ہو تو دیت کا حق ہے۔ اگر یہ بھی ادا ہو جائے تو آئندہ کے لیے قتل و غارت گری رک جاتی ہے۔ قتل خطا میں دیت کا بوجھ قاتل کے پورے خاندان، دوست احباب اور محلے داروں پر ہوتا ہے۔ لہذا ایک دفعہ کی ادائیگی کے بعد وہ چوکنے

ہو جاتے ہیں اور آئندہ کے لیے قتل کی روک تھام کا انتظام کر لیتے ہیں۔ بہرحال قتل ناحق کو روکنے کے لیے قانونِ قصاص و دیت ہی کارآمد ہیں۔ مظلوم کی مدد کا مطلب یہ بھی ہے کہ اسلامی حکومت قانونِ شریعت کے مطابق اس کی ضرور مدد کریگی؛ اس کے علاوہ جماعت المسلمین کی ہمدردیاں اور مدد بھی مظلوم کے ساتھ ہوگی، لہٰذا قتل کے معاملہ میں اسراف نہیں کرنا چاہیے۔ یہ دسواں اصول ہوگیا۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾

ترجمہ:۔ اور نہ قریب جاؤ تم یتیم کے مال کے مگر اس (طریقے) کے ساتھ جو بہتر ہے، یہاں تک کہ وہ پہنچ جائے جوانی کو۔ اور پورا کرو عہد کو۔ بیشک عہد سے سوال کیا گیا ﴿۳۴﴾ اور پورا کرو ماپ کو جس وقت تم ماپتے ہو اور وزن کرو سیدھے ترازو کے ساتھ۔ یہ بہتر ہے اور اچھا ہے انجام کے اعتبار سے ﴿۳۵﴾

ربط آیات

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے معاشرتی نظام کے جو پندرہ قوانین ان دو رکوعوں میں بیان فرمائے ہیں ان میں سے دس قوانین گذشتہ دروس میں بیان ہو چکے ہیں۔ گذشتہ درس میں تین دفعات بیان ہوئی تھیں۔ یعنی قتل ناحق، زنا اور اسراف فی القتل کی ممانعت۔ اب آج کے درس میں مزید تین اصول آتے ہیں یعنی یتیم کے مال کی حفاظت، ایفائے عہد اور ماپ تول میں دیانت۔ اس کے بعد اگلے درس میں آخری دو اصول بیان ہو کر پندرہ کی گنتی پوری ہو جائے گی۔

(۱۱) یتیم کے مال کی حفاظت

گیارہواں اصول یہ ہے وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر درست طریقے سے جو بہتر ہے۔ یتیموں کی

پرورش نگہداشت اور حسن سلوک کے احکام سورۃ البقرہ، سورۃ النساء اور بعض دیگر سورتوں میں بھی بیان فرماتے جاچکے ہیں اور ان کا ایک حصہ یہاں بھی موجود ہے۔ کمزور طبقات میں سے یتامیٰ کی نگہداشت اور ان کے مال کی حفاظت کے متعلق بڑے سخت احکام نازل فرمائے ہیں۔ جیسے سورۃ النساء میں ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں۔ وہ گویا اپنے پیٹوں میں دوزخ کی آگ ڈال رہے ہیں، عنقریب ایسے لوگ جہنم میں داخل کیے جائیں گے۔ سورۃ البقرہ میں یتیموں کے مال کو اپنے مال کے ساتھ اس صورت میں ملانے کی اجازت دی گئی ہے جب کہ یتیم کا سرپرست یہ کام یتیم کی بہتری کو ملحوظ خاطر رکھ کر کرے، مثلاً اپنے ساتھ کھیتی باڑی یا صنعت یا تجارت میں لگائے کہ جس سے یتیم کا مال ضائع ہونے کی بجائے بڑھتا ہے۔ اللہ کا فرمان ہے "وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ" (البقرہ - ۲۲۰) اگر تم نیک نیتی سے ان کے مال کو ملاؤ گے تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔ ان کی ہمدردی کے ساتھ اصلاح کی کوشش کرو تاکہ ان کا مال نہ صرف محفوظ رہے بلکہ اس میں اضافہ بھی ہوتا رہے۔ آج کے افراطِ زر کے دور میں اگر کوئی رقم جوں کی توں پڑی رہے تو خرچ نہ کرنے کے باوجود اس میں کمی واقع ہوتی رہتی ہے۔ اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں آئے دن اضافہ محفوظ رقم کی قوتِ خرید میں کمی کا باعث بنتا ہے۔ لہٰذا اب یہ ضروری ہو گیا کہ نقد رقم کو کسی کاروبار میں لگایا جائے اگر اس کی قوتِ خرید میں اضافہ نہیں تو کمی بھی تو واقع نہ ہو۔ غرضیکہ یتیموں کے مال کو ان کی بہتری کے لیے اچھے مصرف میں لگانے کی اجازت دی گئی ہے۔ اسی طرح ان کے راشن کو سرپرست کے راشن میں ملا لینا کہ اس سے یتیم کے خرچہ میں بچت ہوگی یہ بھی درست ہے۔ برخلاف اس کے اگر کوئی شخص یتیم کے مال کو اپنے مال کے ساتھ بدنیتی

سے ملاتا ہے تاکہ یتیم کا مال خود ہضم کر سکے تو اس کی سختی سے مذمت بیان کی گئی ہے۔ "وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰٓ أَمْوَالِكُمْ" (النساء-۲) یتیموں کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر مت کھاؤ۔ "وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ" (البقرہ-۲۲۰) اللہ تعالیٰ فسادی اور اصلاح کنندہ کو خوب جانتا ہے۔ اُسے خوب علم ہے کہ کون یتیموں کا خیر خواہ اور کون ان کا بدخواہ ہے۔ بعض نابکار ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو یتیموں کے مال کو جلدی جلدی خرچ کرتے ہیں تاکہ ان کے سنِ بلوغت تک پہنچنے سے پہلے پہلے ہی ختم ہو جائے۔ اسی لیے اللہ نے یہ بھی فرمایا "وَلَا تَأْكُلُوهَآ إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَن يَكْبَرُوا" (النساء-۶) یتیموں کا مال مت کھاؤ فضول خرچی کر کے اور جلدی کر کے کہ بالغ ہونے پر مال ان کے سپرد کرنا پڑے گا۔ فرمایا اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرنا "إِنَّهُۥ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا" (النساء-۲) بڑے گناہ کی بات ہے جس کا بھگتان کرنا پڑے گا۔

قرونِ اولیٰ میں یتیمی کے مسائل زیادہ تر جہاد میں شہید ہو جانے والے لوگوں کی وجہ سے پیدا ہوتے تھے۔ شہدا کے بچوں کے ساتھ حسنِ سلوک اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ مسلمانوں میں جذبہ جہاد بیدار رہے۔ اگر شہدا کے پس ماندگان کا پرسانِ حال کوئی نہیں ہوگا تو جذبہ جہاد سست پڑ جانے کا خطرہ تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یتیموں کی نگہداشت کے قانون پر سختی سے عملدرآمد کا حکم دیا۔ اس سلسلے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ترغیب بھی دی ہے۔ فرمایا خَيْرُ بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ الْمُسْلِمِينَ فِيهِ يَتِيمٌ يُحْسَنُ عَلَيْهِ مسلمانوں کے گھروں میں بہتر گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم زیرِ پرورش ہو اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہو۔ آپ علیہ السلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کے گھروں میں بُرا گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو مگر اس سے بدسلوکی کی جاتی ہو۔

یتیم کا سن بلوغت

فرمایا یتیم کے مال کی اس وقت تک نگرانی کرتے رہو حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّہٗ یہاں تک کہ وہ اپنی قوت کو پہنچ جائے۔ یتیم کے قوت، جوانی یا سن بلوغت تک پہنچنے کی مدت میں فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے بعض بچے بچپن میں ہی باشعور ہوتے ہیں اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت جلدی حاصل کر لیتے ہیں۔ البتہ بعض ناسمجھ بھی ہوتے ہیں اور ان کے مال کی نگہداشت کے لیے زیادہ عرصہ مطلوب ہوتا ہے۔ اسی لیے امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ سرپرست پچیس۲۵ سال کی عمر تک مال کی نگرانی کرے اور اس کے بعد مال یتیم کے حوالے کر دے۔ بعض آئمہ اس سے بھی زیادہ عرصہ کے قائل ہیں تاکہ یتیم کا مال ضائع ہونے سے بچ جائے۔ ہاں اگر بچہ باصلاحیت ہے، اپنے مال کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہے تو ۱۴، ۱۵ سال کی عمر میں بھی اس کا مال اس کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ اَشُدَّ کے لفظ میں یہی بات سمجھائی گئی ہے۔ اور یہ بھی آتا ہے کہ لَا یُتْمَ بَعْدَ الْبُلُوْغِ یعنی سن بلوغت کو پہنچنے کے بعد یتیمی باقی نہیں رہتی۔ چونکہ بعض لوگوں میں ضعف ہوتا ہے، دماغی صلاحیت زیادہ نہیں ہوتی اس لیے یتیم کی عمر میں رعایت برتنے کا حکم دیا گیا ہے۔

ابوذر غفاریؓ کو نصیحت

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے فرمایا[1] اِنِّیْ اَرٰىكَ ضَعِيْفًا وَّاِنِّیْ اُحِبُّ لَكَ مَا اُحِبُّ لِنَفْسِیْ میں تجھے کمزور آدمی خیال کرتا ہوں، اور میں تمہارے لیے وہی چیز پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔ فرمایا لَا تَأَمَّرَنَّ عَلَى اثْنَيْنِ وَلَا تَوَلَّيَنَّ مَالَ الْيَتِيْمِ کبھی دو آدمیوں پر بھی حاکم نہ بننا اور کسی یتیم کی سرپرستی قبول نہ کرنا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ جسمانی لحاظ سے کمزور نہ تھے بلکہ آپ کی کمزوری یہ تھی آپ کی طبیعت میں جوش غضب اور غصہ رہتا تھا۔ اور آپ پر جذب والی کیفیت طاری رہتی تھی

[1] مسلم صفحہ ۱۲۱ ج ۲ (فیاض)

حضور علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ حاکمیت کے لیے طبیعت میں ٹھہراؤ اور سوچ بچار کی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ آپ کی طبیعت میں جوش و غضب تھا، تو ایسی حالت میں صحیح فیصلے کی توقع نہیں کی جا سکتی اس لیے فرمایا کہ تم حاکمیت کو قبول نہ کرنا۔ اسی طرح یتیم کی پرورش اور اس کے مال کی حفاظت کے لیے بھی ٹھنڈے دل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ گرم طبیعت آدمی یتیم کی کوئی جائز ضرورت بھی پوری کرنے سے انکار کر دے یا طبیعت میں لاابالی کی وجہ سے اس کا مال ہی ضائع کر دے، اس لیے آپ نے ان دونوں چیزوں سے منع فرما دیا۔ البتہ جہاں تک حضرت غفاریؓ کے زہد و تقویٰ کا تعلق ہے، حضور علیہ السلام نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے۔ فرمایا گرد آلود زمین اور نیلے آسمان کے درمیان ابوذر غفاریؓ سے سچا کوئی آدمی نہیں، اور یہ زہد و تقویٰ اور پرہیزگاری میں عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام سے مشابہت رکھتے ہیں۔

بہر حال فرمایا کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، مگر اس طریقے کے ساتھ جو بہتر ہے۔ معاشرے کی درستگی کا انحصار اس بات پر ہے کہ کمزور طبقات کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے اور اس معاملہ میں یتامیٰ سرفہرست ہیں

۱۲: ایفائے عہد

اللہ نے بارہواں اصول یہ بیان فرمایا ہے وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ اور عہد کو پورا کرو کیونکہ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا بیشک عہد کے متعلق پوچھا جائے گا کہ تم نے پورا کیا یا نہیں۔ قرآن پاک میں ایفائے عہد کی جگہ جگہ تاکید کی گئی ہے۔ مثلاً سورۃ مائدہ کی پہلی ہی آیت میں فرمایا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ اپنے عہدوں کو پورا کرو۔ سورۃ الانعام میں ہے وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا اللہ کے ساتھ کیے گئے عہد کو پورا کرو۔ اور یہاں منشور اسلامی میں اس کا بارہواں

ضمیر ہے۔ عہد عام بھی ہوتا ہے اور خاص بھی۔ مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ ایک مومن آدمی جب اپنی زبان سے کلمۂ شہادت ادا کرتا ہے اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ تو وہ گویا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول سے عہد کرتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی تعمیل کرے گا اور ان کی ہدایت کی پیروی کرے گا۔ اللہ نے سورۃ الانعام اور دوسری سورتوں میں بھی فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت، رسالت اور قیامت سے متعلق عہد پیمان کی باز پرس ہو گی۔

انسان اللہ کے ساتھ بصورت نذر بھی عہد کرتا ہے کہ فلاں کام کروں گا۔ اب یہ بھی اس کے ذمہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس عہد کو پورا کرے۔ روزمرہ زندگی میں انفرادی اور اجتماعی بے شمار قسم کے عہد پیمان ایک دوسرے کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔ خرید و فروخت، لین دین، قرضہ، امانت، نکاح طلاق سب عہد ہیں جن کا ایفا ضروری ہے۔ اسی طرح حکومتی سطح پر بھی ملکی جماعتوں یا غیر ملکی حکومتوں کے ساتھ عہد کیے جاتے ہیں۔ ان سب کا پورا کرنا لازم ہے۔ بشرطیکہ جائز ہوں اور ان میں حلال کو حرام یا حرام کو حلال نہ بنایا گیا ہو۔ جو شخص، جماعت، یا حکومت عہد کی خلاف ورزی کرے گی، وہ غدار سمجھی جائے گی، اور رسول اللہ کا فرمان یہ ہے لَا تَغْدِرُوْا غداری مت کرو کہ یہ بہت بڑا جرم ہے۔ البتہ سورۃ انفال میں اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ کوئی عہد و پیمان کرنے کے بعد اگر تم سمجھتے ہو کہ اسے نبھا نہیں سکتے "فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ" اگر دوسری قوم کی طرف سے بدعہدی کا خطرہ ہو تو آپ ان کے عہد کو ان کی طرف برابر سرابر پھینک دیں یعنی اس معاہدے کے خاتمے کا اعلان کر دیں اور اس کے بعد جو کارروائی مناسب سمجھیں کریں۔ بہر حال عہد کی پابندی ضروری ہے۔ عہد شکنی نفاق کی علامت

ہے ۔حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ عملی منافق کی ایک نشانی یہ ہے اِذَا عَاهَدَ غَدَرَ جب وہ عہد کرتا ہے تو غداری کرتا ہے ۔ اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرتا ہے ۔ اور اگر اس سے جھگڑا ہو جائے تو گالی گلوچ پر اتر آتا ہے ۔

(۱۲) ماپ تول میں دیانت

اسلامی معاشرے کا تیرہواں اصول اللہ نے یہ بیان فرمایا ہے وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ اور پورا کرو ماپ کو جب تم کوئی چیز ماپتے ہو ، اس میں کمی بیشی نہ کرو ، اور جب کسی چیز کا لین دین بذریعہ وزن ہو ۔ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ تو سیدھے ترازو کے ساتھ پورا پورا وزن کر کے دو ۔ اس میں ڈنڈی مارنے کی قطعی اجازت نہیں ۔ ایسا کرنا خیانت ہے جو کہ حرام ہے ۔ قرآن پاک میں موجود ہے کہ بعض قومیں ماپ تول میں کمی کی وجہ سے ہلاک ہوئیں جن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے ایکہ اور مدین والے لوگ سر فہرست ہیں ۔ یہ لوگ بین الاقوامی شاہراہ پر آباد تھے ۔ تاجر پیشہ تھے ، مگر ماپ تول میں خیانت کرتے تھے مدینہ کے اطراف میں یہودی بھی تاجر پیشہ تھے اور یہ خرابی ان میں بھی پائی جاتی تھی ۔ اللہ نے سورۃ المطففین میں سخت وعید فرمائی وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ہلاکت ، تباہی اور بربادی ہے ماپ تول میں کمی بیشی کرنے والوں کے لیے ۔ جب اپنا حق لینا ہو تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب لوگوں کا حق ادا کرنا ہو تو اس میں ڈنڈی مار جاتے ہیں ۔ یہ بڑی ہی قبیح حرکت ہے ۔

ترمذی شریف کی روایت[۲] میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضور علیہ السلام بازار میں تشریف لے گئے اور تاجروں سے یوں خطاب فرمایا يَا مَعْشَرَ التُّجَّارِ قَدْ وُلِّيتُمْ اَمْرَيْنِ هَلَكَتْ فِيهِ الْاُمَمُ السَّابِقَةُ قَبْلَكُمْ اے تاجروں کے گروہ! تمہیں دو

[۱] الترغیب والترھیب ج۲ص۳ [۲] ترمذی ص۱۹۶ (فیاض)

چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن کی وجہ کئی سابقہ اقوام ہلاک ہوئیں۔ فرمایا یہ دو چیزیں اَلْمِکْیَالُ وَالْمِیْزَانُ ماپ اور تول ہیں۔ سابقہ قومیں ان دو چیزوں میں کمی بیشی کی وجہ سے عذاب کی مستحق ٹھہریں۔ لہٰذا تمہیں آگاہ کرنا مطلوب ہے کہ تم ان کے نقشِ قدم پر نہ چلنا اور کسی کا حق ضائع نہ کرنا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے واقعہ میں موجود ہے کہ جب آپ لوگوں کو اس قبیح فعل سے منع کرتے تو وہ کہتے، اے شعیبؑ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں یا اپنے مالوں میں اپنی مرضی کا تصرف کرنا ترک کر دیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کا غضب نازل ہوا اور ساری قوم ہلاک ہو گئی۔

ماپ تول میں کمی بیشی عام طور پر تاجر لوگوں کا کام ہے یہ دھوکہ دینے کے مترادف ہے جو کہ قطعی حرام فعل ہے۔ جھوٹے دعوے اور جھوٹی قسمیں اٹھانے سے برکت اٹھ جاتی ہے اور مال کی تباہی قریب آجاتی ہے۔ فرمایا جھوٹی قسم مال کو تو چلا دیگی مگر برکت کو بالکل مٹا دیگی۔ ایسا سرمایہ غلط کاروبار میں ہو گا اور "مال حرام بود بجائے حرام رفت" والا مقولہ صادق آئے گا۔ ہیرا پھیری اور دھوکے فریب سے کمایا ہوا پیسہ باطل رسوم اور لہو و لعب میں ہی ضائع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا لین دین اور تجارت میں دیانت کو برقرار رکھنا چاہیئے کہ اسی میں انسانی حقوق کا تحفظ اور برکت ہے۔

جب کوئی شخص حضور علیہ السلام کی موجودگی میں کوئی مال ماپتا یا تولتا تو آپ فرماتے زِنْ وَاَرْجِحْ یعنی تولو اور زیادہ ہی دو، کم نہ دو۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا ہے کہ ماپتے وقت پورا پورا ماپو اور وزن کرتے وقت سیدھے ترازو کے ساتھ کرو ذٰلِکَ خَیْرٌ یہی بہتر ہے وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا اور انجام کے اعتبار سے بھی اچھا ہے۔ اس طرح لوگوں کے حقوق

ادا ہوتے رہیں گے کہ ان حقوق کی ادائیگی کے بعد بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (ہود) جو کچھ بچ جائے وہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر تم مومن ہو۔ ایماندار تاجر کے متعلق حضور کا فرمان ہے اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ[1] ہے اور امانت دار تاجر کا حشر نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ تاجروں کا فرض ہے کہ وہ کاروبار میں دیانت و امانت کی پاسداری کریں کسی کو دھوکے سے ناقص مال فروخت کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ اگر کوئی نقص ان کے نوٹس میں آگیا ہے تو گاہک کو واضح طور پر بتلا دیں کہ بھائی اس مال میں یہ خامی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ناپ تول میں پورا پورا دینا انجام کے اعتبار سے بہتر ہے۔

---

[1] سنن دارمی ج۲ ص۱۶۳ و ترمذی ص۱۹۵ (فیاض)

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾ اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ ع

ترجمہ:- اور نہ پیچھے پڑو اس چیز کے جس کا تمہیں علم نہیں ہے بیشک کان، آنکھیں اور دل، ان سب سے سوال کیا جائے گا (۳۶) اور نہ چلو زمین میں اتراتے ہوئے۔ بیشک تم نہیں پھاڑ سکتے زمین کو اور نہیں پہنچ سکتے پہاڑوں کی بلندی تک (۳۷) ان ساری باتوں کی برائی تیرے رب کے نزدیک بہت ناپسندیدہ ہے (۳۸) یہ باتیں اُس میں ہیں جو وحی کی ہے تیری طرف تیرے پروردگار نے حکمت سے۔ اور نہ ٹھہرائیں اللہ

کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود ۔ پھر ڈال دیے جاؤ گے تم
جہنم میں ملامت کیے ہوئے اور دھکیلے ہوئے (۳۹) کیا
منتخب کیا ہے تم کو تمہارے پروردگار نے بیٹوں کے ساتھ
اور بنائی ہیں اُس نے فرشتوں سے بیٹیاں ۔ بیشک تم البتہ
کہتے ہو ایک بہت بڑی بات (۴۰)

اسلامی فلاحی معاشرے کے قیام کے سلسلے میں اب تک تیرہ اصول بیان کیے جا چکے ہیں۔ اب چودھواں اصول یہ ہے وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑو۔ مطلب یہ ہے کہ بلا تحقیق کسی چیز کو نہ دل میں جگہ دو، نہ زبان سے نکالو اور نہ اس پر عمل کرو۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے[1] كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سُنی سنائی بات کو بلا تحقیق آگے چلا دے۔ مثلاً یہ ہے کہ کوئی شخص بغیر تحقیق کیے گواہی دے دے، کسی پر تہمت لگا دے، بغیر تحقیق کسی سے نفرت و عداوت رکھے یا ایذا پہنچائے۔ رسومات باطلہ کی اندھی تقلید بھی اسی فہرست میں آتی ہے کیونکہ یہ بھی قوم، برادری یا آباؤ اجداد سے منسوب بلا تحقیق کی جاتی ہے۔ اَن دیکھی اور اَن سُنی باتوں کو اس طرح بیان کرنا گویا کہ وہ چشم دید ہیں، خلافِ حق باتوں کی حمایت اور جھوٹا خواب بیان کرنا سب ایسی باتیں ہیں جو بلا تحقیق عمل درآمد کی مد میں آتی ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ ہر بات کی اندھا دھند پیروی کرنے کی بجائے اس کے متعلق پورا پورا علم حاصل کرے اور پھر اس کے متعلق کوئی فیصلہ کرے محض اٹکل پچو اور غیر یقینی باتوں پر حکم دینا یا اس پر عمل کرنا ہرگز روا نہیں۔ یہ تو جھوٹا ہونے کی علامت ہے اور ایسا شخص اللہ کے ہاں ماخوذ ہوگا۔

فرمایا اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ بیشک کان، آنکھ اور دل كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ان سب سے سوال کیا جائے گا۔ انسان سے پوچھ گچھ ہوگی کہ

[1] مسلم ص۸ ج۱ (فیاض)

اس نے اللہ کی ان نعمتوں کو غلط طور پر کیوں استعمال کیا وہم و گمان پر بیہودہ غلط باتیں کانوں میں کیوں ڈالیں؟ آنکھ جیسی عظیم نعمت سے غلط چیزیں کو کیوں دیکھا اور دل تو بہت بڑی دولت ہے جو اللہ نے انسان کے سینے میں رکھی ہے۔ اعتقاد، اخلاق، عزم اور قوت عملیہ کا مرکز دل ہی ہے۔ اگر یہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ اور یہ درست ہو تو سارا جسم درست رہتا ہے، اس کے متعلق بھی باز پرس ہوگی کہ اتنی بڑی نعمت کو غلط سمجھ اور غلط کاموں پر کیوں لگایا۔ سورۂ ہمزہ میں عذاب کا ذکر کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْـِٕدَةِ ؕ جہنم کی آگ کا اثر سب سے پہلے دل پر ہوگا کیونکہ مرکز اخلاق اور ہر فعل کا منبع دل ہی ہے، اس لیے سب سے پہلے یہی ماخوذ ہوگا۔

کان سنتے ہیں، آنکھ دیکھتی ہے جب کہ دل غور و فکر کرتا ہے محبت و نفرت دل میں ہی پیدا ہوتی ہے۔ عزم و ارادہ اسی سے وابستہ ہے توحید اور ایمان کا مرکز بھی یہی ہے، کفر، نفاق، بد اخلاقی، حسد اور کینہ بھی یہیں جنم لیتے ہیں اور بغض و عداوت کا منبع بھی دل ہی ہے۔ اگر اعتقاد کے معاملے میں دل کو غلط طور پر استعمال کرے گا تو اللہ کا ارشاد ہے "اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ" ایسے لوگ جانوروں کی مانند ہیں یا ان سے بھی بدتر۔ اسی دل کو صحیح طور پر استعمال نہ کرنے والے کافروں کے متعلق فرمایا اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (الانفال) یہ اندھی اور بہری بدترین مخلوق ہے جو عقل کو صحیح طور پر استعمال نہیں کرتی، یہ ساری باتیں اللہ نے چودھویں اصول کے تحت بیان فرمائی ہیں۔

اللہ نے پندرہواں اصول یہ بیان فرمایا وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اور زمین میں اتراتے ہوئے مت چلو، غرور اور اکڑ نہ دکھاؤ۔

کیونکہ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ تم غرور و تکبر کرکے زمین کو نہیں پھاڑ سکتے۔ اور نخوت کی بنا پر کتنا بھی سر اونچا کرو وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا تم پہاڑوں کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتے۔ تمہارا قد پانچ چھ فٹ سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ خدا کی زمین پر اکڑ کر اور گردن اونچی کرکے چلو۔ عاجزی اختیار کرنے والا شخص اللہ تعالیٰ اور لوگوں کے نزدیک بھی قابل عزت ہوتا ہے۔ مگر جو شخص غرور و تکبر کو اپناتا ہے۔ اپنے آپ میں بڑا بننے کی کوشش کرتا ہے، وہ اللہ اور اس کی مخلوق کے نزدیک ذلیل و خوار ہی ہوتا ہے۔ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ جو اللہ کی خاطر عاجزی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اُس کو بلند کرے گا۔ وَمَنْ تَكَبَّرَ كَسَرَهُ اللّٰهُ اور جو تکبر کرے گا، اللہ تعالیٰ اُس کی گردن توڑ دیگا۔ اور کسی نہ کسی مرحلے میں وہ ذلیل ہو کر رہے گا۔ اس کو دنیا میں بھی سزا ملے گی اور آخرت کا عذاب تو دائمی ہے۔

قارون کے تکبر کا ذکر خود قرآن میں موجود ہے۔ اللہ نے اُس کو خزانوں سمیت زمین میں دھنسا دیا۔ بخاری شریف میں حضور علیہ السلام کا یہ فرمان بھی ہے کہ ایک آدمی بڑی خوشنما قسم کی دو بڑی چادریں پہنے جا رہا تھا۔ غالباً ایک تہبند کے طور پر استعمال کی ہوگی اور دوسری اوپر اوڑھی ہوگی۔ تو اللہ نے اُس کے تکبر کی وجہ سے اُسے زمین میں دھنسا دیا وَهُوَ يَتَجَلْجَلُ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ اور وہ قیامت تک دھنستا ہی چلا جائے گا۔ جب قیامت برپا ہوگی تو اس کا قدم کہیں جا کر ٹکے گا۔ اللہ نے عاد، ثمود اور قوم فرعون جیسی متکبر قوموں کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ اُن کے تکبر کی وجہ سے اللہ نے انہیں دنیا میں ہی سخت سزائیں دیں۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے زمین پر اکڑ کر چلنے سے منع فرمایا ہے۔ اس کے برخلاف اللہ کے نیک بندوں کی یہ صفت بیان کی ہے۔ وَعِبَادُ

الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا
(الفرقان) اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی اور وقار کے ساتھ
چلتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے کہ جس انسان میں ذرہ برابر بھی تکبر
ہوگا، وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ تکبر ہمیشہ حق کے مقابلہ میں ہوتا ہے
حضور نے فرمایا اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ تکبر یہ ہے
کہ حق بات کو ٹھکرا دیا جائے اور دوسروں کو حقیر کیا جائے۔ حق بات کو بلا سوچے
سمجھے ٹھکرا دینا اور چھوٹے آدمیوں کی بات کو کوئی حیثیت نہ دینا تکبر کی علامت
ہے۔ حق یہ ہے کہ حق بات خواہ کسی اعلیٰ کی طرف سے ہو یا ادنیٰ کی طرف سے
اس کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ جو شخص تکبر کی وجہ سے حق بات کو ٹھکراتا ہے اور
کسی کو حقیر سمجھتا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔

زمین پر اکڑ کر چلنا منہیات میں داخل ہے۔ اس سے پہلے بھی بہت
سی ممنوع باتوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ جیسے قتل اولاد، قتل ناحق، اسراف، بے
اتفاقی۔ زنا، بدعہدی، ناپ تول میں خرابی، یتیم کا مال کھانا، بلا تحقیق کسی چیز
پر اعتقاد رکھنا، زبان سے کہنا یا اس پر عمل کرنا۔ ان سب کے متعلق
اللہ تعالیٰ نے فرمایا كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ
مَكْرُوْهًا کہ ان کی برائی تیرے پروردگار کے ہاں سخت ناپسندیدہ ہے
نیز رب ان سے بیزار ہے۔ لہذا ان سے بچنے کی کوشش کرو۔

فرمایا ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ
یہ ساری باتیں ان میں سے ہیں جو آپ کے پروردگار نے آپ کی طرف
وحی کے ذریعے نازل فرمائی ہیں، اور یہی ہیں حکمت کی باتیں۔ ان باتوں
میں علم، دانائی، سمجھ اور فہم پایا جاتا ہے۔ اللہ کے نزدیک حکمت بہت
بڑی چیز ہے۔ سورۃ البقرہ میں فرمایا يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ
يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا

گئی۔" اللہ تعالیٰ جس کو چاہے حکمت عطا کرے، اور جسے حکمت عطا کی جاتی ہے۔ اُسے بہت بڑی بھلائی حاصل ہو جاتی ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سنت ساری کی ساری حکمت ہے۔ قرآن میں اس کی مختلف مقامات پر تشریح کی گئی ہے۔ تو فرمایا کہ یہ جتنی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ اُن حکمت و دانش کی باتوں میں سے ہیں جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہیں۔

اب آخر میں اللہ تعالیٰ نے پھر وہی بات کی ہے جو ان پندرہ اصولوں کی ابتداء میں کہی گئی تھی یعنی شرک کی تردید۔ ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ اور نہ بناؤ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود۔ اُس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ کسی کو نافع اور ضار نہ سمجھو۔ مشکل کشا اور حاجت روا تسلیم نہ کرو۔ اگر ایسا کرو گے فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ تو جہنم میں ڈال دیے جاؤ گے مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ایسی حالت میں کہ ملامت کیے ہوئے اور دھکیلے ہوئے ہو گے۔ شرک میں مبتلا ہونا سخت ترین جرم ہے۔ اللہ نے اپنے پاک نبیوں کے متعلق بھی فرمایا لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (الزمر) اگر شرک کرو گے تو تمہارے اعمال بھی ضائع ہو جائیں گے اور تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاؤ گے۔ ایمان اور اخلاص بڑی حقیقت ہے جس میں کسی صورت میں بھی خرابی نہیں آنی چاہیئے۔ اگر کفر، شرک یا بدعقیدگی پیدا ہو گئی تو سارے نیک اعمال بھی ضائع ہو جائیں گے۔ اللہ نے شرک کی تاکیداً دوبارہ تردید فرمائی ہے کہ خدا کے ساتھ کسی کو الٰہ نہ بناؤ ورنہ تمہارا ٹھکانا جہنم ہو گا۔

آگے ایک بات کی طرف بھی اشارہ فرمایا اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ بھلا کیا منتخب فرمایا ہے تمہارے پروردگار نے تمہیں بیٹوں کے ساتھ یعنی تم اپنے لیے بیٹے پسند کرتے ہو وَاتَّخَذَ مِنَ

الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا اور اللہ نے فرشتوں میں سے اپنی بیٹیاں بنالی ہیں۔ یہ دراصل مشرکین کے باطل عقیدے کا رد ہے جو کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ فرمایا کیسی بے عقلی کی بات ہے کہ لڑکیوں کو اپنے لیے تو پسند نہیں کرتے بلکہ اُسے پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کردیتے ہیں مگر ان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے سے ذرا شرم نہیں کرتے۔ یہ تو احمقانہ تجویز ہے۔ فرشتے تو تذکیر و تانیث سے پاک اللہ کی مخلوق ہیں۔ بھلا تم خدا کی بیٹیاں کیسے کہتے ہو؟ فرمایا اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا بیشک تم بہت بڑی ناشائستہ بات کہتے ہو۔ خدا تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کرنا اور خاص طور پر بیٹیوں کی نسبت اس کی طرف کرنا جنہیں تم خود حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہو، اللہ کے ساتھ بڑی بھاری گستاخی کی بات ہے۔ دوسری جگہ اللہ کا فرمان ہے کہ خدا تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کرنا اس کی ناراضگی کا سبب ہے۔ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا (مریم) قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں "اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا" (مریم) کہ انہوں نے خدا کے لیے بیٹا تجویز کیا ہے۔ یہ تو بڑی گستاخی کی بات ہے۔ اللہ نے مشرکین کے باطل عقیدہ بنات کا رد بھی فرمادیا ہے اور توحید پر کاربند رہنے کی تلقین کی ہے

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ۭ وَمَا
يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿٤١﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ
كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ
سَبِيْلًا ﴿٤٢﴾ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ
عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿٤٣﴾ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ
وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ
بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ اِنَّهٗ
كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿٤٤﴾ وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ
جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿٤٥﴾ وَّجَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً
اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ
فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿٤٦﴾
نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ
اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ
تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿٤٧﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ
الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿٤٨﴾

ترجمہ:- اور البتہ تحقیق ہم نے (مختلف طریقوں سے) پھیر کر بیان کیا ہے اس قرآن میں تاکہ لوگ نصیحت پکڑ لیں۔ اور نہیں زیادہ کرتا ان کے لیے مگر نفرت کرنا (۴۱) آپ کہہ دیجئے، اگر ہوتے اس کے ساتھ اور معبود جیساکہ یہ (مشرک لوگ) کہتے ہیں، تو اس وقت وہ ضرور تلاش کرتے عرش والے کی طرف راستہ (۴۲) پاک ہے اُس کی ذات اور بلند و برتر ہے اُن باتوں سے جو یہ کہتے ہیں، بہت بلند (۴۳) تسبیح بیان کرتے ہیں اُس (خدا) کے لیے ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ اُن میں ہے۔ اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی تسبیح اس کی تعریف کے ساتھ بیان نہ کرتی ہو، مگر تم اُن کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے۔ بیشک وہ بڑا بردبار اور بخشنے والا ہے (۴۴) اور جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم کر دیتے ہیں آپ کے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے، ایک پردہ ڈھانپنے والا (۴۵) اور کر دیا ہے ہم نے اُن کے دلوں پر پردہ اس بات سے کہ وہ اس کو سمجھ سکیں۔ اور ان کے کانوں میں بوجھ ہے۔ اور جب آپ ذکر کرتے ہیں اپنے پروردگار کا قرآن میں اکیلا، تو وہ پھر جاتے ہیں اپنی پشتوں پر نفرت کرتے ہوئے (۴۶) ہم خوب جانتے ہیں اس بات کو جس کے واسطے وہ سنتے ہیں جب کہ وہ کان لگاتے ہیں آپ کی طرف اور جب کہ وہ سرگوشیاں کرتے ہیں، ... ظالم

کرنے والوں نے کہ دیا کہ تم نہیں پیروی کرتے مگر سحر زدہ آدمی کی (۴۷) دیکھو! کیسے بیان کرتے ہیں یہ آپ کے لیے مثالیں، پس یہ گمراہ ہوئے، اور نہیں طاقت رکھتے یہ راستہ پانے کی (۴۸)

قرآن المجید نصیحت

اسلامی معاشرے کی فلاح کے لیے پندرہ زریں اصولوں کے اوّل و آخر میں اللہ تعالیٰ نے مسئلہ توحید بیان فرمایا۔ اب ان آیات میں بھی قرآن پاک کی صداقت اور مسئلہ توحید ہی کا ذکر، اور شرک کا رد ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ ہم نے اس قرآن پاک میں مختلف طریقوں، عنوانوں اور پیرایوں میں پھیر پھیر کر بیان کیا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، ایمانیات، رسالت، معاد اور موجودہ اور دوسری زندگی سے تعلق رکھنے والی ساری باتیں آسانی سے سمجھ میں آسکیں اور دوسرا مقصد یہ ہے لِيَذَّكَّرُوا تاکہ لوگ ان مثالوں سے نصیحت پکڑیں اور کفر و شرک کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کر لیں۔ مگر حقیقت یہ ہے وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا کہ اس تمام تر تشریح کے باوجود متعصب، ضدی اور عنادی لوگوں کی نفرت میں اضافہ ہی ہوتا ہے اور قرآن پاک سے کچھ نصیحت حاصل نہیں کر پاتے۔

توحید کی دلیل

ارشاد ہوتا ہے قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے معبود بھی ہوتے كَمَا يَقُوْلُوْنَ جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مشرک لوگ ایک خدا پر یقین نہیں رکھتے تھے اور اس کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کرتے تھے، حالانکہ گذشتہ پندرہ اصولوں کے اول و آخر میں یہی بات سمجھائی گئی ہے وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود نہ ٹھہراؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو ملامت شدہ اور دھکیلے ہوئے بن جاؤ گے اور پھر جہنم میں پھینک دیئے جاؤ گے، مگر یہ لوگ اپنی بد عقیدگی سے باز آنے والے نہیں۔

الٰہ کا معنی معبودِ برحق ہے جس میں صفاتِ کمال پائی جائیں اور جو حاضر ناظر، مختارِ کل، علیم کل، قادرِ مطلق، خالق، مربی، نافع وضار، مدبّر اور تمام علوی اور سفلی کائنات کا متصرف ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ صفات خدا تعالیٰ کے سوا کسی دوسری ذات میں نہیں پائی جاتیں۔ انبیاء، اولیاء، شہداء، ملائکہ اور جنات میں سے کوئی بھی ان صفات کا حامل نہیں۔ اگر یہ صفاتِ کمال خدا کے سوا کسی دوسری ذات میں پائی جائیں گی تو انسان مشرک بن جائے گا۔

فرمایا، اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور الٰہ بھی ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں۔ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰی ذِی الْعَرْشِ سَبِیْلًا تو یقیناً وہ عرش والے کی طرف راستہ تلاش کرتے کیونکہ ہر الٰہ کی یہی خواہش ہوتی کہ وہ ہی غالب آجائے اور دوسرے سب مغلوب ہو جائیں۔ سورۃ انبیاء میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے "لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا" اگر کائنات ارض و سما میں اللہ کے سوا دوسرے معبود ہوتے تو کائنات میں فتنہ برپا ہو جاتا اور سکون باقی نہ رہتا۔ شیخ سعدی نے بھی تو کہا ہے کہ ایک گودڑی میں دس درویش تو آرام کر سکتے ہیں مگر ایک سلطنت میں دو بادشاہ نہیں سما سکتے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کی کوشش کرے گا اور اس طرح ملک میں فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو گا۔ جب ایک چھوٹی سی سلطنت کا یہ حال ہے تو پوری کائنات میں ایک سے زیادہ الٰہ کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس طرح تو نظام ہی قائم نہیں رہ سکتا۔

خدا تعالیٰ کی تسبیح و تحمید

فرمایا سُبْحٰنَهٗ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا اور بلند ہے ان باتوں سے جو یہ مشرک کہتے ہیں۔ بے انتہا بلند۔ مطلب یہی ہے کہ مشرکوں کا یہ دعویٰ بالکل باطل ہے کہ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرے معبود بھی ہیں۔ وہ تو ایک الٰہ پر اکتفا ہی نہیں

کرتے تھے بلکہ کہتے تھے "اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ" (ص) کیا اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود بنا لیا ہے، یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ جو کام اتنے خدامل کر کرتے ہوں، وہ اکیلا ہی انجام دے دے۔

فرمایا، وہ شرک سے پاک وحدہٗ لاشریک ہے، وہ اس قدر عظمتوں کا مالک ہے تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ کہ ساتوں آسمان، زمین اور ان کے درمیان موجود ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے کہ یہ تسبیح حالی بھی ہو سکتی ہے اور قالی بھی۔ حالی تسبیح غیر اختیاری ہوتی ہے اور اس سے مراد یہ ہے شجر و حجر، ذرات، پہاڑ، دریا، چاند، سورج، ستارے غرضیکہ ہر چیز کا وجود اس کے اوصاف اور اس کی حالت بتلاتی ہے کہ اس کا پیدا کرنے والا کوئی ہے وَفِيْ كُلِّ شَیْءٍ لَّهٗ اٰيَةٌ تَدُلُّ عَلٰى اَنَّهٗ وَاحِدٌ ہر چیز میں ایسی نشانی موجود ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل ہے۔ اس جہان کو عالم اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے پیدا کرنے والے کی علامت ہے جسے دیکھ کر انسان کا ذہن فوراً اس کے خالق کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ عالم علم کے مادے سے بھی ہو سکتا ہے اور اس سے بھی یہی مراد ہے کہ عالم کو دیکھ کر اس کے پیدا کرنے والے کے متعلق علم حاصل ہوتا ہے۔ بہر حال تسبیح حالی تو ہر چیز میں پائی جاتی ہے، حتیٰ کہ مشرکوں، کافروں اور دہریوں کا وجود بھی حالی تسبیح کر رہا ہے۔ سورۃ النحل میں بھی گذر چکا ہے کہ کیا ان لوگوں نے خدا کی مخلوق میں ایسی چیزیں نہیں دیکھیں "يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ" جن کے سائے دائیں بائیں لوٹتے رہتے ہیں اور خدا کے سامنے "سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ" عاجز ہو کر سجدے میں پڑے رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے دل و دماغ اور زبان سے اللہ کی توحید کا انکار

بھی یوں ذکر تا ہو مگر اس کا وجود اور اعضاء خدا تعالیٰ کی تسبیح بیان کر رہے ہیں
مگر اس تسبیح کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ گویا کہ ہر چیز کا حال
ہی خدا تعالیٰ کی قدرت تامہ حکمت بالغہ اور اس کی عظمت و وحدانیت
کی دلیل ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ تسبیح قالی سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز
اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید اپنی زبان سے بھی کرتی ہے۔ چنانچہ یہاں پر بھی یہی بات
بیان کی گئی ہے وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ ہر چیز اللہ تعالیٰ
کی تسبیح و تحمید بیان کرتی ہے وَلَٰكِنْ لَّا تَفْقَهُونَ
تَسْبِيحَهُمْ مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھنے سے قاصر ہو۔ عام طور پر شجر و حجر
اور دیگر بے جان چیزوں کی تسبیح انسان نہیں سنتے مگر بعض اوقات معجزہ
یا کرامت کے طور پر ایسا ہو سکتا ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت
میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے ہاتھوں میں سنگریزے تھے جن سے اس
طرح تسبیح کی آواز آ رہی تھی جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے بخاری
شریف کی روایت میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم دسترخوان پر کھانا تناول فرما رہے تھے اور کھانا اللہ کی تسبیح پڑھ
رہا تھا اور سبحان اللہ سبحان اللہ کہتا جاتا تھا۔ اسی طرح شیخ ابن عربیؒ فرماتے
ہیں کہ میں نے اپنے کانوں سے درختوں کی تسبیح سنی ہے ایک حدیث
میں یہ بھی آتا ہے کہ مینڈک کو نہ مارو کیونکہ ان کی ٹرٹراہٹ دراصل اللہ تعالیٰ
کی تسبیح ہوتی ہے۔

مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ ایک دیہاتی حضور علیہ السلام کی خدمت
میں حاضر ہوا جس نے بڑا فیشنی لباس پہن رکھا تھا۔ اس نے عام مجلس سے
یوں خطاب کیا کہ تمہارے یہ صاحب (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) چرواہوں کو تو بڑا
بلند کر رہے ہیں مگر باعزت لوگوں کو ذلیل کر رہے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے

اس کے لباس کا کپڑا ہاتھ میں لے کر کہا کرتا تھا ایسا لباس عقلمندوں کا لباس معلوم نہیں ہوتا۔ پھر آپ نے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ جب نوح علیہ السلام کا آخری وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلا کر کہا میں تمہیں دو باتوں کا حکم دینا چاہتا ہوں اور دو باتوں سے منع کرتا ہوں منہیات یہ ہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور تکبر نہ کرنا۔ اور اوامر یہ ہیں کہ ہر وقت لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھتے رہا کرو کیونکہ یہ ایسی تسبیح ہے کہ اگر ایک پلڑے میں یہ ہو اور دوسرے پلڑے میں پوری ارض و سما ہو تو پھر بھی یہ بھاری ہے اور دوسرا حکم یہ ہے کہ ہر وقت سبحان اللہ وبحمدہ کا ورد رکھا کرو، کیونکہ کائنات کی ہر چیز اسی کلمہ سے خدا تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کرتی ہے اور اسی کی بدولت انہیں روزی ملتی ہے۔

باقی رہ گیا ہر چیز کی تسبیح کے الفاظ کا سمجھنا، تو یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ سورۃ النور میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ زمین و آسمان کا ہر شخص اور پر پھیلائے ہوئے پرندے بھی اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور وہ سب اپنی نماز اور تسبیح کو جانتے ہیں "كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ" اور اس مقام پر بھی فرمایا کہ ارض و سما کی ہر چیز تسبیح بیان کرتی ہے مگر تم اسے سمجھ نہیں سکتے۔

فرمایا اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا دیکھو! وہ اللہ تعالیٰ کس قدر بردبار اور بخشنے والا ہے۔ وہ نافرمانوں کو مہلت دیتا رہتا ہے فوری گرفت نہیں کرتا۔ مگر اس کا قانون یہ ہے کہ وہ کسی مجرم کو سزا دیئے بغیر چھوڑے گا نہیں۔ جب پکڑے گا تو پھر پورا پورا مواخذہ کرے گا۔

قرآن کی برکات سے محرومی

فرمایا وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے درمیان اور آخرت کے

منکرین کے درمیان ذہنا جیسے وزا پردہ ڈال دیتے ہیں۔ یہ ان کی گمراہی اور غفلت کا پردہ ہوتا ہے۔ کوئی بات ان کے ذہن میں نہیں بیٹھتی۔ اُن کی ضد، عناد، ہٹ دھرمی اور تعصب کی وجہ سے پردہ پڑا ہوا ہے اور وہ قرآن کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔ فرمایا وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ اور ہم نے اُن کے دلوں پر پردہ ڈال دیا ہے اس بات سے کہ وہ قرآن کو سمجھ سکیں۔ وہ اس کے مفہوم و مطالب کو سمجھنے سے عاری ہو چکے ہیں۔ وَفِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا اور ان کے کانوں میں بوجھ پڑے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے اُن کے کان بند ہو چکے ہیں اور وہ کچھ سنتے ہی نہیں۔ اور بعض تنافس طور پر فرمایا وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِى الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا جب آپ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا ذکر کرتے ہیں تو یہ لوگ پشت پھیر کر بھاگ جاتے ہیں۔ عتبہ، شیبہ اور ابوجہل، جیسے لوگ قرآن کو سننے کے لیے بھی تیار نہ ہوتے تھے۔ اسی لیے فرمایا کہ ان کے دلوں اور کانوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔

فرمایا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ہم خوب جانتے ہیں اس بات کو جس کے واسطے وہ سنتے ہیں جب کہ وہ کان لگاتے ہیں آپ کی طرف اگر وہ سنتے بھی ہیں تو کس لیے، یہ لوگ محض اعتراض کرنے اور قرآن پاک کی تردید کرنے کے ارادے سے کسی وقت اس کا کچھ حصہ سن لیتے ہیں۔ یہ اس تلاش میں رہتے ہیں کہ ان کے زعم کے مطابق اسلام کی کوئی کمزوری ان کے ہاتھ میں آجائے جسے اچھال کر وہ دین کے خلاف پراپیگنڈا کر سکیں فرمایا وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى جب وہ سرگوشیاں کرتے ہیں، دین حق اور پیغمبر اسلام کے خلاف مخفی مشورے کرتے ہیں تو ہم ان کو جانتے ہیں۔ ان کی کوئی حرکت اور کوئی ارادہ ہمارے علم سے مخفی نہیں۔ ہم ان کی ایک ایک بات کو جانتے ہیں اور اس کا انہیں پورا پورا بدلہ دیں گے

فرمایا ان کی دین دشمنی کی حد یہ ہے اِذْ يَقُولُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا کہ ان ظالموں نے مسلمانوں کو یہ بھی کہہ دیا کہ تم تو ایک سحر زدہ آدمی کی پیروی کر رہے ہو العیاذ باللہ نبی کی شان میں اس قدر گستاخی کی کہ اس پر جادو کا اثر ہے جس کی وجہ سے بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ مرنے کے بعد پھر سب لوگ زندہ کیے جائیں گے ابھی اگلے درس میں آرہا ہے "وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا" کہتے تھے جب ہم مرکر بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے۔ تو کیا پھر دوبارہ پیدا کیے جائیں گے۔ یہ تو عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ منکرین نے اکثر انبیاء کو ساحر کہا، خاص طور پر موسیٰ علیہ السلام کا ذکر تو قرآن میں موجود ہے۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کو بھی کبھی ساحر کہا کبھی دیوانہ کبھی کاہن اور کبھی شاعر۔

حدیث میں حضور علیہ السلام پر سحر کا اثر ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ یہودیوں نے دھاگے میں گیارہ گرہیں لگا کر اسے ایک پرانے کنویں میں دفن کر دیا، جس کی وجہ سے آپ بیمار بھی ہو گئے۔ یہ بات یاد رہے کہ نبی کو جسمانی بیماری تو لاحق ہو سکتی ہے مگر آپ کے دل و دماغ پر جادو کا اثر نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ منصب نبوت کے منافی ہے۔ بہرحال اللہ نے فرشتہ بھیج کر جادو کے اثر کو زائل کرنے کا نسخہ بھی بتا دیا، حضور علیہ السلام نے جادو کا سامان بھی اس جگہ سے نکلوا لیا۔ آپ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کی گیارہ آیات ایک ایک کر کے پڑھتے جاتے تھے اور ایک ایک گرہ کھلتی جاتی تھی اور اس طرح آپ جادو کے اثر سے بالکل پاک ہو گئے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ لفظ مسحور سحر سے نہیں بلکہ سَحَر سے ہے جس کا مطلب ہے پھیپھڑے رکھنے والا انسان ہے۔ مشرک لوگ یہ غلط پراپیگنڈا کرتے تھے کہ مسلمان ایک انسان کی پیروی کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان کے خیال کے

مطابق انسان پیغمبر نہیں ہو سکتا، بہرحال مُسحّر کا معنی کھانے پینے والا انسان ہے عربی کا ایک شاعر بھی اس لفظ کو اس طرح استعمال کرتا ہے۔

أُرَانَا مُوْضِعِيْنَ لِأَمْرِ غَيْبٍ
وَنُسْحَرُ بِالطَّعَامِ وَبِالشَّرَابِ

ہم اپنی سواریاں ایک امر غیب کے لیے دوڑا رہے ہیں اور ہمیں کھانے پینے کی چیزوں کی غذا دی جا رہی ہے گویا ہم پر اکل و شرب کا سحر چلایا رہا ہے لبید یا امیہ ابن ابی الصلت میں سے کسی ایک کا یہ کلام بھی ہے۔

إِنْ تَسْأَلِيْنَا فِيْمَ نَحْنُ فَإِنَّنَا
عَصَافِيْرُ مِنْ هٰذَا الْأَنَامِ الْمُسَحَّرِ

اگر تو ہمارے بارے میں پوچھے کہ ہم کیا ہیں تو ہم اس دنیا کے پرندوں جیسے ہیں جنہیں خوراک دی جاتی ہے۔

بہرحال مسحر سے مراد سحر زدہ بھی ہو سکتا ہے اور کھاتا پیتا انسان بھی۔ مشرکین کسی انسان کو نبی ماننے کے لیے قطعاً تیار نہ تھے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے ہم انسانوں کی طرف انسانوں کو ہی رسول بنا کر بھیجتے ہیں۔ اور اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے ہوتے لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا۔ تو ہم آسمان سے فرشتے کو رسول بنا کر بھیج دیتے اللہ تعالیٰ نے بشریت اور انسانیت کا اعلان خود حضور علیہ السلام کی زبان سے بھی کرا دیا "قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" (الکہف) میں تو تمہارے جیسا ہی انسان ہوں، البتہ اللہ نے مجھے شرف بخشا ہے مجھ پر وحی نازل فرمائی ہے نبی معصوم بنایا ہے۔ میری اتباع کا حکم دیا ہے۔ بلکہ ہر نبی نے اپنی امت کے لوگوں سے یہی کہا "فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ" (الشعراء) لوگو! اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں تمہارے سامنے نمونہ پیش کرتا ہوں بہرحال مشرک لوگ پراپیگنڈا کرتے

تھے کہ مسلمان ایک سحر زدہ اور انسان کا اتباع کرتے ہیں۔
اللہ نے فرمایا اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ دیکھو یہ لوگ کس طرح آپ کے سامنے مثالیں بیان کرتے ہیں۔ حقیقت میں فَضَلُّوا یہ گمراہ ہو چکے ہیں۔ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا اور اب راستہ پانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ کسی متعصب ضدی اور عنادی آدمی کو صراطِ مستقیم نصیب نہیں ہو سکتا۔

وَقَالُوٓا أَءِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَءِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا ﴿۵۰﴾ أَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ ۚ فَسَيَقُولُونَ مَن يُعِيدُنَا ۖ قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هُوَ ۖ قُلْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ قَرِيبًا ﴿۵۱﴾ يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۵۲﴾

ع ۵ ۱۲

ترجمہ:- اور کہا (کفر کرنے والوں نے) جب ہم ہو جائیں گے ہڈیاں اور چورہ چورہ تو کیا ہم لوٹائے جائیں گے نئی پیدائش میں؟ (۴۹) (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے، ہو جاؤ تم پتھر یا لوہا (۵۰) یا کوئی مخلوق جو زیادہ دشوار ہے تمہارے دلوں میں۔ پھر یہ لوگ کہیں گے کہ کون ہمیں دوبارہ لوٹائے گا؟ آپ کہہ دیجئے، وہی ذات جس نے پیدا کیا تمہیں پہلی مرتبہ۔ پھر ہلائیں گے آپ کی طرف اپنے سروں کو، اور کہیں گے کہ وہ کب ہے؟ آپ کہہ دیجئے شاید کہ وہ قریب ہو (۵۱) جس دن کہ وہ بلائے گا تمہیں۔ پس جواب دو گے تم اس کی تعریف کے ساتھ۔ اور تم گمان کرو گے کہ نہیں ٹھہرے تم مگر بہت تھوڑا (۵۲)

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے توحید و رسالت کا مسئلہ بیان فرمایا
مشرکین حضور نبی کریم علیہ السلام پہ اعتراض کرتے تھے کہ یہ تو ہمارے جیسا ہی
انسان ہے، بھلا ہم اس کی اتباع کیوں کریں، کبھی کہتے کہ اس پہ جادو کر دیا
گیا ہے جس کی وجہ سے یہ نعوذ باللہ بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس
قسم کے شکوک و شبہات کا ردّ فرمایا اور مشرکوں کی غلط ذہنیت کو واضح کیا کہ
یہ لوگ محض ضد، عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ایسے اعتراض کرتے ہیں۔
پھر اللہ نے مسئلہ توحید کے ضمن میں فرمایا کہ ارض و سما کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ
کی تسبیح اور تنزیہہ بیان کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی حقانیت اور صداقت
کا ذکر بھی کیا اور توحید و رسالت اور دوسرے دینی حقائق مختلف عنوانات کے
تحت سمجھا دیے۔

مسئلہ توحید کے بعد اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے معاد کا مسئلہ
بیان فرمایا ہے۔ بنیادی عقائد میں توحید، رسالت، قرآن کی حقانیت جیسے اہم
مسائل شامل ہیں اور مکی سورتوں میں عام طور پر انہی مسائل کو مختلف پیرایوں میں بیان
کیا گیا ہے۔ اب بعث بعد الموت کے مسئلہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے نہایت
وضاحت کے ساتھ مدلل طور پر بیان فرمایا ہے۔ پہلے مشرکین کا اعتراض
نقل کیا ہے اور اس کے بعد اس کا شافی جواب ارشاد فرمایا ہے۔ وَقَالُوْا
یہ کفار و مشرکین کہتے ہیں ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا جب ہم مر کر ہڈیاں ہو جائیں
گے وَّرُفَاتًا اور بوسیدہ ہو کر بالکل چورہ چورہ بن جائیں گے ءَاِنَّا
لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا تو کیا ہم نئی پیدائش میں دوبارہ اٹھائے
جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی انسان مٹی میں دفن ہو جاتا ہے تو اس کا
گوشت پوست بہت جلد گل سڑ کر ضائع ہو جاتا ہے اور باقی صرف ہڈیاں
رہ جاتی ہیں جو گوشت کی نسبت زیادہ سخت ہوتی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ہڈیاں
بھی بوسیدہ ہو کر بھربھری ہو جاتی ہیں اور ذرا سا چھونے سے بھی ریزہ ریزہ ہو

جاتی ہیں اور اس طرح انسان کا پورا جسم مٹی میں مل کر نابود ہو جاتا ہے۔ سورۃ النّٰزعٰت میں "ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً" کے الفاظ آتے ہیں۔ جب ہم کھوکھلی ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا پھر زندہ کیے جائیں گے؟ اسی بات کو سورۃ السجدہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے "ءَ اِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَ اِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيْدٍ" کیا جب ہمارے جسم کے ذرات منتشر ہو کر بکھر جائیں گے اور ہم مٹی میں رل مل جائیں گے تو پھر دوبارہ زندہ ہوں گے؟

لوگوں کو اُن کے انجام سے ڈرانا حضور علیہ السلام کے فرضِ منصبی میں داخل ہے چنانچہ جب آپ مشرکین کی توجہ اس طرف دلاتے کہ مرنے کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا، اللہ کی بارگاہ میں تمہاری حاضری ہوگی اور اس دنیا میں کیے گئے ہر نیک و بد عمل کا حساب دینا ہوگا، تو وہ لوگ دوسری زندگی کا انکار کر دیتے اور کہتے کہ آج تک تو ہم نے اپنے آباؤ اجداد میں سے کسی کو دوبارہ زندہ ہوتے اور حساب کتاب دیتے نہیں دیکھا۔ آپ تو (نعوذ باللہ) دیوانوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ بھلا جو جسم گل سڑ کر مٹی کے ساتھ مٹی ہو گیا۔ اس کو دوبارہ زندگی کیسے حاصل ہوگی۔

آگے اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کا مدلل جواب دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے قُلْ اے پیغمبر! آپ ان مشرکوں سے کہہ دیں کہ انسانی جسم کی ہڈیاں گوشت سے سخت مگر کائنات میں پائی جانے والی بعض چیزوں سے نرم بھی ہیں۔ دنیا میں ان ہڈیوں سے بھی سخت چیزیں موجود ہیں۔ فرمایا، ان کے اعتراض کا یہ جواب دیں "كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا" تم پتھر بن جاؤ یا لوہا۔ پتھر بڑی مضبوط چیز ہے جو مٹی میں گلتا سڑتا نہیں اور لوہا اس سے بھی سخت ہے جو پتھر کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ لوہے کے نام پر قرآن پاک میں سورۃ الحدید بھی موجود ہے اللہ نے بطور احسان فرمایا ہے "وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ" ہم نے نہایت سخت لوہا پیدا کیا جس میں تمہارے لیے بہت سے فائدے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو آج دنیا میں ایک تہائی تمدن کا انحصار لوہے پر ہے۔ ضروریاتِ زندگی میں لوہے کو بنیادی

حیثیت حاصل ہے کوئی کل پرزہ اور مشین لوہے کے بغیر نہیں بن سکتی اور یہی مشینیں ضروریات کی لاکھوں چیزیں پیدا کر رہی ہیں۔ لوہا معدنیات کی صورت میں زمین سے نکالا جاتا ہے پھر اسے صاف کر کے اس سے مختلف چیزیں تیار کی جاتی ہیں۔

فرمایا تم پتھر جیسی ٹھوس اور بے جان چیز بن جاؤ یا لوہے جیسی سخت اور زندگی سے بعید چیز بن جاؤ۔ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ یا کوئی اور چیز بن جاؤ جو تمہارے دلوں میں ان سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ گوشت پوست اور ہڈیوں میں تو جان موجود تھی اب ان کو دوبارہ زندہ کرنا شاید آسان ہو مگر پتھر، لوہے یا کسی ایسی چیز کو تو زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں، اگر تم یہ کچھ بن جاؤ۔ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا تو یہ لوگ فوراً کہہ دیں گے کہ ہمیں کون دوبارہ لوٹائے گا؟ جب ہمارا تعلق زندگی سے مطلقاً منقطع ہو جائے گا تو پھر وہی زندگی کیسے لوٹ کر آئے گی جب کہ ہمارا گوشت پوست اور ہڈیاں بوسیدہ ہو کر مٹی میں مل چکے ہوں گے۔

اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا قُلِ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں۔ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ تمہیں وہی ذات دوبارہ زندہ کرے گی جس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ سورۃ بقرہ میں ہے "كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ" خدا نے تمہیں موت سے زندگی بخشی، تم کچھ نہیں تھے، اللہ نے تمہیں جیتا جاگتا انسان بنایا۔ تم اپنے آغاز سے واقف ہو کہ اللہ نے تمہیں بغیر مادے، آلے اور نمونے کے پیدا کیا۔ اب اپنا انجام بھی دیکھ لو گے کہ وہ تمہیں کیسے دوبارہ زندہ کر کے اٹھاتا ہے۔ دوسرے مقام پر اللہ نے فرمایا کہ انسان کی پیدائش اگر مشکل ہوتی تو پہلی دفعہ ہوتی۔ جب کہ اس کا نمونہ تک موجود نہیں تھا۔ اب جب کہ وہ ایک معقول زندگی گزار کر موت سے ہمکنار ہوا ہے، اس کو دوبارہ پیدا کرنا تو یقیناً آسان ہے۔ تم مٹی تھے، قطرۂ آب تھے، جمادِ لا یعقل تھے

مگر اللہ نے تمہیں زندگی بخشی، مکمل انسان بنایا تو اب اسی خالق و مالک کے
لیے دوبارہ زندہ کرنا کون سا مشکل کام ہے؟

وقوعِ قیامت کا وقت

فرمایا، اے پیغمبر! جب دوبارہ جی اٹھنے کی یہ ٹھوس دلیل آپ ان کے سامنے
پیش کریں گے تو وہ لاجواب ہو جائیں گے فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ
رُءُوسَهُمْ اور تعجب، انکار اور استہزاء کی بنا پر سر ہلا دیں گے۔ پھر
اور تو کچھ بن نہیں پڑے گا۔ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هُوَ صرف اتنا کہہ سکیں
گے کہ اگر آپ کے دعوے کے مطابق دوبارہ زندگی لازمی ہے تو یہ
کب ہوگا؟ ہم نے آج تک تو کسی کو دوبارہ زندہ ہوتے دیکھا نہیں۔ آخر
یہ سارا معاملہ کب پیش آئے گا۔ اللہ نے جواب میں فرمایا قُلْ اے پیغمبر!
آپ ان کو بتا دیں عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ قَرِيبًا ممکن ہے کہ وہ وقت
قریب ہو جب تم سب دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہے
کہ اس نے قیامت کے وقت کو ظاہر نہیں کیا، ورنہ کائنات کا سارا نظام
ٹھپ ہو کر رہ جائے۔ وقوعِ قیامت کے متعلق قرآنِ پاک میں جگہ جگہ موجود ہے
کہ اس کے وقت کے متعلق اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے۔ اور اس نے یہ علم کسی
دوسری ذات کو نہیں دیا۔ البتہ حضور علیہ السلام نے بعض نشانیوں کا ذکر کیا
جو قیامت سے پہلے ظاہر ہوں گی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بھی یہی
فرمایا تھا کہ قیامت آنے والی ہے "أَكَادُ أُخْفِيهَا لِتُجْزَىٰ كُلُّ
نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ" (طٰہٰ) مگر میں اس کے وقت کو مخفی رکھوں گا تاکہ
ہر ایک کو اس کے کیے کا بدلہ مل سکے۔ قیامت کو قریب اس لیے بھی فرمایا
کہ آئندہ آنے والی چیز دن بدن قریب ہی ہوتی ہے کیونکہ اسے بہرحال آنا
ہے، البتہ گزرا ہوا وقت دن بدن بعید ہوتا چلا جاتا ہے کیونکہ اسے لوٹ کر
نہیں آنا ہوتا۔ فرمایا شاید کہ قیامت قریب ہی ہو اور تم ضرور اسے پا لو گے۔

دوبارہ زندگی پر حمد

فرمایا يَوْمَ يَدْعُوكُمْ جس دن اللہ تعالیٰ تمہیں دوبارہ زندگی

عطا کر کے اپنی طرف بلائے گا۔ سورۃ المعارج میں ہے کہ جب قیامت
کا بگل بجے گا تو لوگ قبروں سے نکل کر اس طرح دوڑتے ہوئے آئیں گے۔
"كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ" جیسے شکاری شکار کے
جال کی طرف دوڑتے ہیں۔ بہرحال جب اللہ تعالیٰ تمہیں بلائے گا۔
فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ تو تم جواب دو گے اس کی تعریف کے
ساتھ اس وقت تمہاری زبانوں سے بے اختیار اللہ تعالیٰ کی حمد بیان ہو گی
اس وقت تمہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر یقین آئے گا۔ مگر اس وقت الحمدللہ
کہنا کچھ مفید نہیں ہو گا۔ البتہ اہل ایمان اللہ کی تعریف ان الفاظ کے ساتھ
کریں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ
(فاطر) اس خدا تعالیٰ کا شکر ہے جس نے آج ہمارے تمام غم و اندوہ دور
کر دیئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ لَيْسَ عَلَىٰ اَهْلِ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا اللّٰهُ وَحْشَةٌ فِى الْمَوْتِ وَلَا فِى الْقُبُوْرِ
وَلَا حِيْنَ يَخْرُجُوْنَ (او کما قال) یعنی اہل ایمان کلمہ طیبہ پڑھنے
والوں پر نہ تو موت کے وقت وحشت ہو گی، نہ قبروں میں اور نہ قبروں سے
دوبارہ نکلتے وقت۔ ان کی زبانوں پر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے الفاظ ہوں گے
اور وہ نہایت اطمینان کے ساتھ میدان حشر کی طرف روانہ ہوں گے۔ ایسے
لوگ خوشی خوشی حمد و ثنا کا یہ ترانہ بھی گائیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىٓ
اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اس اللہ کی سب تعریفیں ہیں جس نے ہم
سے غم کا بوجھ اتار دیا۔

دنیا کی قلیل زندگی

فرمایا آج تو تم دوبارہ زندگی کو بعید سمجھتے ہو اور اس کا ذکر حقارت کے
ساتھ سر ہلا کر کرتے ہو اور پوچھتے ہو کہ وہ کب آئے گی۔ مگر اس دن تم غیر ارادی
طور پر اللہ کی تعریف کرو گے وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا
اور تم اس دن گمان کرو گے کہ تم دنیا میں بہت تھوڑا عرصہ مقیم رہے جب

مستقبل کی دائمی زندگی نظر آئے گی تو دنیا کے سو سال بھی معمولی ساعت معلوم ہوں گے۔ سورۃ الاحقاف میں آتا ہے کہ کہیں گے لَمْ يَلْبَثُوٓا إِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ یعنی دنیا میں ایک دن کا تھوڑا سا حصہ ٹھہرے۔ سورۃ النّٰزعٰت میں ہے لَمْ يَلْبَثُوٓا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحٰهَا ”پچھلے پہر یا پہلے پہر کا تھوڑا سا وقت دنیا میں قیام کیا۔ کفر و شرک اور معاصی میں گزرا ہوا یہ وقت بالکل قلیل محسوس ہوگا۔ آگے دائمی زندگی نظر آئے گی جس میں نہ عذاب میں تخفیف ہوگی۔ اور نہ موت آئیگی۔ فرمایا آج تم یوں تمسخر کرتے ہو لیکن اس دن یہ حالت ہوگی کہ جب اللہ جلائے گا تو حسرت کے ترلے کرتے ہوئے آئیں گے اور اس دنیا کی زندگی کو بالکل قلیل گمان کریں گے۔

درس شانزدہم ۱۶ — آیت ۵۳ تا ۵۵

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۵۳﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ؕ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

ترجمہ:- اور (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیں میرے بندوں سے کہ وہ کہیں وہ بات جو بہتر ہے۔ بیشک شیطان جھگڑا ڈالتا ہے اُن کے درمیان۔ بیشک شیطان انسان کے لیے کھلا دشمن ہے ﴿۵۳﴾ تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے تمہاری حالت کو اگر چاہے تو رحم کرے تم پر یا اگر چاہے تو تمہیں سزا دے۔ اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر ﴿۵۴﴾ اور تیرا پروردگار خوب جانتا ہے اُن کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ اور البتہ تحقیق ہم نے فضیلت بخشی ہے بعض نبیوں کو بعض پر۔ اور دی ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور ﴿۵۵﴾

ربطِ آیات — گذشتہ آیات میں عقیدے کے بارے میں اہم مضامین کا ذکر ہو چکا ہے

اللہ نے مشرکین کا رد فرمایا، کفار کی مذمت بیان فرمائی اور رسالت کے متعلق شکوک و شبہات کے جوابات دیے اس کے بعد قیامت کا مسئلہ بیان کیا کہ لوگ اس کو بعید خیال کرتے ہیں مگر ممکن ہے یہ قریب ہی ہو۔ پھر فرمایا جب قیامت برپا ہوگی اور اللہ تعالیٰ ان کو بلائے گا تو یہ خدا کی تعریف کرتے ہوئے اس کی طرف دوڑ کر آئیں گے مگر اس وقت اللہ تعالیٰ کی بات کو قبول کرنے اور اس کی حمد بیان کرنے کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔

شائستہ بات

آپ آج کی آیات میں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطاب کر کے اہل ایمان کو اچھا اخلاق اختیار کرنے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ مشرکین اکثر ناشائستہ باتیں کرتے تھے اور عمل سے بھی مسلمانوں کو اذیت پہنچانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے تھے۔ ان حالات میں خدشہ تھا کہ کہیں مسلمان بھی مشرکین کے جواب میں غیر اخلاقی اور ناشائستہ راستہ اختیار نہ کر لیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اخلاقی تعلیم کا پابند بنایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَقُلْ لِّعِبَادِيْ اور اے پیغمبر! آپ میرے بندوں سے کہہ دیں يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ کہ وہ ایسی بات کریں جو بہتر ہے۔ اخلاق کے منافی ناشائستہ بات یا گالی گلوچ سے اجتناب کریں اور اس ضمن میں مشرکوں کی روش اختیار نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانعام میں گالی گلوچ کی صریح الفاظ میں ممانعت کر دی ہے وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ غیر اللہ کو پکارنے والے مشرکین کو گالی گلوچ نہ دو، اور نہ ان کے معبودوں کے متعلق کوئی ایسی بات کرو، کہیں وہ تمہارے معبود برحق کو گالیاں نہ دینے لگیں اور تم اس قبیح حرکت کا ذریعہ بن جاؤ۔ سورۃ آل عمران میں ہے کہ اہل ایمان! تم اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے بڑی تکلیف دہ باتیں سنو گے وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (آیت ۱۸۶)

اور برائی کا جواب برائی سے دینے کی بجائے اگر تم صبر کرو گے اور تقوے کا راستہ اختیار کرو گے تو یہ پختہ بات ہے اور اسی کا نتیجہ اچھا ہوگا۔

شیطان دشمن انسان

فرمایا اگر مشرکین کی دیکھا دیکھی تم بھی ویسی ہی باتیں کرنے لگے تو اس سے شیطان کا کام بن جائے گا کیونکہ إِنَّ الشَّيْطَٰنَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ شیطان تو ان کے درمیان جھگڑا ڈالتا ہے۔ وہ تو چاہتا ہے کہ معاملہ مزید الجھ جائے اور فریقین کے درمیان فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو جائے لہٰذا تمہارا کام یہ ہے کہ شیطان کو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دو۔ یاد رکھو! شیطان انسان دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا کیونکہ إِنَّ الشَّيْطَٰنَ كَانَ لِلْإِنسَٰنِ عَدُوًّا مُّبِينًا وہ تو انسان کا کھلا دشمن ہے اور اس نے اس دشمنی کو بروئے کار لانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کے لیے مہلت لے رکھی ہے۔

بہر حال فرمایا کہ مشرکین کی طعن و تشنیع تمسخر اور دل آزاری سے تنگ دل ہو کر ان کا رویہ نہ اختیار کر لو بلکہ بہتر بات کہو۔ اور بہتر بات وہی ہے جس میں نصیحت کا پہلو نمایاں ہو۔ آگے اللہ کا یہ فرمان بھی آ رہا ہے کہ یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ مشرک لوگ ضرور ہی ایمان لے آئیں۔ دوسری جگہ موجود ہے کہ مشرکین کی تکلیف دہ باتوں کے مقابلے میں تم اگر اچھی بات کرو گے تو نتیجۃً تمہارے اور ان کے درمیان دوستی کا امکان پیدا ہوگا اور اس طرح انہیں تمہاری بات سننے، سمجھنے اور ایمان قبول کرنے کا موقع میسر آ جائے گا۔ اور اگر تم سختی سے بات کرو گے تو ان کی ضد اور عناد میں اضافہ ہو کر ہدایت سے محرومی کا سبب بن سکتا ہے۔

اچھی بات کیا ہے

فرمایا ایک اچھی بات تو یہ ہے کہ مشرکین کی اشتعال انگیزیوں کے جواب میں تم اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اچھی بات کرو، اور دوسری یہ کہ تم اپنی زبانوں سے ہر موقع اور محل پر اچھی اور بہتر بات ہی کہو۔ مفسرین کرام

فرماتے ہیں کہ سب سے اچھی بات اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور پیغمبر خدا کی رسالت کی گواہی دینا ہے شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ۔ اس کے بعد امر بالمعروف یعنی نیکی کا حکم کرنا اور نہی عن المنکر یعنی برائی سے روکنا بھی اچھی بات میں شامل ہے ۔ بداخلاقی کے مقابلے میں اخلاق کا مظاہرہ کرو ۔ اور بدخواہی کے مقابلے میں خیر خواہی کی بات بھی اچھی بات ہے ۔ فرمایا یاد رکھو! رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ تمہارا پروردگار تمہاری حالت کو خوب جانتا ہے اگر تمہاری حالت اچھی ہوگی تو اللہ تعالیٰ ضرور ہدایت نصیب کرے گا ، اور اگر حالت بُری ہوئی تو وہ ہدایت سے محروم ہی رکھے گا ۔ سارا اختیار اس کے پاس ہے اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ وہ اگر چاہے تو تم پر رحم فرمائے ۔ ایمان ، نیکی اور اطاعت کی توفیق عطا فرمائے ۔ اعمال صالحہ انجام دینے کی توفیق مرحمت فرمائے ۔ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ یا اگر چاہے تو تمہیں سزا دے دے ۔ یہ بھی اُس کی طرف سے سزا ہی ہے کہ کسی شخص کی ضد اور عناد کی وجہ سے اُسے ہدایت سے محروم رکھے جیسے اللہ کا فرمان ہے " خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (البقرۃ ۔ ۷) اللہ نے کافروں کے دلوں پر مہریں لگا دی ہیں ۔ سورۃ النساء میں ہے " بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ " (آیت ۔ ۱۵۵) اُن کے کفر کی وجہ سے اللہ نے اُن کے دلوں پر ٹھپے لگا دیئے ہیں ، اب یہ ہدایت قبول نہیں کر سکیں گے ۔ سورۃ نساء ہی میں ہے کہ ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد جو شخص رسول دشمنی پر قائم رہتا ہے اور مومنوں کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے " نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى " تو پھر جدھر وہ جانا چاہتا ہے ، ہم اُدھر ہی کی توفیق دے دیتے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے " وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا " (آیت) کہ وہ جہنم میں داخل ہوں گے جو کہ بدترین ٹھکانا ہے ۔

نبی کی ذمہ داری

فرمایا اے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ہم نے آپ کو ان کفار و مشرکین پر ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا کہ آپ ضرور ہی انہیں راہِ راست پر لے آئیں۔ آپ کا یہ کام نہیں ہے۔ بلکہ آپ کا کام یہ ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے راہِ ہدایت پیش کریں ان کے لیے تعلیم و تبلیغ کا کام کریں۔ کسی کو راہِ راست پر لانا یا گمراہی میں مبتلا رکھنا اللہ کا کام ہے اسی لیے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی کی ہدایت کے لیے نبی کو ذمہ دار نہیں بنایا تو امت کے لوگوں کو بھی زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہیئے کہ فلاں شخص یا جماعت ہدایت کو قبول کیوں نہیں کرتے انہیں حتی الامکان کوشش کر کے نتیجہ اللہ جل جلالہٗ پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ لوگ تبلیغ و تعلیم کے معاملے میں دو فیصد کام بھی انجام نہیں دے رہے ہیں۔ عام لوگ ذاتی کاروبار اور معاملات میں مصروف ہیں اور دین کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی جا رہی ہے۔ مشرک کافر تو دنیا کی زندگی تک محدود ہیں اور وہ اس کے لیے تگ و دو میں لگے رہتے ہیں مگر مومن کی دعا ہمیشہ یہ ہوتی ہے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (البقرۃ - ۲۰۱)

اے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی۔ یہ دنیا تو آخرت کا ایک ذریعہ اور پل ہے جس سے گزر کر آخرت کی دائمی زندگی میں پہنچنا ہے۔ یہ دنیا تو آخرت کی کھیتی ہے۔ اس سے غفلت برتنا تباہ کن ہے اور آخرت سے غافل ہونا ابدی خسران اور بدنصیبی کی علامت ہے۔

بہرحال فرمایا کہ کسی کو راہِ راست پر لانا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے "اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ" (القصص) آپ اپنی خواہش پر کسی کو ہدایت

نہیں ہو سکتے بلکہ منزلِ مقصود تک پہنچانا اللہ کا کام ہے۔ یہ اہل
ایمان کے لیے تسلی بھی ہے کہ آپ تبلیغ و تعلیم کا کام کرتے رہیں،
انسانوں کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کا برتاؤ کریں، اگر یہ لوگ راہِ راست
پر نہیں آتے تو یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے "وَلَا تُسْئَلُ عَنْ
اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ" (البقرۃ - ۱۱۹) جہنم والوں کے متعلق آپ سے
کچھ نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیوں دوزخ میں گئے؟ بلکہ یہ اُن سے
سوال ہو گا کہ تمہارا ایمان کیسے آنا ہوا؟ تم سے صرف یہ پوچھا جائے گا
کہ تم نے انہیں صحیح راستہ بتایا یا نہیں۔ انہیں دین کو قبول کرنے کی
ترغیب دی یا عمر بھر کھیل تماشے اور گانے بجانے میں ہی لگے رہے
عمارات کی تزئین ہی کرتے رہے یا انسانیت کی بہتری کے لیے بھی
کوئی کام کیا۔ فرمایا وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
اور تیرا پروردگار آسمان و زمین کی تمام مخلوق ملائکہ، جن اور انسان سب
کی حالت کو خوب جانتا ہے۔ جب اللہ ہی بہتر جانتا ہے تو پھر وہ یہ بھی
جانتا ہے کہ کون شخص اس قابل ہے کہ اسے ہدایت نصیب ہو اور کون ہے
جو گمراہی کے قابل ہے۔ بہرحال ہدایت اور گمراہی اللہ کے اختیار میں
ہے اور وہی اس کا فیصلہ کرتا ہے یہ کسی نبی یا امتی کی ذمہ داری نہیں ہے۔

انبیاء کے بھی درجے ہیں

ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى
بَعْضٍ اور البتہ تحقیق ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت بخشی ہے۔
مشرکین کا اعتراض تھا کہ نبوت کا دعویدار تو ہمارے جیسا انسان ہے۔
ہم اسے نبی کیسے مان لیں۔ اگر اللہ کسی انسان کو ہی نبی بناتا تو کسی بڑے
آدمی کو بناتا۔ کہتے تھے لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ
مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (الزخرف - ۳۱) یہ قرآن مکے اور
طائف کی دو بڑی بستیوں کے کسی سردار پر کیوں نہیں اُترا۔ کیا الولید

کا تقسیم نبیِ حیات بھی اس کام کے لیے رہ گیا ہے۔ اس اعتراض کا ایک جواب پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر ایک کی حالت، کیفیت اور استعداد کو جانتا ہے اور اسی کے مطابق کوئی فیصلہ کرتا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اس کی استعداد کے مطابق منصب نبوت کے لیے منتخب فرما لیتا ہے، اس میں کسی دوسرے کو اعتراض کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اور اب دوسرا جواب یہ دیا جا رہا ہے کہ اللہ نے بعض انبیاء کو بعض پر ان کے کمال اور شرف کی بنا پر فضیلت بخشی ہے۔ نبوت کی تقسیم کسی ظاہری تعلقات کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ روحانی اور نفسانی کیفیت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ظاہری طور پر خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے نبی کا تعلق ساری مخلوق سے ہوتا ہے مگر اس کے باوجود وہ اللہ کا نبی ہے کیونکہ اس کی روحانی، اخلاقی اور نفسانی حالت کمال درجے کی ہے۔ جیسے اللہ نے داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا "یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ" (صٓ - ۲۶) اے داؤد علیہ السلام! ہم نے آپ کو زمین میں خلافت عطا کی۔ خلیفہ ہونے کے باوجود آپ بڑے عبادت گزار تھے اور اللہ نے آپ کو کمال درجے کی روحانیت بھی عطا فرمائی تھی۔ آپ بطور خلیفہ جہاد بھی کرتے تھے اور اللہ کی طرف سے عطا کردہ کتاب زبور کی تبلیغ کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔ آپ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔ کبھی نصف رات عبادت کرتے تھے، کبھی چھٹا حصہ اور کبھی تیسرا حصہ اور اس طرح آپ عبادت بھی کرتے اور آرام بھی کرتے۔ اور جب جہاد کا موقع آتا "وَکَانَ لَا یَفِرُّ اِذَا لَاقٰی" جب دشمنوں سے ٹکر ہو جاتی تو پیٹھ پھیر کر نہیں بھاگتے تھے بلکہ ثابت قدم رہتے تھے۔

اب یہی چیز اللہ نے نبی آخر الزمان میں بھی رکھی ہے۔ آپ جہاد

بھی کرتے تھے اور قرآن کے ذریعے تبلیغ کا فریضہ بھی انجام دیتے رہیں۔
وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (الفرقان) آپ اس
قرآن پاک کے ذریعے لوگوں کے ساتھ بڑا جہاد کریں۔ جب تک دنیا
میں کفر، شرک اور گمراہی موجود ہے جہاد بذریعہ قرآن جاری ہے۔ آپ
خلیفۃ اللہ بھی ہیں اور خداداد استعداد اور اعلیٰ درجے کی انسانی کیفیت
کی بنا پر تبلیغ دین کا کام بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ اللہ نے دونوں صلاحیتیں
آپ کو عطا فرمائی تھیں۔ آپ کمال درجے کے عبادت گزار اور خوف خدا
سے معمور تھے۔ اللہ کے پانچ نبی حضرت نوح علیہ السلام، حضرت
ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور
خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اولوالعزم رسول شمار ہوتے ہیں۔ لہٰذا آپ
علیہ السلام کو بھی حکم ہوا فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ
مِنَ الرُّسُلِ (الاحقاف - ۳۵) آپ بھی اولوالعزم رسولوں کی
طرح صبر کا دامن تھامے رکھیں۔ مگر چونکہ ان اولوالعزم رسولوں میں
سے بلند ترین مرتبہ حضور کو حاصل ہے۔ آپ صاحب کتاب، صاحب
جہاد، صاحب عبادت اور صاحب معاملہ ہیں اللہ نے آپ کو تمام
انبیاء پر فضیلت بخشی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ہم نے بعض انبیاء کو بعض
پر فضیلت عطا کی ہے اگرچہ تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے مگر
ان کے درجات بہر حال متفاوت ہیں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام
کے متعلق فرمایا وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا (النساء)
اللہ نے آپ کو اپنا دوست بنایا۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے
متعلق فرمایا وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (النساء) اور موسیٰ
علیہ السلام کو شرف تکلم بخشا۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہوا۔
وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ

بِرُوْحِ الْقُدُسِؕ (البقرۃ - ۸۷) کہ ہم نے انہیں نشانیاں دے کر
بھیجا اور روح القدس کے ساتھ ان کی تائید فرمائی۔ اسی طرح نوح علیہ السلام
کو بھی اللہ نے خاص فضیلت عطا فرمائی "اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ وَ
نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ" (آل عمران)
اللہ نے ان انبیاء کو جہان بھر میں منتخب فرمایا۔ اور پھر حضور خاتم النبیین علیہ السلام
کو خلت (دوستی) کے ساتھ محبوبیت کا درجہ بھی عطا فرمایا "اَنَا حَبِیْبُ
اللّٰہِ" میں اللہ کا محبوب ہوں۔ الغرض! اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء کو بعض پر شرف
عطا فرمایا ہے۔ لہذا یہ مشرکین اعتراض کرنے والے کون ہیں جو کہتے ہیں کہ
یہ تو ہمارے جیسا انسان ہے۔ ہم اس کی اتباع کیسے کریں؟

زبور کا خصوصی ذکر

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو عطا کی گئی
کتاب زبور کا خاص طور پر ذکر فرمایا "وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا" اور ہم
نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ زبور کے
ذکر کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس میں آخری دور کے نبی اور آپ کی امت
کی خلافت ارضی کا ذکر ہے۔ سورۃ الانبیاء میں ہے "وَلَقَدْ كَتَبْنَا
فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ
الصّٰلِحُوْنَ" (آیت ۱۰۵) ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ بات
لکھ دی کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔ اور نیک
بندوں کی تشریح میں حضور خاتم النبیین اور آپ کی امت کے لوگ آتے
ہیں۔ چنانچہ اللہ نے اس پیشگوئی کو خلافت راشدہ کی صورت میں پورا
فرما دیا، دین کو مستحکم کیا اور خوف کو امن میں تبدیل کر دیا۔ نظام اسلام کو
تمام باطل قوتوں حتیٰ کہ قیصر و کسریٰ پر بھی غالب کر دیا۔ یہ سلسلہ صدیوں تک
قائم رہا، پھر مسلمانوں کی نا اتفاقی کی وجہ سے ان پر زوال آ گیا۔ انہوں نے
خلافت کو ترک کر کے ملوکیت اختیار کر لی تو ذلیل ہو کر رہ گئے۔ جس بجائے

کو مسلمانوں نے ختم کیا تھا، خود اسی میں مبتلا ہو کر رسوا ہوئے۔ مگر ان کی ترقی کا زمانہ بھی دنیا نے دیکھا۔ بہرحال زبور میں مسلمانوں کے درخشاں مستقبل کی پیشین گوئی تھی۔ اس واسطے اس کا خصوصی ذکر کیا۔

تلاوت زبور اور قرآن

اس مقام پر زبور کے خصوصی ذکر کی ایک وجہ یہ بھی مفسرین بیان کرتے ہیں کہ زبور اور قرآن کی تلاوت کے سلسلے میں دونوں کتابوں کو ایک خاص شان حاصل ہے۔ زبور کی ایک سو پچاس سورتیں ہیں جن میں زیادہ تر خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اخلاقی تعلیمات ہیں۔ جب آپ زبور کی تلاوت خوش الحانی کے ساتھ کرتے تھے تو پہاڑ اور پرندے بھی آپ کے ساتھ اللہ کی تسبیح بیان کرتے تھے۔ آپ کو تلاوتِ زبور کا اتنا ذوق و شوق تھا کہ خادم کو گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیتے۔ جب تک خادم گھوڑا اصطبل سے لاکر اس پر کاٹھی ڈالتا، آپ اتنے عرصہ میں پوری زبور کی تلاوت فرما لیتے۔ اللہ نے آپ کو یہ معجزہ عطا کیا تھا کہ چار پانچ منٹ میں پوری زبور پڑھ جاتے۔ اسی طرح قرآن پاک کی تلاوت کے ضمن میں بھی بعض حضرات کو غیر معمولی توفیق حاصل رہی ہے، جیسے حضرت عثمانؓ ایک رات میں پورا قرآن پاک ختم کر لیتے تھے۔ حضرت سعید ابن جبیرؓ خانہ کعبہ کے قریب نماز شروع کرتے تو ایک رکعت میں قرآن مجید کی تلاوت مکمل کر لیتے۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے قاضی حمید الدین ناگوری کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے ایک بزرگ کو دیکھا جو طواف کر رہے تھے۔ آپ انکی روحانیت سے متاثر ہوئے اور طواف میں انکے نقش قدم پر چلنے لگے۔ وہ بزرگ فرمانے لگے طواف میں میرے نقش قدم پر کیا چلتے ہو، اگر کچھ کرنا ہے تو میرے والا کام کرو۔ اور وہ کام یہ تھا کہ آپ رات کو نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو دو رکعت میں پورا قرآن پاک اور چار پارے تلاوت کر گئے۔ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کو بھی اللہ نے خاص توفیق بخشی تھی کہ عصر اور مغرب کے درمیان پورا قرآن پاک تلاوت کر لیتے۔ یا صبح کی نماز پڑھ کر بیٹھتے اور طلوع آفتاب تک

تلاوت مکمل کر لیتے۔ یہ ان بزرگوں کی خاص کرامت تھی۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ
ہر روز دس پارے تلاوت فرماتے تھے۔ امام محمدؒ کا بھی یہی دستور تھا۔ حضرت
مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ بھی دس پارے روزانہ پڑھتے۔ ہمارے شیخ
حضرت مدنیؒ تمام تر مصروفیات کے باوجود رمضان میں ہر روز سات پارے
تلاوت کر لیتے۔ تاہم عام ایام میں نوافل میں دو اڑھائی پارے ضرور پڑھ
لیتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ ہر رات ایک قرآن نماز میں ختم کرتے۔ البتہ
رمضان المبارک میں ایک قرآن پاک دن کو اور ایک رات کو تلاوت کرتے
حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ ایک بزرگ ایسے بھی گزرے
ہیں جو کرامت کے طور پر ہر روز سات سو مرتبہ قرآن پاک ختم کرتے تھے۔ کسی
نے پوچھا کہ پھر وہ خیال ہی کرتے ہوں گے۔ تو آپ نے فرمایا نہیں، بلکہ
مَلْفُوظاً لَا مَوْهُوماً یعنی وہم سے نہیں بلکہ نقداً بلفظاً تلاوت فرماتے
ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات عقل میں نہیں آ سکتی اس کا تعلق کرامت سے
ہوتا ہے۔ بہر حال زبور اور قرآن میں یہ قدر مشترک ہے کہ دونوں کتابوں
کی تلاوت غیر معمولی طور پر قلیل وقت میں کر لی جاتی ہے۔

تلاوتِ زبور کو واقعہ معراج سے بھی نسبت ہے۔ جس طرح داؤد علیہ السلام
زبور کی تلاوت چند منٹ میں مکمل کر لیتے تھے، اسی طرح اللہ نے حضور
علیہ السلام کو ارض و سما کی سیر بھی چند منٹ میں کرا دی۔ اس کا ذکر اس سورۃ کی
پہلی آیت میں گزر چکا ہے اور آگے بھی آ رہا ہے۔ تو گویا زبور کے ذکر کی
ایک یہ مناسبت بھی ہو سکتی ہے۔

فضیلتِ انبیاء میں احتیاط

فرمایا کہ اللہ نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت عطا کی ہے۔ تاہم حضور علیہ السلام
کا ارشاد مبارک ہے کہ کسی نبی کی فضیلت کا ذکر اس انداز میں نہ کرو کہ کسی دوسرے
نبی کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہو۔ حتیٰ کہ آپ نے فرمایا لَا تُفَضِّلُوْنِیْ بَیْنَ
الْاَنْبِیَاءِ مجھے باقی انبیاء پر اس انداز میں فضیلت نہ دو کہ کسی دوسرے نبی

کی تحقیر ظاہر ہوتی ہو مثلاً حضرت یونس علیہ السلام کی لغزش کے مقابلے میں
حضور علیہ السلام کا ذکر کیا جائے۔ کسی نبی کی شان میں تحقیر کا کوئی پہلو رکھنا
ایسا کریں گے تو ایمان سلب ہو جائے گا۔ ہر نبی کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے
ہوئے ان کے درجے اور مرتبے کے لحاظ سے بات کرنی چاہیے۔ کسی
ایک نبی کی تعریف اور دوسرے کی توہین کفر کی بات ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿٥٦﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿٥٧﴾ وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِى الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿٥٨﴾

ترجمہ :- (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے کہ بلاؤ تم اُن کو جن کو تم اللہ کے سوا خیال کرتے ہو۔ پس نہیں مالک وہ تکلیف دُور کرنے کے تم سے اور نہ تبدیل کرنے کے (۵۶) یہی لوگ ہیں جن کو یہ پکارتے ہیں، وہ تو تلاش کرتے ہیں اپنے رب کی طرف وسیلہ کہ کون اُن میں سے زیادہ قریب ہو۔ اور اُمید رکھتے ہیں اُس کی رحمت کی، اور خوف کھاتے ہیں اُس کے عذاب سے۔ بیشک تیرے پروردگار کا عذاب ڈرنے کے قابل ہے (۵۷) اور نہیں ہے کوئی بستی مگر ہم اس کو ہلاک کرنے والے ہیں قیامت سے پہلے، یا اس کو سزا دینے والے ہیں سخت سزا۔ یہ بات کتاب میں لکھی ہوئی ہے (۵۸)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو نصیحت فرمائی کہ وہ مشرکین سے عداوت کی بنا پر اپنی زبانوں سے کوئی غلط بات نہ نکالیں، بلکہ ہمیشہ اچھی بات کریں۔ شیطان چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان جھگڑا کھڑا کر کے اپنا الو سیدھا کرے کیونکہ وہ انسان کا صریح دشمن ہے۔ فرمایا شیطان کے پیچھے لگنے کی بجائے ہمیشہ سچی بات کریں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خطاب فرمایا کہ آپ اس بات کے ذمہ دار نہیں ہیں کہ ہر شخص ضرور ہی ہدایت قبول کرے، آپ کا کام تبلیغ کرنا اور لوگوں کو سمجھانا ہے۔ آپ اپنا فریضہ ادا کرتے رہیں۔ اس کے بعد اللہ نے فرمایا کہ اس نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت بخشی ہے خاص طور پر داؤد علیہ السلام کا ذکر کیا کہ انہیں خلافت عطا کی، صاحب نبوت اور صاحب جہاد بنایا اور اسی طرح نبی آخر الزمان کو صاحب کتاب و جہاد بنایا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضور خاتم النبیین علیہ السلام کو خلافت انجام دینے کے باوجود اللہ کے سب سے زیادہ عبادت گزار بندے تھے۔ دنیا کے کام ان کے تعلق باللہ میں حائل نہیں ہوئے۔

معبودان باطلہ کی بے بسی

اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے معبودان باطلہ کی پرستش کرنے اور ان کو اپنی حاجات میں پکارنے والے مشرکین کا رد فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے۔ قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُونِهِ اے پیغمبر! آپ ان مشرکین سے کہہ دیں کہ اللہ کے سوا تم جن کے متعلق گمان کرتے ہو کہ وہ تمہاری حاجت روائی اور مشکل کشائی کر سکتے ہیں، ان کو پکارو۔ اُن کو مدد کے لیے بلاؤ اور پھر دیکھ لو۔ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا کہ وہ اس بات کے مالک نہیں ہیں کہ تم سے کوئی تکلیف دور کر سکیں یا اسے تبدیل کر سکیں۔ شاہ عبد القادر فرماتے ہیں کہ تمہارے معبود خواہ

فرشتے ہوں، جنات ہوں، انبیاء ہوں یا اولیاء، کسی کو بھی پکار کر دیکھ لو، وہ تمہاری مدد کو نہیں پہنچ سکیں گے، فرشتے تو اللہ کی پاک مخلوق ہیں، اللہ نے اُن کو ایک حد تک اختیار بھی دے رکھا ہے مگر وہ بھی وہی کام کرتے ہیں جس کا اللہ انہیں حکم دیتا ہے۔ خود بخود وہ کسی کی حاجت روائی اور مشکل کشائی نہیں کر سکتے۔ یہی حال انسانوں اور جنوں کا ہے۔ وہ بھی مافوق الاسباب کسی کی مدد نہیں کر سکتے کہ کسی بیمار کو شفا عطا کر دیں، کسی ملزم کو بری کرا دیں یا کسی کو حادثے سے بچا سکیں۔ نفع و نقصان تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہ چاہے گا تو تکلیف کو دور کر دے گا اور چاہے گا تو نقصان میں ڈال دے گا البتہ جن کو تم پکارتے ہو۔ وہ کوئی تکلیف دور کرنے یا اسے تبدیل کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ تبدیل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی مصیبت میں کمی کر دیں یا ایک کی تکلیف دوسرے پر ڈال دیں، فرمایا یہ ان کے بس کی بات نہیں۔ جب فرشتوں، انسانوں اور جنوں کو یہ اختیار حاصل نہیں، جن کو اللہ نے کسی حد تک اختیار بھی دیا ہے تو پھر پتھروں، درختوں اور بتوں سے یہ کیسی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں جو کہ خود بے جان اور حرکت کرنے سے بھی عاجز ہیں۔ بھلا وہ ان کے کام کیسے آسکتے ہیں۔

فرمایا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ جن کو یہ لوگ اپنی حاجتوں میں پکارتے ہیں، ان کی حالت تو یہ ہے يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ وہ تو خود اپنے رب کی طرف وسیلہ تلاش کرتے ہیں۔ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ کہ کون اُن میں زیادہ قریب ہو۔ بخاری شریف میں موجود ہے کہ دورِ جاہلیت میں بعض مشرکین جنات کی پوجا کرتے تھے اور انہی کو اپنی حاجات میں پکارتے تھے۔ جب حضور علیہ السلام کی بعثت ہوئی، تو یہ جن تو مسلمان ہو گئے، مگر مشرک لوگ بدستور ان کی پرستش کرتے رہے اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا کہ دیکھو! جن کو یہ مشرک پکارتے ہیں وہ

تو ایمان لے آئے ہیں اور خدا کے قرب کے لیے وسیلے کے متلاشی ہیں ، مگر یہ مشرک لوگ ابھی تک انہی کی پوجا کیے جا رہے ہیں ۔ یہ کتنی حماقت کی بات ہے ۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قرب کا بہترین وسیلہ ایمان اور نیک اعمال ہیں تو جن کو مشرک پکارتے ہیں ، وہ خود ایمان لانے کے بعد نیک اعمال انجام دے رہے ہیں تاکہ اللہ کا زیادہ سے زیادہ قرب حاصل ہو جائے ۔ بعض مفسرین اَیُّھُمْ اَقْرَبُ کا یہ معنی بھی کرتے ہیں کہ جو زیادہ مقرب ہیں وہ بھی مزید تقرب حاصل کرنے کے لیے وسیلہ ڈھونڈ رہے ہیں مگر یہ بدبخت انہی کی پوجا کیے جا رہے ہیں ۔ جب مقربین بھی وسیلے کے متلاشی ہیں تو دور والوں کا کیا حال ہو گا وہ تو قرب الٰہی کے زیادہ محتاج ہیں ۔ ایسے لوگوں کو حاجات میں پکارنا تو ویسے ہی قرین قیاس نہیں ۔

فرمایا اللہ کے یہ مقربین اس کی طرف وسیلہ تلاش کرتے ہیں وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَہٗ اور ساتھ ساتھ رحمت خداوندی کی امید بھی رکھتے ہیں کہ وہ ضرور انہیں اپنی رحمت سے نوازے گا ۔ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَہٗ اور وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے خوفزدہ بھی ہیں کیونکہ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحْذُوْرًا بیشک تیرے پروردگار کا عذاب ایسی چیز ہے کہ اس سے خوف ہی کھانا چاہیئے ۔

وسیلے کے مختلف معانی

وسیلہ کا لفظ سورۃ المائدہ میں بھی موجود ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ اے ایمان والو ! اللہ سے ڈر جاؤ اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو ۔ وسیلہ کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے ، مثلاً اس سے وہ چیز مراد ہوتی ہے جس کے ذریعے دوسرے کا قرب حاصل کیا جائے ۔ وسیلہ کا ایک معنی حاجت بھی ہوتا ہے ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد حضرت نافعؒ نے آپ سے سوال کیا کہ حضرت وسیلہ کا کیا معنی ہے ؟ آپ نے فرمایا حاجت

انہوں نے پھر دریافت کیا کہ کیا عربی زبان میں اس کا کوئی ثبوت موجود ہے
آپ نے فرمایا، ہاں، کیا تم نے زمانہ جاہلیت کے عربی شاعر ابن شداد کا یہ
یہ شعر نہیں پڑھا؟

إِنَّ الرِّجَالَ لَهُمْ إِلَيْكِ وَسِيلَةٌ
أَنْ يَأْخُذُوكِ تَكَحَّلِي وَتَخَضَّبِي

عشق و محبت کے تعلق سے شاعر عورت کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ
مردوں کو تیری حاجت ہے، لہٰذا تم آنکھوں میں سرمہ اور ہاتھوں میں مہندی
لگا کر بن سنور کر رہا کرو۔ ان معانی میں "وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ"
کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے رب کے ہاں حاجت طلب کرو۔

وسیلہ کا ایک معنیٰ درجہ اور مرتبہ بھی ہے جیسا کہ اذان کے بعد والی دعا
میں سکھایا گیا ہے اٰتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِيلَةَ..... (اے پروردگار
نبی رحمت کو اعلیٰ ترین مرتبہ عطا فرما۔ حضرت مولانا شیخ الاسلام فرماتے ہیں۔ کہ
وسیلہ حق تعالےٰ کے مقاماتِ قرب میں سے بلند ترین مقام کا نام ہے۔

توسل بالاعمال

ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ آیا دعا میں کسی کا توسل جائز ہے یا نہیں۔ توسل
دو قسم کا ہے۔ توسل بالاعمال یہ ہے کہ انسان اپنے نیک اعمال کو پیش کر کے
اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرے کہ مولا کریم! میں نے فلاں نیک کام
تیری رضا کی خاطر کیا تھا، اگر تجھے یہ منظور ہے تو اس کی برکت سے میرا فلاں
کام کر دے، یا فلاں تکلیف رفع کر دے۔ بخاری شریف کی روایت میں تین
آدمیوں کا ذکر آتا ہے جو کسی غار میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ غار کے منہ پر
ایک بڑا پتھر آ گرا تھا جس کی وجہ سے باہر نکلنے کا بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آتا
تھا۔ جب وہ لوگ ظاہری اسباب سے بالکل مایوس ہو گئے تو ان میں
سے ہر ایک نے اپنے اپنے ایک ایک نیک عمل کے توسل سے اللہ تعالےٰ
سے رہائی کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور اس پتھر کو

غار کے منہ سے سرکا دیا اور وہ تین آدمی باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ توسل بالاعمال ہے اور سب کے نزدیک جائز ہے۔

توسل بالذات (ناجائز وسیلہ)

اپنی دعا میں کسی کی ذات کا وسیلہ پیش کرنا دو طرح سے ہے ایک طریقہ وہ ہے جو مشرک لوگ اختیار کرتے ہیں۔ وہ اپنے معبودانِ باطلہ کو اللہ کی بارگاہ میں اس طرح وسیلہ بناتے ہیں کہ خدا تعالیٰ راضی ہو یا ناراض، یہ معبود ہمارا کام ضرور بنا دیں گے۔ اس قسم کے توسل کو شفیع غالب یا شفیع قاہر کا عقیدہ کہا جاتا ہے جسے مشرک اختیار کرتے ہیں اور یہ باطل اور ناجائز ہے۔ مشرک اپنے معبودان کے متعلق کہتے تھے مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ (الزمر) ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں تاکہ یہ ہمیں اللہ کا قرب دلا دیں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ معبود ہماری حاجتیں اللہ سے پوری کرا دیتے ہیں۔ یہی عقیدہ یہودیوں کا بھی تھا۔ وہ بھی کہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کسی ختنہ شدہ یہودی کو دوزخ میں نہیں گرنے دیں گے۔ بلکہ اپنے ساتھ جنت میں لے جائیں گے۔ اس قسم کا عقیدہ امت مسلمہ کے بعض فرقوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ جو سمجھتے ہیں کہ امام حسینؓ کا نعرہ مار لینے ان کا جلوس نکالنے اور ماتم کرنے سے ہی نجات حاصل ہو جائیگی۔ انہیں نہ نماز کی فکر ہے۔ نہ روزے کی، نہ حج کی اور نہ زکوٰۃ کی۔ وہ امام حسینؓ کی خود ساختہ محبت کی بنا پر ہی جنت کے وارث بننا چاہتے ہیں۔ بعض اپنے پیروں کے متعلق بھی اس قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کا عرس کر لو ختم دلا دو۔ اور قوالی کرا دو تو بات بن جائے گی، باقی کسی فرض واجب کی ضرورت نہیں۔ یہ جبری شفاعت والا مشرکین کا عقیدہ ہے یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کرتے ہیں۔ کہ جس طرح کوئی بادشاہ اپنے امیر، وزیر یا مصاحب کی بات کو نہیں ٹال سکتا کہ ایسا کرنے سے ملک میں بغاوت کا خطرہ ہوتا ہے، اسی طرح (نعوذ باللہ) وہ اللہ تعالیٰ کو بھی اپنے مقربین کے

سامنے مجبور سمجھتے ہیں کہ وہ اُن کی سفارش کو رد نہیں کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، اُس کی مشیت میں کوئی دم نہیں مار سکتا بلکہ اُس کا فرمان تو یہ ہے "مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ" (البقرہ) اُس کے حکم کے بغیر تو کوئی ذات اس کے سامنے سفارش کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتی چہ جائیکہ اُس سے کوئی بات زبردستی منوا سکے۔

(۲)
جائز وسیلہ

البتہ ذات کا ایک توسل جائز بھی ہے مثلاً کوئی شخص مستعان اور معبود صرف ذاتِ حق کو سمجھتے ہوئے یوں کہے کہ اے اللہ! ملائکہ، انبیاء یا اولیاءؒ کے وسیلے سے میری یہ حاجت پوری کر دے۔ کسی نبی، ولی یا قبر والے سے براہِ راست طلب کرنا تو بلاشبہ شرک ہے مگر اُن کا محض وسیلہ ڈالنا روا ہے۔ حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے تقویۃ الایمان میں لکھا ہے کہ لوگ یہ وظیفہ پڑھتے ہیں "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ" یعنی اے پیر عبدالقادر جیلانی خدا کے واسطے سے ہمیں کوئی چیز دے دے فرماتے ہیں یہ غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کسی کے سامنے وسیلے کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر اس وظیفہ کو الٹ دیا جائے اور یوں کہا جائے۔ "یا اللہ شیئاً لشیخ عبدالقادر جیلانی" یعنی اے اللہ! شیخ عبدالقادر جیلانی کے وسیلے سے ہماری حاجت پوری کر دے تو یہ درست ہوگا۔ اسی طرح کوئی شخص کہتا ہے کہ اے اللہ! سید علی ہجویریؒ کی برکت سے میرا یہ کام کر دے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سیدؒ تیرا ایک مقبول بندہ تھا، میں اُن کو اپنا ہادی و رہنما سمجھ کر ان سے محبت کرتا ہوں۔ میری اُن سے محبت اور تعلق ہی میرا عمل ہے جس کا میں وسیلہ پیش کر رہا ہوں، لہٰذا میری مراد پوری فرما دے اس وسیلہ کو علمائے دیوبند بالاتفاق جائز قرار دیتے ہیں۔ مولانا حسین علیؒ واں بھچراں والے فرماتے ہیں کہ کسی نیک آدمی کی ذات کے ساتھ جو تعلق ہوتا ہے، وہ ایمان، اتباع اور محبت کی وجہ سے ہوتا ہے، اور یہی محبت اور حسنِ عقیدت اللہ کی بارگاہ میں بطور وسیلہ پیش کرنا

بالکل درست ہے۔ اور یہ دراصل اعمال ہی کا وسیلہ ہوتا ہے۔
اب ذات کا وسیلہ کسی نیک اور مقرب ہستی کی زندگی میں بھی روا ہے اور وفات کے بعد بھی۔ زندگی میں نبی یا ولی یا کسی بزرگ سے دعا کرائی جائے گی اور اُن کی وفات کے بعد محض توسل پیش کیا جائے گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وسیلے کی کیا ضرورت ہے؟ بھئی! درست ہے، بیشک براہ راست دُعا مانگو، لیکن اگر کوئی درمیان میں وسیلہ ڈالتا ہے تو اس میں حرج کیا ہے؟ دیکھو! حضرت مجدد الف ثانیؒ کی دعاؤں میں یہ الفاظ موجود ہیں "بحرمت النبی وآلہٖ" یعنی اے اللہ! نبی اور آپ کی آل کی حرمت سے ہماری فلاں مراد پوری کر دے۔ بخاری شریف میں حضرت عمرؓ کا یہ عمل موجود ہے کہ قحط کے زمانے بارش کی دُعا کے لیے حضرت عباسؓ کا وسیلہ پکڑا۔ عرض کیا۔ اے اللہ! پہلے ہم نبی علیہ السلام کا توسل پکڑتے تھے، آپ کی زندگی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دُعا کی درخواست کیا کرتے تھے، اب وہ ہم میں موجود نہیں لہذا ہم تیرے نبی کے چچا کا توسل کر رہے ہیں۔ لہذا باران رحمت نازل فرما۔
بعض کہتے ہیں کہ یہ تو زندگی میں توسل ہے۔ وفات کے بعد کیسے جائز ہوا؟ تو عرض ہے کہ ترمذی شریف کی صحیح حدیث میں عثمان ابن حنیفؓ کی روایت موجود ہے کہ انہوں نے اس طرح دُعا کی کہ اے اللہ! میں تیرے نبی رحمت کا واسطہ پیش کرتا ہوں کہ اُن کی وجہ سے میری حاجت پوری فرما۔ البتہ کسی نبی یا ولی سے اللہ کے علاوہ براہِ راست طلب کرنا شرک میں داخل ہے۔ اُن کو یہود و مشرکین کی طرح شفیع قاہر ماننا بھی سراسر گمراہی ہے۔

ہر بستی کی ہلاکت

ارشاد ہوتا ہے وَإِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ إِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اور کوئی بستی نہیں ہے مگر ہم اسے قیامت

سے پہلے ہلاک کرنے والے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس ہلاکت کا مطلب یہ ہے کہ یا تو ہم سزا کے طور پہ قحط، وبا، طوفان یا زلزلہ وغیرہ بھیج کر کسی بستی کو ہلاک کر دیں گے یا پھر ساری بستیاں طبعی طور پہ ہلاک ہو جائینگی۔ صحیح حدیث میں آتا ہے اٰخِرُ الْبُلْدَانِ خَرَابًا اَلْمَدِیْنَۃُ یعنی قیامت سے پہلے سب سے آخر میں ختم ہونے والی بستی مدینہ ہوگی۔ فرمایا چرواہے اپنی بکریاں شہر کی طرف لا رہے ہوں گے، شہر میں الّو بول رہے ہوں گے، قیامت کا طوفان بپا ہو چکا ہوگا۔ اور وہ بھاگ کر شہر کی طرف آ رہے ہوں گے۔ وہ چرواہے ثنیۃ الوداع کے مقام پہ پہنچیں گے، تو وہیں گر کر ہلاک ہو جائیں گے۔ مطلب یہ کہ سزا کے طور پہ یا طبعی طور پہ ہر بستی ہلاک ہوگی۔ اور مدینہ طیبہ سب سے آخر میں ہلاک ہوگا۔

بعض مشرکوں کا یہ عقیدہ ہے کہ فلاں فلاں ہماری بستیوں کے شاہ ولایت ہیں جو ہماری مصیبتوں کو ٹالتے رہتے ہیں۔ بعض جنات کے متعلق ایسا عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ سب غلط ہے۔ کوئی شاہ ولایت کسی کا دکھ دور نہیں کر سکتا اور نہ آنے والی مصیبت ٹال سکتا ہے۔ بین الاقوامی جنگوں میں کتنی تباہی آتی ہے مگر کوئی شاہ ولایت اس کے آڑے نہیں آتا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں ملکوں کے ملک تباہ ہو گئے فرانس، جرمنی، روس اور بیلجیم وغیرہ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ جب امن ہوا تو پھر آباد ہوئے۔ اب دنیا میں اگلی جنگ ایٹمی جنگ ہوگی، خدا جانے دنیا کا کتنا حصہ تباہ ہوگا۔ جنگ قحط سالی، زلزلہ وغیرہ سب خدا تعالیٰ کی طرف سے سزا ہوتی ہے جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ ملکوں کے ملک تباہ کر دیتا ہے اس قسم کی سزائیں ملتی رہتی ہیں اور پھر آخر میں طبعی طور پر تمام بستیاں ختم ہو جائیں گی۔

فرمایا کوئی بستی ایسی نہیں جسے ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں۔ اَوْ مُعَذِّبُوْھَا عَذَابًا شَدِیْدًا یا اُسے سخت سزا میں مبتلا کریں

فرمایا کَانَ ذٰلِکَ فِی الْکِتٰبِ مَسْطُوْرًا یہ سب کچھ لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں۔ کہ ہر شہر اور بستی کے لوگ ایک ایک بزرگ کو پوجتے ہیں کہ ہم اس کی پناہ میں ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی شاہ ولایت کا تصور عرض کیا۔ مگر وقت آنے پر کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکے گا لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ (ھود) کوئی کسی کو مصیبت سے نہیں بچا سکتا سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ خود مہربانی فرمائے۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿۵۹﴾ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۭ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ﴿۶۰﴾ ع

ترجمہ:۔ اور نہیں روکا ہمیں کہ ہم بھیجیں نشانیاں مگر (اس چیز نے) کہ جھٹلایا ہے اِن (نشانیوں) کو پہلے لوگوں نے اور دی تھی ہم نے قوم ثمود کو ایک اونٹنی ، روشن نشانی پس ظلم کیا انہوں نے اس کے ساتھ اور نہیں بھیجتے ہم نشانیاں مگر خوف دلانے کے لیے ﴿۵۹﴾ اور جب کہ دیا ہم نے آپ کے لیے کہ بیشک آپ کا پروردگار احاطہ کرتا ہے لوگوں کو ، اور نہیں بنایا ہم نے وہ دکھلاوا جو دکھایا تھا آپ کو مگر لوگوں کی آزمائش کے لیے ۔ اور (ایسا ہی) وہ درخت جس پر پھٹکار کی گئی ہے قرآن میں ۔ اور ہم خوف دلاتے ہیں اُن کو ، اور نہیں زیادہ ہوتی ان کے لیے مگر سرکشی بہت بڑی ﴿۶۰﴾

ربط آیات

پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا رد فرمایا کہ وہ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں، وہ نفع نقصان کے مالک نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جو خود اللہ کا قرب تلاش کرتے ہیں، اُس کی رحمت کے امیدوار اور اُس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ پھر اللہ نے قیامت سے پہلے تمام بستیوں کی ہلاکت کا ذکر کیا کہ انہیں سخت سزا دیں گے اور یہ بھی کہ اللہ کے علم میں یہ حتمی فیصلہ ہے کہ ایسا ضرور ہوگا اور نافرمانوں کو اُنکی نافرمانی کی ضرور سزا دی جائیگی۔

شانِ نزول

اب آج پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا رد فرمایا ہے جو حضور علیہ السلام سے طرح طرح کی نشانیاں اور معجزات طلب کرتے تھے۔ اس آیت کے شانِ نزول میں طبرانی اور بعض دوسرے مفسرین نے حضرت سعید ابن جبیرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ سے روایات نقل کی ہیں۔ مشرکین مکہ نے حضور سے کہا کہ آپ خود بتلاتے ہیں کہ پہلی امت کے لوگوں نے اپنے انبیاء سے مختلف قسم کے معجزات طلب کیے، کسی نبی نے مادر زاد اندھوں کو بینا اور مُردوں کو زندہ کیا اور کسی کی لاٹھی نے عجیب و غریب کام کیے لہٰذا آپ بھی ہماری خواہش کے مطابق یہ نشانی ظاہر کریں کہ وہ کوہِ صفا کو سونے کا بنا دیں۔ مکے کی سرزمین خشک پہاڑیوں پر مشتمل ہے، ان پہاڑوں کو ہٹا کر اس زمین میں چشمے اور نہریں جاری کر دیں تاکہ ہم کھیتی باڑی کر سکیں۔ اگر آپ ہماری یہ فرمائش پوری کر دیں تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ اس کے علاوہ بعض دیگر نشانیوں کا ذکر بھی آگے اسی سورۃ میں آ رہا ہے بہرحال ان لوگوں نے ایمان لانے کے لیے یہ پیشگی شرط عائد کر دی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر وحی نازل ہوئی اور اللہ نے فرمایا کہ اے پیغمبر! میں اس بات پر قادر ہوں کہ انکی مطلوبہ نشانیاں ظاہر کر دوں، لیکن آپ ان پر واضح کر دیں کہ یہ نشانیاں پاکر بھی اگر یہ لوگ ایمان نہ لائے تو پھر انکو بھی اسی طرح ہلاک کر دیا جائے گا جس طرح پہلی قوموں کو ہلاک کیا گیا، دوسری بات یہ ہے کہ نشانیاں ظاہر کرنے کی بجائے میں ان کو مہلت دیتا ہوں اور ان کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھتا ہوں تاکہ یہ ایمان لا سکیں

اس پہ حضور علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ مولا کریم! نشانیاں ظاہر کرنے کے بعد ان کو ہلاک کرنے کی بجائے ان کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھ، شاید یہ ایمان لے آئیں۔

تو یہاں پہ اللہ تعالیٰ نے اسی بات کو بیان کیا ہے وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ اور نہیں روکا ہمیں نشانیاں یا معجزات ظاہر کرنے سے مگر اس بات نے کہ ایسی ہی نشانیوں کو پہلے لوگوں نے بھی جھٹلا دیا۔ اور اگر نشانیاں پانے کے باوجود ان لوگوں نے بھی تسلیم نہ کیا۔ تو پھر انہیں بھی ہم ہلاک کیے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ سابقہ انبیاء کے معجزات سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا اور ید بیضا وغیرہ کے معجزات ہیں جنہیں دیکھ کر فرعونی ایمان نہ لائے اور پانی میں غرق کر دیے گئے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مُردوں کو زندہ کرنے، کوڑھیوں کو ٹھیک کرنے اور مادر زاد اندھوں کو بینا کرنے کے معجزات دیکھ کر بھی لوگ ایمان نہ لائے اور طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہوئے۔ آگے خاص طور پر حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا ذکر آ رہا ہے کہ انہوں نے یہ معجزہ خود طلب کیا مگر اللہ کی اس نشانی کو خود ہی قتل کر دیا جس کی وجہ سے سخت عذاب میں مبتلا ہوئے تو اللہ نے فرمایا کہ ان مشرکین کی مطلوبہ نشانیاں ظاہر کرنے سے ہمیں اس بات نے روک رکھا ہے کہ کہیں یہ بھی انکار کر کے عذاب کے مستحق نہ بن جائیں۔

ناقۃ اللہ کی نشانی

ارشاد ہوتا ہے وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً اور ہم نے قوم ثمود کو اونٹنی دی روشن نشانی۔ اگر "مُبْصِرَةً" سے پہلے ایۃً محذوف سمجھ لیں تو مطلب ہوگا۔ ایک ایسی نشانی جو بصیرت پیدا کرنے والی تھی مبصرۃ کا معنی اسبت واضح اور روشن بھی ہوتا ہے۔ گویا

اونٹنی کی نشانی ایک ایسی منہ مانگی نشانی تھی جس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی
فَظَلَمُوا بِهَا مگر اس قوم نے اُس اونٹنی کے ساتھ ظلم کیا اور اُسے ہلاک
کر ڈالا۔ پھر خدا تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور تین دن کی مہلت کے بعد یہ
قوم ہلاک ہوگئی۔ دراصل قوم ثمود نے خود صالح علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہم آپ
پر اس صورت میں ایمان لائیں گے کہ ہمارے سامنے اُس چٹان سے دس ماہ
کی گابھن اونٹنی پیدا ہو اور وہ ہمارے سامنے بچہ جنے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی
یہ فرمائش قبول فرمائی اور اُس پتھر سے اتنی بڑی اونٹنی برآمد ہوئی جو [illegible] فٹ
جگہ پر بیٹھتی تھی۔ اُس کا بچہ بھی کم و بیش اسی قد کاٹھ کا تھا۔ یہ اونٹنی دودھ
بھی بہت زیادہ دیتی تھی جس سے سب لوگ سیراب ہوتے تھے۔ پانی
بھی بہت زیادہ پیتی تھی۔ چنانچہ اس اونٹنی اور باقی جانوروں کے درمیان
پانی کی باری تقسیم ہو چکی تھی۔ سورۃ القمر میں موجود ہے "اَنَّ الْمَاءَ
قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ" ایک دن یہ اونٹنی چشمے کا سارا پانی پی جاتی تھی
جب کہ دوسرے دن باقی سارے جانور پیتے تھے۔ معجزانہ طور پر پیدا ہونے والی
اس اونٹنی کے متعلق اللہ نے حکم دیا ہے "وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوْٓءٍ
فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيبٌ" (ھود) اس اونٹنی کو برائی کے
ساتھ ہاتھ نہ لگانا ورنہ عذاب کے مستحق بن جاؤ گے۔ مگر اُن بدبختوں نے
اللہ کی اس وعید کی پروا نہ کی "وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ
رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ" (النمل) شہر میں نو غنڈے آدمی
تھے جنہوں نے فساد بپا کر رکھا تھا۔ اُن میں سے اُن کے سرغنہ قیدار بن سالف
نے تلوار کے ذریعے اللہ کی اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں جس سے وہ
ہلاک ہوگئی اور پھر قوم پر خدا کا قہر نازل ہوگیا۔ بہرحال اللہ نے فرمایا کہ ہم نے
قوم ثمود کو ایک واضح نشانی اونٹنی کی شکل میں دی مگر انہوں نے اس کے
ساتھ بھی ظلم کیا۔ اللہ نے یہ بات سکھا دی کہ جب کوئی قوم منہ مانگی نشانی پاکر

بھی ایمان نہیں لاتی تو پھر اس کا یہی حشر ہوتا ہے۔ فرمایا ہمیں نشانیاں ظاہر کرنے سے اسی بات نے روک رکھا ہے کہ پہلے لوگ بھی ان کی تکذیب کر کے ہلاک ہوئے۔

نشانی برائے تخویف

فرمایا وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰیٰتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا ہم نہیں نشانی بھیجتے مگر خوف دلانے کی غرض سے تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نشانیاں طلب کرنا محض نہ ماننے کا بہانہ ہوتا ہے۔ وگرنہ سچے لوگ بغیر نشانی دیکھے ہی ایمان لے آتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے بعض دیگر مواقع پر بھی لوگوں کی تخویف کی ہے مثلاً چاند اور سورج گرہن کے متعلق فرمایا اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰیَتَانِ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ لَا یَنْخَسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَّلَا لِحَیَاتِہٖ فَاِذَا رَاَیْتُمْ ذٰلِکَ فَادْعُوا اللّٰہَ وَکَبِّرُوْا وَصَلُّوْا وَتَصَدَّقُوْا (صحیحین) سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ ان کا گہن کسی کی موت یا زندگی کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ لہٰذا جب تم ایسی چیز دیکھو تو اللہ تعالیٰ کو پکارو۔ اس کی بڑائی بیان کرو۔ نماز کی طرف رجوع کرو اور صدقہ خیرات کرو۔ دوسری حدیث میں آتا ہے فَافْزَعُوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَدُعَآئِہٖ وَاسْتِغْفَارِہٖ ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ کے ذکر، دعا اور استغفار کی طرف جلدی کرو۔ مطلب یہ کہ ایسی چیزیں اللہ تعالیٰ کا خوف دلانے کے لیے ظاہر ہوتی ہیں کہ جب سورج اور چاند جیسی بڑی بڑی چیزیں بھی گہنا سکتی ہیں تو انسان تو ایک حقیر سی چیز ہے، اس کی کیا حیثیت ہے۔ لہٰذا ہر وقت اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیئے کہ کہیں اس کی گرفت نہ آجائے۔ افسوس کا مقام ہے کہ جدید دنیا کے لوگ اللہ سے ڈرنے کی بجائے ایسے مواقع پر سورج یا چاند کی توڑ تاڑ نا شروع کر دیتے ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ سے بے خوفی

کی علامت اور اس کے غضب کو دعوت دینے والی بات ہے۔
فرمایا وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ
اور جب کہ ہم نے کہہ دیا کہ بیشک آپ کے پروردگار نے لوگوں کا
احاطہ کر رکھا ہے یعنی وہ سب کے حالات سے پوری طرح باخبر ہے
اور جس طرح چاہے ان کے ساتھ سلوک کرنے پر قادر ہے آپ گھبرائیں
نہیں اللہ تعالیٰ ان مکذبین کو سزا دیئے بغیر چھوڑے گا نہیں۔

واقعہ معراج بطور آزمائش

سورۃ ہذا کی پہلی آیت میں واقعہ معراج بیان ہوا تھا۔ اب اس آیت
کریمہ میں اسی واقعہ کو مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَمَا
جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ
اور نہیں بنایا ہم نے دکھلانے کو جو آپ کو دکھلایا گیا تھا مگر لوگوں کے
لیے آزمائش۔ دکھلانے سے مراد واقعہ معراج اور اس سے متعلقہ تمام
مشاہدات ہیں جو آپ کو رات کے ایک تھوڑے سے حصے میں کرائے
گئے۔ چونکہ مشرکین مکہ اس واقعہ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور اس
کے خلاف پراپیگنڈا کرتے تھے تو اللہ نے فرمایا یہ واقعہ ان کے لیے آزمائش
کا سبب بن گیا۔ اہلِ ایمان نے تو فوراً تسلیم کر لیا مگر منافقین الٹا طعنہ
زنی کرنے لگے۔

رؤیا کا اطلاق خواب پر بھی ہوتا ہے اور بیداری میں ظاہری آنکھ سے
دیکھنے پر بھی۔ مگر یہاں پر اس سے مراد خواب نہیں بلکہ آنکھ سے دیکھنا ہے
تفسیر درمنثور اور تفسیر مظہری وغیرہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت
منقول ہے رُؤْيَا عَيْنٍ اُرِيَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمِعْرَاجِ وَالْاِسْرَاءِ یعنی جو واقعہ
اللہ نے معراج کی رات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دکھایا۔ وہ آنکھ کا دکھلاوا
تھا نہ کہ خواب کا واقعہ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جنت، دوزخ، سدرۃ المنتہیٰ

عالم بالا، انبیاء سے ملاقات وغیرہ حالت بیداری میں ظاہری آنکھ سے دکھلا دیئے
تھے۔ اس پر سب سے بڑا قرینہ یہ ہے کہ کسی چیز کا خواب میں دیکھنا تو کوئی
حقیقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ انسان خواب میں بہت کچھ دیکھنے کے باوجود
اس پر تعجب نہیں کرتا۔ اگر مشرکین ایسے خواب کا واقعہ سمجھتے تو اتنا واویلا
نہ کرتے اُن کو تو مخالفت کا موقع ہی اس لیے ملا کہ حضور علیہ السلام نے
تمام واقعات بالمشافہ دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔

بعض گمراہ فرقے بھی اسے خواب پر محمول کرتے ہیں۔ اُن کی دلیل
یہ ہے رُؤْيَا الْأَنْبِيَاءِ وَحْيٌ یعنی انبیاء علیہ السلام کے خواب سچے
ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب ہی میں بیٹے کو ذبح
کرنے کا حکم ہوا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب من وعن سچا ثابت
ہوا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض خوابوں کا ذکر قرآن پاک میں
موجود ہے۔ حضور علیہ السلام نے عمرہ کرنے کے متعلق سورۃ الفتح میں
موجود ہے لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ اللہ نے
اپنے رسول کا خواب سچا کر دکھایا۔ بہرحال معراج کا واقعہ خواب میں پیش
نہیں آیا تھا۔ بلکہ یہ ایک حقیقت تھی۔ اس بارے میں پرویز، سرسید
اور اصلاحی وغیرہم کا استدلال درست نہیں ہے کیونکہ جمہور محدثین اور مفسرین
اس بات کے قائل ہیں کہ واقعہ معراج حالت بیداری میں پیش آیا۔ احادیث
میں پینتالیس ۴۵ صحابہ کرام سے یہ واقعہ منقول ہے اور اس کا ذکر حضور علیہ السلام
نے مختلف مجالس میں بار بار کیا ہے۔ غرضیکہ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے اس
واقعہ کو آزمائش کا سبب بنا دیا کہ کون اس کی تصدیق کرتا ہے اور کون
اس کا انکار کر دیتا ہے۔

شجرہ ملعونہ

فرمایا ایک تو واقعہ معراج کو آزمائش بنایا اور دوسرا وَالشَّجَرَةَ
الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ اس درخت کو بھی ذریعہ آزمائش بنا دیا

جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے۔ ملعون کا معنیٰ اللہ کی رحمت سے دوری ہے
اس سے مراد تھوہر کا درخت ہے جس کے متعلق فرمایا "لَآكِلُوْنَ
مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ" (الواقعہ) جھٹلانے والے گمراہ
لوگوں کو کھانے کے لیے تھوہر دیا جائے گا۔ بہت کڑوا اور بدبودار
تھوہر ہوگا جسے اس دنیا کے تھوہر پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ تھوہر کے
درخت کو رحمتِ خداوندی سے اس لحاظ سے بھی دوری ہے۔ کہ یہ
درخت "فِيْ اَصْلِ الْجَحِيْمِ" جہنم کے گہرے گڑھے میں ہوگا۔
جو خدا کی رحمت سے بہت ہی بعید ہوگا۔ ملعون سے یہ مراد بھی لیا جا
سکتا ہے کہ اس درخت کو کھانے والے لوگ ملعون ہوں گے۔ اس لیے
اسے شجرِ ملعونہ کہا گیا ہے

ابوجہل اور اس کی پارٹی نے یہ اعتراض کیا تھا کہ مسلمان کہتے ہیں کہ جہنم
آگ کا گڑھا ہوگا اور اس کے ساتھ وہاں پر درخت کی موجودگی کو بھی مانتے
ہیں، بھلا آگ اور درخت اکٹھے کیسے ہو سکتے ہیں؟ پھر کہتے کہ ہم زقوم
کھجور اور مکھن کے مرکب کو کہتے ہیں، چنانچہ وہ دونوں چیزیں منگواتے
____ اور کھجوریں اور مکھن ملا کر کھاتے اور کہتے کہ ہم زقوم کھا رہے ہیں
اس قسم کا تمسخر بھی کرتے۔ جہاں تک آگ کے اندر درخت کی موجودگی کا
تعلق ہے یہ تو اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے ہے۔ وہ جو چاہے کرے
اسے کون کسی کام سے روک سکتا ہے؟ تاہم اس قسم کی بعض مثالیں دنیا
میں موجود ہیں۔ مثلاً مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ترکی کے بعض علاقوں میں
سمندل نامی پرندہ ہوتا ہے جس کے جسم کی پشم سے کپڑا تیار کیا جاتا ہے
مگر حیران کن بات یہ ہے کہ اگر اس پرندہ کو آگ میں پھینک دیا جائے تو
وہ جلنے سے محفوظ رہتا ہے۔ اور یہ آگ میں اسی طرح خوش ہوتا ہے
جس طرح مچھلی پانی میں ہوتی ہے آپ شتر مرغ کو دیکھ لیں۔ یہ جانور جلتا

ہوا کو بلکہ لوہے کا سرخ گرم گولہ یا سلاخ نگل جاتا ہے اور اس پر کوئی منفی اثر نہیں ہوتا۔ اسی طرح جہنم کی آگ میں درخت کا ہونا بھی بعید از قیاس نہیں۔ جو لوگ اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھتے ہیں، وہ اللہ کی قدرت کے سامنے سر تسلیم خم کر لیتے ہیں جب کہ اسکی وحدانیت کے منکر ہمیشہ شک وارتیاب میں پڑے رہتے ہیں۔ خدا کی قدرت کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کے متعلق فلسفہ تاریخ کے امام ابن خلدون کا کہنا ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سنار کے نرم و نازک کانٹے پر پہاڑ کو تولنا چاہے۔ ایسا ہی ان واقعات کو اپنے ترازو میں تولنا نہایت بے سمجھی کی بات ہے۔ اگر یہ چیز عقل میں نہیں آتی تو اسے چھوڑ دو۔ اس پر ایمان لانا ہی کافی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ہم نے واقعہ معراج اور تھوہر کے درخت کو لوگوں کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنا دیا ہے۔

سرکشی میں اضافہ

فرمایا ہم اس قسم کے واقعات بیان کر کے اور لوگوں کو آزمائش میں ڈال کر وَنُخَوِّفُهُمْ اُن کو خوف دلاتے ہیں۔ مگر یہ مشرک، کافر اور بدعقیدہ لوگ اس سے خوفزدہ نہیں ہوتے فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا طُغْيَانًا كَبِيرًا بلکہ ان کی سرکشی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ تمام نشانیاں اور معجزات دیکھنے کے باوجود اُن کے دل، نیت اور عزائم فاسد رہتے ہیں۔ جو کہ سرکشی میں مزید اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔ وہ ایمان لانے کی بجائے طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ کوئی کاہن کہتا ہے کوئی شاعر اور کوئی جادوگر۔ چاند کو دو ٹکڑے ہوتا دیکھا تو کہنے لگے "سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ" (القمر) یہ تو چلتا ہوا جادو ہے جو پہلے بھی ہوتا تھا اور اب بھی چلتا ہے، فرمایا، آپ فکر نہ کریں، اللہ ان سب کا احاطہ کرنے والا ہے، وہ ہر ایک کے ساتھ اس کے فکر، عقیدے اور عمل کے مطابق سلوک کرے گا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ
اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ﴿٦١﴾
قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۡ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ
اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا
قَلِيْلًا ﴿٦٢﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ
فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿٦٣﴾ وَاسْتَفْزِزْ
مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ
بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ
وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿٦٤﴾
اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى
بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿٦٥﴾

ترجمہ:۔ اور (اس بات کو بھی دھیان میں لاؤ) جب کہا ہم
نے فرشتوں سے کہ سجدہ کرو آدم علیہ السلام کے لیے ۔
پس سجدہ کیا انہوں نے مگر ابلیس نے ۔ کہا (ابلیس نے)
کیا سجدہ کروں میں اُس کے لیے جس کو پیدا کیا ہے تو
نے مٹی سے ﴿٦١﴾ اُس نے کہا ، بھلا بتلائیں یہ شخص
ہے جس کو تو نے بزرگی بخشی ہے مجھ پر ۔ اگر تو مہلت

دے گا مجھے قیامت تک ، تو میں قابو کروں گا اس کی اولاد کو مگر بہت تھوڑے (۶۲) فرمایا (اللہ نے) جاؤ ، جو پیروی کریگا اِن میں سے تیری ، پس بیشک جہنم تمہارا بدلہ ہو گا پورا پورا بدلہ (۶۳) اور قابو کرلو جس کو تم طاقت رکھتے ہو اِن میں سے تم اپنی آواز کے ساتھ اور کھینچ کر لاؤ اُن کے اُوپر اپنے سوار اور پیدل ، اور شریک ہو اِن کے ساتھ مالوں میں اور اولاد میں اور اِن کو وعدہ دے ۔ اور نہیں وعدہ دیتا شیطان مگر دھوکے کا (۶۴) بیشک میرے بندے نہیں ہے تیرے لیے اُن پر غلبہ ، اور کافی ہے تیرا پروردگار کارساز (۶۵) ۔

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کا رد فرمایا اور اُن کے بیہودہ اعتراضات کا جواب دیا ۔ اُن کی منہ مانگی نشانیوں کے متعلق واضح کیا کہ وہ سخت عذاب میں مبتلا ہو سکتے ہیں ۔ اللہ نے یاد دلایا کہ وہ سب لوگوں کا احاطہ کرنے والا ہے اور کوئی فردِ واحد اس کی پہنچ سے باہر نہیں ہے ۔ پھر اللہ نے واقعہ معراج کے تذکرہ میں بتایا کہ یہ واقعہ لوگوں کے لیے ذریعہ آزمائش بن گیا اور اسی طرح دوزخ کا درخت ملعونہ بھی ایمانداروں اور بے ایمانوں کے لیے وجہ امتحان بن گیا ۔ فرمایا اس قسم کی نشانیاں ہم محض خوف دلانے کے لیے ظاہر کرتے ہیں مگر یہ لوگ تعصب میں مزید اندھے ہو جاتے ہیں ۔

ابلیس کا انکارِ سجدہ اور چیلنج

گمراہ لوگوں کی گمراہی کی دو بڑی وجوہات ہیں ۔ ایک تو خود ان کی ذات میں سرکشی کا مادہ پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ گمراہ ہوتے ہیں اور دوسری وجہ شیطان کی وسوسہ اندازی ہے جو لوگوں کے دِلوں میں ڈالتا رہتا ہے ۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے شیطان کی سرکشی اور لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کا تذکرہ فرمایا

ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ
اور اس بات کو دھیان میں لاؤ جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم علیہ السلام
کے لیے سجدہ کریں فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ تو ان سب نے سجدہ کیا
سوائے ابلیس کے۔ اس نے نہ صرف اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کی بلکہ اتراتے
ہوئے بولا قَالَ ءَ اَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا کیا میں ایسی
ذات کے سامنے سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ؟ دوسری جگہ ہے
کہ پروردگار ! تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا۔ اور آدم کو مٹی سے، تو بھلا
میں اعلیٰ ہو کر ادنیٰ کے سامنے کیسے سجدہ کر سکتا ہوں ؟ پھر مزید حقارت
سے کہا قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ذرا بھلا
بتلائیں، دیکھیں تو سہی کہ یہ شخص ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت بخشی ہے
اَرَءَيْتَكَ میں ک تاکید کے لیے ہے اور مطلب ہوتا ہے اَخْبِرْنِيْ
مجھے بتلائیں، خبردار کریں۔ تو شیطان نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ یہ
بات کی۔ پھر اس نے چیلنج کر دیا لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ
الْقِيٰمَةِ اے اللہ ! اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت
دے دے لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا تو میں آدم علیہ السلام
کی اولاد کو پوری طرح قابو میں کر لوں گا مگر بہت تھوڑے احتناک
کا معنی استحصال بھی ہوتا ہے یعنی اولاد آدم کی جڑ بنیاد اکھاڑ دوں گا۔
جب کسی جانور کو قابو کرنے کے لیے اس کے نچلے جبڑے میں رسی ڈال دی
جاتی ہے یا گھوڑے کو لگام دے دی جاتی ہے تو اسے بھی حناک کہا جاتا ہے
شاہ عبد القادرؒ اس کا معنی ڈھانٹی لگانا کرتے ہیں۔ جب گدھے کو کھانے
پینے سے روکنا مقصود ہو تو اس کے منہ کے اردگرد رسی باندھ دی جاتی ہے
ہندی محاورے میں اسے ڈھانٹی لگانا کہتے ہیں۔ مطلب یہی ہے کہ شیطان
نے چیلنج کر دیا کہ اگر اسے قیامت تک مہلت دے دی جائے تو وہ اولاد

آدم کو پوری طرح قابو میں کر لیگا۔ اور اُسے اللہ کے راستے کی طرف نہیں جانے دیگا۔ سورۃ اعراف میں شیطان کا یہ بیان اس طرح منقول ہے "قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ" اے مولا کریم! چونکہ تو نے مجھے گمراہ ٹھہرا ہی دیا ہے تو اب میں اولادِ آدم کے راستے میں بیٹھوں گا۔ اور انہیں صراطِ مستقیم اختیار نہیں کرنے دوں گا

اللہ کی طرف سے مہلت

قَالَ اذْهَبْ اللہ نے فرمایا، اچھا جاؤ۔ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اولادِ آدم میں سے جو کوئی تیری پیروی کریگا فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا تو جہنم تمہارا بدلہ ہوگا۔ جو کہ پورا پورا بدلہ ہوگا۔ تمہارے اعمال و کردار کی یہی سزا ہوگی۔ فرمایا جاؤ تمہیں اجازت ہے وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ تم ان میں سے جس پر طاقت رکھتے ہو قابو پالو۔ انسانوں کو ورغلانے کی حتی الامکان کوشش کر لو۔ استفزاز کا معنیٰ ہلکا کرنا اور کمزور بنا کر قابو پالینا ہوتا ہے۔ اس کا معنیٰ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جسے کمزور خیال کرتے ہو اس پہ قابو پالو۔

آگے اللہ تعالیٰ نے شیطان کی طرف سے اولادِ آدم کو بہکانے کے لیے چار ذرائع کا ذکر فرمایا ہے یعنی آواز کے ذریعے، اپنا لاؤ لشکر چڑھا کر ان کے مال و اولاد میں شراکت کر کے اور ان سے جھوٹے وعدے کر کے فرمایا جاؤ تمہیں اجازت ہے، ان تمام ذرائع سے اولادِ آدم کو گمراہ کر کے دیکھ لو تمہیں اس کام کے لیے قیامت تک کے لیے مہلت دی جاتی ہے

غلبہ بذریعہ آواز

شیطان سے فرمایا، ان پہ قابو پا لے بِصَوْتِكَ اپنی آواز کے ساتھ۔ آواز سے مراد شیطان کی دعوت اور اس کی وسوسہ اندازی ہے اس کے علاوہ ہر بُرا نعرہ اور بُری دعوت صوتِ شیطانی میں داخل ہے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے غنا اور آلات موسیقی بھی مراد ہیں۔ اس زمانے میں ریڈیو اور ٹیلیویژن کے ذریعے گانے اور موسیقی کی آواز

ہر گھر میں پہنچ رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس سے انسان کے فطری جذبے کی تسکین ہوتی ہے۔ بھائی! فطری باتیں بھی کسی حد تک ہوتی ہیں چوبیس گھنٹوں میں اٹھارہ گھنٹے تک گانے بجانے سے فطری تسکین حاصل کرتے رہے تو باقی امور اور آرام کے لیے کون سا وقت بچے گا۔ ساز و آواز تو ان کے ہیجانہ جذبات کو ابھار کر انسان کو گناہ کی طرف مائل کرتی ہے یہ شعر و شاعری جو گانے کی بنیاد ہے خود شیطان کا آلہ ہے جس کے ذریعے وہ لوگوں کو شہوانیت کی طرف مائل کرتا ہے۔ آگے سورۃ الشعرآء میں آئیگا وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ شاعروں کے اکثر پیروکار گمراہ لوگ ہوتے ہیں، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سرگرداں پھرتے ہیں اور وہ کچھ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔ فرمایا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا البتہ وہ شعراء مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے، جنہوں نے نیک کام کیے اور جو خدا تعالیٰ کو یاد کرتے رہے ایسے لوگ تو ہزاروں میں اکا دکا ہی ملیں گے ورنہ اکثریت کا تعلق پہلے گروہ سے ہی ہے۔ اہل ایمان شعراء میں سے حضرت حسان بن ثابتؓ کا نام سر فہرست ہے۔ زمانہ جاہلیت میں تو ان کا کلام دیگر شعراء سے مختلف نہ تھا مگر اسلام کی دولت نصیب ہونے پر ان میں مکمل انقلاب پیدا ہوا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تعریف میں مستند شعر کہے۔ بعد کے دور میں جامی اور سعدی جیسے شعراء پیدا ہوئے۔ ہمارے دور میں اقبال کو یہ اعزاز حاصل ہوا ورنہ عام طور پر تو دیوان شیطانی آواز سے ہی بھرے ہوئے ہیں۔ وہی عشق و محبت کی داستانیں اور اخلاق سوز کلام ہر زبان اور ہر دور میں ملتا ہے۔ یہی شیطانی آواز ہے۔

بعض آثار میں آتا ہے کہ شیطان نے عرض کیا، پروردگار! اگر تو نے رسول بھیجے کتابیں نازل کیں، تو اب میرا کیا بنے گا۔ اللہ نے فرمایا کہ تیرے

لیے یہ شعر و شاعری جو موجود ہے، تو اس کے ذریعے اپنا کام کرتا رہ اور لوگوں کو ورغلاتا رہ۔

شریعت محمدی نے گانے بجانے کو اس قدر مذموم قرار دیا ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن پاک جیسی مقدس کتاب بھی گانے کی طرز پر پڑھے گا۔ تو مکروہ تحریمی کا مرتکب ہو کر گنہگار ہو گا۔ البتہ اچھی آواز اور خوش الحانی کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت باعث اجر و ثواب ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسی خوش الحانی عطا فرمائی تھی کہ جب آپ زبور کی تلاوت کرتے تھے تو آپ کے ساتھ پہاڑ اور پرندے بھی تسبیح و تحمید میں شامل ہو جاتے تھے۔ بہر حال شیطان کی دعوت، وسوسہ اندازی اور پھر گانا بجانا آلات موسیقی اور شعر و شاعری شیطانی حربے ہیں جن کے ذریعے وہ اولاد آدم کو ورغلاتا ہے۔

لاؤ لشکر کا استعمال

اللہ نے فرمایا کہ تم اپنی آواز کا جادو جگا کر لوگوں کو گمراہ کر لو۔ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِم بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ اور سوار اور پیادے بھی ان پر کھینچ کر لے آؤ تاکہ اولاد آدم کو گمراہ کر کے صراط مستقیم سے ہٹا سکو۔ جب دو قبیلوں یا دو جماعتوں کے درمیان جنگ ہوتی ہے، تو پھر ہر فریق اپنے تمام وسائل استعمال کر کے دشمن پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے، وہ اپنے گھڑ سوار بھی لے آتا ہے اور پیدل فوج کو بھی مارچ کا حکم دیتا ہے۔ موجودہ زمانے میں ہوائی جہاز، توپ خانہ، بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک سبھی کچھ میدان جنگ میں جھونک دیا جاتا ہے تو اللہ نے شیطان کو بھی کہا کہ تم انسانوں کے خلاف جنگ میں پورے وسائل استعمال کر کے دیکھ لو۔ اپنی تمام فوجوں کو ان پر چڑھا لاؤ اور پھر دیکھو کہ کون تمہارے پھندے میں پھنستا ہے۔

مال کی شراکت

اللہ نے شیطان سے فرمایا کہ اولاد آدم کو ورغلانے کے لیے تیرے پاس ایک حربہ یہ بھی ہے وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ کہ ان کے مالوں میں شراکت اختیار کر۔ شیطان کی مال میں شراکت کا مطلب یہ ہے

کہ مال حرام راستے سے حاصل کیا جائے اور حرام اور مکروہ راستے میں خرچ کیا جائے۔ اسراف و تبذیر، رسم و رواج، لہو و لعب، کھیل تماشے، سینما اور تھیٹر اور بدعات میں خرچ کرنا، شیطان کو شریک کرنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح جو مال رشوت، سمگلنگ، خیانت، ڈاکہ زنی اور حق تلفی کے ذریعے حاصل کیا جائے، اس میں بھی شیطان کی شراکت ہوتی ہے کیونکہ وہی ایسے کاموں کی ترغیب دیتا ہے اور ناجائز امور کو مزین کر کے دکھاتا ہے۔ اللہ کے نبیوں نے لوگوں کو کہا ہے "بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (ھود۔۸۶) تمام حقوق ادا کرنے کے بعد جو مال بچ رہے تمہارے لیے وہی بہتر ہے اگر تم سچے مومن ہو۔ اللہ نے فرمایا "لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" (البقرۃ) ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔ غرضیکہ اسلام نے کسب اور خرچ دونوں جگہ پہ پابندی لگائی ہے اور جو شخص اس پابندی کی پاسداری نہیں کرتا، اس کے مال میں شیطان حصے دار ہوتا ہے اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ جاؤ مال کے ذریعے بھی اولادِ آدم کے ساتھ شریک ہو جاؤ۔

اولاد میں شراکت

پھر فرمایا "وَالْاَوْلَادِ" تم اولاد میں بھی انسانوں کے ساتھ شراکت کر کے انہیں بہکانے کی کوشش کرلو۔ امام بیضاوی اور دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ شیطان کی اولاد میں شراکت یہ ہے کہ وہ وسوسہ اندازی کر کے انسان کو حرام راستے سے اولاد پیدا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ زنا کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد میں شیطان کی شراکت ہوگی۔ اگر اولاد صحیح النسل بھی ہو تو ان کے مشرکانہ نام رکھ کر شیطان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اسی طرح بیٹے یا بیٹی کی پیدائش پر غیر اللہ کی نذر و نیاز دے کر شیطان کو اپنے ساتھ شریک کیا جاتا ہے۔ بیٹا خدا نے دیا مگر نیاز علی ہجویریؒ، خواجہ اجمیریؒ یا بہاؤالحق زکریا ملتانیؒ کی دی جا رہی ہے بعض لوگ کسی بزرگ کے نام کی

چوٹی بچے کے سر پہ رکھ لیتے ہیں، کبھی جسم پر کوئی خاص نشان لگا لیتے ہیں۔ یہ سب شیطانی وسوسہ کا نتیجہ ہوتا ہے جو انہیں اس قسم کی شرک اور بدعتی افعال پر ابھارتا ہے اور یہی شیطان کی شراکت ہے۔

شیطان کے جھوٹے وعدے

اللہ نے فرمایا، لوگوں کو بہکانے کے لیے وَعِدْهُمْ ان سے جھوٹے وعدے بھی کر کے آزما لو۔ شیطان بُری چیزوں کے متعلق ایسا فلسفہ گھڑتا ہے اور انہیں ایسا مزین کر کے دکھاتا ہے کہ لوگ اس کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ کہتا ہے کہ ترقی اسی بات میں ہے کہ عورتیں بے پردہ ہو جائیں اور غیر مردوں کے ساتھ سرِ عام خلط ملط ہوں، عزت اسی میں ہے کہ شادی بیاہ کی رسوم میں دل کھول کر اسراف کیا جائے۔ تقربِ الٰہی اور محبتِ رسول کا ذریعہ بدعات ہی رہ گئی ہیں۔ شیطان اس قسم کے غلط کاموں پر لوگوں کو لگا کر وعدہ کرتا ہے کہ اسی میں تمہاری دنیا میں عزت ہے اور اسی کے ذریعے تم آخرت میں فلاح پاؤ گے۔ مگر اللہ نے فرمایا، وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا اور نہیں وعدہ دیتا انہیں شیطان مگر دھوکے کا۔ جب شیطان جھوٹے وعدے کرتا ہے اور لوگوں کو سبز باغ دکھاتا ہے تو احمق لوگ اس کے فریب میں آجاتے ہیں مگر قیامت والے دن صاف مکر جائے گا اور کہے گا کہ میں نے تو تمہیں غلط راستے کی طرف صرف دعوت دی تھی۔ مگر ساری غلط کارروائی تو تم نے خود کی۔ میں نے تو وعدہ کیا تھا اور تم نے انبیاء کی بات ٹھکرا کر میرے وعدے پر یقین کر لیا، اب خود اپنے آپ کو ملامت کرو، میں تم سے بری الذمہ ہوں۔ بہرحال اللہ نے شیطان سے فرمایا کہ اولادِ آدم کو اغوا کرنے کے یہ سارے ذرائع تمہارے پاس ہیں، اب تو ان کو آزماتا رہ۔

عباد اللہ محفوظ رہیں گے

مگر یاد رکھو! اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ جو میرے خاص بندے ہیں ان پر تو غلبہ نہیں پا سکے گا۔ وہ تیرے جھانسے

میں نہیں آئیں گے کیونکہ ان کا تعلق اللہ کے ساتھ ہر وقت درست ہوتا ہے
وہ اپنے ایمان اور استقامت کی فکر کرتے رہیں گے اور شیطان ان پر غلبہ حاصل
نہیں کر سکے گا کیونکہ ایمان، ذکر الٰہی، عبادت، نیکی اور اطاعت ایسی چیزیں
ہیں جو شیطانی اثرات سے محفوظ رکھتی ہیں۔ جب بھی شیطان وسوسہ اندازی
کی کوشش کرتا ہے تو اللہ کے نیک بندے فوراً متنبہ ہو جاتے ہیں۔ اللہ
کا فرمان ہے "وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ
فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ" (الاعراف ... ۲۰۰) جب بھی شیطان چھیڑ چھاڑ کرے
یعنی وسوسہ ڈالے تو فوراً اللہ کی پناہ پکڑو اور لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ
کہہ کر شیطان کی بات کو رد کر دو۔

مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا
اَلْمُؤْمِنُ لَيُنْضِيْ شَيَاطِيْنَهٗ كَمَا يُنْضِيْ اَحَدُكُمْ
بَعِيْرَهٗ فِى السَّفَرِ (اوکماقال) یعنی ایماندار آدمی اپنے
شیاطین کو اس طرح کمزور اور لاغر کر دیتا ہے۔ جس طرح آدمی اپنے اونٹ
کی سواری کو سفر کے دوران کمزور کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پرانے زمانے
میں اونٹوں کے ذریعے سینکڑوں میل کا سفر کیا جاتا تھا۔ دوران سفر بھوک
اور پیاس سے اونٹ کمزور ہو جاتے تھے حتیٰ کہ ان کی چربی پگھل جاتی
تھی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت
عمرؓ کے بارے میں فرمایا کہ شیطان تمہیں دیکھ کر گلی تبدیل کر لیتا ہے۔ وہ تم
سے اس قدر دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ بہرحال اللہ نے فرمایا کہ تو اپنے
تمام حربے استعمال کر لے مگر میرے جو مومن بندے ہیں۔ ان پر تو غلبہ
حاصل نہیں کر سکے گا۔ تیرا غلبہ ان لوگوں پر ہوگا جن کا ایمان کامل نہیں، جو
بہیمیت اور شہوت سے مغلوب ہیں، جو کتاب الٰہی اور قیامت پر
یقین نہیں رکھتے اور جو روحانیت سے بے بہرہ ہیں۔

فرمایا وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيلًا اور تیرا پروردگار ہی تیرے لیے کارساز کافی ہے۔ اگر تم اللہ پہ توکل کرو گے تو وہ ہر رنج پہ تمہاری دستگیری کرے گا کیونکہ کارساز وہی ہے۔

رَبُّكُمُ الَّذِىْ يُزْجِىْ لَـكُمُ الْفُلْكَ فِى الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا
مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِـكُمْ رَحِيْمًا ﴿٦٦﴾ وَاِذَا مَسَّكُمُ
الضُّرُّ فِى الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِيَّاهُ ۚ
فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ
الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿٦٧﴾ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ
بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا
ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَـكُمْ وَكِيْلًا ﴿٦٨﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ
اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ
قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ
ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَـكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ﴿٦٩﴾

ترجمہ :- تمہارا پروردگار وہ ہے جو چلاتا ہے تمہارے
لیے کشتیوں کو سمندر میں تاکہ تم تلاش کرو اُس کے فضل
سے۔ بیشک وہ تمہارے ساتھ مہربان ہے ﴿٦٦﴾ اور
جب پہنچتی ہے تمہیں تکلیف سمندر میں تو گم ہو جاتے
ہیں وہ جن کو تم پکارتے ہو، مگر اُسی کی ذات
ہوتی ہے پس جب کہ اُس نے نجات دی تم کو
خشکی کی طرف تو تم اعراض کرتے ہو اور ہے انسان

ناشکر گزار (۶۷) کیا تم بے فکر ہو گئے ہو اس بات سے کہ وہ دھنسا دے تم کو خشکی کے کنارے پر یا بھیج دے تم پر آندھی، پھر تم نہ پاؤ اپنے لیے کسی کو کارساز (۶۸) کیا تم بے فکر ہو گئے ہو اس بات سے کہ لوٹا دے تمہیں دوبارہ اسی (سمندر) میں۔ پس بھیج دے تم پر سخت ہوا۔ پس غرق کر دے تم کو اس وجہ سے کہ تم نے کفر کیا پھر نہ پاؤ گے تم اپنے لیے ہمارے برخلاف کسی کو مطالبہ کرنے والا (۶۹)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کا مضمون بیان فرمایا۔ پھر شیطان کی نافرمانی اور وسوسہ اندازی کا ذکر ہوا کہ جس کے ذریعے وہ انسانوں کو گمراہ کرتا ہے۔ اب آج کی آیات میں ایک تو اللہ تعالیٰ نے بحری نقل و حمل کو اپنی قدرت کی نشانی قرار دیا ہے اور دوسرے اسی مناسبت سے شرک کی تردید فرمائی ہے کہ جب ان کی کشتی بھنور میں پھنس جاتی ہے تو خالص اللہ کو پکارتے ہیں اور جب اس مصیبت سے نجات مل جاتی ہے تو پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ نے وعید بھی فرمائی ہے کہ اگر تم کفر پر اصرار کرتے ہو یا اس کی نعمتوں کی ناشکر گزاری کی تو وہ تمہیں خشکی پر بھی سزا دینے پر قادر ہے۔

بحری سفر کے ذرائع

ارشاد ہوتا ہے رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے لیے کشتیاں اور جہاز سمندر میں چلاتا ہے۔ کشتیاں اور بڑے بڑے جہاز بنانے کا طریقہ بھی اللہ ہی نے انسانوں کو سکھلایا اور پھر ہواؤں کے زور پر ان کو چلانا بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہی ہے۔ پرانے زمانے میں بادبانی جہاز ہوتے تھے جو ہوا کے رخ پر چلتے تھے۔ اب ترقی کے زمانے میں تیل اور بھاپ کے ذریعے ہزاروں ٹن وزنی جہاز سمندر کی سطح پر تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ البتہ جب سمندر

میں طوفان آتا ہے اور اوپر سے بارش بھی اپنا جوہر دکھاتی ہے تو بڑے
بڑے جہاز بھی تنکے کی طرح ہچکولے کھانے لگتے ہیں۔ بڑی بڑی موجیں
اٹھتی ہیں اور تمام تر حفاظتی انتظامات کے باوجود جہاز کے حادثے کا شکار
ہو جانا خارج از امکان نہیں ہوتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی شفقت
کا نتیجہ ہے کہ اسی اسی ہزار ٹن وزنی جہاز اپنے بوجھ سے دگنا وزن اٹھا کر
سمندر کے سینے کو چیرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی
جہازوں میں آگ لگ جانے اور ان کی غرقابی کی داستانیں اخبارات کے
صفحات پر آتی رہتی ہیں۔ آمد و رفت کے جہاں دیگر ذرائع میں ترقی ہوئی ہے
وہاں بحری جہازوں کی نقل و حرکت بھی بہت بڑھ گئی ہے اور یہ جہاز لاکھوں
ٹن وزنی سامان ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک پہنچاتے ہیں تاہم
یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مہربانی کا مرہون منت ہے۔

فضل ربی کی تلاش

فرمایا تمہارا پروردگار تمہارے لیے دریاؤں اور سمندروں میں کشتیاں
چلاتا ہے جس سے مقصود یہ ہے لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ
تاکہ تم اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کر سکو۔ تمام جائز امور کے لیے بحری سفر کرنا فضل ربی
میں شامل ہے۔ مثلاً علم کے حصول کے لیے سفر کرنا، حج و عمرہ جیسی عبادات،
دین کی تبلیغ اور فریضہ جہاد کی ادائیگی کے لیے سفر اسی مد میں آتا ہے۔ نیک لوگوں
کی ملاقات اور بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے تجربات حاصل کرنے کی غرض
سے جانا بھی فضل ربی کی تلاش میں شامل ہے۔ البتہ ان تمام امور میں جو کام
سر فہرست ہے وہ تجارت کے ذریعے رزق حلال کی تلاش ہے۔ لوگ
روزی کے حصول کے لیے دور دراز کا سفر اختیار کرتے ہیں تاکہ اپنی معیشت
کو مضبوط بنا سکیں۔ آج کل یہ کام زیادہ تر حکومتی سطح پر ہو رہا ہے۔ ایک
ملک دوسرے ملک کو کوئی سامان دے رہا ہے اور کچھ سامان اس سے لے
رہا ہے۔ بین الاقوامی طور پر بڑے بڑے تجارتی معاہدے ہوتے ہیں جن

کے تحت کروڑوں ٹن وزنی سامان ایک ملک سے دوسرے ملک کو منتقل ہوتا ہے۔ اگرچہ اب سامان کی نقل و حمل کے لیے بڑے بڑے ہوائی جہاز بھی استعمال میں لائے جاتے ہیں مگر بھاری سامان کا بیشتر حصہ آج بھی سمندری راستوں سے ہی پہنچتا ہے اگر اللہ تعالیٰ کی مہربانی شامل حال نہ ہو اور حالات ناسازگار ہو جائیں تو جہازوں کی آمد و رفت میں آج بھی خلل پڑ جاتا ہے۔ بہرحال اللہ نے فرمایا کہ یہ کشتیاں اور جہاز اللہ تعالیٰ ہی چلاتا ہے تاکہ تم اپنے لیے رزقِ حلال تلاش کر سکو۔ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝ بیشک وہ تمہارے ساتھ بڑا ہی مہربان ہے دریاؤں اور سطحِ سمندر پر دوڑتی ہوئی کشتیاں اور بڑے بڑے جہاز اُس مالک الملک کی کارسازی ہی کا نمونہ ہیں

طوفان میں اللہ کی یاد آوری

اب اگلی آیت میں بحری سفر ہی کے تناظر میں مشرکین کا رد کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ جب سمندر میں سفر کے دوران تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے۔ طوفان آ جاتا ہے، کشتی بھنور میں پھنس جاتی ہے، تو پھر کیا ہوتا ہے ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ تو وہ تمام گم ہو جاتے ہیں جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو جن غیر اللہ کو اپنی حاجات میں پکارتے ہو، نذر و نیاز دیتے ہو، جن کی دہائی دیتے ہو اور جن کو نفع نقصان کا مالک سمجھتے ہو، مصیبت کے وقت وہ سب بھول جاتے ہیں اور اللہ وحدہٗ لاشریک ہی یاد رہ جاتا ہے جو کہ حقیقی کارساز اور مصیبت سے نجات دینے والا ہے۔

ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی دشمنِ اسلام تھا۔ مکہ فتح ہوا تو وہ جان کے خوف سے بھاگ گیا۔ جدہ پہنچ کر جہاز میں سوار ہو گیا تاکہ کہیں حبشہ وغیرہ کی طرف چلا جائے۔ اتفاق کی بات کہ دورانِ سفر سمندر میں زبردست طوفان برپا ہوا جس میں جہاز پھنس گیا۔ ملاحوں نے کہا کہ ان حالات میں اگر اللہ چاہے تو جہاز بچ سکتا ہے، وگرنہ اور کوئی ہستی نہیں جو اس مشکل وقت میں کام

آسکے۔ یہ سن کر عکرمہ کے دل پر چوٹ لگی اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر سمندر میں اللہ کے سوا کوئی کارساز نہیں تو خشکی پر اُس کے سوا کون مدد کو پہنچ سکتا ہے۔ اور پھر ہم لات، مناۃ اور عزیٰ وغیرہ کی پرستش کس لیے کرتے ہیں۔ اس نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا کہ اگر اللہ نے اُسے طوفان سے بچا لیا تو پھر سیدھا حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دے دوں گا کیونکہ یہی وہ شخص ہے جو وہ سمجھاتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی کارساز و مددگار نہیں۔ کوئی نفع اور ضرر نہیں اور نہ ہی کوئی عبادت کے لائق ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں محمد کو مہربان اور شفیق پاؤں گا۔

خدا کی قدرت جہاز بچ گیا۔ جہاز سے اُتر کر عکرمہ سیدھا حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضری کے لیے چل پڑا۔ اُس کی بیوی پہلے ہی مسلمان ہو چکی تھی۔ اُس نے حضور علیہ الصلوٰۃ کی خدمت میں حاضر ہو کر عکرمہ کے لیے امان چاہی آپ نے قبول کر لی اور اپنی خاص نشانی بھی اُس کو دی کہ جاؤ جا کر اپنے خاوند کو لے آؤ۔ الغرض بیوی راستے میں ہی مل گئی جو انکو لیکر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو گئی۔ آپ نے دیکھا تو عکرمہ کو خوش آمدید کہا مَرْحَبًا بِالرَّاكِبِ الْمُهَاجِرِ فرمایا تم ہجرت کر کے آئے ہو، ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ حضرت عکرمہؓ نے سچے دل سے اسلام قبول کیا اور اسلام کی خدمت میں پیش پیش رہے۔ جہاد میں بھی بڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں عجمیوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

نجات ملنے پر دوبارہ شرک

فرمایا مصیبت کے وقت تو تم خالص اللہ ہی کو پکارتے ہو کہ اس کے سوا کوئی نجات دہندہ نہیں فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ جب تمہیں مشکل سے نجات حاصل ہو جاتی ہے اِلَى الْبَرِّ سمندر کی تاریکیوں سے نکل کر خشکی پر پہنچ جاتے ہو اَعْرَضْتُمْ تو پھر وہی اعراض کرنے لگتے ہو مالک حقیقی، وحدہٗ لاشریک سے منہ موڑ کر پھر غیر اللہ کو پکارنے لگتے ہو

انہی کی نذر و نیاز شروع کر دیتے ہو اور پھر شرکیہ رسوم ادا کرنے لگتے ہو۔ فرمایا
وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا انسان تو بڑا ہی ناشکر گزار ہے۔ یہ اپنے
محسن حقیقی کی قدر نہیں کرتا۔ جب یہ موت کی آغوش کے قریب ہوتا
ہے تو اسی کو پکارتا ہے مگر جب وہ اپنی رحمت سے مصیبت کو
دور کر دیتا ہے تو اس نجات کو غیروں کے ساتھ منسوب کرنے لگتا ہے
مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ پرانے زمانے کے مشرکوں کا یہ حال تھا
کہ مصیبت کے دوران جب تمام ظاہری اسباب منقطع ہو جاتے تو وہ
خالص اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے کہ سب سے بڑا وہی ہے
اور وہی اس مصیبت سے نجات دے سکتا ہے مگر افسوس کا مقام ہے
کہ موجودہ زمانے کے مشرکین ان سے بھی گئے گزرے اور بدنصیب ہیں
کہ مصیبت کے وقت بھی غیروں کو پکارتے ہیں۔ کوئی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ
کو پکار رہا ہے، کوئی علی ہجویریؒ کو آوازیں دے رہا ہے، کوئی خواجہ اجمیریؒ
کی طرف نظریں جمائے بیٹھا ہے، کوئی بہاؤالحق زکریاؒ کی درگاہ پہ حاضر ہے
اور کوئی شہباز قلندرؒ کی نذر مان رہا ہے۔ یہ سارے بزرگ تو اللہ کے برگزیدہ
بندے تھے، وہ تو خود اللہ سے مدد طلب کرتے رہے، وہ خود خدا تعالیٰ
کے تقرب چاہنے والے تھے۔ ایسے میں بھلا۔ انبیاء، ملائکہ، جنات اور
اولیاء تمہاری کیا مدد کریں گے۔ وہ خود اسی سے دعا کرتے رہے۔ پریشانی
میں ڈالنا اور اس سے نجات دینا صرف اللہ کا کام ہے، لہٰذا اسی کو
پکارنا چاہیئے اور اسی سے مدد طلب کرنی چاہیئے، اللہ کا فرمان ہے کہ
جس دن قیامت برپا ہوگی، اللہ کے سوا تمام معبود دشمن بن جائیں گے جب
لوگ ان سے مدد کی درخواست کریں گے کہ ہم دنیا میں تمہاری پرستش
کرتے رہے، اب ہمارا کام بناؤ تو وہ صاف جواب دے دیں گے۔
مَّا كُنتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ (یونس۔ ۲۸) تم ہماری عبادت کہاں

کرتے تھے تم تو اپنے نفس اور شیطان کے پیچھے لگے ہوئے تھے ۔ ہم نے تمہیں کب کہا تھا کہ ہماری پوجا کرو اور ہماری نذر و نیاز دو ۔ وہ سب ان کے خلاف گواہی دیں گے ۔ اللہ کے فرشتے، انبیاء اور اولیاء اللہ کے حضور نہایت عاجزی سے عرض کریں گے ، پروردگار ! ہم نے دنیا میں تیرے سوا کسی کو کارساز نہیں بنایا تو ہم ان سے اپنی کارسازی کیسے منوا سکتے تھے غرضیکہ حقیقی کارساز اللہ تعالیٰ ہی ہے ، وہ نافع و ضار ہے ۔ اس نے اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کئے ، نہ حقیقی طور پر اور نہ مجازی طور پر ۔ اس کی کوئی اولاد نہیں ، وہ غنی اور صمد ہے ۔ ساری مخلوق اس کی محتاج ہے "يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ" (فاطر - ۱۵) اے لوگو ! تم سب اللہ کے فقیر ہو ۔ نبی ، ولی ، فرشتے ، جنات ، اپنی حیات میں بھی اس کے محتاج ہیں ۔ اور بقائے حیات میں بھی اسی کے محتاج ہیں ۔ غنی اور تعریفوں والا صرف وہی ہے ۔

خشکی پر سزا

آگے اللہ نے وعید کے طور پر فرمایا أَفَأَمِنتُمْ أَن يَخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ کیا تم اس بات سے بے فکر ہو گئے ہو کہ خشکی کے کنارے پر دھنسا دیئے جاؤ ، جب خدا کا قہر نازل ہو تو تم خواہ جنگل میں ہو یا صحرا میں یا زمین کے کسی بھی خطے میں ، وہ تمہیں ہلاک کرنے پر قادر ہے ۔ اس نے قارون کو اپنے خزانوں سمیت زمین میں دھنسا دیا تھا ۔ اللہ نے قوم فرعون اور قوم نوح کو پانی میں ڈبو کر زمین میں دھنسا دیا ۔ اس قسم کے واقعات زلزلے کی صورت میں آج بھی دنیا میں پیش آتے رہتے ہیں ۔ ۱۹۲۳ء میں جاپان میں زبردست زلزلہ آیا تھا ۔ جس کی وجہ سے زمین میں ہزار ہزار میل لمبی دراڑیں پڑ گئی تھیں اور لوگ زمین میں زندہ دھنس گئے تھے ۔ اس سانحہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ انسان موت

کی آغوش میں چلے گئے اور اتنے ہی زخمی بھی ہوئے ۔ اس وقت مصری شاعر شوقی نے کہا تھا ۔

قِفْ بِتُوكِيُوْ وَطُفْ عَلٰى يُوكُوهَامَا
وَسَلِ الْقَرْيَتَيْنِ كَيْفَ الْقِيٰمَةُ

ٹوکیو اور یوکوہاما کی حالت پر افسوس ہے ۔ ان دو بستیوں سے پوچھ کر قیامت کیسی ہوتی ہے ۔ ان پر زلزلے کی صورت میں قیامت وارد ہو چکی ہے ۔ جب قیامت کبریٰ کر پوری کائنات درہم برہم ہو جائے گی تو ایسی ہی حالت ہو گی ۔

فرمایا اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ تمہیں زمین میں دھنسا دے اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا یا تم پر تند و تیز آندھی بھیج دے جو پتھر برسانے والی ہو، جس طرح کہ اس نے قوم لوط پر پتھروں کی بارش کی ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ۔ پھر تم نہ پاؤ گے اپنے لیے کوئی کارساز جو تم سے اس طوفان کو دور کرے کہ تمہاری جانوں کو بچا سکے ۔

سمندری طوفان

فرمایا اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى کیا تم اس بات سے بے فکر ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دوبارہ اسی سمندر میں لے جائے جہاں سے اس نے تمہیں نجات دی تھی فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ پھر وہ تم پر سخت ہوا بھیج دے جو توڑنے والی ہو ۔ قصف کا معنی توڑنا ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اتنی تیز ہوا تم پر بھیجے کہ تم آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ جاؤ اور بالآخر ہلاک ہو جاؤ ۔ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ پھر وہ تمہارے اس کفر کی وجہ سے تمہیں وہیں سمندر میں غرق کر دے ۔ یہاں پر کفر سے مراد کفرانِ نعمت ہے کہ تم نے اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کی قدردانی نہ کی ۔ بہر

چیز کا عطا کرنے والا وہ ہے مگر تم نے غیروں کو حاجت روا اور مشکل کشا
سمجھ کر ان کے آگے دست سوال دراز کیا۔ فرمایا جب خدا تعالیٰ سزا
دینے کا فیصلہ کرے ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهِ
تَبِيعًا۔ پھر نہ پاؤ گے تم اپنے لیے ہمارے خلاف کسی کو باز پرس کرنے
والا جو تمہارے پیچھے لگا ہوا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی کو اپنے انعامات
سے نوازے یا کسی کو سزا میں مبتلا کر دے، اس سے باز پرس کرنے والا کوئی
نہیں، کہ ایسا کیوں کیا۔ محاسبہ کرنے اور باز پرس کرنے والی ذات تو
خود خدا تعالیٰ کی ہے، بھلا اس سے کون پوچھ سکتا ہے کہ مولا کریم! تم نے
فلاں فیصلہ کیوں اور کیسے کیا؟

بہرحال اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ناشکر گزاری اور غفلت کے پیش نظر
اپنی وحدانیت کا اثبات اور شرک کا ابطال ایک دوسرے عنوان کے ساتھ
کر دیا ہے کہ کیا تم اس بات سے بے فکر ہو گئے ہو کہ اللہ تعالیٰ کسی
وقت بھی کسی قسم کی سزا دینے پر قادر ہے۔

وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيٓ ءَادَمَ وَحَمَلۡنَٰهُمۡ فِي ٱلۡبَرِّ وَٱلۡبَحۡرِ وَرَزَقۡنَٰهُم مِّنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَفَضَّلۡنَٰهُمۡ عَلَىٰ كَثِيرٖ مِّمَّنۡ خَلَقۡنَا تَفۡضِيلٗا ﴿٧٠﴾

ترجمہ:- اور البتہ تحقیق ہم نے عزت بخشی ہے اولادِ آدم کو اور ہم نے اُن کو سواری دی ہے خشکی اور سمندر میں۔ اور ہم نے روزی دی ہے اُن کو پاکیزہ (اور عمدہ سے عمدہ) چیزوں سے۔ اور ہم نے اُن کو فضیلت بخشی ہے بہت سی مخلوق پر جس کو ہم نے پیدا کیا ہے، بڑی فضیلت ﴿٧٠﴾

ربطِ آیات پہلے اللہ نے شرک کا ابطال اور توحید کا اثبات بیان کیا۔ پھر انسان کی عاجزی اور بے چارگی کا ذکر کیا کہ مصیبت کے وقت وہ صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کو پکارتے ہیں مگر جب وہ مصیبت دور ہو جاتی ہے تو دوبارہ شرکیہ کام کرنے لگتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ انسان بہت ہی ناشکر گزار ہے اس کے بعد اللہ نے وعید سنائی کہ لوگوں کو اس بات سے بے فکر نہیں ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ انہیں خشکی میں دھنسا دے یا دوبارہ سمندر میں جانے پر مجبور کر دے اور وہیں ان کو ڈبو دے، اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ سے کوئی باز پرس کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔

شرفِ انسانیت گذشتہ سے پیوستہ درس میں گزر چکا ہے کہ شیطان نے اللہ تعالیٰ سے کہا تھا أَرَءَيۡتَكَ هَٰذَا ٱلَّذِي كَرَّمۡتَ عَلَيَّ " مجھے بتلاؤ کہ کیا تم نے اس شخص (آدم علیہ السلام) کو مجھ پر فضیلت بخشی ہے۔ اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر تو مجھے قیامت

تک مہلت دے دے تو میں اس کی اولاد کو گمراہ کرتا رہوں گا۔ شیطان کے اس اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آج کی آیت کریمہ میں اولاد آدم کی فضیلت کا ذکر فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ اور البتہ تحقیق ہم نے اولادِ آدم کو عزت اور بزرگی بخشی ہے آیت کے اگلے حصے میں اللہ نے اس فضیلت کی بعض باتوں کا ذکر بھی فرمایا ہے

فضیلت عامہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو فضیلت بخشی ہے، وہ دو قسم سے ہے فضیلت عامہ تو عام ہی نوع انسان کو حاصل ہے جس میں اہل ایمان اور کافر مشرک شامل ہیں۔ جبکہ فضیلت خاصہ اللہ نے اپنے خاص بندوں کو عطا فرمائی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل جیسی عظیم نعمت عطا کر کے اسے باقی مخلوق پر فضیلت بخشی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ نے عقل کو پیدا کر کے فرمایا سامنے آؤ۔ وہ سامنے آئی۔ پھر اللہ نے فرمایا پیچھے ہٹ جاؤ۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ پھر اللہ نے فرمایا، میں جو کچھ بھی انسان کو دوں گا تیری وجہ سے ہی دوں گا اور تیری وجہ سے ہی مؤاخذہ کروں گا۔ تو گویا انسان عقل کی وجہ سے ہی مکلف ہے۔ فرشتے اگرچہ اللہ کی مقدس ترین مخلوق ہیں اور صاحب عقل بھی ہیں مگر ان میں شہوت کا مادہ مفقود ہے، جس کی وجہ سے ان کا محاسبہ بھی نہیں ہے کیونکہ ان کی طرف سے اللہ کی نافرمانی کا کوئی امکان نہیں۔

امام ضحاکؒ فرماتے ہیں کہ اللہ نے انسان کو اس لیے فضیلت بخشی ہے کہ اسے زبان حاصل ہے جس کی بنا پر گفتگو کرتا اور اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتا ہے۔ پرانے یونانی منطقی انسان کو حیوان ناطق یعنی بولنے والا جاندار کہتے تھے۔ یہ ایسا کمال ہے جو کسی دوسری مخلوق چرند، درند، پرند وغیرہ کو حاصل نہیں۔ امام شاہ ولی اللہؒ انسان کی تعریف زیادہ بہتر طریقے پر کرتے ہیں اَلَّذِيْ يَتَفَكَّرُ وَيَحْمِلُ بِالْاٰلَاتِ یعنی انسان وہ ہستی

ہے جو غور و فکر کرتی ہے اور کام کاج کے لیے آلات استعمال کرتی ہے۔ اب خورد و نوش میں ہاتھوں کا استعمال بھی انسان کی ہی خصوصیت ہے۔ دیگر جانور اور پرندے اپنی خوراک منہ سے کھاتے ہیں جب کہ یہ شرف صرف انسان کو حاصل ہے کہ وہ ہاتھوں سے پکڑ کر خوراک منہ میں ڈالتا ہے۔ یہ عبداللہ بن عباسؓ کی توجیہ ہے۔

صاحبِ کتاب "الخراج" امام ابو یوسفؒ خلیفہ ہارون الرشید عباسی کے دور میں چیف جسٹس کے عہدے پر فائز تھے۔ آپ متقی، محدث اور فقیہ تھے۔ ایک دفعہ ہارون الرشید نے کھانے کی مجلس قائم کی جس میں امام صاحبؒ بھی مدعو تھے۔ خلیفہ نے کھانے کے ساتھ دسترخوان پر چمچے بھی رکھوائے تاکہ حسبِ ضرورت مہمان ان کو بھی استعمال کر سکیں۔ جب امام صاحبؒ نے یہ دیکھا تو خلیفہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ کے جد امجد حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے توجیہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے انسان کے لیے انگلیاں بنائی ہیں اور ہم نے اولادِ آدم کو فضیلت بخشی ہے، لہٰذا انگلیوں کے ساتھ کھانا کھانا ہی انسان کا کمال ہے اور چمچوں کا استعمال محض تکلف ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید پر اس نصیحت کا اس قدر اثر ہوا کہ اس نے فوراً دسترخوان سے چمچے اٹھوا دیے۔ ایک حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تین انگلیوں سے کھانا تناول فرماتے تھے کیونکہ ساری انگلیوں کا استعمال حرص کی علامت ہے۔

انسان کے جسمانی کمالات

انسان کے شرف کی یہ وجہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جسمانی اور روحانی کمالات عطا فرمائے ہیں۔ انسان کا اولین جسمانی کمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے دستِ قدرت سے پیدا فرمایا۔ سورۃ صٓ میں اللہ کا فرمان ہے مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ

اے ابلیس! جس ہستی کو میں نے اپنے دستِ قدرت سے بنایا اس کے سامنے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے روکا۔ حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص کی روایت ہے جسے امام طبرانیؒ نے بیان کیا اور امام ابن کثیرؒ نے نقل کیا ہے حضور کا فرمان ہے:

إِنَّ الْمَلَائِكَةَ قَالَتْ يَا رَبَّنَا أَتَيْتَ بَنِي آدَمَ الدُّنْيَا يَأْكُلُونَ فِيهَا وَيَشْرَبُونَ وَيَلْبَسُونَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَلَا نَأْكُلُ وَلَا نَشْرَبُ وَلَا نَلْهُو كَمَا جَعَلْتَ لَهُمُ الدُّنْيَا فَاجْعَلْ لَنَا الْآخِرَةَ قَالَ لَا أَجْعَلُ صَالِحَ ذُرِّيَّةِ مَنْ خَلَقْتُ بِيَدَيَّ كَمَنْ قُلْتُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ

بیشک فرشتوں نے کہا، اے ہمارے پروردگار! اولادِ آدم کو تو نے دنیا عطا کی۔ وہ دنیا میں کھاتے پیتے اور لباس پہنتے ہیں۔ اور ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ اور نہ کھاتے ہیں اور نہ پیتے ہیں اور نہ کھیل کود کرتے ہیں۔ تو جس طرح تو نے اولادِ آدم کے لیے دنیا بنا دی اس طرح ہمارے لیے آخرت بنا دے۔ اللہ نے فرمایا کیا میں اپنے ہاتھ سے پیدا کردہ ہستی کی نیک اولاد کو اُن کے برابر کر دوں جن کو میں نے کہا "ہو جاؤ" تو وہ ہو گئے؟

اللہ نے نوعِ انسانی کے متعلق یہ بھی فرمایا ہے هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ (آل عمران) خدا تعالیٰ وہ ہے جو شکمِ مادر میں تمہاری تصویر بناتا ہے جس طرح چاہے۔ انسان کی شکل و صورت قطرۂ آب پر بن جاتی ہے کیا یہ کم شرفِ انسانیت ہے؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو حسن صورت بھی عطا فرمائی سب روئے زمین
کی تمام مخلوق میں انسان خوبصورت ترین ہستی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ التین
میں فرمایا ہے "لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ"
ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت عطا کی۔ اس کا یہ بھی احسان ہے
کہ انسان کو سیدھا قد عطا کیا، حالانکہ مخلوق میں سے کچھ جاندار ٹیڑھے ہیں
کچھ چار پاؤں پہ جھکے ہوئے ہیں اور کچھ بالکل زمین کے ساتھ لگے ہوئے ہیں
اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو پاؤں دیے اور اس کا سر اونچا رکھا۔ حکما کہتے ہیں
کہ سر کی بلندی کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا مقصد بھی بلند ہے یعنی خدا تعالیٰ
کی رضا اور خوشنودی تک پہنچنا۔ انسانی جسم کے اعضا کی جوڑ بندی بھی کمال
درجے کی ہے۔ ہر عضو اپنی اپنی جگہ کمال طریقے سے موزوں کیا ہے اور
اس کا رخ بھی سامنے کی طرف کر دیا ہے۔ انسان میں موجود روح الٰہی اور
نفس ناطقہ بھی کمال درجے کی چیز ہے۔ غذا کے معاملے میں بھی انسان کو
دوسری مخلوق پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ اناج اور پھل کا مغز استعمال
کرتا ہے جب کہ چھلکا وغیرہ دوسرے جانوروں کی خوراک بنتا ہے
اللہ نے انسان کا سلسلہ تولید بھی کمال درجے کا مقرر کیا ہے۔ انسان کو یہ سارے
شرف حاصل ہیں۔

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ نے انسان کو کمال درجے
کا متمدن بنایا ہے۔ یہ نفاست پسند ہے اور طہارت اس کی فطرت میں
داخل ہے۔ جانور کے آگے گندی جگہ پہ بھی چارہ رکھ دیا جائے تو کھا
لیتا ہے مگر انسان کسی گندے برتن میں بھی کھانا پسند نہیں کرتا۔ حضور
علیہ السلام چمڑے کا دستر خوان زمین پہ بچھا کر کھانا کھاتے تھے۔

انسان کو دوسری مخلوق پر اس لحاظ سے بھی شرف حاصل ہے کہ اللہ
نے اس میں فہم، تمیز اور تحقیق و تجسس کا مادہ بھی رکھا ہے جس کی وجہ سے

چیزوں کی حقیقت کو سمجھتا ہے۔ اللہ نے انسان کو مزید شرف اس لحاظ سے
دیا ہے کہ اُسے دوسری چیزوں پر تسلط حاصل ہے۔ انسان تمام جانوروں ،
درختوں ، ہواؤں ، پتھروں اور پانیوں سے کام لیتا ہے اللہ نے اُسے حکومت
کرنے کی استعداد بھی بخشی ہے انسان اپنے لیے معیشت کی تدبیر بھی کرتا ہے اور آخرت کی تدبیر
بھی، انسان عقل و فہم کی بنا پر اچھے اعتقادات اور عمدہ اخلاق بھی حاصل کر سکتا ہے۔

اللہ نے انسان کی روح میں نورِ معرفت کا مادہ بھی رکھا ہے جس سے
وہ خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل کرتا ہے، البتہ یہ علیحدہ بات ہے کہ کوئی
شخص اپنی غلطی کے نتیجے میں اس نورِ معرفت کو ضائع کر دے اور یہ ایک ایسی چیز
ہے کہ جس سے اکثر لوگ فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اللہ نے انسان کو یہ فضیلت
بھی عطا کی ہے کہ اُسے لکھنا پڑھنا سکھایا جس سے دوسرے جاندار بے بہرہ
ہیں۔ ظاہری شکل و صورت میں اللہ نے مردوں کے لیے داڑھی اور عورتوں
کے لیے بالوں میں حسن رکھا ہے۔ انسان کے مزاج میں اعتدال رکھا ہے
جو کسی دوسری ہستی میں نہیں ہے۔ انسان کو صنعت و حرفت کی اعلیٰ درجے
کی استعداد عطا کی ہے جس کی بنا پر یہ لاکھوں اور کروڑوں اشیاء تیار کرتا ہے
یہ عام فضیلت کی باتیں ہیں جن میں مومن ، کافر یا بُرے بھلے کی تمیز نہیں ہے

انسان کے روحانی کمالات

اللہ تعالیٰ نے انسان میں بہت سے روحانی کمالات بھی رکھے ہیں
مثلاً اولین کمال یہ ہے کہ اُس نے انسان کا ڈھانچہ بنا کر اس میں جان
پھونکی۔ پھر اللہ نے آدم علیہ السلام کی پشت سے اُن کی تمام اولاد کو نکال
کر اُن سے عہد لیا "أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ" (الاعراف)
بھلا بتلاؤ تو کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ تو سب روحوں نے بیک زبان

کہا کیوں نہیں؟ مولا کریم تو ہی ہمارا رب ہے۔ پھر اللہ نے یہ روحانی شرف بھی بخشا کہ بنی نوع انسان میں نبوت کا سلسلہ رکھا۔ اللہ نے ان کی طرف اپنے رسول اور کتابیں بھیجیں، خدا کے مقرب بندے اولیا بھی ان کی روحانی تربیت کے لیے آتے رہے۔ اللہ نے انھیں ایمان اور اسلام کی دولت سے مشرف کیا، آداب اور اخلاق سکھائے۔ عالم بالا اور عالم لاہوت کی طرف ترقی عطا فرمائی۔ حظیرۃ القدس اور مقام علیین تک رسائی نصیب فرمائی۔ اور اس طرح بنی نوع انسان خصوصاً اہل ایمان کو عزت بخشی۔ قرآن میں اللہ نے ایمانداروں کو خیر البریہ یعنی مخلوق کا بہترین حصہ اور کافروں کو شر البریہ یعنی بدترین مخلوق قرار دیا ہے۔

اب اللہ نے تو فرمایا ہے کہ ہم نے اولادِ آدم کو عزت اور شرف بخشا ہے مگر شیطان لعین ہے جس نے سب سے پہلے اولین انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی توہین کی اور کہا کیا اس مٹی کے پتلے کو تو نے مجھ پر فضیلت بخشی ہے؟ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ (ص ۲) میں اس سے بہتر ہوں کیونکہ مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے جب کہ آدم کو خاک سے۔ اس کے بعد کافروں نے اللہ کے پاک نبیوں کا انکار کیا۔ بڑی حقارت سے کہتے تھے اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا (التغابن) کیا یہ انسان ہماری راہنمائی کرے گا۔ ہم نہیں سنتے، حالانکہ بشر کو اللہ تعالیٰ نے بڑا شرف عطا کیا ہے، خاص طور پر اگر اُسے ایمان کی دولت حاصل ہے تو وہ سب سے برتر ہے۔ تاہم رسولوں کی بشریت کا انکار مشرکانہ عقیدہ ہے۔

انسان کے لیے سواری کا انتظام

آگے اللہ تعالیٰ نے انسان پر ایک اور احسان کا ذکر فرمایا ہے وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ اور ہم نے انھیں خشکی اور تری میں سواری مہیا کی، جانوروں کی سواری صرف انسان ہی کے لیے اللہ نے بنائی ہے، خود جانور ایک دوسرے کی سواری نہیں بنتے۔ انسان کے نقل و حمل

کے لیے خشکی پر اونٹ، گھوڑے، خچر اور گدھے وغیرہ ہیں جب کہ سمندروں اور دریاؤں میں سفر کے لیے اللہ نے چھوٹی چھوٹی کشتیاں اور بڑے بڑے جہاز بنا دیے ہیں۔ جن کا ذکر پہلے بھی گزر چکا ہے۔ آج کے زمانہ میں زمینی سفر کے لیے بیشمار قسم کی سواریاں موجود ہیں۔ بائیسکل، موٹر سائیکل، کار، ریل گاڑی اور بڑی بڑی بسیں انسان کی خدمت کے لیے موجود ہیں۔ اب تو ہوا کو بھی اللہ نے ہر انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (البقرۃ - ۱۶۴) پہلے زمانے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی مثال موجود ہے کہ انہیں ہواؤں پر مکمل تسلط حاصل تھا۔ آپ کا تخت اور فوج بغیر پٹرول کے ہوا کے دوش پر سفر کرتا تھا۔ آج یہ سہولت تمام لوگوں کو حاصل ہے۔ اب ہوائی سفر دنیا کا تیز ترین سفر ہے جسے فوجی اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے، غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے بری بحری اور ہوائی سفر کی سواریاں مہیا فرمائی ہیں، یہ بھی اس کے شرف کی علامت ہے۔

پاکیزہ روزی

فرمایا، اللہ نے انسان کو اس لحاظ سے بھی برتری عطا فرمائی ہے۔ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ کہ اسے پاک ستھری اور عمدہ روزی عطا کی جو کسی دوسرے جاندار کو میسر نہیں۔ ہر سبزی، اپھل اور اناج کا بہترین گودا انسان کی خوراک ہے جب کہ چھلکا اور بھوسہ وغیرہ جانوروں کی خوراک بنتا ہے۔ فرمایا وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا اور ہم نے اپنی بہت سی پیدا کردہ مخلوق پر انسان کو فضیلت بخشی، بہت بڑی فضیلت۔ ظاہر ہے کہ اللہ نے انسان کو حسن صورت، عقل اور تدبیر سے نوازا۔ دنیوی اور اخروی [illegible] معاد کو سمجھنے کی صلاحیت عطا فرمائی، دوسری مخلوق اس کے تابع کر دی، ہر قسم کی سواری مہیا کی، آرائش و آرام کے لیے عمدہ لباس اعلیٰ

مکانات اور باغات عطا فرمائے۔ پھر آدم علیہ السلام کو فرشتوں سے سجدہ کروایا۔ یہ سب شرفِ انسانی کی علامات ہیں۔ جو اللہ نے ظاہر فرمائیں۔

حقیقی شرف

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس تمام تر عزت و شرف کے باوجود انسان کو حقیقی عزت و تکریم اس وقت حاصل ہو گی جب وہ اپنے خالق و مالک کے قانون کی پابندی اختیار کرے گا۔ اللہ کے ہاں کامیابی انہی کو حاصل ہو گی۔ جو اللہ تعالیٰ پر صدقِ دل سے ایمان لائیں گے، قیامت پر یقین رکھیں گے، انبیاء کا اتباع کریں گے۔ اور اس کے احکام کا اتباع کریں گے فرمایا جو ایمان اور نیکی سے خالی ہوں گے "ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ" (التین) وہ نہایت ہی پستی میں چلے جائیں گے۔

حضرت مولانا شیخ الاسلام حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ مفسرین نے اس موقع پر یہ بحث بھی چھیڑی ہے کہ فرشتوں اور بشر میں افضل کون ہے؟ فرماتے ہیں کہ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ ہی نہیں کرتی، تاہم امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے پیروکار کہتے ہیں کہ انسانوں کے رسول فرشتوں کے رسولوں سے بہتر ہیں۔ یعنی انبیاء علیہم السلام جبرائیل میکائیل وغیرہ سے افضل ہیں۔ اور عام ایماندار عام فرشتوں سے افضل ہیں۔ اس کے علاوہ عام مخلوق سے باقی فرشتے افضل ہیں مطلب یہ ہے کہ عام انسانوں میں سے بھی جو ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں۔ وہ عام فرشتوں سے بہتر ہیں۔ اور جن کو ایمان نصیب نہیں ہوا، ان سے عام فرشتے افضل ہیں۔

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۱﴾ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۷۲﴾

ترجمہ:- (اس دن کو دھیان میں لاؤ) جس دن ہم بلائیں گے ہر ایک گروہ کو ان کے امام کے ساتھ۔ پس جس کو دیا گیا اس کا اعمالنامہ اس کے دائیں ہاتھ میں، پس یہی لوگ ہیں جو پڑھیں گے اپنے اعمالنامے، اور نہیں ظلم کیا جائے گا ان پر ایک دھاگے کے برابر بھی ﴿۷۱﴾ اور جو شخص اس دنیا کی زندگی میں اندھا ہوا، پس وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا، اور بہت زیادہ گم کردہ راہ ہوگا ﴿۷۲﴾

ربطِ آیات

گزشتہ آیات میں باقی مخلوق پر انسان کی فطری برتری کا ذکر تھا۔ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے اولادِ آدم کو عزت بخشی اور اس کے لیے بری اور بحری سواریاں مہیا کیں۔ اب انسان کو فضاؤں پر بھی تسلط حاصل ہے۔ اور انہیں ہوا کے دوش پر تیز ترین سفر کی سہولتیں حاصل ہیں۔ پھر فرمایا کہ ہم نے انسان کو روزی کے طور پر پاکیزہ اور عمدہ چیزیں عطا فرمائیں اور اس طرح اللہ کی مخلوق میں سے اکثریت پر بڑی فضیلت عطا فرمائی۔ اب اصل سوال یہ ہے کہ اللہ نے انسان کی جو عزت افزائی کی ہے اس نے اپنے آپ کو کس حد تک اس کا اہل ثابت کر کے اسے قائم رکھا ہے۔ آگے اچھے اور برے اعمال

کی منزل آنے والی ہے۔ اُس وقت پتہ چلے گا کہ انسان نے اللہ تعالےٰ کے عطا کردہ انعامات سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو ان نوازشات کا اہل ثابت کیا ہے یا اُس نے اپنے آپ کو ذلیل و رسوا کر لیا ہے۔ آج کی آیات اسی موضوع سے متعلق ہیں۔

امام کے نام پر پکار

ارشاد باری تعالیٰ ہے یَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ اُس وقت کو دھیان میں لاؤ جب ہم ہر گروہ اور فرقہ کو اس کے امام کے ساتھ پکاریں گے۔ اُس وقت سے مراد وہ وقت ہے جب سب لوگ میدان حشر میں جمع ہوں گے اور محاسبہ اعمال شروع ہونے والا ہوگا۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو اپنی اپنی جماعت کے قائدین کے ساتھ آواز دیں گے کہ فلاں گروہ اور اس کے راہنما ادھر آجائیں، اور فلاں فرقے والے اپنے لیڈر سمیت اِس طرف ہو جائیں۔

مفسرین کرام نے لفظ " امام " کی مختلف تفسیریں کی ہیں جو سب کی سب درست ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ امام سے مراد اعمالنامہ ہے جس کا تسلسل آیت کے اگلے حصے میں بھی برقرار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام لوگ اپنے اپنے اعمالناموں کے ساتھ بلائے جائیں گے۔ بعض مفسرین امام سے نبی مراد لیتے ہیں کہ ہر امت کو اپنے اپنے نبی کی قیادت میں طلب کیا جائے گا۔ جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اللہ نے فرمایا اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا " (البقرۃ - ۱۲۴) میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ اسی طرح گویا میدان حشر میں اس طرح آواز دی جائے گی " اے نوح علیہ السلام کی امت "، " اے ابراہیم علیہ السلام کی امت "، " اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت " اللہ تعالیٰ کے دربار میں اپنے اپنے انبیا سمیت پیش ہو جاؤ۔

بعض فرماتے ہیں کہ امام سے مراد کتب سماویہ ہیں۔ ہر امت کو ان کی کتاب کے ہمراہ پکارا جائے گا۔ یَا اَھْلَ التَّوْرٰۃِ، یَا اَھْلَ

الْاِنْجِیْلِ یَا اَھْلَ التَّوْرٰیۃِ اور یَا اَھْلَ الْقُرْاٰنِ اِدھر آکر اپنا اپنا محاسبہ پیش کرو۔

امام اُس ہستی کو بھی کہتے ہیں جس کی اقتدا کی جائے اور جو کسی امت یا گروہ کا پیشوا ہو۔ اس کی مثال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سکھلائی ہوئی ختم قرآن کی دعا میں موجود ہے۔ اے اللہ! قرآن پاک کی برکت سے میری قبر میں اُنس کا سامان پیدا کر دے، اے اللہ! قرآن پاک کی برکت سے مجھ پر رحم فرما۔ وَاجْعَلْہُ لِیْ اِمَامًا وَّ نُوْرًا وَّ ھُدًی وَّ رَحْمَۃً اور اسے میرے لیے امام، نور، ہدایت اور روشنی بنا دے۔ اِس دعا میں گویا قرآن کو بھی امام کہا گیا ہے۔ حضرت علیؓ کی روایت کے مطابق امام سے مراد امامِ زماں یعنی اپنے اپنے دور کے پیشوا اور لیڈر بھی ہو سکتے ہیں۔ اور ہر دور کے پیشوا سچے بھی ہو سکتے ہیں۔ اور جھوٹے بھی۔ امامِ ضلالت یعنی لوگوں کو گمراہ کرنے والے پیشوا بھی مراد لیے جا سکتے ہیں، جیسے شیطان کا اتباع کرنے والوں کو اس کے نام پر پکارا جائے گا کہ ادھر آکر اپنا حساب کتاب چکاؤ۔ یہ بڑا خوفناک منظر ہوگا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ امام، اُم کی جمع ہے جیسے خفاف خف کی جمع ہے اور اُم کا معنی چونکہ ماں ہے، لہٰذا امام کا مطلب یہ ہے کہ لوگ اپنی ماؤں کے نام پر پکارے جائیں گے، یہ تفسیر مرجوح نہیں ہے کیونکہ زیادہ قوی روایات کے مطابق لوگوں کو باپ کے نام پر آواز دی جائے گی۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ اچھے نام رکھا کرو اور برے اور شرکیہ ناموں سے پرہیز کرو۔ البتہ جس کا باپ نہیں ہوگا اُسے ماں کے نام سے پکارا جائے گا۔ جیسا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ کہہ کر بلایا جائیگا۔ اسی طرح آدم علیہ السلام کا نہ باپ ہے اور نہ ماں، لہٰذا انہیں قدم کے نام سے پکارا جائے گا یعنی اے آدم علیہ السلام!

رادھر متوجہ ہوں۔ حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ ارشاد ہوگا۔ جنتیوں اور دوزخیوں کو الگ الگ کر دو۔ آدم علیہ السلام عرض کریں گے، مولا کریم! دوزخی کتنے ہیں اور جنتی کتنے؟ ارشاد ہوگا کہ ایک ہزار افراد میں سے نو سو ننانوے ۹۹۹ دوزخی ہیں جب کہ صرف ایک جنتی ہے۔ بہرحال مفسرین نے لفظ امام کی مختلف تفسیریں کی ہیں۔

اعمالناموں کی تقسیم

آگے ارشاد ہوتا ہے فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ جس کو اس کی کتاب یعنی اعمالنامہ دائیں ہاتھ میں مل گیا فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ پس وہ اپنے اپنے اعمالنامے پڑھیں گے اور بڑے خوش ہوں گے۔ سورۃ الحاقہ میں آتا ہے کہ ایسے لوگ اپنا اعمالنامہ دوسروں کو دکھا کر کہیں گے "هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ"۔ دیکھو یہ اعمال نامہ پڑھو مجھے حساب کتاب کے عمل پر یقین تھا۔ وہ آدمی سمجھے گا کہ مجھے پروانہ نجات مل گیا۔ حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ میدان حشر میں اعمالنامے اڑیں گے اور اڑ کر کسی کے دائیں ہاتھ میں اور کسی کے بائیں میں پہنچیں گے کسی شخص کو اس کا اعمالنامہ سامنے سے ملے گا اور کسی کو پیچھے سے۔

حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان میں سے ایک شخص کا قد دراز فرمائیں گے، اس کا چہرہ نورانی ہوگا اور اس کا اعمالنامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔ وہ اعمالنامہ لے کر جب اپنی جان پہچان والے لوگوں کے پاس پہنچے گا، تو وہ بھی اسے دیکھ کر خوش ہوں گے وہ شخص ان سب کو خوشخبری دے گا کہ تم بھی میری طرح خوش نصیب ہو تمہیں ان کے اعمالنامے دائیں ہاتھ میں ملنے والے ہیں اور یہ کامیابی کی علامت ہے۔ اس کے برخلاف جس شخص کو اعمالنامہ بائیں ہاتھ میں ملے گا اس کا چہرہ سیاہ اور شکل منحوس ہو جائے گی۔ جب وہ اپنے لوگوں کے قریب پہنچے گا تو وہ کہیں گے کہ تم منحوس ہو، ہمارے قریب نہ آنا۔ وہ کہے گا

کہ میں تو منحوس ہوں مگر تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہونے والا ہے۔ غرضیکہ اعمالناموں کی تقسیم کی یہ کیفیت بھی بیان کی گئی ہے۔

حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ حشر میں بعض مواقع ایسے بھی آئیں گے جب کوئی کسی کی طرف دھیان نہیں کرے گا اور سب کو اپنی اپنی پڑی ہو گی جن کو اُن کے اعمال نامے دائیں ہاتھ میں ملیں گے۔ وہ بڑے خوش ہوں گے اور دوسروں کو بھی دکھائیں گے۔ مسلم شریف کی روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ جو جو لوگ جس جس معبود کی پوجا کرتے تھے، ان کے پیچھے لگ جاؤ۔ وہ سب اپنے اپنے معبود کے پیچھے قطار بنالیں گے جو انہیں لے کر سیدھا جہنم میں پہنچا دے گا۔ سورج، چاند، درخت اور پتھروں کے پجاریوں کے معبود ان کے سامنے متشکل ہو کر آئیں گے اور جہنم تک پہنچا دیں گے۔ جن لوگوں نے اپنے اپنے انبیاء کی پرستش کی اُن سے دوسرے طریقے سے بات کی جائیگی۔ یہودی اور عیسائی شدت پیاس کی وجہ سے پانی طلب کریں گے تو انہیں سراب دکھایا جائیگا کہ جاؤ اُدھر پانی ہے۔ جب وہ پانی کی تلاش میں اُس طرف جائیں گے تو آگے جہنم ہو گا۔

فرمایا کہ جن کو اعمالنامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ وہ اُسے پڑھ کر خوش ہو جائیں گے وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا اور اُن پر دھاگہ برابر بھی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ ہر شخص کو اس کے عقیدہ اور عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائیگی۔ فتیل اُس بتی کو بھی کہتے ہیں جو چراغ میں ڈالی جاتی ہے۔ اور کھجور کی گٹھلی کی دراڑ میں جو باریک سا دھاگہ ہوتا ہے، اُسے بھی فتیل کہتے ہیں۔ تو فرمایا ایک باریک دھاگے کے برابر بھی کسی سے ظلم نہیں کیا جائے گا۔

حشر میں اندھاپن

فرمایا یاد رکھو! وَمَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ

جو شخص اس دنیا میں اندھا رہا فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ
وہ آخرت میں بھی اندھا ہی اٹھایا جائے گا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں
کہ اس اندھاپن سے مراد ظاہری آنکھوں کی بینائی سے محرومی نہیں،
کیونکہ یہ محض عوارض کی بنا پر ہوتا ہے، بلکہ اندھے سے مراد وہ آدمی ہے
جو اس دنیا میں ہدایت کے راستے سے محروم رہا۔ اللہ نے دنیا میں ہدایت
کے تمام اسباب مہیا کر دیے تھے۔ انسان کو عقل اور سمجھ عطا کی، اس
کی راہنمائی کے لیے کتابیں اور انبیاء مبعوث فرمائے۔ ہادی اور منذر بھیجے
پڑھانے اور سکھلانے والے بھیجے، اس کے باوجود جو شخص دنیا میں ہدایت
کے راستے کو نہ پا سکا، وہ اگرچہ ظاہری آنکھیں رکھتا ہے مگر اس کے دل
کی آنکھیں نہیں ہیں جس کی وجہ سے وہ بصیرت سے محروم ہے۔ سورۃ
حج میں ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن
تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ" اُن کی ظاہری
آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ اُن کے سینوں میں رکھے ہوئے دل اندھے ہوتے ہیں۔

بہرحال اللہ نے دنیا میں ہدایت کے تمام وسائل مہیا کر دیے ہیں۔ تاکہ
کل کو کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ مجھے پتہ نہیں چلا یا مجھے کسی نے سمجھایا نہیں۔
اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اردگرد ہزاروں اور لاکھوں ایسی
نشانیاں بکھیر دی ہیں جنہیں دیکھ کر انسان اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لا
سکتا ہے۔ اس کے باوجود جو شخص اس دنیا میں راہ ہدایت سے محروم رہا،
وہ آخرت میں امن و سلامتی کے راستے سے محروم رہ جائے گا۔ اس کے
سامنے تباہی، بربادی اور جہنم کا راستہ ہوگا اور نجات کے راستے کی طرف
سے اندھا ہی رہیگا۔ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہاں پہ ہدایت کی راہ
سے اندھا رہا۔ وہ آخرت میں بہشت کی راہ سے اندھا رہیگا۔ بہشت
کی راہ اُس سے بہت دور ہوگی جہاں وہ کبھی نہیں پہنچ سکے گا۔

فرمایا ایسا شخص آخرت میں اندھا ہوگا وَأَضَلُّ سَبِيلًا اور بہت زیادہ گم کردہ راہ ہوگا۔ جب تک انسان اس دنیا میں موجود ہے۔ اس کے پاس تلافی کے ذرائع موجود ہیں، وہ توبہ کر کے اور ایمان صالح سے مالا مال ہو کر راہ ہدایت حاصل کر سکتا ہے، مگر آخرت میں پہنچ کر یہ امکان بھی ختم ہو جائے گا۔ وہاں پر انسان کی عملی دنیا ختم ہو چکی ہوگی اور وہ صرف جزا کے عمل سے گزرے گا۔ پچھلی سورۃ النحل میں گزر چکا ہے کہ جس دن ہم ہر امت سے گواہ اٹھائیں گے، اس دن کافروں کو بات کرنے کی بھی اجازت نہیں ہوگی وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ اور نہ انہیں کوئی موقع دیا جائیگا کہ وہ اپنے پروردگار کو منا سکیں۔ اس وقت وہ شخص پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے اسی دنیا میں موقع ہے کہ وہ راہ راست پہ آ جائیں، وگرنہ آخرت میں وہ بہت ہی گم کردہ راہ ہوں گے۔

وَإِن كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ ۖ وَإِذًا لَّاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا ﴿٧٣﴾ وَلَوْلَا أَن ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ﴿٧٤﴾ إِذًا لَّأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا ﴿٧٥﴾ وَإِن كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا ۖ وَإِذًا لَّا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٧٦﴾ سُنَّةَ مَن قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِن رُّسُلِنَا ۖ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا ﴿٧٧﴾

ترجمہ:- اور بیشک قریب تھا کہ یہ لوگ آپ کو فتنے میں مبتلا کریں اُس چیز سے جس کو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا ہے تاکہ تو افترا کرے ہم پر اس کے علاوہ دوسری بات ۔ اور اُس وقت البتہ بنا لیں گے یہ تجھ کو اپنا دوست ﴿۷۳﴾ اور اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو البتہ تحقیق قریب تھا کہ آپ اُن کی طرف مائل ہو جاتے تھوڑا سا میلان ﴿۷۴﴾ اُس

وقت ہم چکھاتے آپ کو دگنی سزا دنیا کی زندگی میں اور دگنی
سزا دوسری زندگی میں ۔ پھر آپ نہ پاتے اپنے لیے ہمارے
اوپر کسی کو مددگار ﴿۷۵﴾ اور قریب تھا کہ یہ لوگ آپ کے
قدم ہلا دیں زمین سے تاکہ یہ آپ کو اس سے نکال دیں۔
اور اس وقت یہ نہیں ٹھہریں گے آپ کے پیچھے مگر
بہت تھوڑا ﴿۷۶﴾ یہ دستور ہے اُن کا جن کو ہم نے بھیجا
آپ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے ۔ اور نہ پائیں گے
آپ ہمارے دستور میں کوئی تفاوت ﴿۷۷﴾

ربطِ آیات

پہلے اللہ نے مشرکین کا ردّ فرمایا، پھر انسان کی برتری اور عزت واحترام کو بیان کیا اس کے بعد محاسبے کا ذکر کیا کہ جس دن اللہ تعالیٰ سب کو اپنے پیشواؤں سمیت بلائے گا، اُس دن بہت ہی خوفناک منظر ہوگا۔ لوگوں کو اعمالنامے دیئے جائیں گے۔ جنہیں وہ پڑھیں گے اور اس سلسلے میں کسی کے ساتھ ذرہ بھر بھی زیادتی نہیں ہوگی۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ جو شخص اس دنیا کی زندگی میں ہدایت کے راستے سے اندھا رہا وہ آخرت میں بھی ہدایت کے راستے سے اندھا رہے گا، اور گم کردہ راہ بن کر بہت دور جا پڑے گا۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبرِ اسلام کے خلاف مشرکین کی عداوت کا ذکر فرمایا ہے کہ یہ لوگ آپ کے خلاف طرح طرح کی تدبیریں کرتے ہیں مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔

مشرکین کی سازشانہ شرائط

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ طائف کے مشرکین کا ایک وفد حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، اور انہوں نے آپ پر ایمان لانے کے لیے چند شرائط پیش کیں۔ پہلی شرط یہ تھی کہ آپ ہمیں تمام عربوں پر امتیازی حیثیت دلائیں۔ دوسری بات یہ کہ مکے اور طائف کے درمیان واقع ہماری "وادی وجہ" کو مکہ معظمہ کی طرح حرم قرار دیں تاکہ یہاں پر عبادت اور اجر و ثواب بڑھ جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہمیں زکوٰۃ کی ادائیگی

سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ اور یہ بھی کہ ہم تمہارے ساتھ کسی جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ جہاں تک ہمارے معبودوں کی بات ہے ہم انہیں اپنے ہاتھ سے نہیں توڑیں گے۔ ان معبودوں کو مکمل طور پر ترک کرنے کیلئے ایک سال کی مہلت دی جائے۔ اس دوران ہم ان کی عبادت تو نہیں کریں گے مگر ان کے سامنے پیش کیے جانے والے نذرانے وصول کرنے کے حقدار ہوں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ رکوع و سجود کی ادائیگی ہم پر گراں گذرتی ہے لہذا ہمیں نماز سے بھی مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

حضور علیہ السلام کا جواب

وفدِ طائف کی یہ شرائط سن کر حضور علیہ السلام نے فرمایا لَا خَیْرَ فِیْ دِیْنٍ لَا رُکُوْعَ وَلَا سُجُوْدَ فِیْہِ یعنی جس دین میں رکوع اور سجود نہیں ہے، اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ یہ تو کمال درجے کی عبادت ہے، لہذا تمہیں نماز سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بتوں کو اپنے ہاتھوں سے نہ توڑنے کے متعلق آپ نے فرمایا، کوئی بات نہیں، انہیں توڑنے کے لیے دوسرے لوگ کافی ہیں۔ اس زمانے میں اکثر بیشتر ایسا ہوا تھا کہ اسلام قبول کرنے والوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے عبادت خانے گرائے اور ان کی جگہ مسجدیں تعمیر کیں اور بتوں کو اپنے ہاتھوں سے توڑا۔ تاہم حضور نے طائف والوں کی یہ بات قبول کر لی کہ وہ خود بت نہیں توڑیں گے۔ اسی طرح آپ نے مشرکین کے دوسرے مطالبات یعنی عربوں میں امتیازی حیثیت دلانے، وادی کو حرام قرار دینے اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے استثنا بھی مسترد کر دیے۔

دراصل مشرکین چاہتے تھے کہ حضور علیہ السلام سے "کچھ لو اور کچھ دو" کے اصول پر سمجھوتہ ہو جائے۔ وہ اپنی چرب زبانی اور سازش کے ذریعے پیغمبر اسلام کو دین کے اصولوں سے ہٹانا چاہتے تھے اس قسم کی سازش کا ذکر سورۃ القلم میں بھی موجود ہے "وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ"

وہ چاہتے ہیں کہ تھوڑا سا آپ ڈھیلے پڑ جائیں اور کچھ وہ نرم ہو جائیں۔ کہتے تھے آپ ہمارے معبودوں کے خلاف بدگوئی نہ کریں تو ہم آپ کی مخالفت نہیں کریں گے۔ کفار و مشرکین آپ علیہ السلام کی سیادت تسلیم کرنے کی پیش کش بھی کرتے تھے، اچھے سے اچھا رشتہ لا کر دینے کا لالچ دیتے تھے، مال و دولت ڈھیر کر دینے کی بات کرتے تھے مگر آپ نے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر آپ سورج کو میرے ایک ہاتھ پر رکھ دیں اور چاند کو دوسرے ہاتھ پر، تو پھر بھی میں تمہاری بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گا بلکہ اپنے پروردگار کی طرف سے عائد کردہ فریضۂ تبلیغ ادا کرتا رہوں گا۔

انہی حالات و واقعات کے پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے یہاں پر ارشاد فرمایا ہے وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ اور بیشک قریب تھا کہ یہ لوگ آپ کو فتنہ میں ڈال دیں اس چیز سے جس کو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا ہے یعنی وہ اپنی کمال ہوشیاری اور چرب زبانی سے آپ سے کوئی چیز منوا لیں اور اس طرح آپ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ ہم پر قرآن کے علاوہ کوئی دوسری بات افترا کر دیں۔ مثلاً یہ کہ آپ طائف والوں کی وادی کو حرم قرار دینے پر آمادہ ہو جائیں یا انہیں نماز اور زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیں تو فرمایا کہ اگر آپ ان کی کوئی بات مان لیں تو پھر وَإِذًا لَّاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا وہ لوگ آپ کو اپنا دوست بنا لیں گے اور آپ سے مراسم قائم کر لیں گے۔ فرمایا یہ بات درست نہیں ہے۔ بلکہ آپ اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے فریضہ تبلیغ ادا کرتے رہیں اور ان مشرکین کی سازشوں کا شکار نہ ہوں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ اور اگر ہم

آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا تو قریب تھا کہ آپ ان کی طرف تھوڑا سا مائل ہو جاتے۔ رکون کا معنی ہوتا ہے کسی ایک طرف کو جھک جانا یا مائل ہو جانا۔ دوسرے مقام پر ہے وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (ھود) اے ایمان والو! ظالموں کی طرف مت جھکو۔ اگر ایسا کرو گے تو تم بھی جہنم کی آگ کے مستحق بن جاؤ گے، اس میں حضور علیہ السلام کی تعریف کا پہلو بھی نکلتا ہے کہ اللہ نے آپ کو عصمت کا درجہ عطا کیا ہے۔ اگر آپ کا جھکاؤ اس طرف ہوتا بھی تو بہت ہی قلیل ہوتا۔

اور پھر یہ بھی ہے کہ اگر جھکاؤ ذرہ بھی جاتا ہے تو پھر اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ہم آپ کو چکھاتے دگنی سزا دنیا کی زندگی میں بھی اور دوسری زندگی میں بھی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ خاص لوگوں کو تنبیہ بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر گرفت ہو جاتی ہے حالانکہ ایسی معمولی باتوں پر عوام سے باز پرس نہیں کی جاتی۔ اس قسم کی مثال سورۃ الاحزاب میں بھی موجود ہے اللہ کے نبی کی ازواج مطہرات خواص میں سے ہیں۔ اس لیے ان کے متعلق فرمایا يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو اس لیے مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ اگر تم میں سے کوئی غیر اخلاقی بات کرے گی تو اس کو دگنی سزا دی جائیگی۔

اس مقام پر بھی نبی علیہ السلام سے خطاب کر کے یہی بات بیان کی گئی ہے کہ اگر آپ کا جھکاؤ دوسری طرف ہو جاتا تو ہم آپ کو دگنی سزا دیتے۔ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا پھر آپ اپنے لیے

ہمارے اُوپر کوئی مددگار بھی نہ پاتے ۔ ایسی صورت میں کوئی بھی آپ کی دادرسی کرنے والا نہ ہوتا ۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تنبیہ بھی فرما دی ۔ ظاہر ہے کہ جب پیغمبر بھی غلطی سرزد ہونے پر گرفت میں آ سکتے ہیں تو عام مسلمانوں کو تو زیادہ محتاط رہنا چاہیئے اور اللہ کی پکڑ سے خوف کھانا چاہیئے ۔

حضرت شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ ان آیات کو تلاوت کرتے وقت دو زانو ہو کر انتہائی خشیت کے ساتھ اللہ کی شان جلال و جبروت میں غور کرنا چاہیئے اور وہی درخواست کرنی چاہیئے جو خود حضور علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں پیش کی تھی اَللّٰھُمَّ لَا تَکِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَۃَ عَیْنٍ اے اللہ ! آنکھ جھپکنے کے برابر بھی مجھے میرے نفس کی طرف نہ سونپ ، میری ہر وقت دستگیری فرما تاکہ غلطیوں سے محفوظ رہوں اور نیکی کے راستے پر استقامت نصیب ہو گویا اللہ تعالیٰ کے حضور انتہائی درجے کی عاجزی اختیار کرنی چاہیئے ۔

ہجرت کے بعد تباہی

آگے اللہ تعالیٰ نے ایک اور اصول بیان فرمایا ہے وَاِنْ کَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَکَ مِنَ الْاَرْضِ اور قریب تھا کہ یہ لوگ آپ کے قدم زمین سے متزلزل کر دیں استفزاز کا معنی ہلا دینا ، جھنجھوڑ دینا اور کمزور کر کے کسی چیز پر قابو پا لینا ہوتا ہے جیسے کسی دیوار یا درخت کو جھٹکے دے کر کمزور کر لیا جاتا ہے اور پھر اسے گرا لیا جاتا ہے ۔ فرمایا مشرکین بھی آپ کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا چاہتے ہیں ۔ لِیُخْرِجُوْکَ مِنْھَا تاکہ آپ کو مکہ کی بستی سے نکال دیں ۔ فرمایا اگر انہوں نے یہ کام کیا وَاِذًا لَّا یَلْبَثُوْنَ خِلٰفَکَ اِلَّا قَلِیْلًا تو پھر یہ بھی آپ کے بعد نہیں ٹھہر سکیں گے مگر بہت تھوڑا عرصہ مطلب یہ ہے کہ اگر مشرکین نے آپ کو ہجرت پر مجبور کر دیا تو پھر وہ خود بھی زیادہ عرصہ مکہ میں قیام نہیں کر سکیں گے ۔ اگلی آیت میں بھی یہ اصول

بیان کیا جا رہا ہے کہ ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے ہیں ان میں یہی دستور رہا ہے کہ جب انہوں نے اللہ کے نبیوں کو نکل جانے پہ مجبور کر دیا تو پھر اُن پہ اللہ کا عذاب نازل ہو گیا اور وہ دنیا میں باقی نہیں رہے۔ سورۃ الانفال میں گزر چکا ہے کہ مشرکین نے اپنے حق میں بددعا کی اگر محمد کا دین سچا ہے تو ہم پہ پتھروں کی بارش برسا مگر اللہ نے فرمایا "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ" جب تک آپ اُن کے درمیان موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن پہ عذاب نہیں بھیجے گا۔

بالآخر وہ وقت بھی آ گیا جب قریش مکہ کی ایذا رسانیاں حد سے بڑھ گئیں مسلمانوں کی دو جماعتیں حبشہ کی طرف ہجرت کر چکی تھیں۔ باقی مسلمانوں پہ عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا تھا۔ پھر حضور علیہ السلام کے قتل کی سازش بھی کی گئی تو آپ کو مجبوراً مکہ چھوڑ کر مدینہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ اللہ کے نبی کو مکہ چھوڑے ابھی ڈیڑھ برس بھی گزرنے نہ پایا تھا۔ کہ معرکہ بدر واقع ہوا۔ حضور نے جماعت المسلمین سے فرمایا، اے ایمان والو! آج مکے کے سارے جگر گوشے میدانِ بدر میں جمع ہو گئے ہیں، آج اللہ ان سے انتقام لے گا۔ حضور علیہ السلام نے ائمۃ الکفر کی موت والی جگہ کی نشاندہی بھی کر دی کہ فلاں فلاں جگہ پہ فلاں فلاں کافر جہنم رسید ہوگا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ نے اُن سے ایسا انتقام لیا کہ اُن کی موت نشان زدہ جگہ سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر واقع نہ ہوئی۔ کافروں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مسلمانوں کی اتنی کمزور اور بے سروسامان جماعت اسلحے سے لیس بڑی تعداد پہ غالب آ جائے گی۔ مگر یہ اللہ کا وعدہ تھا جو پورا ہو کر رہا۔

فرمایا سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا یہ اُن رسولوں کا دستور ہے جنہیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا جب کسی رسول کی قوم نے اپنے نبی کو ہجرت پہ مجبور کیا۔ اور اُسے اپنی بستی

سے نکال دیا تو پھر وہ لوگ خود بھی عذاب الٰہی کا شکار ہو کر ہلاک ہو گئے مشرکین مکہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ جب انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو خود بھی تباہی سے دوچار ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ اتنے کمزور ہو گئے کہ فتح مکہ کے دن وہ مکمل طور پر ملیا میٹ ہو گئے۔ فرمایا یہ ہمارے پہلے رسولوں کا دستور ہے وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا اور آپ ہمارے اس دستور میں کوئی تفاوت یا تبدیلی نہیں پائیں گے۔ آپ کے لیے بھی یہی قانون ہے جب یہ لوگ آپ کو نہیں رہنے دیں گے تو پھر ان کا رہنا بھی ناممکن ہو جائے گا۔ اور یہ تباہ و برباد ہو کر رہیں گے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيۡلِ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ كَانَ مَشۡهُوۡدًا ﴿۷۸﴾ وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ﴿۷۹﴾

ترجمہ:۔ قائم کریں آپ نماز کو سورج کے ڈھلنے سے رات کی تاریکی چھا جانے تک اور فجر کا قرآن پڑھنا۔ بیشک فجر کا قرآن پڑھنا حاضری کا وقت ہے ﴿۷۸﴾ اور رات میں سے (کچھ وقت) پس آپ تہجد پڑھیں اس (قرآن) کے ساتھ یہ زائد ہے آپ کے لیے۔ قریب ہے کہ کھڑا کرے گا آپ کو آپ کا پروردگار تعریف والے مقام پر ﴿۷۹﴾

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ نے مشرکین کا رد فرمایا اور انسان کی تکریم کا مسئلہ بیان فرمایا۔ پھر دنیا کی زندگی میں ہدایت اور گمراہی کی بات ہوئی اور مشرکین کی سازشوں کا بیان ہوا جس کے ذریعے حضور خاتم النبیین کو راہِ راست سے ہٹانا چاہتے تھے مگر اللہ نے فرمایا کہ مشرکین اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی بھی دی کہ اگر یہ لوگ آپ کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیں گے تو پھر یہ بھی یہاں پر زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کی گرفت کا شکار ہو جائیں گے۔

اقامتِ صلوٰۃ

مشرکین مکہ حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کرامؓ کو سخت تکالیف پہنچاتے تھے جس وجہ سے اہلِ حق کو پریشانی کا لاحق ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس پریشانی کا حل تجویز کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اَقِمِ الصَّلٰوةَ

آپ نماز قائم کریں۔ مصیبت کے وقت نماز اور صبر کے ذریعے استعانت پکڑنے کا اصول سورۃ البقرۃ میں بھی بیان ہو چکا ہے "یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ" اے ایمان والو جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو صبر اور نماز کے ساتھ مدد حاصل کرو۔ "اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ" بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے صبر بھی ملت ابراہیمیہ کا بہت بڑا اصول ہے۔ اور نماز کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے اُمُّ الْعِبَادَاتِ الْمُقَرِّبَۃِ یعنی اللہ کا قرب دلانے والی عبادات میں سے نماز سب سے اہم عبادت ہے۔

نماز، ذکر، مناجات، قلب وجسم کی عاجزی، زبان کے ساتھ خدا تعالیٰ کے لیے کلمات تعظیم اور کلام الٰہی کی تلاوت کا مجموعہ ہے۔ نماز کے ذریعے انسان کو بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً نماز کا قیام طہارت اور پاکیزگی پر قائم ہوتا ہے۔ جو کہ بذاتہ ایک اعلیٰ اخلاق ہے۔ نماز آپس میں محبت اور مساوات پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ "وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ" (البقرۃ) انسانی برادری کا کمال نمونہ پیش کرتا ہے۔ اکیلے نماز پڑھنے کا ایک نماز کا ثواب ہوتا ہے جب کہ باجماعت نماز کا ثواب ستائیس گنا بڑھ جاتا ہے نماز میں وقت کی پابندی اور تنظیم جیسے زریں اصولوں پر عمل ہوتا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پختہ ہوتا ہے۔

نمازوں کی تعداد

فرمایا، نماز قائم کرو، مگر کب؟ "لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ" سورج ڈھلنے سے لے کر رات کی تاریکی تک۔ دلوک کا معنی میلان ہوتا یا ڈھلنا ہوتا ہے۔ دوپہر کے وقت جب سورج پچھلے پہر کی طرف مائل ہوتا ہے تو اس کو سورج کا ڈھلنا یا زوال کہتے ہیں ظاہر ہے کہ زوال سے لے کر رات کی تاریکی تک مسلسل ایک ہی نماز تو نہیں ہو سکتی، اسی لیے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس عرصہ میں چار نمازوں یعنی

ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کا اشارۃً ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے بھی آثار میں منقول ہے کہ انہوں نے اس حصہ آیت سے چاروں نمازیں مراد لی ہیں۔ تاہم قرآنِ پاک میں ہر نماز کے وقت کا فرداً فرداً ذکر بھی آیا ہے۔ بہرحال اس آیت کے مطابق زوال کے وقت ظہر کی نماز ہوتی ہے۔ اس کے بعد عصر کا وقت ہوتا ہے جس کی سخت تاکید کی گئی ہے کیونکہ یہ مشاغل دنیا کا وقت ہوتا ہے۔ اللہ نے فرمایا "حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى" (البقرۃ) نمازوں کی حفاظت کرو اور خاص کر نمازِ وسطیٰ یعنی عصر کی نماز کی اسی طرح "حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ" (الروم) میں شام اور صبح کی نمازیں آتی ہیں۔ "وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ" (الروم) میں عصر اور ظہر کی نمازوں کا ذکر ہے۔ اسی طرح "قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا" (طٰہٰ) میں فجر اور عصر کا ذکر ہے۔

بہرحال اس حصہ آیت میں چار نمازیں آتی ہیں۔ آگے فرمایا وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اور فجر کا قرآن یعنی نمازِ فجر بھی۔ اس طرح گویا اس آیت کریمہ میں پانچوں نمازوں کا ذکر آگیا ہے۔ پانچ نمازوں کی فرضیت معراج کی رات ہوئی۔ اس سے پہلے "قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝ وَمِنَ الَّيْلِ" (ق۔ ۴۰) کے مطابق فجر، عصر، اور رات کی تین ہی نمازیں تھیں۔ تاہم سورۃ بنی اسرائیل چونکہ واقعہ معراج کے بعد نازل ہوئی۔ اس لیے اس میں پانچوں نمازوں کا ذکر آگیا ہے۔

فرمایا فجر کا قرآن پڑھنا اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا بیشک فجر کا قرآن پڑھنا حاضری کا وقت ہے۔ اس وقت میں فرشتوں کی حاضری ہوتی ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے "يَتَعَاقَبُوْنَ فِيْكُمْ لَيْلًا وَّنَهَارًا" رات اور دن کے فرشتے آگے پیچھے آتے

ہیں۔ یعنی جن فرشتوں کی ڈیوٹی انسانوں کے اعمال کی حفاظت ہوتی ہے وہ فجر اور عصر کی نماز کے وقت ڈیوٹیاں تبدیل کرتے ہیں۔ عصر کی نماز کے وقت دن کے فرشتے چلے جاتے ہیں اور رات والے آجاتے ہیں۔ اسی طرح فجر کے وقت رات والے چلے جاتے ہیں اور دن والے آجاتے ہیں۔ ہر جانے والا گروہ اللہ کی بارگاہ میں اس کے بندوں کی رپورٹ پیش کرتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دریافت کرتا ہے کہ فرشتو! تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ تو نیک بندوں کے فرشتے کہتے ہیں کہ ہم نے انہیں اس حالت میں چھوڑا کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ اسی طرح خدا کی یاد سے بے بہرہ لوگوں کے متعلق فرشتے رپورٹ پیش کرتے ہیں کہ مولا کریم! تیرے فلاں فلاں بندے غفلت میں پڑے ہوئے تھے یا وہ برائی میں لگے ہوئے تھے۔ غرضیکہ فجر کا وقت فرشتوں کی حاضری کا وقت ہے۔

نماز فجر کے ساتھ قرآن کا خصوصی ذکر اس وجہ سے ہے کہ سنت کے مطابق فجر کی نماز میں قرآن کی تلاوت قدرے زیادہ کی جاتی ہے۔ حضور علیہ السلام بالعموم فجر کی نماز میں چالیس سے لے کر سو آیات تک تلاوت فرماتے تھے۔ گویا اس نماز میں باقی نمازوں کی نسبت قرأت لمبی ہوتی ہے۔

بعض گمراہ فرقے

بعض گمراہ فرقے پانچ نمازوں کے قائل نہیں ہیں۔ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو صرف فجر کی نماز ادا کرتا ہے۔ میں نے ایک شخص کو دیکھا جو نماز دن کا مسلم کرتا تھا مگر فجر کے علاوہ کوئی نماز نہیں پڑھتا تھا۔ دریافت کرنے پر کہا کہ نماز صرف ایک ہی ہے۔ بعض منکرین قرآن صرف دو نمازیں پڑھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا (طٰہٰ) کے مطابق صرف فجر اور عصر کی نمازیں فرض ہیں۔ بعض لوگ تین نمازوں کے اور بعض چار کے قائل ہیں۔ پرویز کہتا ہے کہ ہماری یہ نماز

حقیقت میں حقیقی نماز ہی نہیں ہے۔ اُن کا نظریہ یہ ہے کہ جب ہماری حکومت قائم ہوگی اور وہ نماز کا حکم دیگی تو وہی حقیقی نماز ہوگی۔ اس نے یہ بات اپنی کتابوں اور رسالوں میں واضح طور پر لکھی ہے کہ ہماری موجودہ نماز محض رسمی نماز ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ عقیدہ اصلاً کافرانہ ہے کیونکہ نماز وہی ہے جو حضور علیہ السلام نے، اور آپ کے صحابہؓ نے پڑھی اور جس کی تلقین بھی کی۔ یہی نماز تواتر کے ساتھ ثابت ہے جس کا بدعقیدہ لوگ انکار کر رہے ہیں۔

نبی کا قول و فعل بطور دلیل

نمازوں کی تعداد اور رکعات کے بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول اور عمل ہی ہمارے لیے حجت ہے۔ اسی لیے تمام مذاہب حقہ پانچ نمازوں کی فرضیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر نماز کی رکعات کی تعداد کے متعلق بھی کوئی اختلاف نہیں۔ تمام اہل ایمان فجر کے دو، ظہر کے چار، عصر کے چار، مغرب کے تین اور عشاء کے چار فرضوں کے قائل ہیں۔ اسی لیے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ نماز میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے۔ البتہ اس کی بعض ہیئات میں تھوڑا بہت اختلاف ہے اور ان میں سے بعض ہیئات سنن میں داخل ہیں اور بعض مستحبات میں۔ جہاں تک فرائض اور واجبات کا تعلق ہے، وہ اختلافات سے پاک ہیں۔ اختلافی ہیئات میں رفع یدین، آمین بالجہر، ہاتھوں کا باندھنا وغیرہ شامل ہیں مگر ان مسائل میں ہر قسم کی روایات موجود ہیں اور ہر ایک کے لیے مختلف طریقے اختیار کرنے کی گنجائش بھی ہے۔

نماز کے بہت سے ارکان ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن پاک میں نہیں مگر ہم وہ ارکان نبی علیہ السلام کے قول اور عمل کے مطابق تواتر کے ساتھ ادا کرتے ہیں، لہٰذا کسی رکن کا قرآن میں عدم ذکر اس کی شرعی حیثیت کو مشکوک نہیں بنا سکتا۔ حضرت عمران ابن حصینؓ کے سامنے ایک شخص

نے ذکر کیا کہ آپ لوگ مقام محمود والی آیت کی تشریح میں شفاعت والی حدیث پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کا ذکر قرآن حکیم میں نہیں ہے اس پر حضرت عمران رضی اللہ عنہ ناراض ہو گئے، اور فرمایا کیا تو نے قرآن پڑھا ہے؟ اس شخص نے کہا کہ ہاں پڑھا ہے۔ آپ نے فرمایا کیا تم نے فجر کی دو، مغرب کی تین اور ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار رکعتوں کا ذکر وہاں پڑھا ہے؟ کہنے لگا، نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تم نے یہ تعداد رکعات کہاں سے لی؟ فرمایا، کیا تم نے یہ ساری باتیں ہم سے اخذ نہیں کیں؟ اور ہم نے یہ عمل خود حضور علیہ السلام سے لیا۔ پھر پوچھا، کیا تو نے زکوٰۃ کا نصاب قرآن میں کہیں پڑھا ہے کہ سونے چاندی پر اتنے فیصد اور مویشیوں پر اس حساب سے زکوٰۃ واجب ہے؟ وہ شخص کہنے لگا کہ قرآن میں تو یہ تفصیل نہیں ہے، فرمایا، پھر یقیناً مقررہ نصاب ہم سے لیا ہے اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کیا تھا۔ حضرت عمران رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے یہ بھی کہا کہ قرآن پاک میں ہے وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ (الحج) اور چاہیئے کہ اللہ کے قدیم گھر کا طواف کرو۔ اب بتا کہ طواف کے سات چکروں کا ذکر قرآن میں کہاں ہے؟ اور پھر یہ بھی کہ طواف کے بعد مقام ابراہیم پر دو رکعت پڑھو۔ فرمایا کیا یہ ساری باتیں تم نے ہم سے اور ہم نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے حاصل نہیں کیں؟ وہ شخص کہنے لگا کہ ہاں ایسا ہی ہے۔ حضرت عمران رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قرآن میں یہ کہاں ہے لَا شِغَارَ فِي الْإِسْلَامِ یعنی اسلام میں ٹٹے سٹے کا نکاح جائز نہیں حالانکہ ہم سب اس حدیث کے قائل ہیں۔ بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ ایسا نکاح بالکل باطل ہے کیونکہ اس میں جانبین کی طرف سے دونوں رشتے طے کر کے درمیان سے مہر اڑا دیا جاتا ہے تاہم امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نکاح تو ہو جائے گا مگر مہر مثل ادا کرنا پڑے گا

تو یہ مسئلہ بھی ہمیں سنت میں ہی ملا ہے۔ فرمایا، اللہ نے اپنی پاک کتاب میں فرمایا ہے "وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا" (الحشر ۷) جو کچھ اللہ کا رسول تمہیں دے دے، اُسے لے لو اور جس چیز سے روک دے اس سے رُک جاؤ۔ تو فرمایا جن چیزوں کی صراحت قرآن میں موجود نہیں ہے ہم نے یقیناً انہیں اللہ کے رسول سے اخذ کیا ہے جس کا ثبوت آپ کی زبان اور آپ کا عمل ہے۔

حضور علیہ السلام نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا عامل بنا کر بھیجا، تو فرمایا، وہاں پر اہل کتاب رہتے ہیں۔ پہلے انہیں توحید و رسالت کی دعوت دینا۔ اگر وہ تسلیم کر لیں تو پھر کہنا کہ اللہ نے رات دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ واقعہ معراج میں جہاں نمازوں کی فرضیت کا ذکر ہے۔ وہاں یہ الفاظ آتے ہیں ذٰلِكَ خَمْسٌ وَّ ذٰلِكَ خَمْسِيْنَ یعنی یہ ہیں تو پانچ نمازیں مگر ان کا اجر و ثواب پچاس کے برابر ہے کیونکہ ہر عمل کا کم از کم اجر دس گنا ہے۔ بہرحال اس آیت میں اشارۃً پانچ نمازوں کا ذکر آ گیا ہے۔

نمازِ تہجد کی اہمیت

پانچ نمازوں کے ذکر کے بعد اگلی آیت میں فرمایا وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ رات کے وقت آپ تہجد بھی ادا کریں۔ فرمایا نَافِلَةً لَّكَ یہ آپ کے لیے زائد ہے۔ تہجد کا معنیٰ نیند کے بعد بیدار ہونے کے ہیں۔ چونکہ یہ نماز پچھلی رات سو کر اٹھنے کے بعد ادا کی جاتی ہے، اس لیے اسے نمازِ تہجد کہا جاتا ہے۔ نماز کے فرضوں کے علاوہ سنن، مستحبات اور نوافل وغیرہ کو نفل ہی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ فرائض سے زائد ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر بعض محققین فرماتے ہیں کہ تہجد کی نماز فرض نہیں بلکہ نفل ہے تاہم اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ صحیح روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ فرض

نمازوں کے بعد افضل ترین نماز کون سی ہے ۔ تو آپ نے فرمایا "رات کی نماز"
بعض فرماتے ہیں کہ نَافِلَةً" لَّكَ" میں ضمیر واحد کے ذریعے حضور علیہ السلام کو
خطاب کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پانچ فرض نمازوں کے علاوہ یہ
نماز بھی محض آپ کے لیے بطور زائد فرض ہے جب کہ باقی لوگوں کے لیے
نہیں ۔ اگر وہ بھی ادا کریں گے تو بہت زیادہ ثواب ہوگا ، اور اگر ادا نہ
کریں گے تو باز پرس نہیں ہوگی ۔

صحیح احادیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام تہجد کی نماز میں طویل
قیام اور لمبی قرآت کرتے تھے حتیٰ کہ موسمی اثرات کی وجہ سے کھڑے
کھڑے آپ کے پاؤں بعض اوقات متورم ہو جاتے تھے ، اور سردی
کے موسم میں تو پاؤں بعض دفعہ پھٹ بھی جاتے تھے ۔ حضرت ام المومنین رضؓ
اور بعض دوسرے صحابہ رضؓ نے عرض کیا حضور ! آپ تو گناہ سے بالکل پاک
ہیں اور معمولی لغزشوں کے متعلق بھی خدا تعالیٰ کا فرمان ہے ، ہم نے آپکو
فتح مبین عطا کی ہے "لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ
وَمَا تَاَخَّرَ" (الفتح) تاکہ اللہ تعالیٰ آپکی تمام اگلی پچھلی لغزشیں معاف
کردے ۔ تو پھر آپ اس قدر مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں کہ نماز
میں کھڑے کھڑے آپ کے پاؤں مبارک سوج جاتے ہیں ۔ آپ
علیہ السلام نے جواب دیا جب اللہ نے مجھ پر اتنی مہربانی فرمائی ہے
اَفَلَا اَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا تو کیا میں اس کا شکر گزار
بندہ نہ بن جاؤں ؟ بہرحال دونوں تفسیریں آتی ہیں کہ یہ نماز سب کے لیے
زائد ہے اور دوسری یہ کہ حضور علیہ السلام کے لیے فرض اور امت
کے لیے نفل ہے ۔

بعض فرماتے ہیں کہ ابتداء میں رات کی نماز سب کے لیے فرض
تھی جیسا کہ سورۃ مزمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام

کو خطاب کرتے فرمایا يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا اے کمبل اوڑھنے والے! آپ رات کو قیام کریں مگر تھوڑا حصہ پھر دوسرے رکوع میں صحابہ کرامؓ کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم میں بعض بیمار ہوں گے اور دوسرا طبقہ وہ ہے جو زمین پر سفر کریں گے اور اللہ کا فضل تلاش کریں گے اور بعض جہاد کے لیے جائیں گے، لہٰذا آپ قرآن میں سے اتنا حصہ پڑھیں جتنا آسان ہو۔ فرماتے ہیں کہ بعد میں یہ فرضیت اٹھا دی گئی۔

مقامِ محمود

فرمایا عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا امید ہے کہ آپ کا پروردگار آپ کو مقامِ محمود (تعریفوں والے مقام) پر کھڑا کرے گا۔ مقامِ محمود کا ذکر احادیث میں کثرت سے آیا ہے یہ وہ جگہ ہے جسے شفاعتِ کبریٰ کا مقام بھی کہا جاتا ہے۔ حشر کے میدان میں لوگ پریشانی کے عالم میں مبتلا ہوں گے۔ ہر شخص اپنے پسینے میں ڈوبا ہوا ہوگا۔ لوگ چاہیں گے کہ اللہ تعالیٰ حساب کتاب شروع کریں تاکہ اس تنگی سے چھٹکارا پاسکیں۔ اس کام کی سفارش کے لیے لوگ مختلف انبیاء کے پاس جائیں گے کہ آپ اللہ کے ہاں سفارش کرکے حساب کتاب شروع کرا دیں، مگر ہر کوئی جواب دے دیگا۔ اِذْهَبُوْا اِلٰى غَيْرِىْ کسی دوسرے کے پاس جاؤ۔ بالآخر لوگ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے جو اس کام کا بیڑا اٹھانے پر تیار ہو جائیں گے آپ مقامِ محمود پر سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ بعض روایات کے مطابق آپ ایک ہفتہ اور بعض کے مطابق دو ہفتہ تک مسلسل سجدے میں پڑے رہیں گے۔ بعض تفسیری روایات میں دس سال کا ذکر بھی آتا ہے۔ بہرحال اس عرصہ میں آپ اللہ تعالیٰ کی ایسے کلمات کے ساتھ تعریف و توصیف بیان کریں گے۔ جو اللہ تعالیٰ اس وقت آپ کو الہام کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ

فرمائے گا اِرْفَعْ رَأْسَكَ يَا مُحَمَّدُ اے محمد! اپنا سر اٹھائیے۔ آپ سفارش کریں، آپ کی سفارش قبول کی جائیگی، اور آپ سوال کریں آپ کو دیا جائے گا۔ یہی شفاعت کبریٰ ہے جو پوری مخلوق میں آپ کے حصے میں آئیگی۔ بعض محدثین فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام امت کے حق میں بار بار سجدہ ریز ہو کر سفارش پیش کریں گے اور اللہ تعالیٰ آپ کی سفارش قبول کرتا رہے گا اور لوگ عذاب سے نکلتے رہیں گے۔

بہر حال اسی مقام کے متعلق یہاں اشارہ ہے کہ امید ہے کہ اللہ تعالےٰ آپ کو مقام محمود پر کھڑا کریگا، لہٰذا اسی انعام کے شکریہ کے طور پر آپ رات کی نماز (تہجد) ادا کریں۔

اصلاح نفس

مفسرین کرام نماز تہجد کی ایک اور حکمت بھی بیان کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اس کے ذریعے انسان کے نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔ جب تک اصلاح نفس نہ ہو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلقات صحیح نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ایسا شخص دنیا کے اجتماعی نظام کو ٹھیک کر سکتا ہے۔ نماز تہجد تربیت کا پہلا مرحلہ ہے۔ صحابہ کرامؓ یہ تربیت مکمل کر کے ہی دنیا کی فرمانروائی کے لیے نکلتے تھے۔ اگر تعلق باللہ درست نہیں ہے تو اجتماعی نظام میں خود غرضی، ظلم، جور اور فتنہ و فساد کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے؟ لوگ مادی لحاظ سے کتنی بھی ترقی کر جائیں۔ حتیٰ کہ دوسرے سیاروں تک پہنچ جائیں مگر اصلاحِ نفس کے بغیر کوئی بھی درست طور پر کام نہیں کر سکتا۔ ایسے لوگوں کی قیادت میں عیاشی، فحاشی، حق تلفی اور کھیل تماشہ تو ہو سکتا ہے مگر لوگوں کو امن اور چین نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس کام کے لیے اصلاحِ نفس کی تربیت حاصل کرنا ہو گی جس کا پہلا درس نماز تہجد ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ﴿۸۰﴾ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

ترجمہ:۔ اور (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے ، اے پروردگار ! داخل کر دے مجھ کو داخل کرنا سچائی کے ساتھ اور نکال مجھ کو نکالنا سچائی کے ساتھ ۔ اور بنا دے میرے لیے اپنی طرف سے ایک غلبہ جو مددگار ہو ﴿۸۰﴾ اور آپ کہہ دیجئے کہ حق آگیا ہے اور باطل مٹ گیا ہے ۔ بیشک باطل مٹنے والا ہے ﴿۸۱﴾

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کے تعصب کا ذکر کر کے اُن کا رد فرمایا۔ پھر اُن کی سازشوں اور ایذا رسانیوں کا علاج اقامتِ صلوٰۃ کی صورت میں تجویز فرمایا۔ اللہ نے تہجد پڑھنے کی طرف رغبت دلائی تاکہ مخالفین کی حیلہ سازیاں آپ اور آپ کے ساتھیوں پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اللہ نے اشارۃً پانچوں نمازوں کا ذکر فرمایا اور نمازِ تہجد کی خصوصی فضیلت بیان فرمائی۔ پھر حضور علیہ السلام کے مقامِ محمود پر فائز ہونے کی بات کی۔

اب آج کی دو آیات میں سے پہلی آیت میں اللہ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کا اشارہ دیا ہے کہ کفار و مشرکین کی بڑھتی ہوئی ایذا رسانیوں کے پیشِ نظر آپ کو یہاں سے ہجرت کرنا پڑے گی اور دوسری آیت میں اللہ نے فتح مکہ کی پیشگوئی فرمائی ہے۔

ہجرت انبیاء

اکثر انبیاء علیہم السلام کو زندگی میں ہجرت کا مرحلہ پیش آیا۔ جب قوم و ملک کے تمام لوگ مخالف ہو گئے۔ انہیں اتنی تکالیف پہنچائی گئیں کہ ان کا اپنے وطن میں رہنا محال ہو گیا تو پھر اللہ کے حکم سے نبی کو اپنا گھر بار اور وطن چھوڑنا پڑا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلاف پوری قوم اکٹھی ہو گئی حتیٰ کہ باپ بھی دشمنوں کے ساتھ مل گیا تو آپ کو کہنا پڑا، "اِنِّیۡ ذَاہِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ سَیَہۡدِیۡنِ" (الصّٰفّٰت) میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔ وہی مجھے راستہ دکھائیگا۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے بھی ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ آپ کا مکے میں رہنا دوبھر ہو گیا اور اللہ نے آپ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ ہجرت تمام اہل ایمان کے لیے فرض قرار دے دی گئی تھی کیونکہ کفار کی ناکامی اور مسلمانوں کی کامیابی کا راز اسی میں پنہاں تھا۔ ایسی حالت میں ہجرت سے مستثنیٰ صرف عورتیں اور بچے ہوتے ہیں یا وہ کمزور لوگ ہوتے ہیں جو سفر کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں یا جن کو راستہ بتانے والا کوئی نہ ہو۔ اگر کوئی صاحب استطاعت آدمی ہجرت پر آمادہ نہیں ہوتا تو وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

آج کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو ہجرت کا حکم دینے کے بعد ہجرت کی دعا سکھلائی ہے۔ وَقُلۡ اور (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ اے پروردگار! داخل کر مجھے داخل کرنا سچائی کا۔ یہ اس آیت کا عام مفہوم ہے اور مطلب یہ ہے کہ مولا کریم! جائے ہجرت یعنی مدینہ منورہ میں مجھے سچائی کے ساتھ داخل فرما۔ وَّاَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ اور نکال مجھے سچائی کے ساتھ نکالنا۔ یعنی مکہ مکرمہ سے میرا خروج بھی سچائی کے ساتھ ہو۔ سچائی کے ساتھ داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ہجرت کر کے جہاں جا رہے

ہیں۔ وہاں حق و صداقت کا بول بالا ہو اور حق و صداقت ہی کو برتری حاصل ہو۔ اسی طرح جس شہر سے ہم رخصت ہو رہے ہیں۔ وہاں سے ہمارا خروج عزت و آبرو کے ساتھ ہو۔ دشمن چونکہ بے آبروئی پر تلے ہوئے تھے اور جان کے درپے تھے، اس لیے اللہ نے یہ دعا سکھلائی کہ مکہ سے نکلتے وقت ہمیں کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے بلکہ اپنی حفاظت میں ہمیں امن و سکون کے ساتھ نکال لے۔

دخول اور خروج کے دیگر معانی

اس مقام پر بعض مفسرین کرام نے دخول اور خروج کے بعض دیگر معانی بھی کیے ہیں۔ مثلاً امام بیضاویؒ نے اس ہجرت کو آخرت کی زندگی پر محمول کیا ہے اور دعا کا یہ معنی کیا ہے کہ اے پروردگار! جب موت دے تو مجھے قبر میں سچائی کے ساتھ داخل کرنا اور جب قیامت کو دوبارہ زندہ کرے تو اسی قبر سے نہایت عزت و آبرو کے ساتھ نکالنا۔ علیٰ ہذا القیاس خروج سے مراد اس دنیا سے خروج اور دخول سے مراد جنت کا داخلہ بھی ہو سکتا ہے۔ سورۃ یونس میں اہل ایمان کے متعلق فرمایا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِندَ رَبِّهِمْ "ان کے لیے اپنے پروردگار کے ہاں سچائی کا پایہ ہے۔ سورۃ القمر میں بھی ہے۔ "فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ" یعنی وہ بڑے طاقتور بادشاہ یعنی رب العالمین کے پاس نہایت عزت و احترام کی جگہوں پر بیٹھیں گے۔

اس دنیا سے سچائی کے ساتھ نکلنے سے مراد یہ ہے کہ انسان، ایمان، نیکی، اطاعت، حق کی بلندی و برتری کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو۔ اس کا ہر قول و فعل اور ہر کوشش حق کی سربلندی کے لیے وقف ہو۔ اس کے برخلاف برائی کے ساتھ نکلنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان زندگی بھر کفر، شرک، اور معاصی میں پھنسا رہے اور اسی پر اسے موت آ جائے، اس کی ساری کاوش برائی اور باطل کے لیے ہوتی رہی ہو تو یہ نکلنا اس کے حق میں ہرگز مفید نہیں

ہوگا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہی دعا سکھلائی کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت ہمیں حق و صداقت کی حمایت میں رخصت کرنا تاکہ ہمارا دامن کفر، شرک اور معصیت سے پاک ہو۔

ہجرت اور فتح مکہ

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت سے فتح مکہ کا اشارہ بھی ملتا ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے پروردگار! ہمیں ہجرت کے لیے مکہ مکرمہ سے حق و صداقت کے ساتھ نکال اور پھر ہمیں عزت و آبرو کے ساتھ دوبارہ اسی مکہ مکرمہ میں داخل فرما۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر ایسا ہی ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کی یہ جماعت نہایت امن و سلامتی کے ساتھ فتح کا پرچم لہراتی ہوئی مکہ میں داخل ہوئی۔ مکے کی طرف جاتے وقت حضور علیہ السلام سواری پر سوار تھے اور سر پہ خود پہن رکھا تھا۔ شہر میں داخل ہوئے تو آپ نے خود اتار دیا اور سر پہ پگڑی پہن لی۔ اللہ نے آپ کو نہایت عزت و وقار کے ساتھ مکہ معظمہ میں داخل کیا۔ مکہ مکرمہ میں صحابہؓ کا داخلہ تین اطراف سے ہوا تھا۔ آپ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو دائیں پہلو پر رکھا حضرت زبیر بن عوامؓ کو بائیں پہلو پر اور حضرت ابوعبیدہؓ کو پیادے پر مقرر کیا آپ نے حکم دیا کہ قریش میں سے جو کوئی مزاحمت کرے اسے کاٹ کر رکھ دیں۔ چنانچہ خالد بن ولیدؓ والے راستے پر تھوڑی سی مزاحمت ہوئی مگر وہ جلدی ہی ختم ہو گئی اور آپ امن و امان کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے۔

کوہ صفا پہ اعلانِ حق

حضور علیہ السلام نے انصار کو کوہ صفا پہ ملنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ یہ وہی مقام ہے جہاں پہ آپ نے حق کا اولین اعلان فرمایا تھا آپ کی آواز پہ چالیس آدمی اکٹھے ہوئے تھے اور جب آپ نے توحید کی دعوت پیش کی تو ابولہب نے آپ کو گالیاں دی تھیں اور آپ کو پتھر مارے تھے آج ایک دفعہ پھر حضور علیہ السلام اسی مقام پہ جلوہ افروز تھے اور آپ نے پھر اعلانِ حق فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ

وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ فَلَا شَيْئًا بَعْدَهٗ اُس خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے اپنا وعدہ پورا فرمایا اپنے بندے کی نصرت فرمائی اور تمام لشکروں کو اکیلے نے ہی شکست دے دی اور اس کے بعد کفار و مشرکین کی کوئی سکت باقی نہ رہی، آپ نے یہ بھی فرمایا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔

بہرحال یہ اس دعا کی قبولیت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو مکہ مکرمہ سے بھی اطمینان کے ساتھ نکالا مشرکین نے آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا مگر اللہ نے آپ کی حفاظت مکان میں بھی کی اور راستہ بھر بھی آپ کو محفوظ و مامون رکھا، مدینہ طیبہ میں آپ کا داخلہ بڑی عزت و احترام کے ساتھ ہوا اور پھر اللہ نے آپ کو دوبارہ مکہ میں شان و شوکت کے ساتھ داخل فرمایا اس وقت تو لوگ اس دعا کو محض خوش فہمی پر محمول کرتے تھے مگر تو دس سال کے قلیل عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے اسے حقیقت میں تبدیل کر دیا۔

مکے سے خروج اور پھر داخلے کی دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی زبان سے یہ دعا بھی کہلوائی وَاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا اور بنا دے میرے لیے اپنی طرف سے ایک غلبہ، حکومت یا تسلط جو مددگار ہو۔ مطلب یہ کہ مولا کریم! مجھے ایسا غلبہ عطا فرما جس کے ساتھ تیری مدد شامل حال ہو، حق کو برتری نصیب ہو اور مخالفین حق ذلیل و خوار ہو کر رہ جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد اسلام کا ظاہری غلبہ ہے کیونکہ دنیا میں کوئی قانون اس وقت تک نافذ العمل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے پیچھے قوت نافذہ موجود نہ ہو۔ ایک روایت میں آتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَیَضَعُ بِالسُّلْطَانِ مَا لَمْ یَضَعْ بِالْقُرْاٰنِ یعنی اللہ تعالیٰ حاکم عادل کے ذریعے وہ نتیجہ برآمد کر

(حاشیہ: نفاذِ قانون / کی ذمہ داری)

دیتا ہے جو محض قرآن سے حاصل نہیں ہوتا۔ قرآن پاک تو قانون کی کتاب
ہے مگر اسے جاری کرنے کے لیے جماعت اور امیر جماعت کی ضرورت
ہے جس کے لیے حضور علیہ السلام سے دعا کرائی جارہی ہے۔ چنانچہ
اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا بھی قبول فرمائی۔ صحابہ کرامؓ کی جماعت پیدا
ہوئی جو خود بھی قانونِ خداوندی پر عمل پیرا ہوئی اور دوسروں سے پابندی
کرانے کا بھی بیڑا اٹھایا۔ حضور علیہ السلام کی قیادت میں اسی جماعت نے
کلمۂ حق بلند کیا۔ جب آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو آپ کے
خلفائے راشدینؓ نے اس مشن کو آگے بڑھایا۔ بہرحال یہاں پر سلطان نصیر
کی دعا فرمائی جس کے ذریعے اقامتِ نظامِ حق کا فریضہ بھی ادا کیا جا سکے۔

اسلام کے خلاف سازش

اسلام کے ابتدائی دور میں اسلام کو صحابہ جیسی جماعت نصیب ہو گئی۔
جنہوں نے اسلام کے نظامِ عدل کو نافذ کر کے دکھا دیا مگر افسوس کا مقام ہے
کہ تاتاریوں کے حملے کے بعد اہلِ اسلام کی جمعیت ختم ہو کر پوری امتِ مسلمہ
انحطاط کا شکار ہو چکی ہے۔ انگریز نے مسلمانوں کی اجتماعیت کو بہت بھدے
طریقے سے ختم کیا۔ دنیا میں اسلامی خلافت کا رعب و دبدبہ تھا۔ یہودی اور
عیسائی اس کے نام سے ہی ڈرتے تھے۔ انگریز بڑے سوچ و بچار کے
بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ جب تک مسلمانوں کی اجتماعیت کو ختم نہیں کیا جاتا،
انہیں دنیا میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، چنانچہ انہوں نے پوری دنیا میں
تمام غیر مسلم اقوام نے ساتھ مل کر ایسی منصوبہ بندی کی جس سے مسلمانوں کا
نہ صرف شیرازہ بکھر گیا بلکہ وہ ایک دوسرے کی مدد کے قابل بھی نہ رہے
جب پاکستان بنا تو تیرہ کروڑ مسلمانوں کی اجتماعیت انگریزوں، یہودیوں اور
ہندوؤں کو پھر کھٹکنے لگی، چنانچہ وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے
جب تک پاکستان کو دولخت نہیں کر دیا۔ اسلام دشمن طاقتیں تو مسلمانوں
کو کبھی ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہوتے نہیں دیکھ سکتیں۔ ان کی خواہش

ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ مسلمان آپس میں دست و گریبان ہوتے رہیں اور ایک، دوسرے کی مدد کے قابل نہ رہیں۔ ایسے ہی حالات میں اللہ کے نبی نے اللہ کی بارگاہ میں دعا کی تھی کہ مولا کریم! ہمیں غلبہ، تسلط اور امیر میسر فرما جو مدد کرنے والا اور دین کے مشن کو آگے بڑھانے والا ہو۔

حق و باطل کی کشمکش

ہجرت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کی خوشخبری بھی سنا دی۔ ارشاد ہوتا ہے وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کہ حق آگیا وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اور باطل چلا گیا۔ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا بیشک باطل مٹنے والا ہی ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کے روز حضور علیہ السلام کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ آپ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے۔ اس وقت کعبہ کی چھت، دیواروں اور ارد گرد تین سو ساٹھ (۳۶۰) بت رکھے ہوئے تھے۔ آپ اپنی چھڑی سے بتوں کو گراتے جاتے تھے اور زبان مبارک سے یہی الفاظ دہراتے جاتے تھے "جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا" حق آگیا اور باطل چلا گیا، بیشک باطل جانے والا ہی تھا۔ اس موقع پر حضور علیہ السلام نے سورۃ سبا کے یہ الفاظ بھی دہرائے "جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ" حق آگیا اور باطل نہ تو پہلی بار پیدا کر سکتا ہے اور نہ دوبارہ پیدا کرے گا مطلب یہ کہ باطل بالکل ملیا میٹ ہو گیا۔ اس طرح حضور علیہ السلام نے خانہ کعبہ کو بتوں کی نجاست سے پاک کر دیا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے یہ آیت فتح مکہ سے نو یا دس سال پہلے نازل ہوئی تھی جس میں فتح مکہ کی بشارت تھی۔ اس وقت تو کافروں نے اس آیت کا تمسخر اڑایا تھا مگر دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اللہ نے حق کو کس طرح غلبہ عطا فرمایا۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ

اللہ نے مکہ مکرمہ میں اسلام کو ایسا غلبہ عطا فرمایا کہ قیامت تک کے لیے اسے ایمان کا مرکز بنا دیا۔ اب اس پر کوئی دوسری طاقت غلبہ حاصل نہیں کر سکتی۔ دراصل بیت اللہ شریف کو یہ شرف تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں ہی حاصل ہو گیا تھا مگر درمیان میں چار پانچ سو سال کا عرصہ یہ ارض مقدس پھر شرک کا گڑھ بنی رہی۔ اب اللہ نے حضور علیہ السلام کے دست مبارک سے اسے پاک صاف کیا۔ اب قیامت تک اس کے تقدس میں فرق نہیں آئے گا۔ اور یہ حرم مرکز ایمان اور مرکز توحید کے طور پر قائم و دائم رہیگا۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾ ع

ترجمہ:- اور اتارتے ہیں ہم قرآن میں وہ چیز جس میں شفا ہے، اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔ اور نہیں زیادہ کرتا وہ ظالموں کے لیے مگر نقصان ﴿۸۲﴾ اور جس وقت ہم انعام کرتے ہیں انسان پر تو وہ اعراض کرتا ہے، اور پہلو تہی کرتا ہے۔ اور جب پہنچتی ہے اس کو برائی تو وہ مایوس ہوتا ہے ﴿۸۳﴾ (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے، ہر شخص عمل کرتا ہے اپنے طریقے پر۔ پس تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے اس کو جو زیادہ سیدھے راستے پر ہے ﴿۸۴﴾

ربط آیات گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے ہجرت کی طرف اشارہ فرمایا۔ مکی زندگی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے رفقاء کو بے حد پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہجرت کی طرف اشارہ فرما کر یہ دعا سکھلائی کہ مولا کریم! ہمیں حق وصدق

کے ساتھ نکال اور حق و صداقت کے ساتھ ہی داخل فرما۔ اللہ نے اپنے نبی کی زبان سے یہ بھی کہلوایا کہ حق آگیا ہے اور باطل مٹ گیا ہے کیونکہ باطل مٹنے والی چیز ہی ہے۔ یہ گویا فتح مکہ کی طرف اشارہ تھا۔ چنانچہ فتح مکہ کے روز آپ علیہ السلام اپنی چھڑی سے بتوں کو گراتے جاتے تھے اور یہی آیت تلاوت فرماتے تھے اور اس طرح آپ نے خانہ کعبہ کو بتوں کی نجاست سے بالکل پاک کر دیا۔

اب آج کی پہلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کا ذکر کیا ہے جس کے ذریعے حق آتا ہے اور باطل مٹ جاتا ہے۔ اور یہی اس آیت کی گذشتہ آیت کے ساتھ مناسبت ہے جس طرح یہ قرآن دوسری کتب سماویہ کے برخلاف بتدریج نازل ہوا، اسی طرح باطل بھی بتدریج مٹتا چلا گیا۔ اس آیت کریمہ کا تعلق رکوع اول میں آمدہ آیت پاک اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ سے بھی ہے کہ یہ قرآن اس راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو سب سے سیدھا ہے۔ اب اسی قرآن کی بعض صفات کا ذکر بیان بھی ہو رہا ہے۔

قرآن بطور شفا

ارشاد ہوتا ہے وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ اور ہم اتارتے ہیں قرآن کریم میں وہ چیز جس میں شفا ہے۔ اس شفا کا تعلق دراصل روحانی بیماریوں کی شفا سے ہے۔ جیسا کہ سورۃ یونس میں بھی گزر چکا ہے کہ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ اور دلوں میں موجود بیماریوں کی شفا آچکی ہے اگرچہ قرآن پاک دوسرے درجے میں بسا اوقات ظاہری بیماریوں کے لیے بھی شفا بن جاتا ہے مگر اصلاً اس کی شفا روحانی لوگوں کے لیے ہی ہے جب بھی قرآنی آیات نازل ہوتی ہیں تو وہ روحانی بیماریوں کی شفا کا سبب بنتی ہیں۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ روحانی بیماریوں کا تعلق عقیدے، اخلاق اور اعمال سے ہوتا ہے۔ قرآن پاک سب سے پہلے باطل عقیدے کی اصلاح کرتا ہے۔ کفر شرک، منافقت، الحاد، شک وغیرہ ایسی روحانی بیماریاں ہیں جن کا اثر لازمًا کی روح، قلب، جان اور دماغ پر پڑتا ہے۔ گندہ عقیدہ انسان کے دل و دماغ کو ناپاک کر دیتا ہے اور انسان کی فکر بھی نجس ہو جاتی ہے۔ اسی گندی فکر کی بناء پر اللہ نے فرمایا ہے "اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ" (التوبہ-۲۸) یعنی بے شک مشرک لوگ ناپاک ہیں۔ اسی طرح منافقوں کے متعلق فرمایا "فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ" (التوبة-۱۲۵) قرآنی آیات کی وجہ سے ان کی گندگی میں ہی اضافہ ہوتا ہے۔ بہرحال اس نجاست سے مراد ظاہری نجاست نہیں بلکہ ان کے نفاق کی گندگی مراد ہے۔ عقیدے سچے بھی ہوتے ہیں اور باطل بھی۔ تو مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن پاک باطل عقیدے کی روحانی بیماری کے لیے بمنزلہ شفا کے ہے۔

عقیدے کے بعد دوسرے نمبر پر اخلاقی بیماریاں ہیں جن میں حسد، بغض، کینہ، خیانت، جھوٹ وغیرہ شامل ہیں۔ قرآن پاک ان اخلاقی بیماریوں کو بھی شفا بخشتا ہے۔ قرآنی تعلیمات پر عمل کرنے سے ان تمام قبیح بیماریوں سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد تیسرے نمبر پر وہ روگ ہیں جن کا تعلق عمل سے ہے۔ ان بیماریوں میں چوری، قتل، ڈاکہ، اغوا، زنا، کھیل تماشہ، عریانی، فحاشی، ظلم، غرور و تکبر، غیر اللہ کی عبادت، خوشامد، رسومات باطلہ وغیرہ آتی ہیں۔ قرآن کریم ان تمام برے اعمال کی درستگی کے لیے لائحہ عمل بتاتا ہے جس پر عملدرآمد سے ان غلط اعمال کی بیماریوں سے بھی شفا پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے اے لوگو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اختیار کرو۔

اور اُن کی نافرمانی کر کے "وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ" (محمد-۳۳) اپنے اعمال کو باطل نہ کر لو۔ اور نیک اعمال کا ابطال اُس وقت ہوتا ہے جب اس میں سے خلوص نکل جائے اور ریا داخل ہو جائے۔ اس کے علاوہ وہ کام بھی باطل ہوگا۔ جو اگرچہ بذاتہٖ اچھا ہے مگر حضور علیہ السلام کے طریقے کے خلاف انجام دیا گیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَّيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ جس شخص نے کوئی ایسا کام کیا جو ہمارے طریقے کے مطابق نہیں ہے تو اللہ کی بارگاہ میں وہ کام بھی مردود ہوگا اور وہ آدمی بھی۔ غرضیکہ قرآن پاک غلط اعمال کی اصلاح بھی کرتا ہے۔

اس سلسلے میں بزرگانِ دین دو چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ یعنی تخلیہ اور تحلیہ۔ تخلیہ کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک تمام باطل عقائد، باطل اخلاق اور باطل اعمال سے انسان کو پاک کرتا ہے اور تحلیہ یعنی صحیح عقائد، صحیح اخلاق اور اعلیٰ اعمال سے مزین کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ قرآن پاک گندی اور رذیل باتوں سے انسان کو پاک کرتا ہے اور تمام اچھی صفات کے ساتھ مزین کرتا ہے۔ بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ یہی قرآن کی شفا ہے۔

عقیدے کی درستگی

جسمانی اور روحانی بیماریوں سے شفایابی کے لیے ایک چیز قدر مشترک ہے کہ دونوں صورتوں میں پہلے فاسد مادے کو خارج کیا جائے گا۔ تاکہ اس کی جگہ صالح مادہ پیدا ہو کر صحت کامل ہو سکے۔ ڈاکٹر یا حکیم جب بھی کسی جسمانی بیماری کا علاج کرتے ہیں تو پہلے اُسے مسہل دیا جاتا ہے جس سے تمام فاسد مادے انسانی جسم سے خارج ہو جاتے ہیں۔ یہ مادے کبھی آنتوں کے ذریعے نکالے جاتے ہیں کبھی مثانے کے ذریعے کبھی پسینے کے راستے سے اور کبھی بلغم کی صورت میں۔ بسا اوقات گندا خون نکالنے کے لیے پچھنے یا سنگیاں لگائی جاتی ہیں۔ جب تمام گندا مواد نکل جاتا ہے تو پھر اس کو ایسی

دوائی دی جاتی ہے جس کے ذریعے خون، بلغم، سودا اور صفرا میں اعتدال قائم ہو کر انسانی اعضا ٹھیک طور پر کام کرنے لگتے ہیں۔ روحانی معالجین نے علاج کا بھی یہی طریق رکھا ہے۔ جب تک انسان گندے عقائد، گندے اخلاق اور گندے اعمال سے پاک نہ ہو اس میں اعلیٰ عقائد، اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ اعمال پیدا نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے تمام انبیائے کرام اور بزرگان دین سب سے پہلے عقیدے کی درستگی پر زور دیتے ہیں۔ جب تک انسان کے دل و دماغ کو عقیدے کی نجاست سے پاک نہ کیا جائے۔ اس وقت تک صحیح عقیدہ، اعلیٰ اخلاق اور اعمال صالحہ پیدا نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان یعنی عقیدے کو ہر حالت میں مقدم فرمایا ہے۔ سورۃ الانبیاء میں ہے "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ" جس شخص نے کوئی اچھا عمل کیا اُس کی ناقدری نہیں کی جائیگی، بلکہ اُسے قبول کر کے اس کا اچھا بدلہ دیا جائے گا۔ اور اگر ایمان ہی میں خرابی ہے۔ اس میں شرک ریا یا نفاق کی ملاوٹ ہے تو ایسا عمل اللہ کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوگا۔ اسی لیے اللہ نے ایمان اور عمل صالح کو آپس میں لازم و ملزوم قرار دیا ہے، اور جگہ جگہ فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (الکہف) بہتر جزا اور اعلیٰ مقام اُن لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے ایمان و عقیدہ کی درستگی کے ساتھ نیک اعمال انجام دیئے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ عمل کا مدار نیت پر ہوتا ہے اور نیت تب درست ہوگی جب ایمان صحیح ہوگا۔ اور ایمان کی درستگی کا معیار یہ ہے۔ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (المومن) کہ خالص اللہ کی اطاعت کا جذبہ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو پکارو۔ اگر عقیدے اور نیت میں ذرا بھی فتور ہوگا تو ایسا عمل بیکار محض ہوگا چاہے وہ کتنا ہی بڑا عمل کیوں نہ ہو۔ امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ جب تک ایمان میں شرک

لہ بخاری صفحہ ۲ ج ۱ (نیاض)

اور نفاق کی ملاوٹ ہوگی، انسان میں اخلاص پیدا نہیں ہو سکتا اور جب تک اخلاص نہیں آئے گا کوئی عمل مقبول نہیں ہوگا۔

مکمل طہارت

قرآن پاک نہ صرف گندے عقائد کی اصلاح چاہتا ہے بلکہ انسانی زندگی کے ہر موڑ پر پیش آنے والے ہر قسم کے گندے رذائل سے انسان کی مکمل طہارت کا قائل ہے۔ انسانی برادری میں، ملکی، بین الصوبائی اور بین الاقوامی تعلقات میں طہارت ضروری ہے، زبان، رنگ اور نسل کے معاملے میں قرآن انسان کو ہر قسم کے تعصب سے پاک کرنا چاہتا ہے قرآن کریم کے نزدیک ظلم و زیادتی کسی کے لیے بھی روا نہیں۔ جن قوموں نے تعصب اور ہٹ دھرمی کو اختیار کیا، اللہ نے ان کو مغضوب اور ملعون قرار دیا۔ جب تک انسان کے اندر کسی قسم کے رذائل بھی موجود ہیں اُسے شفا حاصل نہیں ہو سکتی۔ مطلب یہ کہ روحانی بیماریوں سے نجات دلانا قرآن پاک کا موضوع ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ مفسرین کی طرف سے مختلف آیات کے شان نزول بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے اُن کی اصطلاح میں خود قرآن کا شانِ نزول یہ ہے کہ جہاں جہاں بھی کسی قسم کی برائی پائی جاتی ہے، وہاں وہاں قرآن پاک کی وہ تمام آیات چسپاں ہوں گی جن میں برائی کو روکنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور جس جس مقام پر اچھائی کی ضرورت ہے، وہاں قرآن پاک کے تمام اوامر فٹ آتے ہیں۔ قرآن تو علی الاعلان کہتا ہے وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا (الاعراف - ۵۶) اصلاح کے بعد زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔ اور فساد فی الارض میں لڑائی جھگڑا، فتنہ و فساد، قتل و خلفشار، گالی گلوچ وغیرہ کے علاوہ کفر، شرک، نفاق، بداخلاقی اور بدعملی بھی آتی ہے۔ لہٰذا صحیح نتائج اخذ کرنے کے لیے ان تمام قبائح سے

مکمل طہارت کی ضرورت ہے۔

رحمت خداوندی

فرمایا نزول قرآن میں ایک تو شفا ہے اور دوسری چیز فرمایا۔ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ اہل ایمان کے لیے رحمت ہے۔ جب انسان صحیح ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ بھی انجام دے رہا ہو تو پھر اللہ کی رحمت بھی اس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ غور فرمائیں کہ یہاں پر رحمت ہے کا تعلق صرف ایمان والوں کے ساتھ قائم کیا گیا ہے اس بات میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ جو لوگ اپنی فطرت سلیمہ کو بگاڑ کر اللہ کی عطا کردہ صلاحیت ہی کو ختم کر لیتے ہیں، ان کے لیے قرآن پاک میں کوئی شفا نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا جو لوگ ظلم پر ڈٹے رہیں ان کے حق میں قرآن پاک نقصان ہی میں اضافہ کرے گا۔ ان کے عقیدے میں یہود و نصاریٰ اور منافقین کی طرح مزید بگاڑ پیدا ہوگا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ (التوبۃ) ان کی نجاست میں تو اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔ جب قرآن کی آیات نازل ہوتی ہیں تو یہ اہل ایمان کے لیے شفا کا کام دیتی ہیں، ان کے دلوں میں سکون پیدا ہوتا ہے، ان میں فضائل کی آمد ہوتی ہے اور ان کی روحانیت درجہ کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح انسان نیکی اور اچھے اخلاق کے ساتھ مزین ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف جب یہی آیات ضدی، عنادی اور ہٹ دھرم لوگوں پر پیش کی جاتی ہیں تو ان کی گندگی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ کفر، شرک، نفاق، مخالفت اور رسومات باطلہ پر مزید پختہ ہو جاتے ہیں۔

شہد میں شفا

اس آیت کریمہ میں تو قرآن کریم کو روحانی بیماریوں کے لیے شفا قرار دیا گیا ہے۔ البتہ گذشتہ سورۃ النحل میں شہد کو انسان کی جسمانی بیماریوں کے لیے

باعث شفا بنایا گیا تھا۔ "فِیْہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ" (آیت ۶۹) روحانی اور جسمانی دونوں قسم کی بیماریوں سے بچاؤ کے لیے اللہ کے نبی نے یہ نسخہ تجویز فرمایا ہے عَلَیْکُمْ بِالشِّفَآئَیْنِ لوگو! شفا کی دو چیزوں کو لازم پکڑو۔ اَلْقُرْاٰنُ وَالْعَسَلُ ایک قرآن ہے جو روحانی بیماریوں سے شفا دیتا ہے اور دوسری شہد ہے جو جسمانی عوارض

کے لیے باعث شفا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا حضور! میرے بھائی کے پیٹ میں اسہال ہو رہے ہیں اس کے لیے علاج تجویز فرمائیں آپ نے فرمایا، اس کو شہد پلاؤ، حسب الحکم شہد پلایا گیا تو مریض کے اسہال میں اضافہ ہو گیا۔ وہ شخص پھر حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور مریض کی حالت بیان کی۔ آپ نے فرمایا اُسے شہد پلاؤ۔ اُس نے جا کر دوبارہ شہد پلائی تو اسہال پھر بھی بند نہ ہوئے۔ حضور علیہ السلام نے تیسری اور چوتھی دفعہ بھی شہد استعمال کرنے کا حکم دیا اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اللہ کا کلام سچا ہے تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے۔ محدثین فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ تیرے بھائی کے پیٹ میں گندے مواد بھرے ہوئے ہیں جب تک وہ خارج نہیں ہوں گے اُسے شفا حاصل نہیں ہو سکتی۔ تو بہر حال چوتھی دفعہ شہد پلانے سے مریض کے اسہال بند ہو کر اُسے شفا حاصل ہو گئی۔

انسان کی احسان فراموشی

اگلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِہٖ جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں کسی نعمت سے نوازتے ہیں تو وہ اعراض کرتا ہے اور پہلو تہی کرتا ہے۔ انسان کی عمومی فطرت ایسی ہی ہے کہ اللہ کی عطا کردہ نعمت کی قدر دانی نہیں کرتا۔ اللہ نے

آلِ داؤد کو شکر گزاری کی تلقین فرمائی اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا "وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ" (سبا-۱۳) کہ میرے شکر گزار بندے بہت قلیل ہیں۔ لوگوں کی اکثریت اللہ کی طرف سے انعام پا کر غرور تکبر میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اسے اپنی ذاتی قابلیت اور استعداد کا مرہونِ منت سمجھنے لگتی ہے۔ قارون نے بھی تو یہی کہا تھا "اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ" (القصص-۷۸) کہ یہ سارے خزانے تو مجھے میرے علم و ہنر کی وجہ سے حاصل ہوئے ہیں، اس میں کسی کا مجھ پر کیا احسان ہے۔ یہ تو میری اپنی کمائی ہے۔ جب اس کی دیدہ دلیری اس حد تک بڑھ گئی تو اللہ نے اُسے خزانوں سمیت زمین میں دھنسا دیا۔ آج تاجروں اور صنعت کاروں کا بھی یہی حال ہے۔ ہر شخص اپنے علم، تجربے، سائنس اور ٹیکنالوجی کو آمدنی کا ذریعہ سمجھتا ہے اور پھر اسے عیاشی، فحاشی، شراب نوشی اور دیگر معاصی پر خرچ کرنے لگتا ہے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ جب ہم کسی انسان پر انعام کرتے ہیں تو وہ اس کو انعامِ الٰہی تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیتا ہے!

اس کے برخلاف "وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوْسًا" جب اُسے کوئی برائی پہنچتی ہے تو وہ مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ فرمایا ناشکری اور مایوسی دونوں حالتیں بُری ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ایمان داروں کے لیے یہ دونوں حالتیں اچھی ہوتی ہیں۔ جب انہیں راحت پہنچتی ہے تو وہ شکر کرتے ہیں اور جب مصیبت آتی ہے تو صبر کا دامن تھام لیتے ہیں اور جزع فزع نہیں کرتے۔

فرمایا "قُلْ" اے پیغمبر! آپ کہہ دیں "كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ" کہ ہر شخص اپنے ڈھب کے مطابق کام کرتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے "فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا"

تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ ہدایت کے راستے پر کون ہے۔ ہر شخص اپنی
فکر اور سمجھ کے مطابق اپنے کام میں مشغول رہتا ہے مگر صحیح راستے پر کون ہے
اور صحیح کام کون کر رہا ہے، یہ اللہ کے علم میں ہے، ہر انسان اس
پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ اللہ کی کتاب اور
انبیاء کے طریق کار کے مطابق اپنے اعمال و اخلاق کی افزائش کرے۔
باقی اللہ ہی جانتا ہے کہ کس کی کوشش مشکور ہوگی اور کس کی سعی میں کیا
خرابی ہوگی۔ تم حتی المقدور سیدھے راستے پر سفر جاری رکھو۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾

ترجمہ :- اور سوال کرتے ہیں یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں ۔ آپ کہہ دیجئے روح میرے رب کے امر سے ہے ۔ اور نہیں دیا گیا تم کو علم میں سے مگر بہت تھوڑا حصہ ﴿۸۵﴾

ربط آیات

گذشتہ درس میں اللہ نے قرآن کریم کے بارے میں فرمایا کہ یہ روحانی بیماریوں کے لیے شفا بخش اور اللہ کی مہربانی اور رحمت کا ذریعہ ہے ۔ ساتھ یہ بھی واضح کیا کہ قرآن پاک کی شفا اور رحمت سے مستفید ہونے کے لیے استعداد اور صلاحیت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ ظالموں کے حق میں یہ نقصان ہی کو زیادہ کرتا ہے ۔ اللہ نے انسان کی ناشکری کا ذکر بھی فرمایا اور یہ بھی کہ محاسبہ اعمال یقیناً ہوگا ۔ اللہ تمام انسانوں کے اعمال اور کوائف سے باخبر ہے اور وہ بہتر جانتا ہے کہ کون ہدایت کے راستے پر چل رہا ہے اور کون گمراہی میں مبتلا ہے ۔ اب آج کی آیت کریمہ میں روح کا ذکر ہے ۔ اس کے بعد پھر قرآن کریم کا ذکر آئے گا ۔ اور پیغمبر اسلام کے خلاف مشرکین کے بیہودہ اعتراضات اور بے جا فرمائشوں کا ذکر ہوگا ۔

شان نزول

آج کی آیت کریمہ کا موضوع روح ہے ۔ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ اے پیغمبر ! یہ لوگ آپ سے روح کے متعلق دریافت کرتے ہیں ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سوال پوچھنے والے کون لوگ ہیں ۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں ہجرت سے دو سال قبل نازل ہوئی جب کہ حضور علیہ السلام کا واسطہ مشرکین مکہ سے تھا جو کہ اس قسم کے پیچیدہ سوالات

پوچھنے کے اہل نہیں تھے۔ چنانچہ اس آیت اور بعض دیگر آیات کی شانِ نزول سے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مشرکین مکہ نے اپنا ایک اعلیٰ وفد نضر بن حارث کی قیادت میں یہودیوں کے پاس مدینہ اس غرض سے بھیجا کہ وہ ان سے بعض ایسے مشکل سوالات پوچھ کر آئیں جو حضور علیہ السلام کے سامنے پیش کیے جائیں اور آپ ان کا جواب نہ دے سکیں۔ اس طرح مشرکین اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کے لیے مواد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ نضر ایک جہاں گشت آدمی تھا۔ اور بادشاہوں کی مجالس کے آداب سے واقف تھا۔ وہ اپنے وفد کے ہمراہ مدینہ پہنچا اور یہودی علماء کے سامنے اپنا مدعا بیان کیا۔ یہودیوں نے اس مقصد کے لیے تین سوال پیش کیے۔ ان میں سے ایک سوال تو روح کے متعلق تھا جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں آگیا ہے۔ دوسرا سوال اصحاب کہف اور تیسرا ذوالقرنین بادشاہ کے متعلق تھا جن کا ذکر اگلی سورۃ کہف میں آرہا ہے۔ یہودیوں کا خیال تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ان سوالات کا جواب نہیں دے سکیں گے اور اگر ان میں سے بعض کا جواب دے بھی دیا تو آپ کے جواب کو درست تسلیم کر لیا جائے گا۔ مذکورہ وفد نے مکہ واپس آکر یہ تینوں سوالات حضور علیہ السلام کے پاس کیے، جن میں دو کا جواب اللہ نے اگلی سورۃ میں تفصیل کے ساتھ دے دیا البتہ روح سے متعلق سوال کا جواب اس مختصر سی آیت میں اجمالی طور پر ہی دیا چونکہ روح کا ذکر تورات میں بھی اجمالی طور پر ہی آیا ہے اس لیے یہودی قرآن پاک کے اس مختصر جواب سے بھی مطمئن تھے۔

روح کے مختلف معانی

قرآن پاک میں لفظ "روح" کے مختلف معانی آتے ہیں۔ روح کا اطلاق خود قرآن پاک پر کیا گیا ہے "وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا" (الشوریٰ۔ ۵۲) اسی طرح ہم نے اپنے حکم میں سے ایک روح آپ کی طرف وحی کی۔ اسی طرح تورات کو بھی روح کہا گیا

ہے۔ اس کے علاوہ روح کا اطلاق جبرائیل علیہ السلام پر بھی کیا گیا ہے
جیسے فرمایا "نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ" (الشعراء۔ ۱۹۳) اس
قرآن پاک کو روح الامین کے ذریعے نازل کیا گیا۔ تاہم صحیح بات یہ ہے
کہ اس مقام پہ روح سے مراد روحِ انسانی ہے۔ جس کے داخل ہونے
سے انسانی جسم کو حیات ملتی ہے اور جس کی علیحدگی سے انسان پر موت
طاری ہو جاتی ہے۔ تخلیق آدم کے سلسلے میں اللہ نے فرشتوں سے
فرمایا کہ میں انسان کو مٹی سے پیدا کرنا والا ہوں۔ پس جب میں اس کو برابر
کر لوں "وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي" (ص ۔۲) اور جب
میں اس میں اپنی طرف سے روح پھونک دوں، تو تم اس کے سامنے
سجدے میں گر پڑو۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے
تمام افراد میں روح ڈالی۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔
کہ روح انسانوں کے علاوہ ملائکہ اور جنات میں بھی ڈالی گئی ہے۔ اگرچہ
ان کی روح انسانی روح کی نسبت نہایت لطیف ہے۔

انسانی روح

انسان کی پیدائش کے متعلق اللہ نے سورۃ المومنون میں یہ طریقہ بتلایا
ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اس کو ایک جگہ میں نطفہ بنا کر
رکھا۔ پھر نطفے کا لوتھڑا بنایا، پھر لوتھڑے کی بوٹی بنائی پھر ہڈیوں پر
گوشت پوست چڑھایا اور پھر اس کو نئی صورت میں بنا دیا۔ حدیث شریف
میں آتا ہے کہ جب قرار حمل پر چار ماہ گزر جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتے
کو بھیجتے ہیں جو بحکم مادر میں بچے میں روح ڈال دیتا ہے۔ اس کی مثال بالکل
ایسی سمجھ لیں کہ اگر کسی شخص کو کوئی مشین لگانی ہو تو پہلے اس کے لیے مکان
کا بندوبست کرتا ہے۔ پھر مشین فٹ کرنے کی جگہ منتخب کرتا ہے، اور
وہاں پر مشین کا ایک ایک پرزہ جوڑتا چلا جاتا ہے۔ جب مشین کے سارے
پرزے فٹ ہو جاتے ہیں تو پھر آخر میں اسے بجلی کا کنکشن دے دیا جاتا ہے

جس سے اس مشین کے پرزے حرکت میں آ جاتے ہیں اور مشین اپنا کام شروع
کر دیتی ہے۔ اسی طرح جب شکمِ مادر میں انسانی ذات بچہ تیار ہو جاتا ہے تو
پھر اس میں روح ڈال دی جاتی ہے جس سے انسانی اعضاء کام کرنے
لگتے ہیں اور انسان میں شعور، علم اور عقل پیدا ہوتی ہے۔ یہ بات قابلِ
ذکر ہے کہ انسانی روح کی آمد سے پہلے انسانی اعضا کی تیاری کے مختلف
مراحل پر بھی ایک روح کارفرما ہوتی ہے۔ جو روحِ حیوانی کہلاتی ہے۔ تاہم
انسانی روح چھٹے چلے میں ہی داخل ہوتی ہے۔ جو زندگی بھر انسان کے ساتھ
رہتی ہے۔ اس مقام پر یہی روح مراد ہے۔

روح پر نظریاتی بحث

روح کی حقیقت پر قدیم زمانے سے حکماء نے بڑا کلام کیا ہے اس
کو سمجھنے سمجھانے کے لیے مضامین اور بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ جدید
یورپ میں روحانی سوسائٹیاں معرضِ وجود میں آ چکی ہیں جن کے اراکین مختلف
عملیات اور طریقوں سے مردہ روحوں کے ساتھ تعلق جوڑنے کی کوشش
کرتے ہیں، لیکن ابھی تک کسی کو مکمل کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ قدیم یونانی،
رومی اور ہندوستانی لوگوں نے روح پر بڑی بڑی بحثیں کی ہیں۔ صوفیائے
کرام نے بھی اس بارے میں کافی کلام کیا ہے۔ شیخ ابن عربیؒ کی کتابوں میں
روح اور نفس کے بارے کثرت سے باتیں ملتی ہیں۔ عبدالکریم جیلیؒ نے
"اَلْاِنْسَانُ الْکَامِلُ" نامی کتاب لکھی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات
اور عالمِ بالا کی باتوں کے بارے میں کشفی انداز میں کلام کیا ہے۔

روح کی حقیقت کے بارے میں بعض بڑے بڑے علماء نے بھی
کلام کیا ہے۔ ان میں امام غزالیؒ ہیں جنہوں نے روح کے متعلق ایک چھوٹی
سی کتاب لکھی ہے۔ پھر چھٹی صدی کے مشہور امام رازیؒ ہیں جنہوں نے
"کتاب النفس والاخلاق" تحریر کی ہے۔ اس میں انہوں نے انسانی روح
اور اخلاق کے متعلق بحث کی ہے۔ اسی طرح امام ابن تیمیہؒ کے شاگرد امام

ابن قیمؒ نے بھی بڑی مفید کتابیں لکھی ہیں۔ آپ نے "زاد المعاد" کے نام سے سیرت پر بہترین کتاب لکھی ہے۔ آپ نے تفسیر، علم حقائق اور سلوک کے موضوعات پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ موضوع زیر بحث پر آپ نے "کتاب الروح" کے نام سے ایک ضخیم کتاب تحریر کی ہے جس میں انہوں نے روح کے بارے میں قدیم و جدید محققین کے نظریات کا تجزیہ کیا ہے۔

آخر میں امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی مختلف کتابوں میں روح کے متعلق جامع کلام کیا ہے۔ آپ کی عادت ہے کہ کسی ایک موضوع کو کسی ایک مقام پر ہی بیان کر کے نہیں چھوڑ دیتے بلکہ اس کا تذکرہ مختلف کتب میں مختلف مقامات پر کرتے چلے جاتے ہیں، ان کی کتابیں مشکل ضرور ہیں مگر علم کا بحر بیکراں ہیں۔ آپ کے بڑے فرزند شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد کی کتابوں کے ساتھ جو شخص نسبت رکھتا ہے اُسے اللہ تعالیٰ ضرور فیضیاب کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے والد کی کتابیں نور اور حکمت سے پُر ہیں۔ پچاس ساٹھ چھوٹی موٹی کتابوں میں قرآن کریم کا ترجمہ، اصول تفسیر، شرح حدیث موطا وغیرہ ہیں۔ علم و حکمت کا سب سے بڑا مخزن آپ کی عظیم کتاب حجۃ اللہ البالغہ ہے جس میں اسلام کی مکمل تشریح اور حکمت آگئی ہے۔ گذشتہ بارہ صدیوں میں ایسی عمدہ کتاب ضبط تحریر میں نہیں آئی۔ بہرحال آپ نے روح کے موضوع پر بھی عمدہ اور جامع کلام کیا ہے۔

روح کی مادیت پر بحث

امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ قدیم حکماء نے روح کے موضوع پر بڑی بحث کی ہے۔ ان کے زیر بحث یہ نکتہ بھی رہا ہے کہ روح متحیز ہے یا غیر متحیز یعنی یہ کسی جگہ مکان یا ٹھکانے میں رہتی ہے یا اسے اس کی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ روح کے متعلق یہ بحث بھی ہوتی رہی ہے کہ یہ قدیم ہے یا حادث یعنی کیا روح خدا تعالیٰ

کی طرح قدیم ہے یا اس کی مخلوق ۔ بعض گمراہ فرقے روح کو بھی قدیم مانتے ہیں حالانکہ قدیم ذات صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی ہے ۔ باقی سب حادث یا مخلوق ہے ، ہندوؤں میں آریہ سماج فرقہ ترقی یافتہ اور جدید فرقہ سمجھا جاتا ہے جب مسلمانوں نے ہندوؤں کی بت پرستی کے خلاف مدلل آواز اٹھائی تو آریہ سماجیوں نے تینتیس ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کا تو انکار کر دیا مگر تین معبودوں میں آکر وہ بھی پھنس گئے ۔ انہوں نے ایک خدا کی بجائے تین چیزوں کو قدیم مانا یعنی پرماتما (خدا تعالیٰ) روح اور مادہ ۔ یہ بھی عیسائیوں کی طرح باپ بیٹا اور روح القدس کی تثلیث میں پڑ گئے ۔

اس سلسلہ میں قرآن پاک کی تعلیم یہ ہے کہ قدیم ذات وہ ہے جس کی کوئی ابتدا اور کوئی انتہا نہیں اور وہ صرف ذاتِ خداوندی ہے اس کے علاوہ ہر چیز مخلوق ہے ۔ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (الرعد) ہر چیز کا خالق ، بدیع اور فاطر وہی ہے اور اپنی تمام صفات کے ساتھ وہی قدیم بھی ہے ، اس کے علاوہ کوئی چیز قدیم نہیں ۔ اس کے علاوہ ہر چیز حادث ہے جس پر فنا لازم ہے ۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (الرحمٰن) اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے ۔ کچھ چیزیں فنا ہو چکی ہیں اور کچھ آگے چل کر فنا ہو جائیں گی ۔ ازلی ، ابدی ، دائمی اور سرمدی ذات صرف ذاتِ خداوندی ہے ۔ بہرحال قدیم حکما نے اس بارے میں طویل بحثیں کی ہیں کہ روح قدیم ہے یا حادث ، انسان کے بعد روح باقی رہتی ہے یا نہیں اور پھر یہ بھی کہ روح کی سعادت اور شقاوت کیا ہے ۔

جہاں تک مادے کا تعلق ہے پرانے سائنس دان بھی اس کی قدامت کے حامی تھے ، وہ کہتے تھے کہ مادے کو نہ پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ فنا کیا جا سکتا ہے ۔ مگر اب بیسویں صدی میں جرمنی کے سائنسدان آئن سٹائن نے

اس نظریے کو بھی غلط ثابت کر دیا ہے۔ اس نے ثابت کیا ہے کہ مادہ کوئی چیز نہیں۔ مادے کو قوت ہیں اور قوت کو مادے میں تبدیل بھی کیا جاسکتا ہے۔ اب تمام سائنسدان اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں۔ چنانچہ اٹیم بم کی تھیوری اسی بنیاد پر قائم ہوئی ہے۔ غرضیکہ مادے اور روح کی قدامت بھی غلط ثابت ہو چکی ہے۔ قدیم صرف ذاتِ خداوندی ہے۔ جو ازلی اور ابدی ہے۔

شاہ ولی اللہ کا نظریہ

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ روح ایک ایسی چیز ہے جس کے متعلق ہر ادنیٰ، اعلیٰ، اَن پڑھ لکھا اور اَن پڑھ جانتا ہے کہ جب یہ انسان کے جسم میں موجود ہوتی ہے تو انسان حرکت کرتا ہے۔ کھاتا، پیتا، بولتا سنتا اور کاروبار کرتا ہے۔ اور جب یہ روح انسانی جسم سے نکل جاتی ہے تو انسان بے جان ہو جاتا ہے مگر فرماتے ہیں کہ اس بات میں کوئی صداقت نہیں کہ روح کی حقیقت کو کوئی نہیں جانتا۔ اس نظریے کی دلیل میں کوئی قرآنی نص موجود نہیں۔ البتہ حضرت اعمش کی قراءت میں جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے، اس آیت کے الفاظ وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ کو وَمَا أُوتُوا مِنَ الْعِلْمِ بھی پڑھا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ روح کے متعلق سوال کرنے والوں اور امتِ محمدیہ سمیت تم سب لوگوں کو اس کا بہت کم علم دیا گیا ہے۔ روح کی تفصیلات کے ضمن میں شریعت بھی خاموش ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں لیا جاسکتا کہ اس سے کوئی بھی واقف نہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس معاملہ میں شریعت کی خاموشی اس وجہ سے ہے کہ عام لوگوں کو روح کا علم نہیں حاصل کرنا چاہیئے اور نہ اس کے پیچھے ہونا چاہیئے کیونکہ ہر شخص میں ہر چیز کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ عام لوگوں کو اجمالی طور پر صرف اتنی بات سمجھ لینی چاہیئے کہ روح اللہ تعالیٰ کے امر میں سے ایک چیز ہے۔ البتہ خواص کو اس کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے اسی بنا پر آپ نے روح کی تشریح بیان کی ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ روح انسانی تین چیزوں کا مرکب ہے ان میں سے ایک چیز بمنزلہ سواری کے ہے جس پر آسمانی روح آکر سوار ہوتی ہے، اس کو نسمہ کہا جاتا ہے اور اس کا ذکر حدیث شریف میں بکثرت آیا ہے، جیسے وَالَّذِیْ خَلَقَ وَبَرَأَ النَّسَمَۃَ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور نسمے کو بھی بنایا۔ نسمے سے عام طور پر روح مراد لیتے ہیں اور تعبیر میں نفسِ ناطقہ، روحِ الٰہی یا روحِ انسانی بھی کہتے ہیں۔ یہ نسمہ جسمِ انسانی میں اس طرح سرایت کیے ہوئے ہے جس طرح گلاب کے پھول میں اس کا عرق ہوتا ہے یا کوئلہ میں آگ ہوتی ہے نسمہ ایک لطیف بخار یا دھواں سا ہے۔ جب تک یہ بخار آدمی کے جسم میں موجود ہو اس کی حرکت جاری رہتی ہے اور جب یہ بخار ختم ہو جائے تو آدمی بھی ختم ہو جاتا ہے۔ یہ بخار یا حرارت انسان کی غذا سے پیدا ہوتا ہے۔ خوراک انسانی معدے میں جا کر ہضم ہوتی ہے۔ پھر یہ جگر میں جا کر خون میں تبدیل ہو جاتی ہے جس میں انسانی جسم کی نشوونما کی ضروریات کے تمام اجزاء شامل ہوتے ہیں۔ پھر جگر، قلب اور دماغ تینوں کی شراکت سے نسمہ پیدا ہوتا ہے جس کا مکمل جوش قلب میں ہوتا ہے۔ لطیف بخار کی آمیزش والا خون قلب میں پہنچ کر پمپ ہوتا ہے اور پھر سارے جسم میں پھیل جاتا ہے۔ یہی نسمہ ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا روحِ انسانی کا پہلا جزو نسمہ ہے جس کی تشریح پیش کر دی گئی ہے۔ اس کا دوسرا جزو روحِ سماوی ہے جس کو امرِ ربی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ شکمِ مادر میں جب بچہ چار ماہ کا ہو جاتا ہے تو یہ روحِ سماوی آکر نسمہ پر سوار ہو جاتی ہے۔ اور وہ بھی سارے جسم میں پھیل جاتی ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ روحِ انسانی کا تیسرا جزو نفسِ ناطقہ ہے۔ جس طرح ہر انسان میں ایک روح پائی جاتی ہے، اسی طرح پوری کائنات کی بھی ایک روح

ہے جس کو نفسِ کل کہا جاتا ہے۔ نفسِ ناطقہ دراصل نفسِ کل کا عکس ہوتا ہے
یا نفسِ کل حظیرۃ القدس میں مجموعہ انسانیت کا ایک فرد (ماڈل) ہے جس
کا عکس نفسِ ناطقہ کے نام سے انسانی روح کا تیسرا جزو بنتا ہے۔ اس طرح
روح سماوی اور نفسِ ناطقہ دونوں اجزاء نسمہ سے آکر مل جاتے ہیں، اور یہ
روح انسانی وجود میں آجاتی ہے۔

روحِ اعظم کے ساتھ خلق

روحِ الٰہی کے متعلق ضعیف حدیثوں میں آتا ہے جیسا کہ امام رازیؒ
نے بیان فرمایا ہے کہ اس کے ستر ہزار منہ اور ستر ہزار زبانیں ہیں دوسری
روایت میں ایک ہزار منہ اور ایک ہزار زبانوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ یہ
سب انسانیت کا ایک نمونہ ہے جسے انسانِ اکبر یا روحِ اعظم بھی کہا
جاتا ہے۔ جب شکمِ مادر میں انسان کا چھوٹا سا ڈھانچہ تیار ہو جاتا ہے تو پھر
روحِ اعظم کا ایک عکس اس کے ساتھ آکر مل جاتا ہے۔ ہر انسان میں
روحِ اعظم کے عکس در آنے کی مثال ایسی ہے جیسے کسی چیز کے سامنے
آئینہ رکھ دیا جائے تو اس چیز کا عکس اس آئینے میں آ جائے گا۔ اب اگر
اس آئینے کے سامنے مزید ہزار آئینے بھی رکھ دیے جائیں تو ہر آئینے میں
اس چیز کا عکس پہنچ جائے گا۔ اس طرح روحِ الٰہی کا عکس ہر انسان میں اپنی
تمام خصوصیات کے ساتھ آجاتا ہے۔ اس طرح نفسِ ناطقہ کا عکس بھی اپنی
تمام تر خصوصیات کے ساتھ انسانی جسم میں نسمہ کے ساتھ آکر مل جاتا ہے
اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق اس قدر پیچیدہ کی ہے کہ کوئی دوسری مخلوق
اس قدر پیچیدہ نہیں۔ روحِ انسانی کے جزو نسمہ کے آگے پھر تین شعبے بن جاتے
ہیں جن کو نفس، قلب اور عقل کہا جاتا ہے۔ شیطان اپنا اثر نفس کے
ذریعے ڈالتا ہے، فرشتے قلب کے ذریعے اثر انداز ہوتے ہیں اور عقل
کا رُخ خدا تعالیٰ کی تجلی اعظم کی طرف ہوتا ہے۔

تجلی اعظم کا عکس

انسان کے پانچ بڑے بڑے لطائف کو تو تمام حکماء تسلیم کرتے ہیں

یعنی نفس، قلب، عقل، روح اور سِر۔ اس کے بعد تمام لطائف چھپے ہوئے ہیں۔ مثلاً سِر کے بعد خفی آتا ہے۔ اس کے بعد اخفیٰ، پھر انانیت کبریٰ، پھر نور القدس اور پھر حجر بحت۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی شخص کو بہت سے پردوں والا لباس پہنا دیا جائے ایک پردہ اتاریں گے تو دوسری چیز سامنے آئے گی اور اس طرح چلتے چلتے آخر میں حجر بحت آتا ہے۔ یہ اتنا لطیف ہوتا ہے کہ اس میں تجلی اعظم کا عکس پڑتا ہے۔ اسی لیے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ہر انسانی قلب میں تجلی اعظم کا عکس پڑتا ہے یہ اس زندگی میں تو محسوس نہیں ہوتا۔ مگر مرنے کے بعد جب اس عکس کی کشش تجلی اعظم کی طرف ہوگی، تو انسان اسے شدت سے محسوس کرے گا۔ اگر اس نے آخرت کے لیے تیاری کر رکھی ہے تو اسے سرور اور راحت حاصل ہوگی اور اگر کچھ تیاری نہیں کی تو یہی کشش اس کے لیے عذاب بن جائے گی۔

روح الٰہی کو روح ملکوت بھی کہتے ہیں۔ یہ تمام مجموعہ انسانیت کا ایک عکس ہے جس کا نمونہ حظیرۃ القدس میں رکھا ہوا ہے۔ ہر انسانی روح کا تجلی اعظم کے ساتھ تعلق اسی کے واسطے سے ہوتا ہے۔ سعید روح سے شاہ صاحبؒ یہی مراد لیتے ہیں کہ اس روح میں تجلی اعظم کا پورا نمونہ پایا جاتا ہے۔ اس نمونہ میں جتنی کمی ہوگی اتنی ہی اس روح کی سعادت میں کمی واقع ہو جائے گی۔
بہر حال تجلی اعظم کے عکس کو روح الٰہی، روح سماوی، روح انسانی، روح ملکوتی روح قدسی یا امر ربی کہا جاتا ہے۔

روح کے متعلق کم علمی

تو روح کے متعلق سوال کے جواب میں اللہ نے ارشاد فرمایا قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کہ روح میرے رب کے امر سے ایک حقیقت ہے۔ وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا اور تم کو اس کا بہت کم علم دیا گیا ہے۔ اللہ نے تفصیل بیان نہیں فرمائی مگر اجمالی طور پر ساری بات ذکر کر دی ہے جیسا کہ

شانِ نزول کے ضمن میں عرض کیا گیا تھا کہ مشرکین کے وفد نے یہودیوں کے ایماء پر حضور علیہ السلام سے تین سوال پوچھے تھے ان میں سے دو سوالوں کا تفصیلی جواب سورۃ الکہف میں آ رہا ہے جب کہ تیسرے سوال یعنی روح کی حقیقت کے متعلق اجمالی طور پر ہی جواب دیا کیونکہ عام لوگوں کے فہم اس کی حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ انہیں صرف اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ انسان اپنے جسم میں روح کی موجودگی کی وجہ سے حس و حرکت کرتا ہے، چلتا پھرتا ہے اور دنیا کے کام کاج انجام دیتا ہے اور جب روح انسانی جسم سے خارج ہو جاتی ہے تو جسم بے جان ہو جاتا ہے۔ عام لوگ اتنی بات ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے اُسے امرِ ربی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ
لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴿۸۶﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ
رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴿۸۷﴾ قُلْ لَّئِنِ
اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ
هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ
لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا
الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؗ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا
كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾

ترجمہ:- اور اگر ہم چاہیں تو لے جائیں (سلب کر لیں) اس
چیز کو جو وحی بھیجی ہے ہم نے آپ کی طرف۔ پھر نہ
پائیں گے آپ اپنے لیے ہمارے اوپر کوئی دلیل (۸۶) لیکن
یہ مہربانی ہے تیرے پروردگار کی طرف سے۔ بیشک اس
کا فضل آپ پر بہت بڑا ہے (۸۷) آپ کہہ دیجئے
اگر اکٹھے ہو جائیں انسان اور جنات سارے اس بات
پر کہ وہ لائیں اس قرآن کی مثل، تو نہیں لاسکیں گے
اس کی مثل اگرچہ بعض ان کے بعض کے مددگار ہوں (۸۸)
اور البتہ تحقیق ہم نے پھیر پھیر کر بیان کی ہیں لوگوں کیلئے
اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں۔ پس انکار کیا ہے اکثر لوگوں نے مگر ناشکر گزاری (۸۹)

ربط آیات

گزشتہ درس میں روح کے متعلق سوال اور اس کا جواب تھا۔ مشرکین مکہ نے حضور علیہ السلام سے روح کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کہہ دیں کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ایک حقیقت ہے مگر تمہیں تو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے اس لیے تم اسے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔

بعض لوگ غرور و تکبر کی وجہ سے کہتے ہیں کہ انسان تمام چیزوں پر حاوی ہے حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ انسان جتنا کچھ جانتا بھی ہے اس میں بھی بعض اوقات اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان کے دماغ میں کچھ ہوتا ہے جب کہ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ اس لیے بعض آثار میں یہ دعا بھی آتی ہے اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْاَشْیَاءَ کَمَا ھِیَ یعنی اے اللہ ہمیں چیزوں کی حقیقت اسی طرح دکھا جس طرح وہ واقع میں ہیں۔ انسان بہت سی چیزوں کی اصلیت سے ناواقف ہیں، کیونکہ ان کا علم قلیل ہے

وحی الٰہی کی ضرورت

دنیا کا ہر علم ناقص ہے اور اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہے صرف وحی الٰہی ہی علم کا قطعی ذریعہ ہے جس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ بعض اوقات کسی چیز کو سمجھنے میں بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ اسی لیے امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ بزرگانِ دین کو کشف کے ذریعے حقیقت اخذ کرنے یا اسے سمجھنے میں غلطی ہو سکتی ہے۔ یا اگر اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس کے بیان کرنے میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے اسی لیے آپ فرماتے ہیں کہ کشف کو قطعی چیز تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ وحی الٰہی ایسی چیز ہے جسے اللہ کا نبی نہ تو اخذ کرتے میں غلطی کرتا ہے نہ سمجھنے میں اور نہ آگے بیان کرنے میں۔ وحی علم کا اٹل ذریعہ ہے اسی لیے اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جس کی قدر کرنی چاہیئے۔

ارشاد ہوتا ہے وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ

اگر ہم چاہیں تو یہ بات بالکل سلب کر لیں اس چیز کو جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے۔ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا پھر آپ نہ پائیں گے اپنے لئے ہمارے مقابلے میں کوئی کارساز۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی چیز کو سلب کر لے تو کس کی طاقت ہے کہ اللہ کے ہاں وکالت کر کے واپس لے سکے؟ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ہاں، یہ تیرے پروردگار کی مہربانی ہے کہ وہ اپنی عطا کردہ نعمت کو چھینے گا نہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کا فضل عظیم ہے کہ اس نے آپ کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا اور وحی الٰہی کے ذریعے عظیم الشان کتاب عطا فرمائی۔ لہٰذا اس کی قدر کرنی چاہئے اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اگر انسان اس نعمت کی ناقدری کرتے ہوئے اس سے مستفید نہیں ہوگا تو اللہ تعالیٰ اُسے واپس بھی لے سکتا ہے لہٰذا عام لوگوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اگر ہم نے اس وحی الٰہی کی قدر نہ کی تو پھر صحیح پروگرام اور کہاں سے مل سکے گا۔ اللہ نے سورۃ مرسلات میں اسی بات کا تذکرہ کیا ہے فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ قرآن پاک کے بعد اور کون سی کتاب آئیگی جس پر تم ایمان لاؤ گے؟ مطلب یہ کہ یہی اللہ کی آخری کتاب اور آخری پروگرام ہے۔ یہ اس کی رحمت اور مہربانی کا نمونہ ہے۔ اسے اللہ نے شفا اور رحمت سے تعبیر کیا ہے لہٰذا اس کی حتی المقدور قدر کرنی چاہئے۔

قرآن کا اٹھ جانا

امام بغوی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ لوگو! قرآن کو سیکھو اور اس پر عمل کرو قبل اس کے کہ اسے اٹھا لیا جائے۔ قرب قیامت میں ایک ایسا وقت آئیگا جب قرآن حکیم کو اٹھا لیا جائے گا۔ اس کی تفسیر میں قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کے اٹھائے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن کے الفاظ اٹھا لیے جائیں گے بلکہ صحیحین کی روایت کے مطابق

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَقْبِضُ الْعِلْمَ اِنْتِزَاعًا وَّلٰکِنْ یَّقْبِضُ الْعُلَمَآءَ یعنی اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں کے سینوں سے نہیں اٹھائے گا بلکہ نیک اور اچھے علماء کو اٹھا لے گا۔ جب دین کا صحیح علم رکھنے والے نہیں ہوں گے تو لوگ جاہلوں کو عالم، مفتی اور قاضی کا درجہ دیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ بغیر علم کے فتوے دیں گے۔ خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے اور اس طرح دنیا سے علم کو چھین لیا جائیگا

ذہابِ علم

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک موقع پر حضور علیہ السلام نے کوئی بات بیان کی اور پھر فرمایا کہ ایسا اُس وقت ہوگا۔ حِیْنَ ذِهَابِ الْعِلْمِ جب علم چلا جائیگا حضور علیہ السلام کے ایک صحابی زیاد ابن لبید ؓ نے عرض کیا، کہ علم کیسے چلا جائیگا جب کہ ہم اُن سے قرآن پڑھتے ہیں اور آگے دوسروں کو پڑھاتے ہیں آپ نے فرمایا، تیری ماں تجھے گم پائے زیاد میں تو تجھے مدینے کا سمجھدار آدمی سمجھتا تھا مگر تم نے تو بے سمجھی کی بات کی ہے۔ کیا تم یہود و نصاریٰ کا حال نہیں دیکھتے؟ اُن کے پاس کتابیں موجود ہیں مگر وہ اُن پر عمل نہیں کرتے۔ ایسے علم کا کیا فائدہ؟ یہی ذہابِ علم ہے ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں تَعَلَّمُوا الْعِلْمَ وَعَلِّمُوْهُ۔ علم سیکھو اور دوسروں کو بھی سکھاؤ۔ تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ فرائض سیکھو اور دوسروں کو بھی سکھلاؤ فَاِنَّ الْعِلْمَ سَیُقْبَضُ کیونکہ علم قبض کر لیا جائے گا اور فتنے برپا ہوں گے، جہالت برپا ہوگی حتیٰ کہ دو آدمی ایک فریضہ میں جھگڑا کریں گے مگر اُن کو بتلانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا۔ اِنِّیْ اِمْرَءٌ مَّقْبُوْضٌ میں تمہارے درمیان ہمیشہ نہیں رہونگا۔ بلکہ مجھے بھی اٹھا لیا جائے گا۔

تو قاضی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ علم چھن جانے کی صورت یہ ہوگی کہ سب سے پہلے لوگوں میں سے عمل اٹھا لیا جائے گا۔ اُن سے عمل کی

توفیق ہی سلب ہو جائیگی جیسا کہ آجکل نظر آرہا ہے۔ علم بہت ہے کتابوں کی لائبریریاں بھری ہوئی ہیں مگر عمل مفقود ہے۔ آپ دیکھ لیں ہر سال سیرت طیبہ پر ہزاروں کتابیں شائع ہوتی ہیں، ان پر انعامات بھی تقسیم ہوتے ہیں مگر کروڑوں کی آبادی میں ان کتابوں پر عمل کرنے والے دس آدمی بھی نہیں ملیں گے۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کے مطابق سب سے پہلے عمل کی توفیق سلب کر لی جائے گی۔ اس کے بعد اچھے اچھے علما اٹھا لیے جائیں گے اور تیسرا مرحلہ قرب قیامت میں پیش آئے گا۔ لوگ سو کر اٹھیں گے تو علم کی کوئی بات سینوں میں محفوظ نہیں ہوگی اور کتابوں کے حروف مٹ چکے ہونگے

بہر حال پہلی چیز یہ ہے کہ علم کے مطابق عمل بھی ہو۔ جب تک انسانوں کے پاس قرآن پاک موجود ہے اس کو غنیمت سمجھتے ہوئے اس کی قدر کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اللہ کا فرمان ہے کہ اگر ہم چاہیں تو وحی کے ذریعے نازل کردہ چیز قرآن کو چھین لیں اور پھر آپ کو ایسا کوئی وکیل بھی نہیں ملے گا۔ جو اس نعمت کو واپس دلا سکے۔ ہاں، یہ تیرے رب کی مہربانی ہے کہ قرآن پاک تمہارے درمیان موجود ہے إِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيرًا بیشک یہ اللہ تعالیٰ کا آپ پر بہت بڑا فضل ہے کہ اس نے یہ سب نعمتیں آپ کو عطا کی ہیں۔

صداقت قرآن

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حقانیت و صداقت پر چیلنج کیا ہے اور اس کا ذکر قرآن میں تین مرتبہ آیا ہے۔ پہلا چیلنج اس آیت میں ہے قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کہ اگر تمام انسان اور جنات اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ وہ اس قرآن جیسا کوئی قرآن لے آئیں گے، تو وہ نہیں لا سکیں گے اس جیسا وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا اگرچہ وہ ایک دوسرے

سے ، اور گار ہی کیوں نہ بن جائیں ۔ وہ سب مل کر پوری کوشش کر کے دیکھ لیں ۔ قرآن پاک کی مثل پیش نہیں کر سکیں گے ۔

یہ تو پورے قرآن کے متعلق چیلنج ہے ۔ اس کے بعد اللہ نے دوسرا چیلنج کیا "قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ" (ھود - ۱۳) آپ کہہ دیں کہ قرآن پاک کی سورتوں میں سے اس جیسی دس سورتیں ہی لے آؤ ۔ جب یہ چیلنج بھی کسی نے قبول نہ کیا تو اللہ نے تیسرا چیلنج کیا کہ اگر تمھیں ہماری نازل کردہ کتاب میں کوئی شک ہے "فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ" (البقرہ - ۲۳) تو اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لے آؤ ۔ اگر تم سچے ہو ۔ تاریخ گواہ ہے کہ چودہ صدیوں سے یہ چیلنج کسی نے قبول نہیں کیا اور نہ ہی کوئی قرآن پاک کی کسی سورۃ کی مثال پیش کر سکا ہے ، یہی اس کی حقانیت اور صداقت کی دلیل ہے ۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قرآن کی مثل لانے کا چیلنج اس کی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ہے کہ ایسی فصاحت و بلاغت کسی دوسرے کلام میں نہیں پائی جاتی ۔ تاہم امام ابوبکر جصاصؒ اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ قرآن کا یہ چیلنج نہ صرف فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ہے بلکہ اس کے علوم و معارف ، اس کی حکمتیں اور مصلحتیں ، اس کے نظام اور دیگر امور ہر اعتبار سے یہ چیلنج قائم ہے ۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ سارے انسان کی بلکہ ساری مخلوق مل کر بھی قرآن کی حکمتوں اور مصلحتوں کی مثال پیش نہیں کر سکتی آپ فرماتے ہیں کہ میں قرآن کی کسی آیت پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس کے تحت علوم و معارف کا وسیع سمندر نظر آتا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ، یہ اللہ تعالیٰ کی صفت اور اس کا کلام ہے جس طرح اللہ کی ذات بے مثل ہے اسی طرح اس کی صفات بھی بے مثال ہیں ۔ انسان اللہ تعالیٰ کی صفت قرآن پر کبھی حاوی نہیں ہو سکتا ، بلکہ اس میں جتنا غور و فکر کرے گا ۔ اس کے علم میں اضافہ

ہوتا چلا جائے گا۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ دُعا سکھلائی ہے "قُل رَّبِّ زِدْنِی عِلْمًا (طٰہٰ ۱۱۴) اے پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا پیش کردہ لائحہ عمل بے مثال ہے دنیا میں جتنے بھی انسانی ہاتھوں سے قوانین در دساتیر بنتے ہیں۔ وہ کچھ عرصہ بعد فیل ہو جاتے ہیں اور انہیں یا تو منسوخ کرنا پڑتا ہے یا پھر ان میں ترمیم کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ایسے قوانین کی خامیاں منظر عام پر آتی رہتی ہیں جن کی بنا پر ان کی تبدیلی لازمی ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف ہر عیب اور نقص سے پاک اگر کوئی قانون ہے تو وہ صرف اللہ کی کتاب قرآن پاک کے اوراق میں محفوظ ہے۔ یہ ایسا پروگرام ہے جس میں قیامت تک کسی تغیر و تبدل کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ اس کتاب کی قدر دانی کریں۔ اس کے احکام کو سمجھیں اور پھر ان پر عمل پیرا ہو جائیں، ہماری فلاح و کامیابی کا راز اسی بات میں ہے۔

فرمایا وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ اور البتہ تحقیق ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں پھیر پھیر کر مثالیں بیان کی ہیں۔ حکمت اور عقل کی گہری باتوں کو سمجھانے کے لیے مثالوں کی ضرورت ہوتی ہے اور قرآن پاک نے اپنے علوم و معارف کے ابلاغ کے لیے یہی طریق کار اختیار کیا ہے۔ قرآن پاک کی ایک ایک مثال میں سینکڑوں علوم پنہاں ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو اللہ نے فرمایا ہے وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (العنکبوت۔ ۴۳) یہ مثالیں ہم بیان کرتے ہیں مگر ان کو اہلِ علم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ نے توحید کی بات مثال کے ذریعے سمجھائی ہے۔ اسی طرح کفر اور شرک کی برائی کو بھی مختلف طریقوں سے سمجھایا ہے۔ قیامت

کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سبب کا عمل اور حکمت کی باریک باتیں اللہ نے مثالوں کے ذریعے واضح کی ہیں۔

فرمایا اس کے باوجود فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا پس انکار کیا اکثر لوگوں نے مگر ناشکری۔ چاہیے تو یہ تھا کہ لوگ اس اعلیٰ وارفع پروگرام کو فوراً قبول کر لیتے مگر ہر دور میں اکثریت ناشکر گزاروں کی ہی رہی ہے۔ آج بھی پوری دنیا میں دیکھ لیں کہ کل آبادی کی کتنی اکثریت کفر اور شرک میں مبتلا ہے اور کتنی برائیوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور پھر یہ بھی دیکھ لیں کہ نیکی کے راستے پر چلنے والے کتنے لوگ ہیں۔ آپ تجزیہ کر کے دیکھ لیں نیکوکاروں کی تعداد بہت قلیل نظر آئے گی۔ اکثر لوگ قرآن پاک کی حقیقت سے مستفید نہیں ہوتے۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ
يَنْۢبُوْعًا ﴿٩٠﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ
عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿٩١﴾ اَوْ تُسْقِطَ
السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا
اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿٩٢﴾ اَوْ يَكُوْنَ
لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ
وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا
نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا
رَّسُوْلًا ﴿٩٣﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ
الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٤﴾
قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ
مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا
رَّسُوْلًا ﴿٩٥﴾ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ
اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ﴿٩٦﴾

ترجمہ:۔ اور کہا (کفر کرنے والوں نے) ہم ہرگز نہیں ایمان
لائیں گے آپ پر یہاں تک کہ آپ جاری کر دیں

ہمارے لیے زمین سے چشمہ (۹۰) یا ہو آپ کے لیے باغ کھجوروں اور انگور کا۔ پس چلائیں آپ نہروں کو ان کے درمیان چلانا (۹۱) یا گرا دیں آسمان ، جیسا کہ آپ خیال کرتے ہیں ، ہم پر کوئی ٹکڑا ، یا لائیں آپ اللہ اور فرشتوں کو سامنے (۹۲) یا ہو آپ کے لیے کوئی گھر سنہری ، یا چڑھ جائیں آپ آسمان پر ، اور ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے آپ کے اوپر چڑھنے سے حتیٰ کہ اُتار دیں آپ ہمارے اُوپر ایک کتاب جس کو ہم پڑھیں۔ (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیں ، پاک ہے میرا پروردگار ، نہیں ہوں میں مگر ایک انسان اور خدا کا فرستادہ رسُول (۹۳) اور نہیں روکا لوگوں کو ایمان لانے سے جب کہ ہدایت اُن کے پاس آئی مگر اس بات نے کہ انہوں نے کہا ، کیا اللہ نے انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے (۹۴) آپ کہہ دیجئے ، اگر ہوتے زمین پر فرشتے چلتے ، بسنے والے تو یقیناً ہم اتارتے اُن پر آسمان کی طرف سے فرشتے رسول بنا کر (۹۵) آپ کہہ دیجئے کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہ میرے درمیان اور تمہارے درمیان بیشک وہ اپنے بندوں کے تمام حالات کے ساتھ خبر رکھنے والا اور ان کو دیکھنے والا ہے (۹۶)

گذشتہ درس میں قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت کا بیان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے چیلنج کر دیا کہ سارے انسان اور جنات مل کر بھی قرآن کی مثل لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے۔ قرآن حکیم (وحی الٰہی) اللہ تعالیٰ کی صفت اور اس کا اُتارا ہوا کلام ہے ، اس میں ماننے والوں کے لیے ہدایت اور شفا ہے۔ البتہ جو لوگ اس کا انکار کریں گے ، اُن کے لیے سراسر خسارہ

ہی خسارے ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ اکثر لوگ سوائے ناشکر گزاری کے کچھ نہیں کرتے حالانکہ قرآن کریم نے مختلف عنوانوں، مثالوں اور طریقوں سے اللہ کی وحدانیت، رسالت انبیاء اور وقوع قیامت کے متعلق بات سمجھا دی ہے۔ اب آج کی آیات میں کفار و مشرکین کے تعصب، عناد، ہٹ دھرمی اور حق ناشناسی کا بیان آرہا ہے۔

آج کی آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ مشرکین مکہ نے حضور علیہ السلام سے کہا کہ آپ رسالت و نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ آپ ہمارے معبودوں کی عیب جوئی کرتے ہیں اور ہمارے بزرگوں کو بیوقوف بتاتے ہیں۔ اس طرح آپ نے ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے ہمارے لیے مشکلات اور پریشانیوں کا سامان پیدا کر دیا ہے۔ کہنے لگے کہ آپ کی ان سرگرمیوں کے بدلے میں ہم آپ کی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اگر آپ کو سرمایہ کی ضرورت ہے تو ہم پہنچا سکتے ہیں۔ اچھے رشتہ کی ضرورت ہو تو ہم انتظام کر دیتے ہیں اور اگر آپ قیادت چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرنے کو تیار ہیں مگر آپ ہمارے معبودوں کو برا بھلا نہ کہیں۔ انہوں نے یہ بھی پیشکش کی کہ اگر آپ ہمارے بزرگ قصی ابن کلاب کو زندہ کر دیں اور وہ آپ کی رسالت کی تصدیق کر دے تو ہم بھی ایمان لے آئیں گے۔ مشرکین نے بعض نشانیاں ظاہر کرنے کا مطالبہ بھی کیا، جن کا ذکر ان آیات میں آرہا ہے۔ ان پیشکشوں اور مطالبات کے جواب میں اللہ کے رسول نے فرمایا، لوگو! میں نے تمہارے سامنے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں فلاں فلاں کام کر سکتا ہوں، بلکہ میں تو اللہ تعالیٰ کا فرستادہ رسول ہوں۔ اور تمہیں اس کے عذاب سے ڈراتا ہوں۔ اگر تم میری بات مان لو گے تو یہ دنیا و آخرت میں تمہاری خوش قسمتی کی علامت ہوگی، اور اگر انکار کرو گے تو میں صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کوئی

فیصلہ کرتے۔

مشرکین کے بے جا مطالبات

ارشاد ہوتا ہے وَقَالُوا اور کفار و مشرکین نے کہا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا ہم ہرگز آپ پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ آپ ہمارے لیے زمین میں چشمہ جاری کر دیں۔ مکہ کا گرد و نواح سنگلاخ پہاڑوں اور بے آب و گیاہ ریتلی زمین پر مشتمل ہے۔ اگر آپ یہاں پر چشمہ جاری کر دیں تو کھیتی باڑی ہونے لگے گی اور ہم خوشحال ہو جائیں گے، لہٰذا آپ پانی کا بندوبست کر دیں تو ہم مان جائیں گے۔ اور یہ نہ ہو سکے تو کم از کم آپ اپنی حیثیت کو ہی نمایاں کر کے دکھا دیں أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ یا آپ کا کھجوروں اور انگور کا باغ ہونا چاہیے .... تاکہ معلوم ہو سکے کہ آپ اعلیٰ حیثیت کے مالک ہیں۔ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا اور محض خشک باغ نہیں ہونا چاہیے بلکہ آپ اس میں نہریں بھی جاری کر دیں تاکہ دیکھنے والا واقعی مرعوب ہو سکے۔ مگر آپ کی مالی حالت تو ہم سے بھی گئی گزری ہے، لہٰذا ہم آپ کی سیادت کیسے قبول کر لیں۔

کہنے لگے، آپ ہمیں اکثر بن دیکھے عذاب سے خوفزدہ کرتے رہتے ہیں اگر آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو ہم پر کوئی عذاب لے آئیں۔ اور اس کی صورت یہ ہے أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا کہ جیسا آپ خیال کرتے ہیں، ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا ہی گرا دیں تاکہ ہمیں پتہ چل جائے کہ خدا کی گرفت واقعی آ سکتی ہے۔ کفار نے کہا، اگر یہ بھی نہیں کرتے أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا تو پھر اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آئیں جو گواہی دیں کہ واقعی آپ اللہ کے رسول ہیں۔ ہم اس طرح بھی آپ کی بات مان جائیں گے۔

کہنے لگے، اور کچھ نہیں تو کم از کم یہ تو ہو أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ

مِّنْ زُخْرُفٍ کہ آپ کا
اپنا گھر ہی سونے کا بنا ہوا ہو۔ اس پر سونے کی چھت ہو یا اگر سونے چاندی کا
میٹریل استعمال نہ ہوا ہو تو اس پر سونے کا ملمع کیا ہوا ہو جس سے پتہ چلے کہ
آپ منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ کی عظمت اس طرح بھی دنیا کے
سامنے واضح ہو سکتی ہے۔ کہا، اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ یا آپ آسمان
پر چڑھ جائیں۔ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ اور ہم محض آپ کے
آسمان تک پہنچ جانے کی وجہ سے ہی ایمان نہیں لے آئیں گے حَتّٰى
تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ یہاں تک کہ آپ ہم پر
ایک کتاب اتاریں جسے ہم خود پڑھ سکیں۔ آپ معراج کا دعویٰ کرتے ہیں۔
کہ ساتوں آسمانوں، جنت اور دوزخ کی سیر کی۔ بھلا ہمارے سامنے آسمان پر
چڑھ جاؤ اور وہاں سے لکھی لکھائی کتاب لے آؤ تو ہم پھر آپ پر ایمان
لے آئیں گے۔

نبی کی حیثیت

کفار و مشرکین کی فرمائشوں اور مطالبات کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کا یہ واضح
فیصلہ موجود ہے " وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا
بِاِذْنِ اللّٰهِ " (المومن - ۷۸) کسی نبی یا رسول کے اختیار میں نہیں ہے
کہ وہ از خود کوئی نشانی یا معجزہ پیش کرے، مگر اللہ کے حکم سے۔ اللہ کا
نبی کبھی دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ یہ کر سکتا ہے یا وہ کر سکتا ہے بلکہ وہ تو ہمیشہ
اللہ تعالیٰ کے حکم کا پابند ہوتا ہے، لہٰذا مشرکین کے مطالبات ان کی ضد اعناد
اور ہٹ دھرمی کی بنا پر تھے بعض اوقات مشرکین دین دشمنی میں اس حد تک
بڑھ جاتے تھے کہ خود اپنے لیے بددعا کرنے لگتے تھے۔ سورۃ انفال میں گزر
چکا ہے کہ انہوں نے کہا اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ
عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ اے اللہ اگر محمد کا دین سچا ہے تو ہم پر پتھروں کی

بارش برسا یا کوئی دردناک عذاب بھیج دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ظالموں کی نظر اس دنیا سے آگے جاتی ہی نہیں تھی۔ ان آیات میں مذکورہ مطالبات کا تعلق بھی دنیا کے مال و متاع ہی سے ہے کہ آپ کے لیے باغ ہو، سنہری گھر ہو سکے کی زمین قابل کاشت بن جائے حالانکہ اللہ کے نبیوں نے دنیا کی اعلیٰ حیثیت کا کبھی دعویٰ نہیں کیا، بلکہ انہوں نے تو ہمیشہ ایمان اور نیکی کی دعوت دی ہے۔ اگر اس پر عمل پیرا ہو جاؤ گے تو دنیا بھی سدھر جائے گی اور آخرت میں بھی نجات مل جائے گی۔ دنیاداری اور سرمایہ داری عارضی اشیا رہیں اور ختم ہونے والی ہیں۔ اس میں نقصان کا پہلو زیادہ ہے اکثر لوگ دنیاوی وسائل کو غلط طور پر استعمال کر کے غلط نتائج اخذ کرتے ہیں۔ مشرکین مکہ کی بیہودہ فرمائشیں انکار کا ایک بہانہ تھیں۔ اللہ نے بنی اسرائیل کا ذکر قرآن میں بار بار کیا ہے۔ وہ بھی اس طرح ایمان کو ٹالنے کے لیے فضول مطالبات کرتے رہتے تھے۔ ایمان لانا ان کا مقصود ہی نہیں تھا یہی حال اللہ نے کفار و مشرکین کا بھی بیان فرمایا ہے۔

بہرحال اللہ نے اپنے نبی کی حیثیت کو خود نبی کی زبان سے واضح فرما دیا۔ قُلْ اے پیغمبر! آپ ان کفار و مشرکین سے کہہ دیں سُبْحَانَ رَبِّيْ میرا پروردگار ہر عیب، نقص اور کمزوری سے پاک ہے۔ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا میں تو محض ایک انسان اور خدا کا فرستادہ ہوں۔ میں نے نہ تو الوہیت کا دعویٰ کیا ہے اور نہ میں فرشتہ ہوں۔ میں اپنی جانب سے کوئی بات نہیں کرتا بلکہ خدا تعالیٰ کے حکم کی خود تعمیل کرتا ہوں اور تم تک بھی پہنچاتا ہوں۔ میں انسان ہوں اور انسان نہ تو عالم الغیب ہوتا ہے اور نہ مختار مطلق لہٰذا میں تمہارے مطالبات پورا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ "إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" (البقرۃ - ۲۰) ہر چیز پر قادر تو صرف اللہ ہے اور "يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ" (البقرۃ - ۲۵۳) وہی ذات

ہے ۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے، اُس کے سامنے کوئی چیز محال نہیں ۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں تو انسان اور اُس کا بھیجا ہوا رسول ہوں ۔

آگے اللہ تعالیٰ نے اس بات کی وضاحت فرمائی ہے ۔ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓی کہ جب بھی لوگوں کے پاس اللہ کی طرف سے ہدایت لے کر رسول آیا اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا تو انہوں نے محض اس بنا پر ایمان لانے سے انکار کر دیا کہ کیا اللہ نے انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے ۔ اُن کے دماغ میں شیطان نے یہ بات ڈال رکھی تھی کہ انسان کیسے رسول ہو سکتا ہے جو کھاتا پیتا، چلتا پھرتا، بیوی بچے رکھتا اور کاروبار کرتا ہے ۔ وہ لوگ اپنے جیسے انسان کو رسول ماننے کے لیے تیار نہ تھے، یہی چیز اُن کے ایمان لانے میں رکاوٹ تھی ۔ یہ نظریہ مشرکین مکہ تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ سابقہ امتوں نے بھی اپنے انبیاء کا اسی بنا پر انکار کیا ۔ قوم ثمود کے متعلق سورۃ القمر میں ہے کہ انہوں نے کہا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ، کیا ہم اپنے میں سے ایک انسان کی اتباع کریں، اِنَّآ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ اس طرح تو ہم گمراہی اور دیوانگی میں پڑ گئے ۔

ہم نوع رسول

بہرحال اللہ تعالیٰ نے بشریت رسول کے متعلق کفار و مشرکین کے اعتراض کا جواب اس طرح دیا ۔ قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ دیں کہ اگر زمین میں انسانوں کی بجائے فرشتے چلتے پھرتے اور آباد ہوتے لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا تو ہم اُن کی طرف آسمان سے فرشتے کو رسول بنا کر بھیج دیتے ۔ مطلب یہ کہ جب زمین پر انسان آباد ہیں تو اُن کی راہنمائی کے لیے انسانوں ہی سے رسولوں کا منتخب ہونا قرین

قیاس ہے۔ بھلا انسانوں کے پاس فرشتہ کیسے رسول بن کر آسکتا ہے جبکہ دونوں کی انواع مختلف ہیں اور ان کے درمیان مناسبت ہی نہیں۔ فرشتے اللہ کی پاک اور مقدس مخلوق ہیں۔ ان کا مادہ تخلیق مختلف ہے۔ ان میں عقل ضرور ہے مگر خواہشات نہیں ہیں۔ یہ مکلف ہیں مگر لوازمات بہیمیہ سے خالی ہیں۔ برخلاف اس کے انسان ناسوتی مخلوق ہے۔ اس میں ملکیت بھی ہے اور بہیمیت بھی۔ اللہ نے اُسے ملکیت کو غالب بنانے کا حکم دیا ہے۔ اور بہیمیت کو کمزور کرنے کی ہدایت کی ہے۔ انسان کو مرتبہ زیادہ بخشا ہے۔ مگر اس کی پیدائش بڑی پیچیدہ ہے۔ غرضیکہ انسان فرشتے سے استفادہ نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی انواع مختلف ہیں۔ اسی لیے مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ معلم اور متعلم میں مناسبت ضروری ہے کہ اس کے بغیر فیض حاصل نہیں ہو سکتا۔ مطلب یہ کہ انسان کی ہدایت کے لیے انسان ہی رسول بن کر آئے گا تو فیض حاصل ہوگا، ورنہ نہیں۔

سورۃ الانعام میں اللہ کا یہ فرمان موجود ہے کہ انسان اگر فرشتے سے استفادہ حاصل کرنا چاہے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ ہم فرشتے کو انسانی صورت میں بھیجیں۔ اگر ایسا ہوگا تو منکرین کا اعتراض اپنی جگہ قائم رہے گا کہ یہ تو ہمارے جیسا انسان ہے، ہم اس کی اتباع کیوں کریں؟ اور اگر بصورت دیگر فرشتے کو اس کی اصلی شکل و صورت میں بھیجیں تو انسان اس کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اُس کی نورانیت، چمک دمک اور شکل و صورت دیکھ کر انسان فوراً دہشت زدہ ہو کر ہلاک ہو جائیں گے۔ عام انسان فرشتے کو اصلی صورت میں دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خصوصیت ہے کہ آپ نے جبرائیل علیہ السلام کا دو مرتبہ ان کی اصل صورت میں مشاہدہ کیا۔ آپ کی پہلی ملاقات غار حرا میں ہوئی جب آپ پر دہشت طاری ہو گئی

اور آپ لرزتے کانپتے گھر آئے اور کپڑا اوڑھانے کے لیے کہا۔ بڑی دیر کے بعد آپ کی دہشت دُور ہوئی اور دوسری مرتبہ آپ کی ملاقات اُس وقت ہوئی جس کا ذکر سورۃ النجم میں ہے۔ بہرحال کوئی عام انسان فرشتوں سے براہ راست استفادہ نہیں کر سکتا، لہٰذا انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ انسان ہی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے ہی رسول منتخب کرتا ہے جس کا اخلاق نہایت پاکیزہ ہوتا ہے اور اس کو گارنٹی حاصل ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کسی معصیت میں مبتلا نہیں ہونے دیتا۔ حوائج بشری رسول کے ساتھ بھی لازم ہوتے ہیں۔ موت و حیات کا وہ بھی پابند ہوتا ہے، لہٰذا انسانوں کی طرف انسان ہی بطور رسول آتا ہے۔ مشرکین کا مطالبہ بالکل بیہودہ اور عقل و فطرت کے خلاف ہے۔

اللہ بطور گواہ

فرمایا، اگر اب بھی یہ لوگ انکار کریں اور بیہودہ مطالبات پیش کریں، تو قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ میرے اور تمہارے درمیان اللہ ہی گواہ کافی ہے۔ اگر تم میری نبوت و رسالت کی گواہی دینے کے لیے تیار نہیں تو اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ کی گواہی ہی کافی ہے۔ وہ گواہی دے رہا ہے کہ اُس نے مجھے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سلسلۂ رسل کی آخری کڑی ہیں اور سب سے زیادہ صاحب فضیلت ہیں اور یاد رکھو! اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے تمام حالات، اُن کے کوائف اور داخلی، خارجی اور ذہنی عوامل سے باخبر ہے۔ وہ بصیر بھی ہے کہ ہر چیز اُس کی نگاہ میں ہے۔ وہ کسی چیز سے غافل نہیں۔ وہ ہر شخص کی نیت اور ارادے سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون حق کو قبول کرتا ہے اور کون اپنی ضد، عناد اور تعصب پر اڑا رہتا ہے۔ کوئی شخص اُس کے محاسبے سے بچ نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے آخر میں یہ تنبیہ بھی فرما دی۔

درس سی ۳۰ — آیت ۹۷ تا ۱۰۰

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۷﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾ ع

ترجمہ:- اور جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جس کو بہکا دے۔ پس ہرگز نہ آپ پائیں گے اُن کے لیے کوئی کارساز اس کے سوا۔ اور ہم اکٹھا کریں گے اُن کو قیامت والے دن چہروں کے بل اندھے، بہرے اور گونگے بنا

کر ۔ ٹھکانا اُن کا جہنم ہوگا ۔ جب کہ وہ بجھنے لگے گی ہم
زیادہ کر دیں گے اُن کو ، بھڑکا دیں گے اُس کو (۹۷) یہ ہے
بدلہ اُن کا اس وجہ سے کہ انہوں نے کفر کیا ہماری آیتوں
کے ساتھ ، اور کہا انہوں نے کہ کیا جب ہم ہو جائیں گے ہڈیاں
اور چورہ چورہ ، تو کیا ہم اٹھائے جائیں گے نئی پیدائش میں (۹۸)
کیا نہیں دیکھا اُن لوگوں نے کہ بیشک اللہ تعالیٰ وہ ہے کہ
جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو ۔ کیا وہ قادر نہیں ہے
اس بات پر کہ پیدا کرے اُن جیسے اور بنائی ہے اُس نے
اُن کے لیے ایک مدت ، کوئی شک نہیں اس میں ۔ پس انکار
کیا ظلم کرنے والوں نے ، سوائے ناشکر گذاری کے (اور کچھ نہیں) (۹۹)
اے پیغمبر! آپ کہہ دیجیے ، اگر تم مالک ہوتے میرے رب کی
رحمت کے خزانوں کے تو البتہ تم روک رکھتے اس کو خرچ
ہونے کے ڈر سے ۔ اور ہے انسان بہت تنگدل (تنگ ہاتھ) (۱۰۰)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مشرکین حضور علیہ السلام کی نبوت و رسالت
میں بایں وجہ شک اور پھر انکار کرتے تھے کہ ایک انسان رسول نہیں ہو سکتا ۔ اس کے
جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر زمین میں فرشتے بستے ہوتے تو ہم کسی فرشتے کو
رسول بنا کر بھیج دیتے ، مگر زمین چونکہ نوعِ انسانی سے آباد ہے تو یقینی بات ہے
کہ ایک انسان ہی اُن کے لیے نمونہ بن سکتا ہے اور وہی اُن کی راہنمائی کا فریضہ ادا
کر سکتا ہے ۔ اللہ نے اپنے نبی کی زبان سے کہلوا دیا کہ اگر تم میری نبوت و رسالت
کا انکار کرتے ہو تو اس کا وبال تمہی پر پڑے گا ۔ البتہ اگر تم میری رسالت کی گواہی نہ بھی دو
تو اس کے لیے میرا اللہ ہی گواہ کافی ہے ، وہ تو یقیناً گواہی دیتا ہے کہ میں اُس کا سچا
رسول ہوں اور اس کا پیغام اُس کے بندوں تک پہنچاتا ہوں ۔ اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں

کے حالات سے خوب واقف ہے اور وہ ہر ایک کے عقیدے عمل اور حالات کے مطابق باز پرس کرے گا۔

مکی سورتوں کے مضامین

آج کی آیات میں ہدایت اور گمراہی کا فلسفہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ معاد کا مسئلہ بھی سمجھایا ہے کیونکہ کفار و مشرکین جس طرح انبیاء کی رسالت کا انکار کرتے تھے، اسی طرح وقوع قیامت اور محاسبہ عمل کو بھی تسلیم نہیں کرتے تھے دراصل تمام مکی سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے چار بنیادی اصولوں کا ذکر کیا ہے یعنی توحید، رسالت، معاد اور وحی الٰہی کی صداقت و حقانیت، سورۃ بنی اسرائیل ہجرت سے ڈیڑھ دو سال پہلے نازل ہوئی، اس لیے اسمیں ہجرت اور فتح مکہ کا اشارۃً ذکر کر دیا گیا ہے۔ پانچ نمازوں کی فرضیت کا ذکر بھی اسی سورۃ مبارکہ میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ اسکی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اسلام کے اجتماعی نظام کے وہ پندرہ اصول بیان کر دیئے گئے ہیں جنہیں منشور اسلام (MANIFESTO OF ISLAM یعنی مینی فیسٹو آف اسلام) کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اور دیگر مکی سورتوں کی طرح چار بنیادی اصول بھی اس سورۃ مبارکہ میں بیان کر دیئے ہیں۔ چنانچہ آج کے درس میں معاد کا بیان اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

ہدایت اور گمراہی کا قانون

اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت میں ہدایت اور ضلالت کا قانون بیان فرمایا ہے وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ جسے اللہ تعالیٰ راہ دکھا دے، وہی ہدایت پانے والا ہوتا ہے۔ وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِهِ اور جسے اللہ تعالیٰ بھٹکا دے تو آپ ہرگز نہ پائیں گے ان کے لیے اللہ کے سوا کوئی کارساز جو ان کو راہ دکھا سکے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا ہے کہ راہ راست انہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو ہدایت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ ضد، تعصب اور عناد پر اڑے رہتے ہیں، اُن کو صراط مستقیم نہیں ملتا۔

اللہ تعالیٰ کا اس سلسلہ میں قانون یہ ہے "فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ" (المائدہ - ۴۴) یہی لوگ کافر ہیں۔ "فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" (المائدہ - ۴۵) یہی لوگ ظالم ہیں۔ "فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ" (المائدہ - ۴۷) یہی لوگ نافرمان ہیں۔ اس قسم کے جو لوگ کفر و شرک کی گندگی کو ہی پسند کرتے ہیں، اللہ کہتا ہے "نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى" (النساء - ۱۱۵) وہ جدھر جانا چاہتے ہیں، ہم انہیں اُدھر ہی جانے دیتے ہیں۔ اور جو لوگ منصف مزاج ہوتے ہیں، ان کے دل میں ہدایت کی تڑپ ہوتی ہے۔ ان کے متعلق فرمایا "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" (العنکبوت ۶۹) جو ہمارے لیے کوشش کرتا ہے، ہم اُسے اپنے رستے کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔

ہدایتِ الٰہی انسان کی اولین ضرورت ہے، اسی لیے ہم ہر نماز کی ہر رکعت میں یہ دعا کرتے ہیں "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" (الفاتحہ - ۵) اے مولا کریم! ہمیں سیدھی راہ دکھائیے اور جو دکھلائی ہے اس پر ہمیں چلا تا رہ۔ اس جملے میں دکھانے اور چلانے کے دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے راہ راست کی تشریح قرآن میں بیان کر دی ہے اور مزید تشریح اپنے پیغمبر کے ذمے لگا دی ہے۔ بہر حال گمراہی کا ٹھپہ انہی پر لگتا ہے جو متعصب ہوتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ" (البقرۃ - ۷) اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ "بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ" (النساء - ۱۵۵) ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں کو سربمہر کر دیا ہے ایسے لوگ "صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ" (البقرۃ - ۱۷۱) بہرے، گونگے اور اندھے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے، حالانکہ اللہ نے انہیں عقل و شعور جیسا

گمراہوں کے لیے سزا

عظیم جوہر عطا فرمایا ہے۔

فرمایا جس کو اللہ گمراہ کر دے وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُمْيًا وَبُكْمًا وَصُمًّا ہم ان کو قیامت والے دن ان کے چہروں کے بل اس حالت میں اٹھائیں گے کہ وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے۔ یاد رہے کہ نافرمانوں کی یہ حالت سارے عرصہ محشر کے لیے نہیں بلکہ ایک خاص وقت کے لیے ہوگی تاکہ ان لوگوں کو ذلیل و رسوا کیا جا سکے۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ جو میری نصیحت سے منہ پھیریگا۔ اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی۔ "وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ" (آیت ۱۲۴) اور قیامت کو ہم اُسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ "قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنتُ بَصِيرًا" (آیت ۱۲۵) وہ کہے گا، پروردگار! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا، میں تو دنیا میں بینا تھا۔ "قَالَ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا ۖ وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنسَىٰ (آیت ۱۲۶) اللہ فرمائے گا اسی طرح تیرے پاس ہماری آیتیں آئیں تو تو نے ان کو بھلا دیا۔ اسی طرح آج ہم تمھیں بھلا دیں گے۔ اس کے بعد میدان حشر میں ایسا وقت بھی آئے گا کہ اللہ فرمائے گا۔ "لَقَدْ كُنتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ" (ق۔ ۲۲) تو اس دن سے غافل رہا تھا۔ اب ہم نے تجھ سے پردہ اٹھا دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔ جب اُس کی آنکھیں کھلیں گی۔ تو نگاہ اتنی تیز ہوگی کہ فرشتے، جن، عرش الٰہی، عالم بالا، جنت، دوزخ وغیرہ جو اب تک نظروں سے پوشیدہ تھے سب نظر آنے لگیں گی۔

چہروں کے بل چلنے سے متعلق ترمذی شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت بھی منقول ہے۔

يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَلَاثَةَ اَصْنَافٍ صِنْفًا مُشَاةً وَصِنْفًا رُكْبَانًا وَّصِنْفًا عَلٰى وُجُوْهِهِمْ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ يَمْشُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ قَالَ اِنَّ الَّذِيْ اَمْشَاهُمْ عَلٰى اَقْدَامِهِمْ قَادِرٌ عَلٰى اَنْ يُّمْشِيَهُمْ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اَمَا اِنَّهُمْ يَتَّقُوْنَ بِوُجُوْهِهِمْ كُلَّ حَدَبٍ وَّشَوْكٍ

ترجمہ :۔ قیامت کے دن لوگ تین گروہوں میں اٹھائے جائیں گے ایک قسم پیدل چلنے والوں کی ہوگی ، ایک سواروں کی اور ایک منہ کے بل چلنے والوں کی ۔ عرض کیا گیا ، یارسول اللہ ! یہ منہ کے بل کس طرح چلیں گے ؟ آپ نے فرمایا جس اللہ نے انہیں پاؤں کے بل چلایا ہے وہ منہ کے بل چلانے پر بھی قدرت رکھتا ہے معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ لوگ اپنے منہ کے ذریعے ہی زمین کے پتھر روڑے اور کانٹے سے بچیں گے ۔ ایک حدیث میں چہروں کے بل گھسیٹنے کے الفاظ آتے ہیں ۔

فرمایا ان کو ہم قیامت کے دن چہروں کے بل اندھے گونگے اور بہرے کر کے اٹھائیں گے مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہوگا ۔ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا جب کبھی جہنم کی آگ ذرا بجھنے لگے گی ، ہم مزید بھڑکا دیں گے ۔ یہ ایسے ہی ہوگا جیسے ان کی کھال کے متعلق فرمایا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا (النساء ۵۶) جب جہنمیوں کی پہلی کھال جل جائے گی ۔ تو ہم انہیں دوسری کھال پہنا دیں گے ۔ فرمایا ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا ۔ آیات سے مراد معجزات اور احکام بھی ہیں ۔ آیت کا اطلاق ، دلیل ، معجزہ اور

نشانی پر بھی ہوتا ہے۔ انہوں نے بعض معجزات کو جادو کہہ کر انکار کر دیا اور واقعہ معراج کے ساتھ تمسخر اڑایا۔ احکام الٰہی پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ دنیا میں کفر و شرک پر اڑے رہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے آخرت میں یہ سزا تجویز فرمائی کہ انہیں اندھا، بہرہ اور گونگا کر کے منہ کے بل اٹھایا جائے گا اور جہنم کی آگ کو اُن کے لیے مزید تیز کر دیا جائے گا۔

قیامت کا انکار

وقوعِ قیامت کے متعلق کفار و مشرکین کا ردِ عمل یہ تھا قَالُوٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا کہتے تھے کیا جب ہم مر کر ہڈیاں اور چورہ چورہ ہو جائیں گے۔ گوشت پوست گل سڑ جائے گا۔ اور صرف ہڈیاں باقی رہ جائیں گی۔ اِن ہڈیوں کے متعلق بھی آتا ہے "ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً" (النّٰزعٰت - ۱۱) کہ جب یہ ہڈیاں بھُربھُری ہو جائیں گی۔ زندگی کے کوئی آثار باقی نہیں رہیں گے ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا تو کیا اُس وقت ہم پھر نئی پیدائش میں اٹھائے جائیں گے؟ بعض اس حالت کو اس طرح بھی بیان کرتے تھے "ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِى الْاَرْضِ" (السجدہ - ۱۰) جب ہم مٹی میں رل مل جائیں گے، ہمارے ذرات منتشر ہو جائیں گے تو کیا پھر ہمیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ کہتے تھے یہ تو خلافِ عقل بات ہے۔ ہم نے تو آج تک مرنے کے بعد کسی کو دوبارہ جی اٹھتے نہیں دیکھا۔ اس طرح وہ بعث بعد الموت کا انکار کرتے تھے اللہ نے جواب میں فرمایا اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کیا اِن لوگوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کیے ہیں قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ کیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ اُن جیسے دوبارہ پیدا کر دے۔ اللہ نے اُن کی توجہ آسمان و زمین، چاند،

اور سورج جیسے بڑے بڑے سیاروں کی طرف دلائی ہے جس زمین پر چلتے پھرتے ہیں اس کا قطر چوبیس ہزار میل ہے اور سورج کے مقابلے میں تو اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ ماہرین فلکیات کہتے ہیں کہ شعریٰ سیارہ سورج سے بھی بیس گناہ بڑا ہے۔ جب اللہ نے اتنی بڑی اشیاء پیدا کر رکھی ہیں تو انسان جیسی چھوٹی سی چیز کو دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے کون سی مشکل بات ہے؟ سورۃ انعام میں اللہ کا فرمان ہے کہ ہر شخص کے لیے ایک مدت مقرر ہے اور اسی طرح پوری کائنات کے لیے بھی ایک وقت مقرر ہے۔ جب مقررہ وقت آئیگا تو ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ پھر مقررہ وقت پر اللہ تعالیٰ انسان کو دوبارہ اٹھائیگا۔ یہاں بھی فرمایا وَجَعَلَ لَهُمْ أَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيهِ اللہ تعالیٰ نے سب کے لیے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں محاسبے کی منزل آکر رہے گی فَأَبَى الظَّالِمُونَ إِلَّا كُفُورًا مگر ظالم لوگ ہی اس منزل کا انکار کرتے ہیں۔ ہر منصف مزاج آدمی قیامت کو برحق تسلیم کرتا ہے۔ ظالم لوگ اکثر و بیشتر کفر و ضلالت ہی کا انکار کرتے ہیں۔

اللہ کی رحمت کے خزانے

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے ایک اور اعتراض کا جواب دیا ہے۔ وہ لوگ حضور علیہ السلام کو محض اس لیے رسول ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ آپ کا تعلق ایک غریب خاندان سے تھا۔ سورۃ الزخرف میں موجود ہے، کفار و مشرکین کہتے تھے "لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ" یہ قرآن حکیم طائف اور مکے کی دو بڑی بستیوں کے کسی صاحب حیثیت آدمی پر کیوں نہ نازل ہوا؟ کیا اس منصب کے لیے ابوطالب کا یتیم بھتیجا ہی رہ گیا تھا؟ جس کے پاس نہ مال ہے اور نہ باغ نہ کوئی کوٹھی ہے، نہ نوکر اور نہ نوکر چاکر۔ بھلا یہ کیسے رسول ہو سکتا ہے؟ اللہ نے جواب میں فرمایا

قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ تو تم اس خزانے کو خرچ ہو جانے کے خوف سے روک رکھتے۔ یعنی تم رحمت کے ان خزانوں کو خرچ ہی نہ کرتے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے اپنی رحمت کے خزانوں کو وا کر رکھا ہے۔ نبوت و رسالت بھی اس کی رحمت کا ایک خزانہ ہے، وہ جہاں چاہتا ہے اُسے خرچ کرتا ہے "اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ" (الانعام۔ ۱۲۴) وہی بہتر جانتا ہے کہ رسالت کا مستحق کون ہے اور پیغمبر وہ جس کو اہل سمجھتا ہے اُس کے سر پہ نبوت کا تاج رکھ دیتا ہے۔ اس ضمن میں وہ امیر غریب یا دنیاوی مال و دولت کا کچھ لحاظ نہیں کرتا۔ تمہارے پاس اگر دنیا کا مال و دولت اور بادشاہی بھی آ جائے تو اسے اپنے خاندان ہی میں تقسیم کر دیتے ہو۔ اس کا فائدہ دوسروں کو نہ پہنچ سکے حالانکہ اللہ کا فرمان ہے "نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" (الزخرف۔ ۳۲) دنیا کی زندگی میں لوگوں کے درمیان معیشت ہم تقسیم کرتے ہیں جب رزق کی تقسیم بھی ہم نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ تو نبوت و رسالت جیسی عظیم چیز کو ہم کسی دوسرے پر کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ اس رحمت کو بھی ہم خود ہی مستحق شخصیت کو عطا کرتے ہیں۔ سورۃ الحجر میں فرمایا "وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۡ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ" (آیت ۲۱) ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم اسے خاص انداز میں نازل فرماتے ہیں۔ چنانچہ سلسلہ نبوت و رسالت کی آخری کڑی کے لیے اللہ تعالیٰ کی نظر انتخاب حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی اور اس نے آپ کو تمام انبیاء و مرسلین میں فضیلت بخشی حتیٰ کہ آپ کے لیے مقام محمود کا ذکر بھی اسی سورۃ میں ہو چکا ہے۔ تو

اللہ کے نزدیک نبوت و رسالت کے لیے معیار مال و دولت یا اعلیٰ خاندان نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاق، بلند کردار اور کمال صلاحیت ہے۔ اُس نے اپنی اوصاف کی بناء پر حضور علیہ السلام کو اپنا آخری نبی منتخب فرمایا ہے۔ لہٰذا کفار و مشرکین کو اس تقسیم خداوندی پر اعتراض کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

انسان کی تنگدلی

فرمایا، انسان کی حالت تو یہ ہے وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُورًا کہ وہ بڑا تنگدل واقع ہوا ہے۔ انسان فطرۃً خود غرض، اقتدار پسند مفاد پرست اور حریص واقع ہوا ہے۔ یہ دنیا کے مال و جاہ ہی کو پسند کرتا ہے حالانکہ اللہ کا فرمان یہ ہے کہ دنیا تو ہم نیک و بد سبھی کو دیتے ہیں۔ دنیا کا حاصل ہو جانا کچھ وقعت نہیں رکھتا اور نہ ہی یہ اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کی علامت ہے۔ انسان کی کامیابی اور ابدی فلاح کا دارومدار اس کی دیانت و امانت، اخلاق اور عقیدے پر ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جنھیں اکثر لوگ نظر انداز کر جاتے ہیں۔ رشتہ کرنا ہو تو ہمیشہ مال و دولت اور جاہ و اقتدار پر نظر ہوتی ہے۔ اخلاق و دیانت اور ایمانداری کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ابن ماجہ شریف کی روایت میں آتا ہے۔ لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى كَافِرًا مِّنْهَا شَرْبَةً اگر اللہ کے نزدیک پوری دنیا کی حیثیت ایک مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتا۔ مگر دنیا میں کامیابی کا معیار تو اللہ نے انبیاء کے ذریعے ظاہر کیا ہے، مگر اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دیتا۔ انسان واقعی تنگدل واقع ہوا ہے، وہ اس دُنیا کی رنگینیوں میں ہی پھنس کر رہ جاتا ہے اور آخرت کو بھول جاتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ﴿۱۰۳﴾ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ﴿۱۰۴﴾

ترجمہ:- اور البتہ تحقیق ہم نے دیں موسیٰ علیہ السلام کو نو نشانیاں واضح ۔ پس آپ پوچھ لیں بنی اسرائیل سے جب کہ وہ (موسیٰ) ان کے پاس آئے ۔ پس کہا فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہ میں گمان کرتا ہوں تیرے بارے میں اے موسیٰ! کہ تو سحر زدہ ہے ﴿۱۰۱﴾ کہا (موسیٰ نے) البتہ تحقیق تو جانتا ہے کہ نہیں اتارا ان نشانیوں کو مگر آسمان و زمین کے پروردگار نے بصیرت کے لیے ۔ اور میں گمان کرتا ہوں تیرے بارے میں اے فرعون! کہ تو ہلاکت زدہ ہے ﴿۱۰۲﴾ پس ارادہ کیا فرعون نے کہ اکھاڑ دے قدم ان کے زمین سے پس ہم نے غرق کیا فرعون کو مع اس کے ساتھیوں کے

سب کے سب ﴿۱۰۳﴾ اور کہا ہم نے اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہ رہو تم زمین میں پس جب آئے گا آخرت کا وعدہ تو ہم لے آئیں گے تم سب کو سمیٹ کر ﴿۱۰۴﴾

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ نے کفار و مشرکین کے تعصب، ضد اور عناد کا ذکر کیا کہ وہ بیہودہ فرمائشیں کرتے تھے ۔۔۔۔۔۔۔۔ اللہ کی توحید کا انکار کرتے تھے۔ رسالت و نبوت پر اعتراضات کرتے تھے اور معاد کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان اعتراضات کا جواب گذشتہ درس میں دیا جا چکا ہے۔ اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی نو نشانیوں اور فرعون اور قوم فرعون کی نافرمانی کا ذکر کیا ہے اس سے اہل ایمان کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ جس طرح قوم فرعون موسیٰ علیہ السلام کی واضح نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائی تھی، اسی طرح مشرکین اپنی مطلوبہ نشانیاں پا کر بھی ایمان سے محروم ہی رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی استعداد کو جانتا ہے۔ ان کی حالت تو یہ ہے کہ حسب فرمائش اگر ان کے آباؤ اجداد کو زندہ کر کے ان کے سامنے لا کھڑا کریں تو تب بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ ضدی اور عنادی لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو کبھی راہ راست کی طرف ہدایت نہیں دیتا بلکہ یہ گمراہی کی راہ پر ہی گامزن رہتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزات

تو ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر فرمایا ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نو واضح نشانیاں عطا فرمائیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے تمام معجزات کی تعداد تو بہت زیادہ ہے تاہم نو وہ بڑے بڑے معجزات ہیں جن کا ذکر سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ ان معجزات میں (۱) ید بیضا (۲) عصا (۳) قحط سالی (۴) پھلوں میں کمی (۵) طوفان (۶) ٹڈی دل (۷) جوئیں (۸) مینڈک اور (۹) خون شامل ہیں۔ ان میں سے ید بیضا اور عصا وہ معجزات ہیں جو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو دے کر فرعون کے پاس بھیجا۔

دیگر نشانیاں

اس کے علاوہ موسیٰ علیہ السلام کی لکنت کا معجزہ بھی قرآن پاک میں مذکور ہے سورۃ

طٰہٰ میں ہے کہ انہوں نے عرض کیا وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي
يَفْقَهُوا قَوْلِي "میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات
سمجھنے لگیں۔ چنانچہ اللہ نے آپ کی یہ دعا قبول فرمائی، سورۃ یونس میں
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا بھی مذکور ہے رَبَّنَا اطْمِسْ
عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ "اے اللہ! فرعونیوں کے مال کو مسخ کر دے یا بالکل
مٹا دے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا بھی قبول فرمائی۔ امام رازیؒ نے
اپنی تفسیر میں یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے تابعین
میں سے محمد ابن کعبؒ مفسر قرآن نے موسیٰ علیہ السلام کی نو نشانیوں کے
متعلق پوچھا تو انہوں نے ان میں سے زبان کی لکنت اور طمس مال کا ذکر
بھی کیا۔ پھر آپ نے خادم سے ایک تھیلا لانے کو کہا۔ اس کے تھیلے میں کچھ
انڈے اور اخروٹ تھے جو دو ٹکڑے ہو چکے تھے، مگر پتھر بن چکے
تھے۔ اس کے علاوہ تھیلے میں سے کچھ لوبیا، چنے اور مسور برآمد ہوئے
یہ سب چیزیں سنگریزوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ انہوں نے کہا موسیٰ
علیہ السلام کی بد دعا کا یہ ایک نمونہ ہے جو خاندانی طور پر ان کے پاس
پہنچا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کے اموال کو اس طرح مسخ
کر دیا یا مٹا دیا کہ کھانے پینے کی چیزیں استعمال کے قابل نہ رہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کی بعض دیگر نشانیوں میں ارتفاع طور بھی ہے۔ سورۃ البقرہ
میں موجود ہے، اللہ نے فرمایا وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ (آیت ۹۳)
ہم نے پہاڑ طور کو ان کے سروں پر معلق کر دیا اور کہا کہ توبہ کرو، ورنہ یہ پہاڑ
تمہیں پیس ڈالے گا۔ اسی طرح بادلوں کے سائے کی نشانی بھی قرآن میں
مذکور ہے وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ
الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ (البقرۃ - ۵۷) میدان تیہ کی چالیس سالہ نظر بندی
کے دوران جب بنی اسرائیل کے خیمے پھٹ گئے تو اللہ نے ان پر بادلوں

کا سایہ کر دیا اور انہیں من و سلویٰ جیسی بلا مشقت اور تر و تازہ غذا بہم پہنچائی تفسیری روایات میں آتا ہے کہ اللہ نے اُن کے لیے روشنی کا انتظام بھی فرما دیا۔ رات کو روشنی کا ایک مینار چمکتا تھا جس کی روشنی بنی اسرائیل کے تمام خیموں تک پہنچتی تھی۔ جب بنی اسرائیل نے پانی کی درخواست کی تو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ اس پتھر پر لاٹھی مارو۔ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا تو اس میں سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔ اور پھر بنی اسرائیل کے لیے سمندر میں رستے بنا دیئے فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ فرمایا اس طرح ہم نے تمہیں نجات دی اور فرعونیوں کو غرق کر دیا۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر بہت سی نشانیاں ظاہر فرمائیں جن میں نو بڑی بڑی تھیں۔ اللہ نے اس آیت میں انہی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

دس احکام

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک موقع پر یہودیوں نے حضور علیہ السلام سے سوال کیا کہ آپ ہمیں موسیٰ علیہ السلام کی نو واضح نشانیوں کے متعلق بتائیں تو آپ نے اِن نشانیوں کے بجائے دس احکام کا ذکر فرمایا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اِن میں سے نو احکام ہمارے اور بنی اسرائیلیوں کے درمیان مشترک ہیں جب کہ دسواں حکم صرف اُن کے لیے تھا۔ فرمایا دس احکام یہ ہیں۔ (۱) شرک نہ کرو (۲) چوری نہ کرو (۳) زنا نہ کرو (۴) ناحق خون نہ کرو (۵) جادو نہ کرو (۶) سود نہ کھاؤ (۷) بےگناہ کو حاکم سے سزا نہ دلواؤ (۸) پاکدامن عورتوں پر تہمت نہ لگاؤ (۹) جہاد سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو (۱۰) ہفتے کے دن کی تعظیم کرو۔ بنی اسرائیل کو ہفتے کے دن صرف عبادت کرنے کا حکم تھا۔ اس دن تجارت، ملازمت، کھیتی باڑی، محنت مزدوری وغیرہ کرنے کی ممانعت تھی۔ بعض محدثین نے اس حدیث کو مجروح قرار دیا ہے، تاہم صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث قابلِ اعتماد ہے جسے

امام ترمذیؒ اور بعض دوسرے محدثین نے بھی نقل کیا ہے۔

یہاں پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں نے تو نو نشانیوں کے متعلق پوچھا تھا مگر حضور علیہ السلام نے جواب میں دس احکام کا ذکر کیسے فرمایا؟ محدثین فرماتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ جواب علیٰ طریق اسلوب الحکیم تھا یعنی مخاطب کو حکمت کے طریقے پر بات سمجھائی گئی تھی۔ حضور علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ تم نو نشانیوں کو معلوم کر کے کیا کرو گے ان کی بجائے یہ دس احکام سمجھو جن پر عمل کرنا ضروری ہے اور جن کی وجہ سے انسان کو نجات نصیب ہو سکتی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون میں مکالمہ

آگے اللہ نے بنی اسرائیل کو تنبیہ کرنے کے لیے فرمایا ہے فَسْئَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَھُمْ پس آپ پوچھ لیں بنی اسرائیل سے جب کہ موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس آئے فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ تو فرعون نے آپ سے کہا اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا اے موسیٰ علیہ السلام! میں تو تجھے سحر زدہ گمان کرتا ہوں۔ کسی نے تجھ پر جادو کر دیا ہے جو تو ایسی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے سوا کوئی اور خدا بھی ہے جس کی بادشاہی پوری کائنات پر ہے۔ نیز یہ کہ تو خدا کا فرستادہ رسول ہے، قیامت آنے والی ہے اور محاسبہ اعمال کا وقت آئے گا۔ سورۃ الشعراء میں فرعون کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ (آیت - ۲۷) یہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے یہ (معاذ اللہ) دیوانہ ہے۔ ایک جگہ پر مَھِیْنٌ کا لفظ بھی آتا ہے۔ یعنی یہ ایک حقیر آدمی ہے۔ اس کی ساری قوم ہماری غلام ہے، بھلا یہ ہم پر کیسے فوقیت رکھتا ہے۔

فرعون کے اس بہتان کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے نرمی اختیار نہیں کی بلکہ فرعون کو ترکی بہ ترکی جواب دیا قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ

اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فرمایا، اے فرعون!
تو خوب جانتا ہے کہ یہ نشانیاں آسمان و زمین کے پروردگار نے نازل فرمائی
ہیں، اور میرے ہاتھ پر ظاہر کی ہیں۔ یہ ایسی نشانیاں ہیں جو بَصَآئِرَ
بصیرت پیدا کرنے والی ہیں۔ ان نشانیوں کے ذریعے انسانوں کے دلوں میں
روشنی کی کرن پیدا ہوتی ہے اور وہ حق کو سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ نشانیاں دیکھ
کر انسان اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام
نے یہ بھی فرمایا وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا بیشک
میں تو تجھے ہلاکت زدہ خیال کرتا ہوں۔ اگر تو اتنی واضح نشانیاں دیکھ کر بھی
ایمان نہیں لاتا تو ضروری ہے کہ تو عنقریب ہلاک ہونے والا ہے۔

فرعون کا تذبذب

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس وقت فرعون عجیب تذبذب کا
شکار تھا۔ ایک طرف اُسے اپنی سلطنت، فوج، حواریوں اور سرمائے
پر غرور تھا۔ جس کے ذریعے وہ ہر مخالف طاقت کو کچلنے کے لیے تیار
تھا، مگر دوسری طرف وہ بنی اسرائیل کی کثرتِ تعداد سے خائف بھی تھا
حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں آپ کے خاندان کے صرف
بہتر افراد مصر میں آباد ہوئے تھے مگر فرعون کے زمانے تک ان کی
تعداد چھ لاکھ ستر ہزار ہو چکی تھی۔ سورۃ النمل میں موجود ہے "وَجَحَدُوْا
بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا" (آیت ۱۴) فرعونیوں نے
بظاہر تو موسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا مگر ان کے دل تسلیم کر چکے تھے کہ جو کچھ ان
کے ہاتھ پر ظاہر ہو رہا ہے، یہ انسانی کام نہیں ہے۔ سمجھتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام
کی بات سچی ہے مگر ان کا غرور و تکبر تسلیم کرنے سے قاصر تھا۔ اس سے
پہلے کاہن بھی بتا چکے تھے کہ بنی اسرائیل کا ایک بچہ پیدا ہونے والا ہے
جو تیری سلطنت کے خاتمے کا باعث بنے گا۔ چنانچہ اس نے بنی اسرائیل
کے نوے ہزار بچوں کو ذبح بھی کروا دیا مگر اس کے دل میں خوف بدستور

موجود تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اللہ نے اس بچے کی پرورش خود فرعون کے گھر میں ہی کروائی۔ بالآخر اس بچے یعنی موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کا مقابلہ کیا اور وہ مع لشکر سمندر میں غرق ہو گیا۔

فرعونیوں کی غرقابی

بہر حال فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کے خوف سے فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ارادہ کیا کہ بنی اسرائیل کے قدم اپنی سرزمین سے اکھاڑ دے۔ اور انہیں ملک بدر کر دے مگر دوسری طرف وہ یہ بھی دیکھتا تھا کہ بنی اسرائیل کی اتنی بڑی تعداد اُن کی غلام ہے، کھیتی باڑی، تجارت اور محنت مزدوری کرتی ہے وہ کماتے ہیں اور ہم کھاتے ہیں۔ اگر ان کو مصر سے نکال دیا گیا تو ہمارا سارا معاشی نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے فرعون سے کہا کہ ہم تیری طرف رب العالمین کی طرف سے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (الشعراء- ۱۷) بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے تو اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

بہر حال فرعون تذبذب کا شکار تھا۔ فرمایا ابھی اس نے ارادہ کیا کہ بنی اسرائیلیوں کے پاؤں زمین سے اکھیڑ دے فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا پس ہم نے اس کو اور اس کے تمام ساتھیوں کو غرق کر دیا۔ امراء، وزراء، مصاحب حواری وغیرہ سب بحر قلزم میں ڈوب کر ہلاک ہوئے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اللہ نے بنی اسرائیل کے لیے سمندر میں بارہ راستے بنا دیئے تھے جن کے ذریعے انہوں نے سمندر کو پار کر لیا۔ مگر جب انہی راستوں سے فرعونیوں نے گزرنے کی کوشش کی "فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ" (طٰہٰ، ۷۸) پھر پانی نے انہیں اس طرح گھیر لیا کہ کچھ نہ پوچھو حضرت

موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب کرنے والے تمام فرعونی پانی کی لہروں کی نذر ہو گئے اور ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔

حشر میں اجتماع

جب فرعون مع اپنے لشکروں کے ہلاک ہو گیا وَقُلْنَا مِنْ بَعْدِهٖ لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ تو اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا اُسْكُنُوا الْاَرْضَ تم سب زمین میں رہو۔ اس سے مراد سرزمین شام و فلسطین ہے مصر سے نکل کر اور بحرِ قلزم کو عبور کر کے بنی اسرائیل صحرائے سینا میں پہنچ چکے تھے، اس لیے واپس مصر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر یہ لوگ چالیس سال تک میدانِ تیہ میں سرگرداں پھرتے رہے۔ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام یہیں فوت ہو گئے۔ یہاں رہتے ہوئے بنی اسرائیل کو ستر سال گزر گئے اور ان کی پرانی نسل ختم ہو گئی۔ پھر نئی نسل نے موسیٰ علیہ السلام کے جانشین حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں سرزمین شام و فلسطین کو فتح کیا اور اس میں آباد ہو گئے۔

فرمایا، تم یہیں آباد رہو فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا پھر جب آخرت کا وعدہ آ پہنچے گا تو ہم تم سب کو لپیٹ کر لے آئیں گے یعنی میدانِ حشر میں سب کو اکٹھا کر لیں گے۔ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح قومِ فرعون نے ضد اور تعصب کی بنا پر موسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا اور پھر ہلاک ہوئے، اسی طرح اگر قریش مکہ بھی اپنی ضد پر ہی اڑے رہے حضور خاتم النبیین کی نبوت و رسالت اور اللہ کی وحدانیت پر ایمان نہ لائے بلکہ بنی اسرائیل کی طرح نشانیاں ہی طلب کرتے رہے تو ان کا حشر بھی ان سے مختلف نہیں ہوگا۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۱۰۵﴾ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۩ ﴿۱۰۹﴾

(وقف لازم) (السجدۃ)

ترجمہ:۔ اور سچائی کے ساتھ ہم نے اس (قرآن) کو اتارا ہے اور سچائی کے ساتھ ہی یہ نازل ہوا ہے۔ اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو (رسولِ مبارک) مگر خوشخبری دینے والا اور ڈر سنانے والا (۱۰۵) اور ہم نے اس قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تاکہ پڑھیں آپ اس کو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر۔ اور اتارا ہے ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اتارنا (۱۰۶) (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے (اے لوگو!) ایمان لاؤ اس کے ساتھ یا نہ ایمان لاؤ، بیشک وہ لوگ جن کو دیا گیا ہے علم اس سے پہلے، جب پڑھا جاتا ہے ان کے پاس قرآن تو گر پڑتے ہیں وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں (۱۰۷)

اور وہ کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، بیشک وعدہ ہمارے رب کا البتہ پورا ہو کر رہے گا (۱۰۸) اور گرتے ہیں وہ ٹھوڑیوں کے بل، وہ روتے ہیں، اور زیادہ ہوتی ہے ان میں عاجزی (۱۰۹)

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی ہٹ دھرمی کا ذکر کیا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا تذکرہ فرمایا جس طرح فرعون کی قوم موسیٰ علیہ السلام سے نشانیاں طلب کرتی تھی، اسی طرح مشرکین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اپنی من مانی نشانیاں طلب کرتے تھے۔ دونوں الزام محض ضد اور عناد کی بنا پر انبیاء علیہ السلام کی مخالفت کرتی تھیں، ورنہ حقیقت میں وہ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے تھے۔ فرعون نے بنی اسرائیل کے زمین سے قدم اکھاڑ کر انہیں ذلیل کرنا چاہا، مگر اللہ نے اُس کو مع اس کے لاؤ لشکر کے غرق کر دیا۔ پھر بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ تم اس زمین میں رہو، یہاں تک کہ جب قیامت کے وعدے کا وقت آجائے گا تو اللہ تعالیٰ تم سب کو سمیٹ کر میدانِ حشر میں اکٹھا کرے گا۔ یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مشرکین مکہ کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اگر فرعونیوں کی طرح وہ بھی ضد اور عناد کا مظاہرہ کریں گے، بیہودہ فرمائشیں کریں گے تو ان کا حشر بھی فرعون اور اس کی قوم سے مختلف نہ ہوگا۔

اب آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ مکی سورتوں کا یہ خاصہ ہے کہ ان میں بالعموم توحید کا اثبات اور شرک کی تردید بیان کی گئی ہے۔ رسالت و نبوت کا ذکر ہے۔ قیامت اور محاسبہ اعمال کا بیان ہے اور قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت کو مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ مشرکین مکہ قرآن پاک کے منجانب اللہ ہونے پر شک کرتے تھے۔ اس لیے اللہ نے اس شک کو رفع کیا ہے اور ساتھ تھوڑا سا رسالت کا بیان بھی کیا ہے۔ اس کے بعد آخری دو آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی توحید کا ذکر ہے۔

ارشاد ہوتا ہے وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ اور ہم نے اس قرآن پاک کو حق و صداقت

کے ساتھ نازل فرمایا ہے وَبِالْحَقِّ نَزَلَ اور حق و صداقت کے ساتھ ہی یہ نازل ہوا ہے۔ حق کے ساتھ نازل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ کلام قطعاً زندہ ہے۔ اس کو نازل کرنے والی اللہ تعالیٰ کی ذات بھی برحق ہے اور اس طرح یہ کلام بھی برحق ہے، اور دوسری بات یہ کہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نزول میں کسی قسم کا تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا۔ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی منشاء کے عین مطابق اسے اتارا ہے۔ اور راستے میں اس کی حفاظت کا انتظام بھی فرمایا ہے۔ بعض دوسری سورتوں میں آتا ہے کہ جب وحی الٰہی نازل ہوتی ہے۔ تو عالم بالا سے لے کر نبی کے قلب مبارک تک فرشتوں کی قطاریں لگ جاتی ہیں تاکہ اس میں شیطان کسی قسم کی دخل اندازی نہ کر سکے۔ پھر اللہ نے اس قرآن کو اپنے پیغمبر کے قلب سے لے کر آپ کی زبان پر جاری کیا اور پھر آپ کے صحابہؓ نے اس کو بالکل اسی طرح سنا جس طرح خود آپ نے سنا تھا، اور اسی طرح سمجھا جس طرح آپ نے سمجھا تھا۔ غرضیکہ اللہ نے قرآن پاک کے نزول کے بعد اس کو ہر قسم کے تغیر و تبدل سے بھی محفوظ فرمایا ہے

حفاظت قرآن کی گارنٹی

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی حفاظت کی ذمہ داری خود اٹھائی ہے۔ فرمایا اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر-۹) اس قرآن کو ہم نے ہی نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اللہ نے دوسری کتب سماویہ کی حفاظت کا ذمہ خود نہیں لیا تھا۔ بلکہ یہ ذمہ داری خود اہل کتاب پر ڈالی گئی تھی مثلاً تورات کے متعلق سورۃ مائدہ میں موجود ہے کہ ہم نے تورات کو نازل فرمایا جس میں ہدایت اور نور ہے۔ اللہ کے نبی اور درویش لوگ اور عالم اسی کے مطابق فیصلہ کرتے تھے بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ اس وجہ سے کہ انہیں اللہ کی کتاب پر نگران بنایا گیا تھا۔ مگر تورات، انجیل اور دیگر صحائف کے حاملین اپنی کتابوں کی حفاظت نہ کر سکے اور ان

ہیں ہزاروں تغیر و تبدل واقع ہوئے۔ بہت سی صحیح باتوں کو غلط رنگ
میں پیش کیا گیا اور بہت سی نئی اور غلط باتیں اِن میں داخل ہو گئیں حتیٰ
کہ اب اِن کتابوں کا اصلی شکل میں وجود تک باقی نہیں رہا۔ صرف انجیل ہی
کو دیکھ لیں۔ ایک کی بجائے ایک سو بیس (۱۲۰) انجیلیں بنیں اور پانچ تو اب
بھی موجود ہیں۔ جن میں چار بائبل کا حصہ ہیں اور پانچویں برنباس علیحدہ ہے۔
اسی طرح بائبل کے پہلے پانچ ابواب تورات کا حصہ ہیں۔ اس میں بھی
ہزاروں تغیر واقع ہو چکے ہیں اور اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں کہ یہ بعینہٖ
اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں۔ برخلاف اس کے اللہ کی آخری
کتاب قرآنِ کریم کا نزول سخت حفاظتی انتظامات میں ہوا۔ اور پھر
خدا تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لے رکھا ہے
مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ نے آپ پر ایسی کتاب نازل
فرمائی ہے یَقْرَءُہٗ نَائِمًا وَّیَقْظَانَ کہ آپ اس کو حالت نیند
میں بھی پڑھتے تھے اور حالتِ بیداری میں بھی۔ حضور علیہ السلام کو یہ خاص
شرف حاصل تھا کہ سوتے ہوئے بھی آپ کی زبان پر قرآن کے الفاظ
جاری رہتے تھے۔ پھر آپ کی برکت سے آپ کے بعض امتی بھی بحالت
نیند قرآن کی تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ سورۃ العنکبوت میں ہے کہ بَلْ
هُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ
یہ ایسی آیتیں ہیں جنہیں اللہ نے اہل علم کے سینوں میں محفوظ کر دیا ہے
آج دنیا میں ایک کروڑ کی تعداد میں حفاظ موجود ہیں جنہیں کتاب الٰہی
حرف بحرف زبانی یاد ہے۔ یہی اس قرآن کی حفاظت کی دلیل ہے خدانخواستہ
اگر اس کے تمام نسخوں کو آگ میں جلا دیا جائے یا سمندر میں پھینک دیا جائے
تو پھر بھی یہ کتاب ختم نہیں ہو گی بلکہ حفاظ کی مدد سے حرفاً بحرفاً دوبارہ تیار
ہو جائے گی۔ اسی لیے یہ بات بالکل برحق ہے کہ اس کتاب کو نہ آگ

جلا سکتی ہے اور نہ اسے پانی دھو سکتا ہے۔ "تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ" (السجدہ - ۲) یہ رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ایسی کتاب ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو مادی اور روحانی طور پر تکمیل انسانیت کا ذریعہ بنایا ہے انسان کو مادی اور روحانی طور پر کامل بنانے کے لیے صرف قرآن ہی کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص درجہ کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ قرآن کے علاوہ ہر ذریعہ غلط اور بے بنیاد رہوگا۔

قرآن کریم کی صداقت بیان کرنے کے بعد اللہ نے نبوت و رسالت کا تذکرہ فرمایا ہے "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا" اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔ آپ ایمان اور نیکی کا راستہ اختیار کرنے والوں کو اللہ کی رحمت کے مقام کی خوشخبری سناتے ہیں اور کفر، شرک اور معصیت کا راستہ اپنانے والوں کو سخت عذاب سے ڈراتے ہیں۔ اللہ نے خود حضور علیہ السلام کی زبان سے کہلوایا "وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ" (الاحقاف - ۹) میں تمہیں واضح طور پر آگاہ کرنے والا ہوں کہ اگر غلط راستے کو نہیں چھوڑو گے تو آگے مصیبت آنے والی ہے۔ تبشیر اور انذار قرآن کے دو بڑے مقاصد ہیں تاکہ نیکی کرنے والوں کی حوصلہ افزائی ہو اور برائی کرنے والوں کو خبردار کر دیا جائے۔ یہ فریضہ صرف خاتم النبیین علیہ السلام ہی کے ذمہ نہیں تھا بلکہ تمام انبیاء و رسل کے متعلق فرمایا "رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ" (النساء - ۱۶۵) کہ وہ مبشر اور منذر ہوتے ہیں تاکہ اللہ کی طرف سے حجت تمام ہو جائے اور کوئی یہ نہ کہے گا کہ ہمارے پاس کوئی بشیر اور منذر نہیں آیا۔

قرآن پاک کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اللہ نے اسے یکبارگی نازل نہیں فرمایا بلکہ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ ہم نے قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے بتدریج نازل کیا ہے تاکہ آپ اسے لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ اور یہ اس لیے لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (الفرقان ۳۲) تاکہ اس کے ذریعے آپ کے دل کو ثابت اور مضبوط رکھیں، اور اسی واسطے ہم اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے پڑھتے رہے ہیں۔ اللہ نے خود حضور علیہ السلام کو بھی یہی حکم دیا وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (المزمل ۔ ۴) اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔ وَنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا ہے حضرت شاہ عبدالقادرؒ اس کا ترجمہ کرتے ہیں "اتارتے اتارتے اتارا ہے" چونکہ اس قرآن کے ذریعے تمام دنیا کے انسانوں کی ہدایت مطلوب تھی اس لیے اللہ نے اس کے اولین مخاطبین کو قرآن خوب پڑھایا۔ نزول قرآن کے تیئس ۲۳ سالہ عرصہ میں اللہ کے نبی نے قرآن کو خوب پڑھایا اور صحابہؓ نے اسے مکمل طور پر محفوظ کر لیا۔ اس کو آہستہ آہستہ بتدریج اتارنے کی یہی حکمت ہے۔

اسماء الرجال والے لکھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے دس ہزار صحابہؓ حافظ قرآن تھے۔ جب مسیلمہ کذاب نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تو اس کے خلاف جہاد کرنا پڑا جس میں گیارہ یا بارہ سو حفاظ شہید ہو گئے۔ آج مرزائیت کا فتنہ بھی مسیلمہ کذاب سے کم نہیں۔ لوگ اسے معمولی سمجھتے ہیں مگر یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ مرزائی کلیدی عہدوں پر فائز ہیں اور یہ اندر اندر سازشوں کے ذریعے ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے پر لگے ہوئے ہیں یہ فتنہ اب سے کم و بیش اسی سال قبل انگریز نے پیدا کیا تھا اور اس کا علاج وہی ہے جو حضرت صدیق اکبرؓ نے مرتدوں کے خلاف کیا تھا۔

طبری کی روایت کے مطابق مسیلمہ کذاب کی لڑائی میں ستائیس ہزار آدمی مارے گئے
ایک روایت میں چالیس ہزار کا ذکر بھی آتا ہے ۔ جب جا کر وہ فتنہ ختم ہوا۔

فرمایا ہم نے قرآن پاک کو آہستہ آہستہ نازل کیا تاکہ یہ اچھی طرح ضبط
ہو جائے اور اس کو سیکھنے والے آگے باقی دنیا کے لوگوں کو بھی پڑھا سکیں
بہرحال دین کی اصل بنیاد قرآن پاک ہے اور حدیث رسول اس کی شرح ہے

سجدہ تلاوت

فرمایا قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا اے پیغمبر! آپ کہہ
دیجئے اے لوگو! تم اس کتاب الٰہی پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ ، حقیقت یہی
ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ کہ جن لوگوں
کو اس سے پہلے علم دیا گیا اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ جب ان کے پاس
یہ قرآن پڑھا جاتا ہے یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا تو وہ فوراً
ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں ۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ پروردگار
عالم کی طرف سے کلام برحق ہے ۔ اہل کتاب میں سے جو منصف مزاج
آدمی ہیں وہ اس حقیقت کو سمجھتے ہیں اور یہ آیتیں سن کر وہ بھی سجدہ ریز
ہو جاتے ہیں ۔ اس سے قرآن پاک کی وہ آیات مراد ہیں جن کی تلاوت و
سماعت پر سجدہ واجب ہو جاتا ہے ۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ سجدہ
واجب ہے جب کہ بعض دیگر آئمہ اسے سنت مؤکدہ کہتے ہیں ۔

تکمیل بشارت کا وعدہ

فرمایا وَیَقُوْلُوْنَ اور ایسے منصف مزاج لوگ یوں کہتے ہیں سُبْحٰنَ
رَبِّنَآ اِنْ کَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا پاک ہے ہمارا پروردگار
بیشک ہمارے رب کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا ۔ یہ وعدہ اللہ نے تورات
میں کیا تھا کہ " اے موسیٰ " میں تیرے بھائی بندوں میں سے تیرے جیسا
ایک رسول برپا کروں گا اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا " بھائی بندوں
سے مراد بنی اسماعیل ، کلام سے مراد قرآن حکیم اور رسول سے مراد حضور خاتم النبیین
صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ۔ چنانچہ اللہ نے اس عظیم المرتبت ہستی کو دنیا میں مبعوث

فرمایا اور اس پہ اپنا کلام یعنی قرآن پاک نازل فرمایا۔
پھر انہی اہل علم کے متعلق فرمایا وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ اور گر پڑتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے۔ وہ خدا تعالیٰ کی عظمت و جلال کے پیش نظر عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔ پہلے فرمایا سجدہ کرتے ہوئے گر پڑتے ہیں اور دوسری مرتبہ فرمایا کہ روتے ہوئے گر پڑتے ہیں۔ دونوں سے مراد خدا تعالیٰ کے سامنے عاجزی اور انکساری کا اظہار ہی ہے۔

خشیت الٰہی کا صلہ

ابن ماجہ شریف میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ جو شخص خوف خدا سے روتا ہے، اس پہ خشیت طاری ہو جاتی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلتے ہیں وَإِنْ كَانَ مِثْلَ رَأْسِ الذُّبَابِ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ اور یہ آنسو اگرچہ مکھی کے سر کے برابر ہی ہو، تو اللہ اس کے چہرے پہ دوزخ کی آگ حرام کر دے گا۔ ترمذی شریف وغیرہ میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت بھی موجود ہے کہ وہ آدمی ہرگز دوزخ میں نہیں جائے گا مَنْ بَكَى مِنْ خَشْيَةِ اللهِ جو اللہ کے خوف سے رو پڑا۔ فرمایا کہ یہ شخص دوزخ میں نہیں جائے گا۔ یہاں تک کہ جانور کے تھنوں سے نکلا ہوا دودھ تھنوں میں واپس چلا جائے۔ اور جس اللہ کے بندے کے جسم پہ اس کے راستے میں نکلے ہوئے گرد و غبار پڑ گیا۔ اس جسم پر دوزخ کی آگ اور دھواں حرام ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ دو قسم کی آنکھیں ایسی ہیں جنہیں دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی، ایک وہ آنکھ جو خشیت الٰہی سے روتی ہے اور دوسری وہ جو اللہ کے راستہ میں پہرہ دیتی ہے۔ ایک دوسری روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ جو آنکھ اللہ کی حرام کردہ چیزوں پہ نہیں پڑتی، اس

آنکھ پر بھی دوزخ کی آگ حرام ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے وقت رونا مستحب ہے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ نماز کے دوران قرآن پڑھتے ہوئے حضور علیہ السلام کی ہچکی بندھ جاتی۔ آپ خدا تعالیٰ کی عظمت و جلال کی وجہ سے اتنا روتے تھے کہ آپ کے سینہ مبارک سے جوش نکلتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن شدادؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ صبح کی نماز پڑھا رہے تھے اور آپ کی زبان پر یہ آیت تھی "قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ" (یوسف - ۸۶) اگرچہ میں پچھلی صف میں تھا مگر قرآن پڑھتے وقت آپکی ہچکیوں کی آواز سن رہا تھا۔

فرمایا ایسے لوگ قرآن پاک کی آیات کو سن کر روتے ہیں وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۩ السجدۃ اور ان کی عاجزی میں اضافہ ہوجاتا ہے یہی صفت اللہ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی بھی بیان فرمائی ہے کہ خدا کے سامنے عاجزی کے ساتھ سجدہ ریز ہوتے ہیں اور اس کی عظمت و جلال کے پیش نظر روتے ہیں۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾ ع

ترجمہ: (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے: پکارو اللہ کو یا پکارو رحمان کو، جس نام سے بھی تم پکارو گے، پس اس کے سب نام اچھے ہیں۔ اور نہ بلند کریں آپ اپنی نماز کے ساتھ آواز، اور نہ بہت پوشیدہ کریں۔ اور تلاش کریں اس کے درمیان راستہ ﴿۱۱۰﴾ اور آپ کہہ دیں سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے نہیں بنائی اولاد، اور نہیں اس کے لیے کوئی شریک بادشاہی میں، اور نہیں اس کے لیے کوئی مددگار کمزوری میں، اور بڑائی بیان کریں اس کی بڑائی بیان کرنا ﴿۱۱۱﴾

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں قرآنِ کریم کی حقانیت اور صداقت کا بیان تھا۔ اس کے منجانب اللہ بتدریج نزول کا ذکر تھا، یہ بھی عرض کیا تھا کہ قرآن کریم ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعے روحانی اور مادی دونوں طریقوں سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اللہ نے فرمایا، لوگو! تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، جو منصف مزاج لوگ ہیں، وہ قرآن کی آیات سن کر سجدہ ریز

ہو جاتے ہیں اور اللہ کے سامنے خشوع و خضوع کا اظہار کرتے ہیں۔ اس طرح گویا اللہ نے ایک طرف مشرکین کو اُن کے انکار پر تنبیہ فرمائی اور دوسری طرف منصف مزاج اہل کتاب کی تعریف بھی فرمائی

مشرکین کی رحمان سے عداوت

سورۃ کی ان آخری آیات میں اللہ نے مشرکین کے ایک بیہودہ اعتراض کا جواب دیا ہے۔ جب وہ حضور علیہ السلام کی زبان سے خدا تعالیٰ کی صفت رحمان کا ذکر سنتے تھے تو بہت بدکتے تھے۔ سورۃ الفرقان میں یہ ذکر بھی موجود ہے وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْجُدُوا لِلرَّحْمَٰنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمَٰنُ (آیت - ۶۰) جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ رحمان کو سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ رحمان کیا ہے اُن کے نزدیک رحمان یمامہ کا رہنے والا مسیلمہ کذّاب تھا۔ پھر بعض بدمزاج لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ دیکھو! محمد ہمیں توحید کی دعوت دیتے ہیں یعنی خدا صرف ایک ہے مگر خود اللہ کے ساتھ رحمان کو بھی پکارتے ہیں یہ کتنی عجیب بات ہے۔ اللہ نے مشرکین کے اس اعتراض کا جواب اس طرح دیا ہے قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کو پکارو یا رحمان کو أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ جس لفظ کے ساتھ بھی تم پکارو گے، پس اُس کے بھلے نام ہیں اللہ تعالیٰ اس کا ذاتی نام ہے اور رحمان اُس کی صفت ہے۔ رحمان سے کوئی دوسری ذات مراد نہیں بلکہ فقط اللہ کی ذات ہی مراد ہے۔ اللہ کے بہت سے صفاتی نام ہیں جیسے صحیح حدیث میں حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے إِنَّ لِلَّهِ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ اسْمًا مِائَةً إِلَّا وَاحِدًا مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ (بخاری، مسلم) بیشک اللہ تعالیٰ کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں، جس نے ان کو یاد کیا اور ان کا ورد کرتا رہا، ان پر یقین رکھا، وہ یقیناً جنت میں داخل ہو گا۔ رحمان، رحیم ستار، غفار، جبار، قہار وغیرہ سب اس کے صفاتی نام ہیں، وہ ذات

وحدہٗ لاشریک ہے اُسے جس نام سے چاہو پکارو۔ یہ چیز توحید کے ہرگز منافی نہیں۔ البتہ بعض مشرک لوگ ایک کی بجائے کئی خداؤں کو مانتے ہیں۔ مجوسی یزدان اور اہرمن دو خداؤں کے قائل ہیں جب کہ نصاریٰ، باپ، بیٹا اور روح القدس کہہ کر تثلیث میں پھنس گئے ہیں۔

تلاوت قرآن میں میانہ روی

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حضور علیہ السلام نماز میں بلند آواز سے قرآن پڑھتے تھے تو مشرک لوگ سخت مزاحم ہوتے تھے۔ قرآن سن کر مشتعل ہو جاتے اور بعض اوقات مسلمانوں پر حملہ کرنے سے بھی نہ چوکتے۔ وہ بدنصیب خود قرآن، اس کے لانے والے جبرائیل علیہ السلام اور جس پر نازل ہوا ہے یعنی محمد، سب کو گالیاں دیتے۔ مکی زندگی کے دوران لوگ بیت اللہ کے پاس سر عام نماز نہیں پڑھ سکتے تھے بلکہ زید بن ارقمؓ کے مکان میں یا کسی پہاڑی درے میں چھپ کر نماز ادا کرتے۔ اس صورتحال میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو یہ آیت نازل فرمائی وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ اور آپ اپنی نماز زیادہ بلند آواز سے نہ پڑھیں وَلَا تُخَافِتْ بِهَا اور نہ بہت پوشیدہ آواز کے ساتھ نماز ادا کریں۔ مطلب یہ تھا کہ آپ اپنی آواز اتنی بلند نہ کریں جو مشرکوں تک پہنچ جائے اور وہ آپ کو نقصان پہنچائیں۔ اور نہ ہی آواز کو اتنا پست رکھیں کہ آپ کے اپنے ساتھی نمازی بھی نہ سن سکیں۔ فرمایا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ اور ان دونوں انتہاؤں کے درمیان درمیانہ طریقہ اختیار کریں۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا اطلاق دعا پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ سورۃ اعراف میں ہے اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (آیت ۵۵) اے لوگو! اپنے رب سے عاجزی اور چپکے چپکے دعائیں مانگا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ چلا کر دعا نہیں

کرنی چاہیئے بلکہ آہستہ ہی زیادہ بہتر ہے۔ بہرحال اس آیت کریمہ میں اللہ نے دو باتوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کو جس نام سے چاہو پکارو اس کے سارے کے سارے نام اچھے ہیں اور دوسری یہ کہ تلاوت قرآن یا دعا کے دوران آواز میں میانہ روی اختیار کریں، نہ بہت بلند ہو اور نہ بہت پست۔

حمد باری تعالیٰ

اب آخری آیت میں اللہ نے حمد و ثناء بیان کرنے کا حکم دیا ہے وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ اور اے پیغمبر! آپ کہہ دیں، سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وہ اللہ جس نے کوئی اولاد نہیں بنائی۔ یہ مشرکین، یہود اور نصاریٰ کا رد ہو گیا جو اللہ کے لیے اولاد تجویز کرتے ہیں۔ یہود نے عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کا بیٹا بنا۔ سورۃ التوبہ میں صاف موجود ہے وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ (آیت - ۳۰) اور مشرکین کا حال تو یہ تھا کہ وہ اپنے لیے بیٹے اور خدا کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے تھے۔ اس بات کا ذکر اسی سورۃ میں پہلے ہو چکا ہے اَفَاَصْفٰکُمْ رَبُّکُمْ بِالْبَنِیْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ اِنَاثًا (آیت - ۴۰) کیا تمہارے پروردگار نے تمہیں بیٹے دیے اور خود فرشتوں کو بیٹیاں بنا لیا، یہ تو بڑی ہی نامعقول بات ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حمد ہمیشہ حصول نعمت پر ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں جہاں جہاں حمد کا ذکر ہے اس کے ساتھ یا تو نزول قرآن کا ذکر کیا گیا یا ارض و سما کی پیدائش کا، یا کسی دوسری نعمت کا۔ مثلاً سورۃ کہف کی ابتداء ہی اس طرح ہوتی ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتٰبَ "سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے عظیم الشان کتاب نازل فرمائی۔ سورۃ الانعام کی ابتداء بھی اس طرح ہوتی ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور

سب تعریفیں اُسی کے لیے ہیں جس نے ارض و سما کو پیدا کیا ۔ اسی طرح حضرت
ابراہیم علیہ السلام کو اولاد کی نعمت ملی تو انہوں نے کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ
وَهَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ (ابراہیم ۱
سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل
اور اسحاق جیسے فرزند عطا کیے ۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے الحمد للہ کے بعد تین چیزوں کا ذکر فرمایا
ہے کہ اُس کی کوئی اولاد نہیں ، بادشاہی میں اس کا کوئی شریک نہیں اور
کمزوری میں کوئی مددگار نہیں ۔ تو یہ چیزیں تو بظاہر نعمت کی تعریف میں نہیں
آتیں مگر اللہ نے ابتداء میں یہاں بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ہی فرمایا ہے ۔
اس ضمن میں امام محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر الرازیؒ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ
کی اولاد نہ ہونا بھی دراصل نعمت ہی کا اظہار ہے ۔ یہ ایک عام دستور
ہے کہ ہر صاحب اولاد شخص ضروریات زندگی میں اپنی اولاد کو مقدم رکھتا ہے ،
اگر اللہ تعالیٰ کی اولاد ہوتی تو وہ بھی تقسیم انعامات کرتے وقت پہلے اولاد
کو دیتا اور پھر دوسروں کو ۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی اولاد نہیں ہے ۔ اس لیے
اس کے انعامات سب کے لیے عام ہیں ۔ اور یہ چیز بجائے خود ایک
انعام ہے ۔ پھر یہ ہے کہ اُس کا شریک بھی کوئی نہیں ۔ اگر کوئی شریک
ہوتا تو وہ تقسیم انعامات میں مزاحم ہو سکتا تھا ۔ اللہ تعالیٰ العیاذ باللہ کسی
کمزوری میں بھی مبتلا نہیں ہوتے کہ اسے کسی دوسری ذات کی مدد کی ضرورت ہو ۔
اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنے مددگار کا زیادہ خیال رکھتا ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان تمام
چیزوں سے پاک ہے ، لہٰذا یہ بنی نوع انسان پر بہت بڑے انعام ہیں اور
اسی واسطے اللہ نے آیت کی ابتدا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے کی ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی بے نیازی

فرمایا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اَلَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ
وَلَدًا جس نے اولاد نہیں بنائی ۔ اللہ تعالیٰ صمد اور غنی ہے ، لہٰذا نہ اُسکی

کوئی حقیقی اولاد ہے اور نہ کوئی بناوٹی۔ نصاریٰ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کو مقرب ہونے کی وجہ سے بیٹا بنا لیا ہے۔ حالانکہ یہ چیز اس کی صمدیت اور استغناء کے خلاف ہے۔ اسے نہ تو بقائے نسل کے لیے اولاد کی ضرورت ہے اور نہ خدمت کے لیے۔ اسی لیے فرمایا کہ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے کوئی اولاد نہیں بنائی، وَلَمْ يَكُن لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ اور بادشاہی میں اس کا شریک بھی کوئی نہیں۔ وہ ہر قسم کے شرک سے پاک ہے وَلَمْ يَكُن لَّهُ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ اور کمزوری یا ناچیزی میں اس کا مددگار بھی کوئی نہیں۔ درحقیقت اس میں کمزوری آتی ہی نہیں لہٰذا مددگار کی بھی ضرورت نہیں۔ شاہ عبدالقادرؒ اس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں۔ "اس کا کوئی مددگار نہیں ذلّت کے وقت" دنیا کے بادشاہ تو بعض اوقات اپنے امراء سے بھی خائف ہوتے ہیں۔ انہیں برے وقت میں ان کی رفاقت مطلوب ہوتی ہے۔ اگر کوئی امیر طاقت پکڑ جائے تو بادشاہ کے مغلوب ہونے کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں تو ایسی کوئی بات ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کمزوری کا تصور ہی نہیں ہے، لہٰذا اُسے کسی مددگار کی ضرورت بھی نہیں ہے

فضائل سورۃ

سورۃ کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تنزیہہ سے ہوئی تھی۔ "سُبْحٰنَ الَّذِي أَسْرٰى بِعَبْدِهٖ" پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات اپنے بندے کو ایک عظیم الشان سفر پر لے گیا اور اُسے اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دکھلائیں۔ یہ بڑی اہم سورۃ مبارکہ ہے جس میں اسلامی ریاست کے منشور کے پندرہ اصول بیان کیے گئے ہیں، عقیدے سے متعلق بڑے بڑے اہم مسائل بیان کیے گئے ہیں اور ضمنی طور پر بھی بہت سی باتیں بیان ہوئی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ سورۃ بنی اسرائیل، کہف اور مریم میرا پرانا اور قیمتی مال ہے۔ جب سے یہ سورتیں نازل ہوئی ہیں، میں ان کو پڑھتا رہتا ہوں۔ حضور علیہ السلام خود بھی رات کو

سونے سے پہلے سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ ملک، سورۃ دخان، اور سورۃ سجدہ کی تلاوت فرماتے تھے۔ یہ ورد کتنی ہے تاکہ مسلمان اپنے ریاستی نظام کو پیش نظر رکھیں۔ اس میں توحید کا ذکر ہے، شرک کا رد ہے۔ قیامت اور محاسبہ اعمال کی بات ہے۔ نبوت کے متعلق بنیادی حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت کو کمال طریقے سے اللہ نے بیان کیا ہے۔ نبی کی عظمت کا ذکر بھی ہے کہ اللہ نے اُسے معراج کی صورت میں اعزاز بخشا۔ اس کے علاوہ موسیٰ علیہ السلام، داؤد علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کی شکر گزاری کا خاص طور پر ذکر ہے۔

افضل اذکار

سورۃ کی ابتدا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سے اور اختتام الحمد للہ پر ہوا۔ یہ تنزیہہ کے کلمات ہیں جنہیں دہراتے رہنا چاہیئے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے اَفْضَلُ الدُّعَآءِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ یعنی سب سے افضل دعا الحمد کہنا ہے۔ اس پر اللہ اتنا زیادہ دے دیتا ہے کہ اتنا مانگنے والوں کو بھی نہیں دیتا۔ حضور کا یہ فرمان بھی ہے اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سب سے افضل ذکر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار ہے۔ صحیح روایت میں حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد مبارک بھی ہے اَفْضَلُ الْکَلَامِ اَرْبَعٌ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ یہ چار افضل کلمات ہیں ان میں سے جس کو چاہو پہلے کہو اور جس کو چاہو بعد میں۔ دوسری روایت میں آتا ہے کہ اللہ نے اپنے فرشتوں کے لیے بھی یہی کلام منتخب فرمایا ہے۔ وہ بھی انہی کلمات سے اللہ کی عظمت بیان کرتے ہیں۔

بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ جو شخص سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ کا سو مرتبہ ورد کرتا ہے، اگر اس کی خطائیں سمندر کے جھاگ کے برابر بھی ہوں گی تو اللہ تعالیٰ انہیں دھو ڈالے گا۔ ایک حدیث میں یہ

بھی آتا ہے کہ خاندان بنی عبد المطلب کا چھوٹا بچہ جب بولنے پر قادر ہوتا تو حضور علیہ السلام اُس کو یہ کلمات سکھاتے جو اس آخری آیت میں وارد ہوئے ہیں یعنی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ...... وَکَبِّرْہُ تَکْبِیْرًا ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور علیہ السلام کا گذر ایک ایسے شخص پر ہوا جو یہ دعا کر رہا تھا۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِاَنِّیْ اَشْھَدُ اِنَّکَ اَنْتَ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ اے اللہ! میں سوال کرتا ہوں تجھ سے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو وہ اللہ ہے کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو اکیلا ہے اور بے نیاز ہے۔ نہ اُس کی اولاد ہے اور نہ وہ مولود ہے اور نہ ہی اس کی برابری کا کوئی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ اس شخص نے اللہ کے ایسے اسمائے پاک کے ساتھ دعا مانگی ہے کہ اللہ اس کو ضرور پورا کرے گا۔

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ ان کلمات کو دہرانے میں کسی مسلمان کا حصہ سو مرتبہ سے کم نہیں ہونا چاہیئے۔ دن بھر میں کم از کم سو مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰہِ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہنا چاہیئے۔ چنانچہ مشائخ چشت بیعت کرتے وقت انہی کلمات کی تلقین کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ سو مرتبہ درود شریف اور سو مرتبہ استغفار پڑھنے کی بھی ترغیب دیتے ہیں۔ سورۃ کے آخر میں فرمایا وَکَبِّرْہُ تَکْبِیْرًا اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کریں جس کے لیے بعض کلمات ذکر کر دیئے گئے ہیں۔

سورة الكهف
مكية

سُوْرَةُ الْكَهْفِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّعَشْرُ اٰيَةً وَّفِيْهَا اِثْنَا عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۃ کہف مکی ہے اور یہ ایک سو دس آیات اور اس میں بارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۞ۜ (۱) قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا (۲) مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا (۳)

ترجمہ:۔ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، وہ جس نے اتاری ہے اپنے بندے پر کتاب، اور نہیں رکھی اس (کتاب) میں کوئی کجی (۱) وہ مستقیم ہے تاکہ ڈرائے سخت گرفت سے جو اس (خدا تعالیٰ) کی طرف سے ہے، اور خوشخبری دے ایمان والوں کو جو اچھے اعمال انجام دیتے ہیں کہ اُن کے لیے بدلہ ہے اچھا (۲) رہنے والے ہوں گے اس کے اندر ہمیشہ (۳)

اس سورۃ مبارکہ میں اصحاب کہف والرقیم کا واقعہ بیان ہوا ہے، اس لیے اس سورۃ کا نام ہی سورۃ الکہف ہے۔ اس سورۃ کا زمانہ نزول بھی قریب قریب وہی ہے

جو سورۃ بنی اسرائیل کا ہے۔ گویا یہ سورۃ بھی مکی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی۔ اس سورۃ مبارکہ کی ایک سو دس آیات اور بارہ رکوع ہیں۔ یہ سورۃ ۱۵۶۷ کلمات اور ۶۳۶۰ حروف پر مشتمل ہے۔

یہ سورۃ مبارکہ گذشتہ سورۃ بنی اسرائیل کے ساتھ مربوط ہے۔ گذشتہ سورۃ کی آیت روح کے متعلق مفسرین کرام کا یہ بیان نقل کیا جا چکا ہے کہ مشرکین مکہ نے یہودیوں کے ایما پر حضور علیہ السلام سے تین سوال کیے تھے، جن میں سے ایک روح، دوسرا اصحاب کہف اور تیسرا ذوالقرنین کے متعلق تھا۔ یہود و مشرکین کا خیال تھا کہ آپ علیہ السلام ان سوالات کا جواب نہیں دے سکیں گے تو ان کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کے لیے موقع میسر آجائے گا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان تینوں سوالوں کے جواب دے کر مخالفین کے منہ بند کر دیے۔

گذشتہ سورۃ کی ابتدا میں واقعہ معراج کا ذکر ہے جب کہ آگے چل کر روح کا بیان ہے۔ ان دونوں واقعات کو بھی آپس میں مناسبت ہے اس لیے انہیں ایک سورۃ میں بیان کیا گیا ہے۔ جس طرح واقعہ معراج انسانی فہم و عقل سے بالاتر ہے، اسی طرح روح کی حقیقت کو بھی انسانی عقل سے دریافت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ان دونوں میں مماثلت ہے، دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ تیسری اور چوتھی صدی کے مشہور منطقی ابن سینا کے بقول۔

هَبَطَتْ اِلَيْكَ مِنَ الْمَحَلِّ الْاَرْفَعِ
وَرْقَاءُ ذَاتَ تَعَزُّزٍ وَّتَمَنُّعِ

روح تو ایک کبوتری کی مثال ہے جو اونچے مقام سے آئی ہے، اور بڑی عزت اور حفاظت والی ہے اور معراج کے واقعہ میں حضور علیہ السلام کو اس مادی دنیا سے عروج حاصل ہوا اور آپ عالم بالا میں روح کے مقام

حظیرۃ القدس تک پہنچے۔ تو اس طرح واقعہ معراج اور روح کو آپس میں گہری مناسبت ہے۔

روح کا جواب تو سابقہ سورۃ میں آگیا۔ اب باقی دو سوالوں کا جواب اس سورۃ مبارکہ میں آرہا ہے یعنی اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے واقعات۔ یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ بڑے عالم فاضل ہیں اور آسمانی کتابوں کا علم جانتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے گذشتہ سورۃ میں یہ کہہ کر ان کا منہ بند کر دیا۔ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے، لہٰذا تم اپنے علم پر مت اتراؤ۔ اب اسی سورۃ میں ایک تیسرا واقعہ موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا بھی بیان ہوا۔ یہ واقعہ بھی انسان کی کم علمی پر دلالت کرتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سے ایک نہایت ہی تھوڑی درجے کی لغزش ہوگئی تھی جس کی بنا پر اللہ نے فرمایا تھا کہ تم سفر اختیار کرو، اور دو دریاؤں کے سنگم پر ہمارے ایک بندے سے جا کر ملو آپ کی تربیت مقصود تھی، لہٰذا آپ نے بڑا لمبا سفر اختیار کیا اور بڑی مشقت برداشت کی اور اس طرح اللہ نے آپ کو امتحان میں ڈال دیا۔ اس سورۃ میں یہ واقعہ اجمالاً بیان کیا گیا ہے تاہم صحیحین میں حضور علیہ السلام نے اس کی تمام جزئیات بیان کر دی ہیں۔

مضامین سورۃ

دیگر مکی سورتوں کی طرح اس سورۃ مبارکہ میں بھی چار بنیادی حقائق، توحید، رسالت، معاد اور قرآن پاک کی حقانیت کو بیان کیا گیا ہے، اصحاب کہف، اور ذوالقرنین کے واقعات کے علاوہ اس سورۃ میں یاجوج ماجوج کا واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے اور اشارتاً دجال کے خروج کا ذکر بھی آگیا ہے۔ اس کے علاوہ مومن اور کافر باغ والوں کا ذکر ہے۔ اس سورۃ میں موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا واقعہ بھی ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔

اس سورۃ مبارکہ کی ابتداء نزول قرآن کے ذکر سے ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے

نے قرآن کریم کو بہت بڑی نعمت قرار دیا ہے، اسی لیے سورۃ فاتحہ، انعام اور فاطر کی طرح اس سورۃ کو بھی اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے شروع کیا گیا ہے اس کتاب کے انعام الٰہی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے انسان کی روح اور جسم دونوں کی تکمیل ہوتی ہے، گویا قرآن پاک ان چیزوں کو کھول کر بیان کرتا ہے جن کے ساتھ روح اور جسم کی سعادت وابستہ ہے اس کتاب میں اللہ نے توحید کے اسرار بیان فرمائے ہیں، خدا تعالیٰ کی تنزیہہ و تقدیس اور اس کی صفات کمال و جلال کا ذکر ہے۔ قضا و قدر کے مسائل بیان ہوئے ہیں، ملائکہ اور عالم بالا کی تفصیلات و احوال وحی ... کتاب کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں۔ انسان کو مکلف بنانے والے احکام و قوانین اسی کتاب مقدس میں بیان ہوئے ہیں۔ ثواب اور عتاب کا سلسلہ بیان ہوا ہے اس کتاب میں دعوت الی التوحید کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے جو کسی دوسری آسمانی کتاب میں نہیں ملتا۔

اس سورۃ مبارکہ میں شکر گزاروں اور ناشکر گزاروں کی مثالیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ گذشتہ سورۃ میں بھی اللہ نے اپنے شکر گزار بندوں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام اور خود حضور خاتم النبیین علیہ السلام کی شکر گزاری کا تذکرہ فرمایا تھا۔ جب کہ اس سورۃ میں اصحاب کہف، ذوالقرنین، موسیٰ اور خضر علیہما السلام اور باغ والے مومن کا ذکر ہوا ہے۔ بہر حال ساری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی فوز و فلاح کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ اس کا تعلق اپنے خالق و مالک کے ساتھ درست ہے۔ اگر یہ تعلق درست نہیں ہے، تو کبھی فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ بہر حال یہ سب باتیں اور اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں اس سورۃ مبارکہ میں آ رہی ہیں۔

ہماری اور دجالی تہذیب

اس سورۃ میں دجال کے خروج کا ذکر آ رہا ہے تو اس لحاظ سے دجالی تہذیب کا بیان خالی از دلچسپی نہیں ہوگا۔ قرب قیامت میں سائنسی

ترقی یافتہ انتہائی عروج پر ہوگی۔ اس دور کو مولانا مناظر احسن گیلانی حماری تہذیب (DONKEY CULTURE ڈنکی کلچر) سے تعبیر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جس طرح گدھے کے پیش نظر صرف دو چیزیں ہوتی ہیں یعنی پیٹ اور شہوت، اسی طرح موجودہ تہذیب کی منتہائے مقصود بھی یہی دو چیزیں ہیں۔ اس دنیا میں ایک طرف کارل مارکس کا فلسفہ ہے کہ دنیا میں مسئلہ صرف پیٹ کا ہے، اور کچھ نہیں۔ اسی بناء پر اس نے مزدور طبقے کو گمراہ کر کے کمیونزم کی راہ ہموار کی ہے۔ اور دوسری طرف یورپ کا فرائیڈ ہے جس نے جنسی نفسیات (SEXUALISM سیکشوئلزم) پر ہی سارا زور بیان صرف کر کے دنیا کا اول و آخر اسی چیز کو سمجھ لیا ہے۔ تو اس طرح گویا آج کی حماری تہذیب کے پیش نظر صرف پیٹ ہے یا شہوت۔

بہرحال جب یہ حماری تہذیب اپنے انتہائی عروج پر ہوگی تو اس وقت دجال کا خروج ہوگا اور دجالی تہذیب شروع ہو جائے گی۔ دجال اپنے زمانے میں وہ تمام کام بغیر آلات کے انجام دے گا، جو اس وقت سائنس دان اور انجینئر آلات کے ذریعے انجام دیتے ہیں۔ حدیث میں دجال کے گدھے کا ذکر بھی آتا ہے، وہ چالیس دن میں گدھے پر سوار ہو کر تمام روئے زمین کا گشت کرے گا۔ خدائی کا دعویٰ کرے گا۔ اس کے پاس خزانے ہوں گے، جس کو چاہے گا مارے گا، وہ جسے چاہے گا زندہ رکھے گا اور جسے چاہے گا ہلاک کر دے گا۔ اس کے ہاتھ پر بڑے بڑے کرشمے ظاہر ہوں گے جن کی وجہ سے وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا اور لوگ اس کے پیچھے لگ جائیں گے۔

دجال جب چاہے گا بارش برسائے گا اور جب چاہے گا زمین سے خزانے نکال دے گا۔ آج زمین سے معدنیات لوہا، کوئلہ، سونا، چاندی، گیس، تیل وغیرہ نکالنے کے لیے بڑی بڑی مشینوں کے ذریعے سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔ مگر دجال بغیر آلات کے آناً فاناً یہ چیزیں نکال کر

دکھا دیگا۔ وہ زمین سے کہے گا۔ اَخْرِجِیْ کُنُوْزَکِ یعنی اپنے خزانے باہر نکال دے تو وہ فوراً باہر اگل دے گی۔ بہرحال یہاں پر صرف ہماری تہذیب اور دجالی تہذیب کا ذکر بھی ہوگا۔

مستدرک حاکم میں صحیح حدیث کا مضمون یہ ہے مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ الْكَهْفِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اَضَاءَ لَهٗ مِنَ النُّوْرِ مَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجُمُعَتَيْنِ جس شخص نے جمعہ کے دن سورۃ کہف کی تلاوت کی اللہ تعالیٰ اس کے لیے دوسرے جمعے تک نور ہی نور بنا دے گا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ جس جگہ پر اس سورۃ کی تلاوت کرے گا۔ وہاں سے مکہ مکرمہ تک اس کے لیے نور ہی نور ہوگا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ ایسے شخص کے لیے زمین سے آسمان تک روشنی ہی روشنی ہوگی۔

ایک حدیث میں یہ بھی آتا ہے مَنْ حَفِظَ عَشْرَ اٰيٰتٍ مِّنْ اَوَّلِ سُوْرَةِ الْكَهْفِ عُصِمَ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ یعنی جو شخص سورۃ کہف کی ابتدائی دس آیتیں یاد کر کے انہیں ورد بنا لے گا، وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ ہو جائے گا۔ ایک حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ جب دجال کو دیکھو تو اس کے سامنے سورۃ کہف پڑھو، وہ تمہیں شر نہیں پہنچا سکے گا۔ دوسری روایت میں ہے مَنْ قَرَأَ الْعَشْرَ الْاَوَاخِرَ عُصِمَ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ جس شخص نے سورۃ کہف کی آخری دس آیتیں پڑھیں وہ فتنۂ دجال سے محفوظ رکھا جائے گا۔ ترمذی شریف کی ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ مَنْ قَرَأَ ثَلَاثَ اٰيٰتٍ مِّنْ اَوَّلِ الْكَهْفِ عُصِمَ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ جس شخص نے سورۃ کہف کی ابتدائی تین آیتیں پڑھیں وہ بھی دجال کے فتنہ سے مامون ہوگا۔ یہ ادنیٰ درجہ ہے لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیے کہ کم از کم جمعہ کے دن ان کو ورد زبان بنا لے۔ ام المومنین حضرت

عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ"...... سے لیکر سورۂ کہف کی آخری دو آیات سونے سے پہلے پڑھے گا۔ وہ جب چاہے گا۔ اللہ اُسے نیند سے بیدار کر دیگا۔

نزول کتاب کی حکمت

جیساکہ پہلے عرض کیا، اس کتاب حکیم کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء سے ہوتی ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ یعنی حمد اور تعریف کا مستحق وہی اللہ ہے جس نے اپنے کامل بندے پر کتاب نازل فرمائی اور کتاب بھی ایسی وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا کہ اس میں کسی قسم کی کجی نہیں رکھی یہ عبارت صاف اور سلیس ہے۔ کلام فصیح و بلیغ اور اس کی تعلیم انقلابی ہے۔ یہ افراط و تفریط سے پاک اعتدال پسند کلام ہے ہر زمانے کے ہر انسان اور ہر زبان بولنے والے پر اس کا یکساں اطلاق ہوتا ہے۔ یہ عقل سلیم کے عین مطابق ہے اور اس میں کوئی ایچ پیچ نہیں ہے۔ یہ کتاب حقائق حقہ اور ثابتہ پر مشتمل ہے اور اس میں کوئی تعارض نہیں پایا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ حقیقی کتاب کہلانے کی مستحق یہی کتاب ہے کیونکہ "لَا رَيْبَ فِيْهِ" اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

یہ کتاب قیم ہے

فرمایا اس کتاب مبین کی پہلی صفت ، تو یہ بیان ہوئی کہ اس میں کوئی کجی نہیں اور دوسری صفت یہ ہے کہ یہ کتاب قَيِّمًا یعنی مستقیم ہے جو کہ صراط مستقیم کی تشریح و توضیح بیان کرتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قیم کا معنی یہ ہے کہ اس میں کوئی تعارض اور تناقض نہیں پایا جاتا بلکہ یہ بالکل سیدھی کتاب ہے۔ یہ بھی اس کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل ہے کیونکہ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا" (النساء - ۸۲) اگر یہ اللہ کے علاوہ کسی غیر کا کلام ہوتا تو لوگ اسمیں یقیناً بہت زیادہ اختلاف اور تعارض پاتے مگر ایسا

نہیں ہے۔ یہ ایسا معجز کلام ہے کہ تمام انس وجن مل کر اس جیسی ایک سورۃ بھی نہیں پیش کر سکتے۔ یہ کتاب قیم یعنی سیدھی، محکم اور اختلاف سے پاک ہے۔

بعض قیم کی تشریح اس طرح بیان کرتے ہیں قَيِّمًا بِمَصَالِحِ الْعِبَادِ یعنی یہ اللہ کے بندوں کی مصلحتوں کو قائم کرنے والی کتاب ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قیم کا معنیٰ محافظ اور نگران ہے۔ یعنی اللہ کی یہ آخری کتاب سابقہ تمام کتب سماویہ کی محافظ اور نگران ہے۔ اُن کی تمام صحیح باتوں کی تعلیم کرتی ہے اور ناجائز طریقے سے شامل کی گئی غلط باتوں کا انکار کردیتی ہے۔ یہ کتاب انسان کے دینی اور دنیاوی ہر دو اقسام کے مقاصد کو قائم کرتی اور اُن کے بارے میں صحیح صحیح تعلیم دیتی ہے۔

مقصدِ نزولِ کتاب

فرمایا ہم نے یہ کتاب اپنے بندے پر نازل فرمائی جس میں کوئی کجی نہیں ہے بلکہ قیم ہے، اور اس کے نزول کا مقصد یہ ہے لِيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا مِّنْ لَّدُنْهُ تاکہ وہ بندہ اُس سخت گرفت سے لوگوں کو ڈرائے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کامل ترین کتاب اپنے کامل ترین بندے پر اتاری ہے۔ یہ کتاب انسانیت کی روحانی اور مادی تکمیل کا ذریعہ ہے، لہٰذا جو بھی اس پر ایمان لائے گا۔ وہ خود بھی عالم اور کامل بن جائے گا اور پھر دوسروں کی تکمیل کا بھی ذریعہ بنے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ اس کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ کفر، شرک، معاصی، اور تکذیب کے مرتکبین کو خدا تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا جائے۔

مومنین کے لیے بشارت

فرمایا اس کتاب کے نزول کا دوسرا مقصد یہ ہے وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ وہ اللہ کا بندہ اہل ایمان کو خوشخبری بھی سنا دے الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصّٰلِحٰتِ جو فکر کی طہارت کے بعد نیک اعمال انجام دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ فرائض نماز، روزہ،

زکوٰۃ اور حج، صدقہ خیرات، جہاد، قربانی پر عامل ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے بشارت ہے اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا کہ بیشک اُن کے لیے بہت اچھا بدلہ ہے۔ سورۃ یونس میں اس طرح بیان کیا گیا ہے اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ اُن کے لیے ان کے پروردگار کے ہاں سچائی کا پایہ ہے اور یہ ایسا بہتر بدلہ ہے۔ مَاكِثِينَ فِيهِ اَبَدًا کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور وہاں سے کبھی بھی نکالے نہیں جائیں گے۔ دنیا کی نعمتوں کے زائل ہونے کا تو ہر وقت خطرہ ہوتا ہے۔ ایک شخص آج دولت مند ہے تو کل قلاش بھی ہو سکتا ہے، آج صحت مند ہے تو کل بیمار بھی ہو سکتا ہے۔ مگر اہل ایمان کی نعمتوں میں نہ کمی آئے گی اور نہ ان کے چھن جانے کا خطرہ ہوگا۔ بقول سعدی صاحبؒ دنیا کی ہر نعمت کو استعمال کرو کیونکہ ایک دن نعمت بھی ختم ہو جائے گی اور انسان خود بھی باقی نہیں رہے گا۔ مگر آخرت میں خطرے والی کوئی بات نہیں ہوگی، نہ موت کا خطرہ نہ نعمت کے چھن جانے کا ڈر اسی لیے فرمایا کہ اہل ایمان کو خوشخبری سنا دو کہ آخرت میں ان کے لیے اچھا بدلہ ہے جس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝۴ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآىِٕهِمْ ۭ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۭ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝۵ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝۶ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَي الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝۷ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝۸

ترجمہ: اور ڈرائے اُن لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ اللہ نے
اولاد بنائی ہے ۴ نہیں ہے اُن کے لیے اس کا
کوئی علم اور نہ اُن کے آباؤاجداد کو۔ یہ ایک بڑی بات
ہے جو اُن کے مونہوں سے نکلتی ہے۔ نہیں کہتے
یہ مگر جھوٹ ۵ پس شاید آپ اپنا گلا گھونٹ ڈالیں گے
اِن کے پیچھے اگر یہ ایمان نہ لائے اس بات پر، افسوس
کرتے ہوئے ۶ بیشک ہم نے بنایا ہے جو کچھ ہے
زمین پر اس کے لیے رونق، تاکہ ہم آزمائیں کہ کون ان
میں زیادہ اچھا عمل کرنے والا ہے ۷ اور بیشک ہم
بنانے والے ہیں جو کچھ اس (زمین) پر ہے ایک چٹیل
میدان ۸

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں قرآن پاک کے نزول کا ذکر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کامل ترین بندے پر ایک عظیم المرتبت کتاب نازل فرمائی جس میں کسی قسم کی غلطی تضاد، تخالف یا خلافِ واقع بات نہیں ہے۔ یہ کتاب سابقہ کتب کا تتمہ اور اللہ کے بندوں کی مصلحتوں کی محافظ اور نگران ہے۔ نزولِ کتاب کا مقصد اللہ نے یہ بیان فرمایا، تاکہ اللہ کا بندہ اللہ کی طرف سے آنے والی سخت گرفت سے لوگوں کو آگاہ کرے اور اہلِ ایمان کو خوشخبری دے کہ اعمال صالحہ انجام دینے والے لوگوں کے لیے اچھا اجر ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

اولاد تجویز کرنے والوں کو تخویف

اب آج کی پہلی آیت میں اللہ نے نزولِ کتاب کا دوسرا مقصد بیان کیا ہے وَيُنْذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا کہ وہ ڈر سنائے ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ اللہ نے اولاد بنا رکھی ہے۔ پہلی وعید عام لوگوں کے لیے تھی کہ سب کو اللہ کی گرفت سے ڈرا دیا جائے اور یہ خصوصی تخویف صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کرتے ہیں۔ ان میں اوّل نمبر پر نصاریٰ ہیں۔ یہ باپ، بیٹا اور روح القدس کے عقیدے والے تثلیث پرست لوگ ہیں۔ دنیا میں ان کی کثیر آبادی ہے اور یہی لوگ ہماری تہذیب کے چیمپئن اور ترقی کے امام ہیں۔ ان میں سے بعض تو تثلیث کے قائل ہیں جو کہتے ہیں إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ (المائدۃ - ۷۳) یعنی خدا تعالیٰ تین میں سے تیسرا ہے اور بعض نے یوں کہہ دیا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ (المائدۃ - ۷۲) خدا تو بعینہٖ مسیح ابن مریم ہے۔ یہ ہندوؤں کے اوتار والا عقیدہ ہو گیا کہ خدا تعالیٰ بعض شخصیتوں میں حلول کر جاتا ہے۔ پھر عیسائیوں نے یہ بھی کہا وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ (التوبۃ - ۳۰) یعنی مسیح علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے۔ اور اسی طرح انہوں نے

خدا تعالیٰ کا جز مان لیا۔

دوسرا گروہ جنہیں ڈرانا مقصود ہے، وہ یہودیوں کا ہے انہوں نے بھی خدا کا بیٹا تجویز کیا۔" وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ" (التوبة ۔ ۳۰) یہودیوں نے کہا کہ عزیر علیہ السلام خدا کا بیٹا ہے اور اس طرح وہ بھی عقیدہ ابنیت میں ملوث ہو گئے۔ یہودی سارے تو اس عقیدے کے قائل نہیں، تاہم ایک عزیری فرقہ ہے جو آپ کو خدا کا بیٹا مانتا ہے۔ حضرت عزیر علیہ السلام بابل میں قید کر دیے گئے۔ پھر جب کافی عرصہ کے بعد آپ باہر آئے تو تورات معدوم ہو چکی تھی چنانچہ انہوں نے تورات حرفاً حرفاً لوگوں کے سامنے پیش کر دی اس پر وہ لوگ کہنے لگے کہ یہ کام خدا کا بیٹا ہی کر سکتا ہے، چنانچہ انہوں نے یہی عقیدہ وضع کر لیا۔

بعض وحدت الوجودی بھی عقیدہ حلول کے قائل ہیں۔ وہ کائنات کی تمام چیزوں کو خدا تعالیٰ کا مظہر یا اوتار مانتے ہیں، لہٰذا یہ بھی مشرک ہیں۔ البتہ وحدت الوجود کا صحیح عقیدہ یہ ہے کہ تمام چیزوں کا قیام صرف خدا تعالیٰ سے ہے۔ چنانچہ خواجہ علی ہجویریؒ اپنی کتاب کشف المحجوب میں بیان کرتے ہیں کہ صوفیا کے بارہ فرقے ہیں، ان میں سے دو فرقے گمراہ ہیں جو خدا تعالےٰ کو انسانی روپ میں مانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسانی شکل میں حلول کر آیا ہے۔ اس کے علاوہ باقی دس فرقے حق پر ہیں۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کی اولاد تجویز کرنے والوں کے لیے اس کتاب کے ذریعے خاص طور پر تخویف دلائی گئی ہے۔ چونکہ اس ضمن میں بدترین عقیدہ نصاریٰ کا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کے رفع الی السماء کے کچھ عرصہ بعد پولس نے وضع کیا تھا، لہٰذا سب سے زیادہ تخویف بھی انہی کے حصے میں آتی ہے اس وقت نصاریٰ کی اپنی تعداد بھی بہت زیادہ ہے اور اگر اس میں یہودیوں کے عزیری فرقہ اور ہندوؤں کے اوتاری فرقہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو پھر

تعداد بہت بڑھ جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام کی اپنی تعلیم یہ ہے "یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ" (المائدہ۔ ۷۲) اے لوگو! عبادت صرف اللہ کی کرو۔ جس نے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا، تو اللہ نے اُس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ میں ہوگا۔ غرضیکہ یہ اولاد تجویز کرنے والے نصاریٰ ہوں یا یہودی، حلولی ہوں یا اوتاری یا اشتراکی سب مشرک ہیں اور اللہ نے نزولِ کتاب کا مقصد یہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ کا کامل ترین بندہ ایک تو عام لوگوں کو آنے والے عذاب سے ڈرا دے اور دوسرا خاص طور پر اُن لوگوں کو ڈرائے جنھوں نے اللہ کے لیے اولاد تجویز کرکے شرک کا ارتکاب کیا ہے۔

کفارے کا غلط عقیدہ

نصاریٰ میں مشرکانہ عقائد کا حال یہ ہے کہ اُن کے جاہل لوگ تو عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کی حقیقی اولاد مانتے ہیں اور جو اہلِ علم ہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا نے آپ کو بیٹا بنا کر ہر قسم کے اختیارات دے دیے ہیں۔ وہ مشکل کشائی اور حاجت روائی کرتے ہیں، جس کو چاہیں عطا کر دیں اور جس سے چاہیں چھین لیں، وہ نافع اور ضار ہیں۔ اُن کو ہر چیز پر تصرف حاصل ہے اس طرح یہ دونوں گروہ شرک کے مرتکب ہوئے۔ اور سب سے بڑھ کر انھوں نے یہ عقیدہ ایجاد کر لیا کہ مسیح علیہ السلام سولی پر چڑھ کر ساری نسلِ انسانی کے لیے کفارہ بن گئے ہیں، اور نجات اسی کو حاصل ہوگی جو اس عقیدہ پر ایمان لائے گا۔ ایسا شخص دنیا میں کچھ بھی کرتا پھرے، وہ جنت میں پہنچ جائے گا۔ یہ خلافِ فطرت اور نامعقول عقیدہ ہے اور اس عقیدے نے بھی دنیا کو تباہ و برباد کیا ہے۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے کہ گناہ کوئی کرے اور سزا کسی دوسرے کو ملے۔ قرآن پاک میں

اس بات کی بار بار وضاحت کی گئی ہے لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (بنی اسرائیل - ۱۵) کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا بلکہ ہر شخص کو اپنے اعمال کی جوابدہی خود کرنا ہوگی۔ حضور علیہ السلام کا فرمان بھی ہے لَا يَجْنِي عَلَيْهِ وَلَا يَجْنِي عَلَيْكَ تیرا بوجھ بیٹا نہیں اٹھائے گا اور بیٹے کا بوجھ تجھ پر نہیں ڈالا جائے گا۔ بیٹا اولاد ماننے والوں کے لیے خاص انذار ہو گیا۔

مسلمانوں کے غلط عقائد

ہم اہل کتاب اور دیگر مشرکین کی بات تو کرتے ہیں مگر افسوس کا مقام یہ ہے کہ وہ مسلمان خود شرک میں مبتلا ہو کر گمراہ ہو چکے ہیں۔ جن کو اللہ کی آخری کتاب میں سابقہ اقوام کے شرک سے خبردار کیا گیا اور ڈرنے کا حکم دیا گیا۔ عیسائیوں نے عیسٰی علیہ السلام کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھ لیا تھا، تو آج کا نام نہاد مسلمان اولیاء اللہ سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کی آس لگائے بیٹھا ہے۔ ان کے نام کی نذریں مانی جاتی ہیں، ان کے مزار پر چڑھاوے چڑھتے ہیں۔ قبروں کو غسل دیا جاتا ہے۔ اور ان کی چادر پوشی کی جاتی ہے، ان کو تابع اور نمائندہ سمجھا جاتا ہے گویا اللہ نے تصرف کی ساری چابیاں اولیاء کو منتقل کر دی ہیں۔ یہی شرک ہے جو بدترین گناہ ہے۔ اللہ نے فرمایا اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان) شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ عیسائیوں اور یہودیوں نے اللہ کے بندوں کو خدا کا جزو مان لیا۔ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا (الزخرف ۱۵) مشرکین عرب کا ایک گروہ کہتا تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ اللہ نے فرمایا وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (الصفت ۱۵۸) انہوں نے اللہ تعالیٰ اور جنات کے درمیان رشتہ داری قائم کر لی۔ آج مسلمانوں نے بھی نُوْرٌ مِّنْ نُّوْرِ اللّٰهِ کا عقیدہ وضع کر کے سابقہ مشرکین کے قدم پر قدم رکھ دیا۔ شرک ہی ایک ایسا بدترین گناہ ہے جس کو مٹانے

کے لیے اللہ نے ایک لاکھ سے زیادہ انبیاء مبعوث فرمائے۔

بلادلیل دعویٰ

فرمایا جو لوگ اللہ کے لیے اولاد تجویز کرتے ہیں مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ اُن کے پاس اس دعوے کے لیے کوئی علم نہیں ہے۔ یعنی نہ اُن کے پاس کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی۔ نہ صرف انہوں نے بلکہ ان کے آباؤ اجداد نے بھی بلادلیل یہ عقیدہ قائم کر رکھا تھا۔ بھلا خدا تعالیٰ کو اولاد کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا وہ نسل کا بھوکا ہے کہ بڑھاپے میں اولاد کام آئے گی یا وہ محتاج ہے کہ اولاد اس کی خدمت کرے گی؟ خدا تعالیٰ تو ان چیزوں سے منزّہ ہے۔ وہ خود مدبّر اور متصرف ہے۔ گزشتہ سورۃ کی آخری آیت میں بھی گزر چکا ہے کہ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے کوئی اولاد نہیں بنائی اور اس کی بادشاہی میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ سورۃ یوسف میں موجود ہے کہ اللہ کے سوا تم جن کی عبادت کرتے ہو وہ تو محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (آیت - ۴۰) اللہ نے اس کے لیے کوئی دلیل نہیں اتاری اور تمہارا دعویٰ بالکل باطل ہے۔ فرمایا كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ خدا کی اولاد ٹھہرانے والی ایک بڑی بات ہے جو اُن کے مونہوں سے نکلتی ہے اُن کے پاس محض یہی باطل دلیل ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد ایسا ہی کرتے ہیں حالانکہ اللہ کا فرمان ہے اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (البقرۃ - ۱۷۰) اگرچہ اُن کے آباؤ اجداد عقل و شعور اور ہدایت سے خالی ہوں مگر یہ انہی کا اتباع کیے جا رہے ہیں۔ سورۃ الانبیاء میں اللہ نے فرمایا ہے کیا انہوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو معبود بنایا ہے۔ اے پیغمبر! قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ (آیت - ۲۴) اِن سے کہہ دیجیے کہ لاؤ اگر

تمہارے پاس کوئی دلیل ہے۔ مگر وہ دلیل کہاں سے لائیں گے حقیقت یہ ہے اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا اُن کا اولاد تجویز کرنے کا دعویٰ نرا جھوٹ ہے کسی کو خدا کا بیٹا بنانا اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہنا سراسر جھوٹ ہے اللہ نے خود عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے کہلوایا "اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ" (مریم - ۳۰) میں تو خدا تعالیٰ کا بندہ ہوں، بیٹا نہیں اور جن کو یہ خدا کی بیٹیاں سمجھتے ہیں بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ (الانبیاء - ۲۶) وہ تو اللہ کے مکرم بندے ہیں۔ فرشتے خدا کی عبادت گزار مخلوق ہے۔ وہ خدا کے سامنے عاجزی کرتے ہیں اور اسی سے ترقی درجات کی درخواست کرتے ہیں۔ جس طرح شجر، حجر، جن انسان اور جانور اللہ کے محتاج ہیں اسی طرح فرشتے بھی اس کے محتاج ہیں تو فرمایا ابنیت کا گندہ عقیدہ سراسر جھوٹ ہے۔

حضور علیہ السلام کے لیے تسلی

اگلی آیت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تسلی دی گئی ہے۔ آپ علیہ السلام لوگوں کو شرک میں مبتلا دیکھ کر ہر چند سمجھانے کی کوشش کرتے۔ جب آپ کی تبلیغ کا ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تو آپ کو سخت صدمہ پہنچتا بعض اوقات آپ اس صدمہ سے نڈھال ہو جاتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا شاید آپ ان کے پیچھے اپنا گلا گھونٹ لیں، اس بات پر افسوس کرتے ہوئے کہ یہ لوگ قرآن پر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ هٰذَا الْحَدِیْثِ سے مراد اللہ کا مقدس کلام قرآن پاک ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مشرکین کی شرک پر ہٹ دھرمی اور پھر اُن کی جہنم رسیدگی پر بڑا کڑھتے تھے مگر اللہ نے تسلی دی "وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ" (البقرۃ - ۱۱۹) اہل دوزخ کے متعلق آپ سے کوئی پرسش نہیں ہوگی کہ یہ لوگ کیوں جہنم کا ایندھن بنے۔ بلکہ خود ان سے

دریافت کیا جائے گا "مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ" (المدثر - ۴۲)
کہ تم جہنم میں کس وجہ سے آئے۔ اللہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے
فرمایا "بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ" (المائدۃ - ۶۷)
آپ اپنا فریضۂ تبلیغ ادا کرتے رہیں جہاں تک راہِ راست پر لانے کا
تعلق ہے "اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ
اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ" (القصص - ۵۶) آپ اپنی
پسند کے مطابق کسی کو ہدایت نہیں دے سکتے۔ بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت دے دے۔
کسی کو منزلِ مقصود تک پہنچانا آپ کا کام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے
یہ تسلی کا مضمون ہو گیا۔

زمینی رونق برائے آزمائش

فرمایا "اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا" بیشک ہم
نے زمین پر کی ہر چیز کو اس کے لیے رونق بنایا ہے۔ زمین پر موجود بیل،
پھول، نباتات، حیوانات، جمادات، معدنیات، زر و جواہر سب کچھ
اس کی زینت اور رونق ہے۔ اور یہ چیزیں پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے
"لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا" تاکہ ہم تم کو آزمائیں کہ
اس رونق میں پھنس کر کون اچھے عمل کرتا ہے اور کون ایسا ہے۔ جو
آخرت سے روگردانی کرتا ہے۔ توحید خداوندی سے منہ موڑتا ہے۔
اور برے عقائد کون اختیار کرتا ہے اسی لیے حضور علیہ السلام کا ارشاد
مبارک ہے کہ تم میں سے زیادہ عقل مند وہ آدمی ہے جو اللہ کی حرام کردہ
چیزوں سے بچتا ہے اور اس کی اطاعت میں جلدی کرتا ہے حضور
علیہ السلام کا یہ بھی فرمان ہے کہ دنیا میٹھی بھی ہے اور سرسبز بھی۔ اللہ نے
باغات، کھیت اور چراگاہیں پیدا کر کے تمہیں اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے۔
"فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ" پھر وہ دیکھتا ہے کہ تم کیسے کام انجام
دیتے ہو۔ نیکی کی طرف راغب ہوتے ہو یا لہو و لعب میں الجھ کر رہ جاتے

ہو۔ حضور علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا اَلَا فَاتَّقُوا الدُّنْیَا وَ اتَّقُوا النِّسَآءَ خبردار! دنیا اور عورتوں کے فتنے سے بچتے رہو۔ فرمایا بنی اسرائیل میں گمراہی کا فتنہ عورتوں کی وجہ سے ہی پیدا ہوا۔ ان فتنوں میں مبتلا ہو کر اپنے اعلیٰ مقصد کو نہ بھول جانا، خدا کی توحید اور آخرت سے بیگانہ نہ ہو جانا۔ اللہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے۔

اور یہ بھی یاد رکھو وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَیْهَا صَعِیْدًا جُرُزًا اور بےشک ہم بنانے والے ہیں۔ جو کچھ اس زمین پر ہے چٹیل میدان جب قیامت برپا ہوگی تو زمین میں کوئی اونچ نیچ، ٹیلہ، پہاڑ، درخت، دریا، سمندر وغیرہ نہیں ہوگا بلکہ ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ اور زمین چٹیل میدان رہ جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ زمین اور اس کی تمام رونقیں عارضی ہیں اور ایک دن فنا ہونے والی ہیں، لہٰذا ان میں پھنس کر اللہ کی یاد کو نہ بھلا بیٹھنا ورنہ سخت نقصان اٹھاؤ گے۔ یہ تو سب کچھ تمہاری آزمائش کے لیے ہے۔

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ﴿٩﴾ إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ﴿١٠﴾ فَضَرَبْنَا عَلٰى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ﴿١١﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصٰى لِمَا لَبِثُوا أَمَدًا ﴿١٢﴾

ترجمہ: کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ بیشک اصحاب کہف اور رقیم تھے ہماری آیتوں میں سے عجیب (۹) جب کہ پناہ پکڑی چند نوجوانوں نے غار کی طرف، پس انہوں نے کہا، اے ہمارے پروردگار! دے دے ہمیں اپنی طرف سے مہربانی، اور مہیا کر دے ہمارے لیے ہمارے معاملہ میں درستگی کی بات (۱۰) پھر ہم نے تھپکی دے دی اُن کے کانوں پر غار کے اندر کئی سال گنے ہوئے (۱۱) پھر اٹھایا ہم نے اُن کو تاکہ ہم معلوم کریں کہ دونوں گروہوں میں سے کون زیادہ یاد رکھنے والا ہے اس مدت کو جتنا وہ ٹھہرے (۱۲)

ربط آیات

سورۃ کی ابتداء میں اللہ نے قرآن کی حقانیت و صداقت کو بیان کیا اور پھر اس کے ذریعے لوگوں کو ڈرانے کا حکم دیا۔ ایک عام تخویف ہے کہ سارے کے

سارے لوگ اللہ کے آنے والے عذاب سے ڈر جائیں اور دوسری تخویف ان لوگوں کے لیے خاص ہے جو خدا تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کرتے ہیں اور عقیدۂ تثلیث کے قائل ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر کو تسلی دی کہ جو لوگ گمراہی کو ترک کر کے ایمان لانے کے لیے تیار نہیں، آپ ان کے لیے زیادہ فکرمند نہ ہوں۔ بلکہ فریضۂ تبلیغ ادا کرتے رہیں۔ باقی معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں۔ اس کے بعد اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ اس نے زمین بھر کی چیزوں کو باعث رونق اور زینت بنایا ہے تاکہ انسانوں کو آزمایا جا سکے کہ کون ان میں سے اچھی فکر اور اچھے اعمال اختیار کرتا ہے۔ فرمایا ایک دن آنیوالا ہے۔ جب زمین پر موجود درخت، پہاڑ، ندی نالے، پھول، پھل کچھ بھی نہیں رہے گا۔ اور زمین محض ایک چٹیل میدان بن کر رہ جائے گی۔

بعض علمی مسائل

یہاں پر صَعِیۡدًا جُرُزًا کے الفاظ آتے ہیں جس کا معنیٰ ہم نے چٹیل میدان کیا ہے۔ صعید دراصل مٹی کو کہتے ہیں جیسا کہ تیمم کے مسئلہ میں سورۃ المائدہ میں موجود ہے فَتَیَمَّمُوۡا صَعِیۡدًا طَیِّبًا پس تیمم کرو پاک مٹی سے یعنی جب پانی نایاب ہو یا کوئی شخص پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو تو وہ مسنون طریقہ کے مطابق پاک مٹی سے طہارت حاصل کر کے نماز ادا کر سکتا ہے۔ مفسر قرآن امام ابو بکر جصاصؒ نے اس سے بعض علمی مسائل اخذ کیے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ مٹی تو فطرۃً پاک چیز ہے اور جب بعد زمین کی ہر چیز فنا ہو کر مٹی کا حصہ بن جائے گی تو وہ ہر چیز بھی پاکیزگی کے حکم میں داخل ہو جائے گی۔ اسی لیے زمین کی جنس سے متعلقہ تمام اشیاء مثلاً گرد و غبار، پتھر، اینٹ، روڑا، چونا، ہڑتال، ریت وغیرہ پر ہاتھ مار کر تیمم کیا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوا کہ کسی چیز کی جنس کی تبدیلی کے ساتھ اس کا حکم بھی بدل جاتا ہے مثلاً

نجاست ایک ناپاک چیز ہے۔ اور اگر یہی نجاست جل کر راکھ بن جائے تو جنس کی اس تبدیلی کے ساتھ ہی اس کا حکم بھی بدل جائے گا۔ اب اگر نجاست کی راکھ کپڑے کو لگ جائے یا پانی میں مل جائے تو کپڑے یا پانی پر پلیدی کا حکم نہیں لگے گا۔ اسی طرح حرام جانور کی چربی بھی حرام ہے اور اس کی خرید و فروخت اور استعمال حرام ہے لیکن اگر سوئر یا خنزیر کی اسی چربی سے صابن بنا لیا جائے تو جنس کی تبدیلی سے صابن پلید نہیں ہوگا بلکہ قابل استعمال ہوگا۔ شراب بھی قطعاً حرام ہے اس کی کشیدگی، خرید و فروخت اور پینا پلانا سب حرام ہے اور اگر اسی شراب کو سرکہ میں تبدیل کر لیا جائے تو حرمت کا حکم ساقط ہو جائے گا اور سرکہ استعمال کیا جا سکے گا۔

عجیب و غریب واقعہ

جیسا کہ پہلے درس میں بیان ہو چکا ہے کہ مشرکین مکہ نے یہود یوں کے ایما پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تین سوال کیے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آپ ان سوالوں کے جواب نہیں دے سکیں گے تو دین اسلام کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کا بہانہ مل جائے گا مگر اللہ تعالیٰ نے تینوں سوالوں کے جوابات دے کر یہود اور مشرکین کے منہ بند کر دیے۔ پہلا سوال روح کے متعلق تھا جس کا جواب گذشتہ سورۃ بنی اسرائیل میں گزر چکا ہے۔ دوسرا سوال اصحاب کہف اور تیسرا ذوالقرنین کے متعلق تھا۔ ان دونوں سوالوں کے جوابات اس سورۃ میں تفصیل کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ اب بعض تمہیدی باتوں کے بعد آج کی آیات میں اصحاب کہف کا واقعہ پہلے اجمالاً بیان کیا جا رہا ہے جس کی تفصیل اگلے دو رکوع میں آ رہی ہے۔ تو اس عجیب و غریب واقعہ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے اَمْ حَسِبْتَ کیا آپ خیال کرتے ہیں اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ کہ بیشک اصحاب کہف و الرقیم كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ہماری آیتوں میں سے بڑے عجیب تھے۔

واقعہ اصحاب کہف شروع کرنے سے پہلے اللہ نے اشارۃً بتلا دیا ہے کہ یہ واقعہ تمہیں بڑا عجیب و غریب معلوم ہوگا، حالانکہ اپنی جگہ یہ کوئی واحد واقعہ نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی لاکھوں واقعات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانی کے طور پر ظاہر کیا ہے۔ گذشتہ سورۃ میں واقعہ معراج بھی گزر چکا ہے جسے کوئی انسان عقل کی کسوٹی پر نہیں جانچ سکتا۔ اسی طرح اصحاب کہف کا واقعہ بھی ایسا ہی ہے جو عام معمولات سے ہٹ کر ہے اور پھر اسی نوعیت کا حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا واقعہ بھی آرہا ہے اس قسم کے تمام واقعات اللہ تعالیٰ اس لیے ظاہر فرماتے ہیں کہ لوگ ان پر غور و فکر کرکے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل کو سمجھ سکیں اور اس پر ایمان لا سکیں۔

اصحاب کہف والرقیم

کہف اور رقیم دو مختلف الفاظ ہیں۔ کہف غار (کیو CAVE) کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ چند نوجوان کسی پہاڑ کی غار میں پناہ گزیں ہو گئے تھے اس لیے انہیں اصحاب کہف کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ البتہ لفظ رقیم کے معانی کے تعین میں مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام بخاری نے اپنی کتاب "صحیح بخاری" میں اس آیت کے ضمن میں ان تین آدمیوں کا حال بیان کیا ہے جن کو دوران سفر بارش کی وجہ سے ایک غار میں پناہ لینا پڑی۔ اسی دوران پہاڑ کے اوپر سے ایک بڑا پتھر سرک کر غار کے منہ پر آگیا جس سے غار کا منہ مکمل بند ہو گیا اور اندر پناہ حاصل کرنے والوں کے لیے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ رہا۔ پریشانی کے اس عالم میں ان تین آدمیوں نے فیصلہ کیا کہ ان میں سے ہر شخص اپنی زندگی میں کیے گئے کسی نیک عمل کا واسطہ دیکر اللہ تعالیٰ سے رہائی کی دعا کرے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پہلے آدمی کی دعا پر اللہ نے وہ پتھر غار کے منہ سے تھوڑا سا سرکا دیا۔ پھر دوسرے نے دعا کی تو پتھر کچھ مزید ہٹ گیا۔ حتیٰ کہ تیسرے

آدمی کی دُعا کے ساتھ ہی اللہ نے ان محصورین کا راستہ کھول دیا اور وہ غار سے باہر آ گئے۔ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ رقیم سے یہ اشخاص مراد ہیں۔ گویا آپ کے نزدیک اصحاب کہف اور اصحاب رقیم دو مختلف گروہ ہیں اصحاب کہف وہ چھ آدمی تھے جو اپنے ایمان کو بچانے کے لیے غار میں چھپ گئے تھے اور جنہیں اللہ نے تین سو سال تک سلائے رکھا اور اصحاب رقیم یہ تین آدمی تھے جو غار میں پھنس کر رہ گئے تھے مگر اللہ نے انہیں رہائی دیدی۔

تاہم اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ اصحاب کہف والرقیم ایک ہی گروہ ہے ان کو اصحاب کہف غار میں پناہ گزین ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں اور رقیم ان کی بستی کا نام تھا اس لیے اصحاب رقیم بھی کہلاتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ رقیم اُس پہاڑ کا نام ہے جس کی غار میں یہ لوگ اتنا لمبا عرصہ سوئے رہے۔ بعض کہتے ہیں کہ رقیم اُس کتے کا نام تھا جو ان لوگوں کی پناہ گزینی کے دوران غار کے منہ پر بیٹھا رہا۔

بعض فرماتے ہیں کہ رقیم بروزن فعیل ہے مگر مفعول کے معنی دیتا ہے۔ اس طرح رقیم درحقیقت مرقوم ہے، گویا اصحاب کہف کے نام کتبے پر مرقوم یعنی لکھے ہوئے تھے اس لیے انہیں اصحاب رقیم بھی کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اصحاب کہف بڑی حیثیت کے لوگ تھے۔ ان کا تعلق شاہی خاندان سے تھا یا حکومت وقت کے اعلیٰ عہدیداروں کی اولاد تھے۔ جب یہ لوگ اچانک لاپتہ ہو گئے تو ان کی تلاش کی ہر ممکن کوشش کی گئی مگر تمام سرکاری اور نجی ذرائع کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ چنانچہ ان افراد کی نمایاں حیثیت اور واقعہ کی عجیب و غریب نوعیت کے پیش نظر حکومتی سطح پر ان لوگوں کے نام اور دیگر کوائف کسی کتبے پر لکھ کر سرکاری محافظ خانے میں محفوظ کر لیے گئے۔ اس طرح یہ لوگ اپنے نام مرقوم ہو گئے

کی وجہ سے اصحاب الرقیم کہلائے۔

بعض فرماتے ہیں کہ اصحاب کہف کے نام اور کوائف ان کی گمشدگی کے وقت لکھ کر محفوظ نہیں کیے گئے تھے بلکہ تین سو سال کے بعد جب یہ لوگ نیند سے بیدار ہوئے تو زمانہ بدل چکا تھا، کئی سلاطین تبدیل ہو چکی تھیں۔ جب اس عجیب و غریب واقعہ کا انکشاف ہوا، تو اس وقت ان کے نام وغیرہ ایک کتبے پر لکھ کر اس غار کے دہانے پر رکھ دیئے گئے جس میں وہ سوئے رہے۔ اس لحاظ سے ان کو اصحاب رقیم کہا جاتا ہے۔ بعد میں وہاں پر مسجد بھی تعمیر کر دی گئی۔ تو گویا اصحاب کہف والرقیم کا معنی ہے غار اور تختی والے۔

چند نوجوان

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کا واقعہ اجمالی طور پر اس طرح بیان فرمایا ہے اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ جب کہ پناہ پکڑی چند نوجوانوں نے غار کے اندر۔ یہ نوجوان تعداد میں چھ تھے اور ساتواں وہ چرواہا تھا۔ جو راستہ چلتے ان کے ساتھ شریک ہو گیا تھا اور آٹھواں اس چرواہے کا کتا تھا۔ جب دورانِ سفر ان لوگوں کی چرواہے سے ملاقات ہوئی تو اس نے ان کے حالات اور سفر کا مقصد معلوم کرنا چاہا۔ پہلے تو وہ اپنے متعلق حقیقتِ حال واضح کرنے سے ہچکچائے مگر بعد میں چرواہے کے اصرار پر انہوں نے پوری بات کہہ دی۔ چرواہے نے کہا کہ میں بھی تمہاری طرح صحیح عقیدے پر ہوں، لہٰذا مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کر لو۔ چنانچہ وہ بھی ساتھ چل دیا۔ وہ لوگ چرواہے کے اس کتے کو بھگانا چاہتے تھے۔ مگر کتا ان کا ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا جب ان لوگوں نے کتے کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا تو اللہ نے اسے قوتِ گویائی عطا فرمائی اور وہ کہنے لگا، مجھے بھگاؤ نہیں۔ میں بھی تم جیسے نیک لوگوں کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہوں۔ مجھے ہمراہ لے چلو جب

آئندہ کیا کرو گے تو میں تمہاری پہریداری کیا کروں گا۔ چنانچہ سات وہ تھے
اور آٹھواں یہ کتا بھی ان کے ہمراہ ہو لیا۔ اس کا ذکر بھی آگے آرہا ہے

ان نوجوانوں کی طرح بعض دیگر بڑے بوڑھے بھی دین حق پر قائم تھے
مگر بادشاہِ وقت کے ظلم و ستم کو مدِنظر رکھتے ہوئے نہ اس کے خلاف آواز بلند
کر سکتے تھے اور نہ ہی وہاں سے ہجرت کرنے کی طاقت پاتے تھے۔
بے حمیتی اور ظلم و جور کی گندگی سے نکل جانے کا انقلابی قدم ان چند نوجوانوں
ہی کے حصے میں آیا۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ انقلاب ہمیشہ نوجوانوں کے
ذریعے ہی آتا ہے۔ پوری زندگی میں جوانی کا زمانہ ہی ایک قیمتی سرمایہ ہوتا
ہے اور دنیا میں بڑے بڑے انقلاب نوجوانوں کے ہاتھوں ہی برپا ہوئے
ہیں۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اولین جاں نثاران بھی زیادہ تر
نوجوان لوگ ہی تھے۔ بوڑھے لوگ خال خال ہی تھے جو اسلام کے ابتدائی
دور میں آپ پر ایمان لائے۔ تو یہی نوجوان قرآن پاک کے
پروگرام کو لے کر آگے بڑھے، اور دین کا پیغام دنیا بھر میں پھیلا دیا۔
قرآن میں بہت سی جگہوں پر جوانی اور شباب کا ذکر ہے۔ اگر نوجوانوں کی
صحیح تربیت کی جائے اور انہیں صحیح لائن پر لگا دیا جائے تو یہ لوگ ملک
ملت کا بہترین سرمایہ ثابت ہوتے ہیں۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ موجودہ
دور میں نوجوانوں کے معاملہ میں بالکل بے اعتنائی برتی جارہی ہے انہیں
صحیح تربیت دینے کی بجائے کھیل تماشے، عریانی، فحاشی اور فلم بینی پر لگایا
جارہا ہے جس کی وجہ سے ان کی انقلابی صلاحیت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے

اصحاب کہف کا زمانہ

واقعہ اصحاب کہف کی تفصیلات بیان کرنے کے باوجود قرآن
پاک نے اس واقعہ کے زمانہ کا تعین نہیں کیا ظاہر ہے کہ قرآن کوئی تاریخ
کی کتاب تو نہیں ہے جو ہر واقعہ کی جزئیات بھی بیان کرے۔ یوں بھی
قرآن حکیم میں یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے علاوہ کسی بھی نبی کا واقعہ یا کوئی

دیگر تاریخی واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا۔ البتہ صرف وہ واقعات بیان کیے گئے ہیں جو بنی نوع انسان کے لیے عبرت اور بصیرت کا سامان پیدا کرسکیں۔ بایں ہمہ بعض فرماتے ہیں کہ چونکہ یہود کو اس واقعہ کے ساتھ خاص لگاؤ ہے، اس لیے یہ واقعہ مسیح علیہ السلام کے دور سے پہلے پیش آیا ہے۔ اس واقعہ کے زمانہ کے متعلق بھی کہتے ہیں کہ یہ انتوکس بادشاہ کا زمانہ تھا جو مسیح علیہ السلام سے ۱۶۱ برس پہلے گزرا ہے۔ یہ بڑا ظالم بادشاہ تھا) اس نے بیت المقدس کو گرا کر یہاں مندر تعمیر کروایا۔ جہاں پر بت پرستی ہوتی تھی۔ یہ شخص خود بھی کفر و شرک میں ڈوبا ہوا تھا۔

بعض کہتے ہیں کہ اصحاب کہف کا واقعہ روم کے بادشاہ قیصر (DECIOS ڈیسس) کے دور میں پیش آیا جو مسیح علیہ السلام سے ۲۵۱ برس بعد گزرا ہے۔ یہ بھی بڑا ظالم بادشاہ مشہور تھا، خاص طور پر مسیح علیہ السلام کے پیروکاروں پر بڑے ظلم و ستم ڈھاتا تھا۔ عربی زبان میں اس بادشاہ کا نام دقیانوس بتایا جاتا ہے۔ اسی زمانے میں یہ چند نوجوان کہیں سفر پر گئے تو کسی مقام پر انہوں نے کسی نیک آدمی کا وعظ سنا تو اس سے متاثر ہو کر دین حق کو قبول کر لیا۔ پہلے تو اپنے دین کو چھپاتے رہے مگر جب بادشاہ کا ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا تو یہ مجبور ہو گئے۔ وہ بادشاہ لوگوں کو غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرنے پر مجبور کرتا تھا اور غیر اللہ کے نام کی قربانیاں بھی کرواتا تھا۔ چونکہ یہ چند نوجوان ایسا کرنے کے لیے تیار نہ تھے لہٰذا انہوں نے بستی سے بھاگ جانے کا پروگرام بنایا اور اس طرح اس غار میں آکر چھپ گئے۔ ان کو غار میں سوتے سوتے ۳۰۹ سال گزر گئے اور اس طرح مسیح علیہ السلام کے بعد ۵۶۰ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ حضور علیہ السلام کی ولادت باسعادت ۵۷۱ء میں ہوئی اور اس طرح اصحاب کہف آپ کی ولادت سے بیس سال پہلے نیند سے بیدار ہوئے۔ مختلف زمانوں کا

تعین مؤرخین کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ ہے مگر یقینی طور پر کسی زمانے کا تعین نہیں کیا
جا سکتا کیونکہ اس ضمن میں وحی الٰہی خاموش ہے۔ اس ضمن میں امام جلال الدین سیوطیؒ
اپنی اصول تفسیر کی کتاب میں فرماتے ہیں أَبْهِمُوا مَا أَبْهَمَهُ اللّٰهُ جس
بات کو اللہ نے پردے میں رکھا ہے اسے پردے میں ہی رہنے دو اور اس
کی تفصیل میں مت پڑو۔ ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ جتنا اللہ نے اس
واقعہ سے پردہ اٹھایا ہے...

اصحاب کہف کا مقام

اس واقعہ کے مقام کے متعلق بھی مؤرخین اور مفسرین میں اختلاف
پایا جاتا ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ واقعہ شام کے علاقے میں پیش آیا۔ مولانا
ابوالکلام آزاد نے پیٹرا (بطرا) کا نام لکھا ہے کہ اس مقام پر یہ واقعہ
پیش آیا۔ سید سلیمان ندوی نے بھی ایسا ہی اشارہ کیا ہے یہ خلیج عقبہ
کے پاس کوئی جگہ تھی۔ بعض مفسرین نے اندلس کا ذکر بیان کرتے ہیں کیونکہ
وہاں کی تاریخ میں اس قسم کے واقعات ملتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں ایشائے
کوچک میں افسوس کے مقام پر یہ واقعہ پیش آیا۔ تاہم زیادہ گمان یہی ہے
کہ یہ شام یا اس کے اطراف میں کوئی مقام ہے۔ قرآن و حدیث میں اس
کی کوئی تصریح موجود نہیں ہے۔ البتہ دمشق سے پچیس میل کی مسافت
پر ایک غار ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ یہی اصحاب کہف کا مقام ہے
لوگ اس غار کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث بھی جب
حج کر کے واپس آ رہے تھے تو دمشق پہنچ کر آپ نے بھی اس غار کی
زیارت کی تھی۔ وہاں پر کچھ قبریں ہیں۔ کتبے بھی لگے ہوئے ہیں۔ مسجد
بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ اصحاب کہف کی غار ہے۔ واللہ اعلم

اصحاب کہف کی دعا

بہرحال اللہ نے فرمایا کہ جب پناہ پکڑی چند نوجوانوں نے پہاڑ کی غار
میں فَقَالُوا تو انہوں نے یہ دعا کی رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ
رَحْمَةً اے ہمارے پروردگار! دے ہمیں اپنی طرف سے مہربانی

وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا اور مہیا کر دے ہمارے لیے ہمارے معاملہ میں درستگی کی بات۔ دراصل یہ تعلق باللہ کی درستگی کی بات ہے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مدارِ فوز و فلاح تعلق باللہ کی استواری پر ہی ہے۔ ان لوگوں کا تعلق اللہ کے ساتھ صحیح تھا جبھی تو یہ محض دینِ حق کی حفاظت کے لیے گھربار چھوڑ کر غار میں پناہ گزین ہو گئے تھے تو انہوں نے انتہائی بے کسی کی حالت میں اپنے مالک الملک کے حضور دعا کی۔ ان کی بے بسی اور مجبوری کا حال اگلے رکوع میں بیان کیا جا رہا ہے۔

نیند اور بیداری

اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا کہ ہم نے ان کی دعا اس طرح قبول کی۔ فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا ہم نے ان کے کانوں پر تھپکی دیدی غار کے اندر سال ہا سال گنے ہوئے جس طرح ماں بچے کو سلانے کے لیے تھپکی دیتی ہے، اسی طرح اللہ نے ان اصحاب کہف کو میٹھی نیند سلا دیا اور اس نیند کو اتنا طویل کر دیا کہ جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ بعض لوگ کئی کئی دن تک بیہوش رہتے ہیں۔ یہ بیہوشی ماہ دو ماہ یا سال دو سال تک بھی ہو سکتی ہے مگر تین سو نو سال تک سلائے رکھنا اپنی نوعیت کا واحد واقعہ ہے۔

فرمایا ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ پھر ہم نے ان کو اٹھایا یعنی نیند سے بیدار کیا لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَىٰ لِمَا لَبِثُوا أَمَدًا تاکہ ہم آشکارا کر دیں کہ دونوں گروہوں میں سے مدتِ قیام کو زیادہ یاد رکھنے والا کون سا گروہ ہے۔ اصحاب کہف کے قیام کی مدت میں بہت زیادہ اختلاف تھا حتیٰ کہ خود ان کے اندر بھی دو گروہ بن گئے۔ کسی نے کہا کہ ایک دن یا اس کا کم و بیش حصہ ٹھہرے ہیں اور کسی نے کچھ اور مدت بتائی۔ بہرحال اللہ نے فرمایا کہ سلانے کے بعد ہم نے انہیں اٹھایا تاکہ قیام کی مدت کے متعلق زیادہ صحیح گروہ کو واضح کر دیں۔

درس چہارم ۴ آیت ۱۳ تا ۱۵

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ۚ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾ وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۠ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ۚ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۱۵﴾

ترجمہ:- ہم بیان کرتے ہیں آپ کے اوپر حال ان (اصحاب کہف) کا حق کے ساتھ۔ بیشک وہ چند نوجوان تھے جو ایمان لائے اپنے رب پر اور ہم نے زیادہ دی ان کو ہدایت ﴿۱۳﴾ اور مضبوط کر دیا ہم نے اُن کے دلوں کو۔ جب وہ کھڑے ہوئے تو انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے۔ ہرگز نہیں ہم پکاریں گے اس کے سوا کسی اور کو الٰہ۔ البتہ تحقیق ہم کہیں گے اُس وقت بات زیادتی والی ﴿۱۴﴾ یہ ہماری قوم ہے جنہوں نے بنا لیا ہے اس (اللہ) کے سوا دوسروں کو معبود۔ کیوں نہیں لاتے وہ اس پر کوئی کھلی دلیل پیس کون زیادہ ظالم ہے اُس سے جو افتراء باندھے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ ﴿۱۵﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کا اجمالی ذکر کیا کہ ہماری
قدرت کی نشانیوں میں یہ کوئی واحد حیرت انگیز نشانی نہیں بلکہ کائنات میں
اس قسم کی بے شمار نشانیاں بکھری پڑی ہیں جنہیں دیکھ کر اللہ کی وحدانیت
اور اس کی قدرتِ تامہ پر یقین آتا ہے۔ فرمایا یہ چند نوجوان تھے جنہوں نے
غار میں پناہ پکڑی اور اپنے رب سے دعا کی کہ اے پروردگار! ہمیں اپنی جانب
سے مہربانی عطا فرما اور ہمارے معاملے میں درستگی پیدا فرما دے۔ اللہ نے
ان کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور ان کے کانوں پر تھپکی دے کر سال ہا سال
تک سلائے رکھا۔ پھر مدتِ مدید کے بعد انہیں نیند سے بیدار کیا تاکہ
واضح ہو جائے کہ ان کے غار میں ٹھہرنے کی مدت کے بارے میں کون
سا گروہ زیادہ یاد رکھتا ہے۔

چند ایماندار نوجوان

اب آج کے درس سے اصحاب کہف کا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان
کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ
بِالْحَقِّ ہم بیان کرتے ہیں آپ پر ان کا حال تحقیق کے ساتھ یعنی ہم
صحیح صحیح واقعات کو بیان کرتے ہیں اور اس میں صرف وہی حصہ بیان ہوگا
جو لوگوں کے لیے باعثِ عبرت اور مفید ہو۔ عام قصے کہانیوں کی طرح
تمام جزئیات کو بیان کرنا قرآن کریم کا موضوع نہیں ہے۔ فرمایا
اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ بیشک وہ چند نوجوان تھے۔ جو اپنے ظالم مشرک
اور بت پرست حاکم سے تنگ آچکے تھے۔ اس زمانے میں قیصرِ روم
ڈیسیس کا تسلط شام تک تھا۔ یہ شخص لوگوں سے زبردستی بت پرستی کراتا
اور غیر اللہ کے نام کی قربانیاں کراتا جو اس کے حکم کی خلاف ورزی
کرتا، اس پر تشدد کرتا۔ عام مشہور یہی ہے کہ چند نوجوان بھی اسی ظالم بادشاہ
کی سلطنت میں ملک شام میں رہتے تھے اور جس پہاڑ کی غار میں انہوں
نے پناہ لی تھی۔ اس کا نام تاسون تھا اور وہ بھی اسی علاقہ میں تھا۔ اگرچہ

بعض یہ واقعہ ایشیائے کوچک، بعض اندلس اور بعض عقبہ کا بتاتے ہیں، تاہم زیادہ صحیح بات یہی ہے کہ یہ شام کا علاقہ تھا۔ یہ غار آج بھی موجود ہے جس کی زیارت کے لیے لوگ جاتے ہیں۔

بہرحال یہ چند نوجوان تھے اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے، انہوں نے کفر، شرک اور غیر اللہ کی نذر و نیاز دینے سے بیزاری کا اظہار کر دیا تھا اور اس طرح صحیح دین کو اختیار کر لیا تھا۔ یہ سب اچھی حیثیت کے لوگ تھے۔ بعض خود سرکاری ملازم تھے اور بعض اعلیٰ عہدیداروں کی اولاد میں سے تھے۔ یہ لوگ کسی سفر پہ گئے۔ تو وہاں انہیں کوئی نیک آدمی مل گیا جس نے ان کو عیسٰی علیہ السلام کے صحیح دین سے روشناس کرایا اور اس طرح یہ لوگ کفر اور شرک کا راستہ چھوڑ کر ایمان کے راستے پر گامزن ہو چکے تھے۔ اس وقت سریانی زبان رائج تھی جس کا رسم الخط عربی تھا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہندی اور سنسکرت دو مختلف زبانیں ہیں مگر ان کا رسم الخط ملتا جلتا ہے۔ اصل انجیل بھی سریانی زبان میں تھی جو اب معدوم ہو چکی ہے اور اب انجیل کے محض تراجم ہی ملتے ہیں جو دنیا کی مختلف زبانوں میں کیے گئے ہیں۔ بہرحال امام جلال الدین سیوطیؒ اور دیگر مفسرین کرام نے اسی سریانی زبان میں ان نوجوانوں کے نام بھی نقل کیے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) یملیخا۔ (۲) مکسل مینا (۳) مثلینا (۴) مرنوش (۵) برنوش۔ (۶) شاذنوش (۷) مرطوش۔ ان کے کتے کا نام قطمیر یا قطمور تھا۔ البتہ قدیم ترین مفسر قرآن امام ابن جریر طبریؒ نے حسب ذیل آٹھ نام لکھے ہیں (۱) مکسل مینا (۲) محسیلمینا (۳) یملیخا (۴) مرطوس (۵) کشوطوش (۶) بیرونس (۷) دینموس (۸) بیطونس قالوس۔ عام مشہور یہی ہے کہ یہ چھ نوجوان تھے جو اپنی بستی سے نکل کھڑے ہوئے۔ ساتواں ایک چرواہا تھا۔ جو ان کے

ساتھ شامل ہوگیا۔ اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔

جوانی کا بہترین دور

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی میں جوانی کا دور ہی ایسا زمانہ ہے جس میں انسان کچھ کر سکتا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ نے انسانی زندگی کے تین دور بیان فرمائے ہیں۔ یعنی بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ بچپن کا زمانہ ناسمجھی کا زمانہ ہوتا ہے اور انسان ناسمجھی کی وجہ سے کوئی اہم کام انجام نہیں دے سکتا۔ بڑھاپا ضعف اور کمزوری کا دور ہوتا ہے اس لیے اس دور میں انسان کوئی انقلابی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ البتہ جوانی کا دور ہی قوت کا دور ہوتا ہے جس میں انسان انقلابی اقدام کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کی فکر صحیح ہو۔ حضور علیہ السلام پر پہلے ایمان لانے والے بھی نوجوان ہی تھے جنہوں نے پوری دنیا میں اسلامی انقلاب برپا کر دیا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جو بوڑھے آدمی ایمان لائے ان کی تعداد اٹھارہ اور بیس کے درمیان ملتی ہے۔

حدیث شریف میں جن سات آدمیوں کو قیامت کے دن عرش کا سایہ نصیب ہوگا۔ ان میں شَابٌّ نَشَأَ فِی عِبَادَۃِ اللّٰہِ بھی ہے یعنی وہ نوجوان جس کا وقت زیادہ تر عبادت الٰہی میں گزرا ہے۔ فارسی والے بھی کہتے ہیں۔

شعر

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری
وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیزگار

رجوع الی اللہ کا اصل وقت جوانی کا زمانہ ہے اور یہ اللہ کے نبیوں کا شیوہ ہے ورنہ بوڑھا ہو کر تو ظالم بھیڑیا بھی اللہ اللہ کرنے لگتا ہے حافظ نے جوانی کے عالم کو اس طرح محسوس کیا ہے۔

رندی و خرافاتی در عہد شباب اولیٰ

یعنی رندی اور خرافاتی بھی جوانی کی عمر میں ہی ممکن ہے، بڑھاپے اور بچپن میں تو کچھ نہیں ہو پاتا۔

جگر مراد آبادی بھی کہتا ہے۔

خصت ہوئی شباب کے ہمراہ زندگی
کہنے کی بات ہے کہ جئے جا رہا ہوں میں

جوانی کا دور ختم ہوا تو سمجھو کہ زندگی ختم ہوگئی کیونکہ بڑھاپے میں ضعف اور امراض کے سوا کیا رہ جاتا ہے!

حضرت خواجہ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کے مرید اور بڑے پائے کے عالم اور شاعر عراقی کہتے ہیں۔

افسوس کہ ایام جوانی بگذشت
سرمایۂ عیش جاودانی بگذشت
خفتم بکنارِ جوئے چنداں!
کز جوئے من آب زندگانی بگذشت

افسوس کہ جوانی کا عالم گذر گیا حقیقت یہ ہے کہ عیش و عشرت کا زمانہ بیت گیا۔ میں ندی کے کنارے ایسا غافل ہو کر سویا کہ زندگی کا پانی ہی ختم ہوگیا۔ یعنی زندگی ختم ہوگئی اور میں غفلت میں پڑا رہا۔

ہدایت میں اضافہ

بہر حال ان چند اہل ایمان نوجوانوں کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ جب انہوں نے کفر اور شرک ترک کر کے ایمان کا راستہ اختیار کر لیا۔ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى تو ہم نے ان کے لیے ہدایت کا سامان زیادہ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص کفر و شرک کے اندھیروں سے نکل کر ایمان کی روشنی میں آتا ہے اور پھر اس راستے پر آنے والے تمام مصائب و آلام کو برداشت کرتے ہوئے صحیح راستے پر گامزن رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ایمان میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔ سورۃ محمد میں موجود ہے "وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ" جو لوگ ہدایت کا راستہ پکڑتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت میں اضافہ کرتے

اور انہیں تقویٰ کا راستہ عطا کرتے ہیں۔

اِن نوجوانوں نے بھی اپنا تعلق اللہ کے ساتھ مضبوط کر لیا تھا، پھر انہوں نے بادشاہ وقت کی کوئی پرواہ نہ کی۔ بت پرستی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ ہم مخلوق کی خاطر اپنے خالق کو ناراض نہیں کریں گے۔ اِن کے دل خشیتِ الٰہی اور تقویٰ سے معمور تھے، اللہ نے انہیں صبر و استقلال عطا فرمایا اور وہ حق کی بات پر ڈٹے رہے۔ اسی بات کے متعلق اللہ نے فرمایا وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ہم نے اُن کے دلوں کو مضبوط کر دیا۔ جس شخص کا تعلق اللہ کے ساتھ درست ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اُس کے دل کو مضبوط کر دیتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے متعلق سورۃ القصص میں موجود ہے "لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا" اگر ہم اُن کے دل کو مضبوط نہ کرتے تو قریب تھا کہ وہ اس معاملہ کو ظاہر کر دیتیں۔ مگر جس کا تعلق اللہ کے ساتھ درست ہو جائے، اللہ تعالیٰ اس کے دل کو مضبوط کر دیتے ہیں۔ آپ پر کڑی آزمائش آئی۔ بچے کو صندوق میں بند کر کے پانی میں بہا دیا۔ مگر ثابت قدم رہیں اور راز کو ظاہر نہ کیا۔

نوجوانوں کی حق گوئی

بہرحال یہ نوجوان دینِ حق پر قائم رہے، اِن کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ جب ان کے ایمان کا چرچا ہونے لگا تو انہیں پکڑ کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اُن کے لیے یہ سخت آزمائش کا وقت تھا۔ اللہ نے فرمایا اِذْ قَامُوْا جب وہ کھڑے ہوئے یعنی بادشاہ کے دربار میں جوابدہی کے لیے پیش ہوئے فَقَالُوْا تو انہوں نے کہا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہمارا پروردگار تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ہم کسی دوسری ذات کو رب تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ کہنے لگے لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ

دُوْنِهٖٓ اِلٰـهًا ہم اللہ کے سوا کسی دوسرے کو ہرگز معبود نہیں پکاریں گے۔ اگر ہم نے کسی دوسری ذات کو بھی معبود مان لیا لَقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا تو ہم بہت زیادتی والی بات کریں گے۔ ہم تو اللہ کے سوا کسی کو حاجت روا اور مشکل کشا ماننے کے لیے تیار نہیں، خالق، مالک، متصرف، عالم الغیب صرف وہی ہے۔ کہنے لگے کہ افسوس کا مقام ہے هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً یہ ہماری قوم کے لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کے سوا طرح طرح کے معبود بنا رکھے ہیں۔ یہ لوگ اپنی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے مختلف آستانوں کا رخ کرتے ہیں، مگر ہمارا تو معبود ایک ہی ہے۔

فرمایا لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ یہ لوگ کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لاتے جس سے ثابت ہو کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا بھی معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی حاجت روا اور مشکل کشا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں کوئی دلیل موجود ہی نہیں۔ یہ کہاں سے لائیں گے؟ وہ رسنی سنائی اور جہالت کی باتیں تو ہو سکتی ہیں معقول دلیل کوئی نہیں ہو سکتی۔ اُن کے پاس زیادہ سے زیادہ یہ دلیل ہے کہ ہم تو اس بات کا اتباع کرتے ہیں " مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا " (البقرۃ - ۱۷۰) جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا۔ ہمارے قبیلے اور برادری کے لوگ ایسا ہی کرتے تھے کیا وہ سارے بیوقوف تھے؟ فلاں غیر اللہ کی نیاز دیتا ہے، فلاں قبروں پہ چادریں چڑھاتا ہے، لہٰذا ہم بھی اسی طرح کرتے ہیں۔ یہی اندھی تقلید ہے جو کہ انسانوں کے لیے تباہ کن ہے یہ تقلید عقل، بصیرت اور فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔ غرضیکہ کفر، شرک اور رسوماتِ باطلہ پر کوئی بھی عقلی یا نقلی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی۔ تو ان نوجوانوں نے بھی یہی کہا کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود بنانے میں کوئی

دلیل نہیں ہے۔ اگر ہے تو لائیں۔

افترا علی اللہ

اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قدرت تامہ کی ہزاروں دلیلیں موجود ہیں جو انسانی عقل کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں۔ سابقہ اقوام اور آسمانی کتابوں سے منقول دلیلیں بھی ہیں اور روزمرہ مشاہدے میں آنے والی دلیلیں بھی موجود ہیں۔ فرمایا یہ لوگ کیوں نہیں کھلی دلیل لاتے۔ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا پس اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو خدا تعالیٰ پر افترا باندھتا ہے۔ کفر، شرک کرنا خدا پر افترا باندھنا ہے۔ دوسری جگہ موجود ہے کہ اگر ارض و سما میں کوئی دوسرا الٰہ ہوتا تو خدا تعالیٰ کے علم میں ہوتا۔ ہرگز ایسا تو نہیں ہے "أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ" (الرعد۔ ۳۳) کیا تم اللہ کو وہ بات بتانا چاہتے ہو۔ جو اس کے علم میں نہیں۔ جو چیز خدا کے علم میں نہیں۔ اُس کا وجود کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب افترا علی اللہ ہے۔ اس کے علاوہ غیر اللہ میں الوہیت ثابت کرنا، یا خدا تعالیٰ کی صفت خاصہ کسی دوسری ذات میں ماننا، قیامت کا انکار کرنا، نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنا سب اللہ پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہے۔ اسلام نے ایسی تمام چیزوں کا علاج سبحان اللہ کے لفظ سے تجویز کیا ہے۔ فرمایا "سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ" (الحشر۔ ۲۳) خدا کی ذات ان تمام چیزوں سے پاک ہے۔ جن کو وہ ذات کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ ہر وقت لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کا ورد رکھو، اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا اقرار کرو۔ اس کی تسبیح اور تنزیہہ بیان کرو۔ کہ شرک کا ارتکاب، خدا پر جھوٹ باندھنے والی بات ہے۔

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾ وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾ وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿۱۸﴾

ترجمہ:- اور جب تم اُن (اپنی قوم) سے الگ ہو گئے ہو، اور اُن سے بھی جن کی یہ پُوجا کرتے ہیں اللہ کے سوا، تو اب رجوع کرو غار کی طرف۔ پھیلائے تمہارے لیے تمہارا پروردگار اپنی رحمت سے اور بنا دے تمہارے لیے تمہارے معاملے میں نرمی ﴿۱۶﴾ اور (اے مخاطب) تم دیکھو گے سورج کو کہ جس وقت وہ طلوع ہوتا ہے، تو کترا جاتا ہے اُن کے

غار سے دائیں طرف۔ اور جس وقت وہ غروب ہوتا ہے
تو کترا جاتا ہے اُن سے بائیں طرف اور وہ ایک کشادہ
جگہ میں ہیں اس غار سے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے
ہے۔ جس کو اللہ ہدایت دے پس وہی ہدایت پانے والا
ہے۔ اور جس کو گمراہ کر دے، پس ہرگز نہیں پائے گا
تو اس کے لیے کوئی کارساز اور کوئی راہِ راست پر لانے
والا (۱۷) اور (اے مخاطب) تم گمان کرو گے ان (اصحابِ کہف)
کو کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔ اور ہم پلٹتے
ہیں اُن کو دائیں طرف اور بائیں طرف، اور ان کا کتا پھیلائے
ہوئے ہے اپنے پاؤں اس غار کی چوکھٹ پر۔ اگر تو جھانک
کر دیکھے ان پر تو البتہ پشت پھیر کر اُن کی طرف سے
بھاگے گا۔ اور بھر جائے گا تیرا دل ان کی طرف سے رعب
اور دہشت میں (۱۸)

ربطِ آیات: اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کے متعلق فرمایا کہ وہ چند نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے۔ اللہ نے اُن کے لیے ہدایت کا سامان زیادہ کر دیا۔ پھر ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا۔ جب اُن کو مشرک اور ظالم بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے کھڑے ہو کر صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا پروردگار وہی ہے۔ جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے۔ ہم اُس کے سوا کسی دوسری ذات کو معبود ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو سخت زیادتی کرنے والے ہوں گے۔ ہماری قوم کے جن لوگوں نے اللہ کے سوا معبود بنا رکھے ہیں اُن کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ فرمایا اس شخص سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر افترا باندھتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی الوہیت میں دوسروں کو شریک بنانا افترا علی اللہ ہے۔ قیصر دقیانوس نوجوانوں کی یہ باتیں سن کر

متعجب ہوا کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو میری سلطنت میں میرے سوا کسی دوسرے کو معبود مانتے ہیں۔ تاہم اس نے ان نوجوانوں کے متعلق اپنا فیصلہ التوا میں ڈال دیا۔

بادشاہ کے سامنے پیشی

اس التواء کے متعلق مفسرین نے مختلف باتیں بیان کی ہیں بعض کہتے ہیں کہ بادشاہ نے ایک دن کی مہلت دی بعض تین دن اور بعض چند دن کا ذکر کرتے ہیں بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ بادشاہ کہیں باہر دورے پر جا رہا تھا تو اس نے اپنی واپسی تک اپنا فیصلہ مؤخر کر دیا تاکہ دیکھے کہ اس دوران میں یہ نوجوان اپنے عقیدے سے باز آتے ہیں یا نہیں بہر حال نوجوانوں کو بادشاہ کی غیر حاضری میں صلاح مشورہ کرنے کا موقع مل گیا، چنانچہ انہوں نے آپس میں طے کیا کہ اب ہمارا یہاں رہنا مناسب نہیں اگر اپنے عقیدۂ توحید پر قائم رہتے ہیں تو بادشاہ قتل کرا دے گا۔ اور اگر ہم بادشاہ کی بات مان کر اپنے عقیدہ کو چھوڑ دیں تو پھر دائمی خسارے میں پڑ جائیں گے اور ہمیں کبھی کسی طرح نجات نہیں ہو سکے گی۔ لہٰذا بہتر ہے کہ ہم یہاں سے کہیں جا کر روپوش ہو جائیں تاکہ اپنا عقیدہ بھی بچا سکیں اور بادشاہ کے شر سے بھی بچ جائیں۔ بعض مفسرین یہ بھی فرماتے ہیں کہ جب ان نوجوانوں نے بادشاہ کے بھرے دربار میں اپنے عقیدے کا اظہار کیا تو بادشاہ نے فوری طور پر ان کو سرکاری لباس اتروا دیا گیا ان کو سرکاری حیثیت سے معطل کر دیا اور حتمی فیصلے کے لیے چند دن کی مہلت دے دی۔

روپوشی کا منصوبہ

بہر حال موقع غنیمت جان کر یہ نوجوان وہاں سے بھاگ نکلے راستے میں ان کی ملاقات ایک چرواہے سے ہو گئی۔ اس نے ان کی پریشانی کو بھانپ لیا اور پوچھا کہ کیا بات ہے۔ پہلے تو انہوں نے کچھ بتانے سے لیت و لعل کیا لیکن بالآخر انہوں نے دل کی بات کہہ دی کہ وہ اس طرح بھاگ کر آئے ہیں۔ چرواہے نے کہا کہ میں بھی تمہارے عقیدے

پڑ رہوں اور تمہارے ساتھ ہی چلنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ اس نے بکریوں کا ریوڑ وہیں چھوڑا اور ان نوجوانوں کے ساتھ ہو لیا۔ البتہ اس کا کتا بھی اس کے ہمراہ چل پڑا۔ انہوں نے ہر چند کتے کو بھگانا چاہا مگر وہ کسی صورت میں ان کی ہمراہی چھوڑنے پر تیار نہ ہوا۔ جب انہوں نے کتے کو زیادہ تنگ کیا تو اللہ نے اُسے قوت گویائی عطا فرمائی۔ اور وہ یوں کہہ کہنے لگا کہ مجھے بھگاؤ نہیں، میں بھی اللہ کے دوستوں کے ساتھ ہی رہنا پسند کرتا ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو، جب تم آرام کیا کرو گے تو میں تمہارا پہرہ دیا کروں گا۔ چنانچہ چرواہے کا کتا بھی اُن کے ساتھ ہو لیا۔

کتے کا شرعی حکم

شریعت نے کتے کو ناپسندیدہ جانور قرار دیا ہے۔ حضور علیہ السلام نے سختی کے ساتھ فرمایا ہے کہ کوئی شخص بلاضرورت شوقیہ طور پر کتا نہ پالے کہ ایسا کرنے والے کی ہر روز دو قیراط نیکیاں کم ہوتی رہیں گی اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں دو بری مثالیں بیان فرمائی ہیں، ایک گدھے کی اور دوسری کتے کی۔ گدھے کی مثال تو یہودیوں کی بے عملی سے متعلق ہے کہ ان کی حالت یہ ہے "كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا" (الجمعہ ۵) جیسے گدھے پر کتابیں لدی ہوئی ہیں۔ جس طرح ایک گدھا کتابیں اٹھانے کے باوجود ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اسی طرح یہودی اہل کتاب ہونے کے باوجود اس کتاب سے مستفید نہیں ہوتے۔ اسی طرح کتے کی مثال حرص، لالچ اور شہوت پرستی کو ظاہر کرتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک بڑا نیک آدمی تھا لیکن حرص اور شہوت پرستی کا اسیر ہو کر موسیٰ علیہ السلام کے مقابل آ گیا۔ اللہ نے فرمایا فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ (الاعراف۔ ۱۷۶) ایسے شخص کی مثال کتے کی سی ہے کہ حرص کی وجہ سے ہر چیز کو سونگھتا رہتا ہے اور شہوت کی وجہ سے ہر وقت ہانپتا رہتا ہے "سَاءَ مَثَلًا الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا" (الاعراف ۱۷۷)

یہ ایسے لوگوں کی بدترین مثال ہے جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کتے کی ایک اور مثال بھی بیان فرمائی ہے
کہ جو شخص کسی کو کوئی چیز تحفے کے طور پر دے دیتا ہے اور پھر اسے واپس لیتا ہے
تو اس کی مثال کَمَثَلِ الْکَلْبِ یَقِیْءُ ثُمَّ یَعُوْدُ کتے
کی مثال ہے جو قے کر کے خود ہی چاٹ لیتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے
فرمایا لَیْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ ہماری مثال بری نہیں ہونی
چاہیئے یعنی ہمیں کتے کی خصلت کو نہیں اپنانا چاہیئے۔
امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ کتا ایک ایسا جانور ہے
جس کو شیطان کے ساتھ بڑی مناسبت ہے، اسی لیے فرمایا کہ اگر
کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اس برتن کو مٹی سے خوب مانجو اور پھر
تین دفعہ دھو ڈالو ورنہ برتن پاک نہیں ہوگا۔ البتہ سات مرتبہ دھونا مستحب ہے
شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ کتا اگرچہ بُرا جانور ہے مگر بعض کتے
اچھے بھی ہوتے ہیں۔ اس کی مثال اصحاب کہف کے کتے کی ہے وہ
اللہ کے دوستوں کی معیت میں رہا اور جو حیرت انگیز واقعات اُن
کے ساتھ پیش آئے، وہ اس کتے کے ساتھ بھی پیش آئے۔ اس کو بھی
اللہ نے اصحاب کہف کی طرح لمبی زندگی عطا فرمائی، شیخ سعدیؒ نے
گلستان میں مثال کے طور پر بیان کیا ہے ؎

پسرِ نوح بابداں بنشست — خاندانِ نبوتش گم شد
سگِ اصحابِ کہف روزے چند — پئے نیکاں گرفت مردم شد

حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا بُروں کی صحبت میں بیٹھا تو اپنے خاندان کی
بدنامی کا باعث بنا، جب کہ اصحاب کہف کا کتا نیک آدمیوں کے ساتھ
رہا تو آدمیوں جیسی خصلت کا مالک بن گیا۔
امام شاہ ولی اللہؒ کے والد شیخ عبدالرحیمؒ اولیاء اللہ میں سے تھے

راستہ چلتے ہوئے کسی تالاب یا جوہڑ وغیرہ کے کنارے سے گزرنے لگے تو سامنے سے کتا آگیا۔ آپ نے اس کتے کو قدرے حقارت کی نگاہ سے دیکھا۔ اللہ نے اس کتے کو فوراً قوت گویائی عطا فرمائی اور اس نے کہا، اللہ کے بندے! تم مجھے حقیر سمجھتے ہو، میں بھی تو تمہاری طرح اللہ کی مخلوق ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے فوراً توبہ کی۔ آپ جوہڑ کے کنارے کھڑے ہو گئے اور پہلے کتے کو گزرنے کا راستہ دیا اور کہا کہ سلامتی کے ساتھ گزر جاؤ۔ اسی طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام کے سامنے خنزیر آگیا۔ آپ نے راستہ چھوڑ دیا اور کہا کہ سلامتی سے گزر جاؤ۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت ایسے بُرے جانور کے ساتھ آپ کا یہ حسن اخلاق۔ فرمایا، بیشک یہ اللہ کی نگاہ میں معتوب جانور ہے۔ مگر میں اپنا اخلاق کیوں چھوڑوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے لو سخرت بالکلب لخشیت ان اکون کلبا اگر میں کتے کے ساتھ تمسخر کروں تو مجھے ڈر ہے کہ خدا مجھے کتا ہی نہ بنا دے۔

غار میں قیام

بہر حال کتا بھی اصحاب کہف کے ساتھ ہو لیا اور انہوں نے پہاڑ کی غار میں پناہ حاصل کی۔ اللہ نے اس غار کا حال بھی بیان کیا ہے، اللہ کے دوستوں کا اور اس کتے کا بھی۔ اللہ نے اپنے دوستوں کو جو کرامت اور بزرگی بخشی اور ان کی حفاظت کا جو غیر معمولی انتظام فرمایا، اللہ نے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ غار میں پہنچ کر انہوں نے آپس میں طے کیا کہ انہوں میں سے ایک آدمی وقتاً فوقتاً بھیس بدل کر غار سے باہر جائے۔ کھانے پینے کا سامان لائے اور ملکی حالات سے بھی آگاہی حاصل کرتا رہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک زیادہ ہوشیار آدمی فقیروں کے لباس میں باہر نکلا شہر میں جا کر خورد و نوش کا کچھ سامان خریدا، ادھر اُدھر کی کچھ باتیں سنیں اور پھر غار میں واپس آگیا۔ ایسا کتنی مرتبہ ہوا۔ اس کی کچھ تفصیل نہیں ملی۔ البتہ ایک دن اس آدمی نے واپس آکر بتایا کہ شہر میں ہماری

روپوشی کا چرچا ہے، ہماری وسیع پیمانے پر تلاش شروع ہو گئی ہے اور بادشاہ نے حکم دیا کہ ہمیں ہر صورت میں گرفتار کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی خبر اُن کے لیے تشویش کا باعث بنی۔ وہ اسی فکر میں غلطاں تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُن پر لمبی نیند طاری کر دی جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے فَضَرَبْنَا عَلَىٰ اٰذَانِهِمْ ہم نے اُن کے کانوں پر تھپکی دے دی اور وہ گہری نیند سو گئے۔ اُن کی یہ نیند سینکڑوں سال تک قائم رہی اُن کا کتا بھی غار کے منہ پر پاؤں پھیلائے بیٹھا رہا اور اس پر بھی نیند طاری ہو چکی تھی۔

تلاش میں ناکامی

بادشاہ کے حکم کے مطابق اُس کے کارندوں نے اللہ کے ان دوستوں کی وسیع پیمانے پر تلاش شروع کر دی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ بعض لوگ اس غار کے دہانے تک بھی پہنچ گئے۔ انہیں اندر کسی کی موجودگی کا شبہ ہوا تو انہوں نے غار کے منہ پر دیوار تعمیر کر کے اُسے بالکل بند کر دیا۔ مگر یہ روایت صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ اصل بات یہ ہے کہ اللہ نے اصحاب کہف کی حفاظت کا انتظام اس طرح کر دیا تھا کہ اُس غار تک کوئی پہنچ ہی نہیں سکا۔ اس قسم کے واقعات پہلے بھی گزر چکے ہیں۔ مثلاً اللہ نے حضرت عزیر علیہ السلام پر سو سال تک موت طاری کرنے کے بعد اٹھایا اور اس عرصہ وہاں پر کسی کا گذر نہیں ہونے دیا۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے اور اس میں کسی انسان کا کوئی دخل نہیں۔ ہجرت پر روانہ ہوتے وقت خود حضور علیہ السلام اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تین دن تک غار ثور میں ٹھہرے رہے۔ کفار نے آپ کی تلاش میں کونہ کونہ چھان مارا حتیٰ کہ غار کے منہ تک پہنچ گئے اور غار کے اندر سے اُن کے پاؤں بھی نظر آ رہے تھے۔ مگر اللہ نے آپ کی حفاظت کا ایسا انتظام کر دیا کہ کسی نے غار کے اندر جھانک کر دیکھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ مکڑی کا جالا اور

کبوتری کے انڈے غار کے منہ پر دیکھ کر کفار کہنے لگے کہ یہ جالا تو حضور کے والد کی پیدائش سے بھی پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔ بھلا اس کے اندر کون جا سکتا ہے۔ اس وقت حضرت صدیق کو کچھ پریشانی بھی لاحق ہوئی۔ تاہم حضور علیہ السلام نے تسلی دی اور فرمایا لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا (التوبۃ۔ ۴۰) غم نہ کریں، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

اسی طرح اللہ نے اصحاب کہف کی حفاظت کا انتظام بھی فرما دیا اور اس غار تک کسی متلاشی کی رسائی نہیں ہونے دی۔ بادشاہ کی طرف سے تلاش کرنے کہ نے خدا جانے سال یا دو سال گزر گئے مگر ناکامی ہوئی آخر کار بادشاہ کے حکم سے ان گمشدگان کے نام اور کوائف ایک تختی پر لکھ کر سرکاری محافظ خانے میں محفوظ کر دیے گئے کہ اس طرح چند نوجوان روپوش ہو گئے ہیں جن کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ ان کو اصحاب رقیم اس لیے کہا گیا ہے کہ ان کے نام تختی پر لکھ کر محفوظ کر دیے گئے تھے۔

اصحاب کہف کی مشاورت

آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اسی واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ جب اُن نوجوانوں کو بادشاہ کے سامنے حاضری کے بعد کچھ مہلت میسر آئی تو انہوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ کہنے لگے، وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ اور جب تم ان کفار و مشرکین سے کنارہ کش ہو چکے ہو وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ اور اُن سے بھی الگ ہو چکے جن کی یہ اللہ کے سوا پوجا کرتے ہیں تم نے اللہ کے سوا کسی دوسری ذات کو معبود بنانے سے انکار کر دیا ہے تو اب تمہارا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں، لہٰذا فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ کسی غار کی طرف رجوع کرو وہاں جا کر چھپ جاؤ اور پھر اللہ کے فیصلے کا انتظار کرو۔ يَنشُرْ لَكُمْ رَبُّكُم مِّن رَّحْمَتِهِ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی رحمت پھیلا دے گا۔ کیونکہ تمہارے دل نورِ ایمان سے بھرے ہوئے ہیں اور اللہ نے تمہارے

دلوں کو مضبوط کر دیا ہے۔ تمہیں اپنے مالک کی ذات پر مکمل بھروسہ ہے وہ تم پر اپنی رحمت کا سایہ کرے گا۔ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ أَمْرِكُم مِّرْفَقًا اور تمہارے معاملہ میں تمہارے لیے نرمی، سکون اور آرام کی بات مہیا کر دے گا۔ لہٰذا کوئی فکر نہ کرو اور کسی غار میں چل کر پناہ حاصل کر لو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور جیسا کہ میں نے تفصیل عرض کی وہ نوجوان اس غار میں روپوش ہو گئے۔

غار کی حالت

اب اس غار کی حالت بھی اللہ نے بیان فرمائی ہے۔ اے مخاطب! وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَت تَّزَاوَرُ عَن كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ تم دیکھو گے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو غار کی دائیں جانب کترا جاتا ہے۔ امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ غار کا رُخ مشرق مغرب کی بجائے شمالاً جنوباً تھا، یہی وجہ ہے کہ سورج کے طلوع وغروب کے وقت وہاں دھوپ کی تپش نہیں جاتی تھی۔ اللہ نے غار کی کیفیت اس طرح کی بنائی تھی کہ جب سورج طلوع ہوتا تو دائیں طرف سے بقدرِ ضرورت روشنی تو اندر جاتی مگر دھوپ کی تمازت انہیں تکلیف نہیں پہنچاتی تھی اور سورج دائیں طرف کترا کر نکل جاتا تھا۔ وَإِذَا غَرَبَت تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ اور جب سورج غروب ہونے کے قریب آتا تو بائیں طرف کترا کر نکل جاتا اور غار کے مکینوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے غار کے اندر اس طرح آڑیں کھڑی کر دی تھیں کہ تھوڑی سی دھوپ اندر پہنچی اور پھر جلدی ہی سامنے آڑ آ گئی اور سورج دائیں یا بائیں طرف کو ہو کر نکل گیا۔ البتہ روشنی اور ہوا غار میں خوب پہنچ رہی ہے وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ اور وہ غار میں کشادہ جگہ پر لیٹے ہوئے تھے۔ انہیں کوئی گھٹن وغیرہ محسوس نہیں ہوتی تھی اور پورے آرام اور سکون کے ساتھ محوِ خواب تھے۔

ہدایت اور گمراہی

فرمایا ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ یہ سب اللہ کی نشانیوں میں سے ہے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کی نشانیاں وقتاً فوقتاً ظاہر کرتا رہتا ہے۔ تاکہ انہیں دیکھ کر لوگ اس کی وحدانیت کو پہچان سکیں اور راہِ راست پر گامزن ہو جائیں۔ فرمایا حقیقت یہ ہے مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ہدایت اُسے نصیب ہوتی ہے جسے اللہ ہدایت عطا فرمائے۔ اور اللہ تعالیٰ ہدایت اُسے دیتا ہے جو اس کا طالب ہو۔ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا اور جسے اس کی ضد عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اس کے لیے نہ کوئی کارساز ہوگا اور نہ ہی کوئی راہِ راست پر لانے والا۔ جب تک اللہ کے ساتھ تعلق درست نہیں ہوگا کسی شخص کو ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی اور نہ وہ گمراہی سے بچ سکتا ہے۔ لہٰذا ہر وقت اللہ تعالیٰ سے صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق طلب کرنا چاہیئے۔ اصحاب کہف نے اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کیا۔ اس سے توفیق مانگی تو اللہ نے ان کے لیے ہدایت کا سامان پیدا کر دیا۔ یہ درمیان میں اللہ نے اصول بھی بیان فرما دیا کہ ہدایت اور گمراہی اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے لہٰذا ہدایت کے لیے اُسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا چاہیئے۔

غار میں اصحاب کہف کی حالت

ارشاد ہوتا ہے، اے مخاطب! وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ تم ان اصحاب کہف کو بیدار گمان کرو گے حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔ اندر جھانک کر دیکھو تو اُن کی آنکھیں کھلی نظر آئیں گی گویا کہ وہ جاگ رہے ہیں اور پھر یہ بھی ہے کہ ایک ہی جگہ پر پڑے پڑے اُن کے جسم گل سڑ سکتے تھے جس کا اللہ نے یہ انتظام فرمایا وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ اور ہم انہیں پلٹتے ہیں دائیں طرف اور بائیں طرف، مفسرین نے اس ضمن میں مختلف

باتیں کی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ہر دس سال کے بعد اللہ تعالیٰ اصحاب کہف کی کروٹیں بدل دیتا تھا۔ بعض نے نو سال کا ذکر کیا ہے۔ بعض نے سال بھر میں دو دفعہ اور بعض نے محرم کے دن کروٹیں بدلنے کا ذکر کیا ہے۔ بہر حال یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اُن کو کس وقت کس چیز کی ضرورت تھی اور اُن کی حفاظت کا کیا انتظام ضروری تھا۔ امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت میں جب تک اصحاب کہف کو غار میں رکھنا مطلوب تھا، اس وقت تک کسی شخص کو وہاں پہنچنے یا انہیں چھیڑنے کی توفیق نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی حالت ایسی بنا دی تھی کہ بال اور ناخن بڑھ چکے تھے، اگر کوئی شخص انہیں ایک نظر دیکھ لیتا تو دہشت کے مارے وہاں ٹھہر نہ سکتا۔ فرمایا اُن کی حالت یہ تھی کہ تم انہیں بیدار سمجھو گے۔ حالانکہ وہ تو سوئے ہوئے تھے اور ہم ان کی کروٹیں بدل رہے تھے۔

اور ان کے ساتھ کتے کی حالت یہ تھی وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ اور اُن کا کتا اپنے اگلے بازو پھیلائے غار کی چوکھٹ پر تھا وہ اتنا دہشت ناک منظر تھا کہ فرمایا اے مخاطب! لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ اگر تو ان کو جھانک کر دیکھے لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جائے گا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا اور تیرا سینہ اُن کے رعب سے بھر جائے گا۔ اللہ نے اُن کی ایسی کیفیت بنا رکھی تھی کہ تم انہیں دیکھنے کی تاب نہ لا سکو۔

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۭ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۭ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۭ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾

ترجمہ :- اور اسی طرح ہم نے اٹھایا ان کو تاکہ وہ سوال کریں آپس میں ۔ کہا ایک کہنے والے نے کہ تم کتنی دیر تک ٹھہرے ہو ۔ انہوں نے کہا کہ ہم ٹھہرے ہیں ایک دن یا دن کا بعض حصہ ۔ کہا انہوں نے تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے جتنی دیر تم ٹھہرے ہو ۔ پس بھیجو اپنے میں سے ایک کو یہ روپیہ دے کر شہر کی طرف ۔ پس دیکھے وہ کون سا کھانا پاکیزہ ہے ۔ پس لائے وہ رزق اس میں سے ۔ اور چاہیئے کہ نرمی کرے اور نہ بتلائے تمہارے بارے میں کسی کو (۱۹) اس لیے کہ بیشک اگر وہ لوگ غالب آجائینگے تم پر ، تو تم کو سنگسار کر دیں گے یا لوٹا دیں گے تم کو اپنے

دین میں اور پھر تم ہرگز نہیں فلاح پاسکو گے کبھی بھی (۲۰)

ربطِ آیات

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کی اپنی قوم سے علیحدگی کا حال ذکر کیا۔ اللہ کے ان نیک بندوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہم اپنے سچے دین پر قائم رہ کر ظالم بادشاہ کا تشدد برداشت نہیں کر سکتے، لہٰذا بہتر ہے کہ ہم یہاں سے بھاگ جائیں اور کسی پہاڑ کی غار میں روپوش ہو جائیں۔ چنانچہ اس منصوبہ کے تحت یہ لوگ شہر کے قریب ہی پہاڑ کی ایک غار میں پناہ گزیں ہو گئے۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنے میں سے ایک آدمی کو شہر بھی بھیجتے رہتے تاکہ ایک تو وہ ان کے لیے خورد و نوش کا سامان لا سکے اور دوسرے شہر کے حالات معلوم کر سکے۔ چنانچہ ان پر نیند طاری ہونے سے قبل جو شخص شہر سے ہو کر آیا اس نے بتایا کہ شہر میں سرکاری طور پر تمہاری تلاش شروع ہو چکی ہے، مختلف مقامات پر چھاپے مارے جا رہے ہیں، لہٰذا ہمارے لیے بڑا مشکل وقت آگیا ہے۔ یہ سن کر وہ سخت پریشان ہوئے، اور اسی دوران اللہ نے ان پر طویل نیند طاری کر دی اور وہ تین سو سال تک سوئے رہے۔

گزشتہ آیات ہی میں غار کے اندر کی کیفیت بھی بیان ہو چکی ہے۔ غار کا رخ اس طرح تھا کہ جب سورج طلوع ہوتا تو غار کی دائیں طرف سے اور جب غروب ہوتا تو بائیں طرف سے ہو کر نکل جاتا جس کی وجہ سے غار میں پڑے ہوئے آدمیوں کو سورج کی شدت نہ پہنچتی اور اس طرح ان کے اجسام گلنے سڑنے سے محفوظ رہے۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم اصحاب کہف پر ایک نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ وہ لوگ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ خوابیدہ ہیں۔ ان کے جسموں کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ ان کی کروٹیں بھی بدلتا رہا، اور ان کا کتا بھی اگلے بازو پھیلائے غار کی چوکھٹ پر بیٹھا رہا۔ اللہ تعالیٰ کو ان اصحاب کی حفاظت منظور تھی، اس لیے سینکڑوں سال تک اس غار

کی طرف کسی کو آنے کا موقع نہ دیا۔

نیند سے بیداری

آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کی نیند سے بیداری کا حال بیان کیا ہے۔ تین سو سال سے زائد عرصہ کے دوران بڑے تغیرات واقع ہوئے، کئی نسلیں بدلیں، سلطنتیں تبدیل ہو گئیں۔ آبادیوں میں ردوبدل ہو گیا مگر ان اصحاب کو اس دوران بھوک اور پیاس کا احساس تک نہ ہوا۔ حضرت عزیر علیہ السلام کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ وہ بھی سو سال تک سوئے رہے۔ جب بیدار ہوئے تو اللہ نے پوچھا کتنی دیر ٹھہرے ہو، کہنے لگے ایک دن یا اس کا کچھ حصہ، فرمایا نہیں بلکہ سو سال گزر چکے ہیں۔ آپ کو بھی اتنا عرصہ بھوک پیاس محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یہ اللہ کی قدرت کی نشانی ہے، وہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔ اس سلسلہ میں قادیانی حیات مسیح علیہ السلام پر اعتراض کرتے ہوئے سوال کرتے ہیں کہ جب آپ آسمانوں پر زندہ ہیں تو ان کے خورد و نوش اور بول و براز کا کیا انتظام ہے؟ یہ بالکل فضول اعتراض ہے۔ جو اللہ اس زمین پر بعض لوگوں کو بھوک پیاس کا احساس نہیں ہونے دیتا، وہ آسمان پر ایسا کیوں نہیں کر سکتا۔ عیسیٰ علیہ السلام تو دوسرے آسمان پر فرشتوں کی طرح اللہ کی تسبیح بیان کر رہے ہیں، انہیں اس مادی جہان والے کھانے پینے کی کیا حاجت ہو سکتی ہے؟ قدیم ماہرین فلکیات بھی کہتے ہیں کہ تغیرات کا جہان فلک قمر ہے۔ تمام تغیرات چاند کی سطح سے نچلے حصے میں واقع ہوتے ہیں۔ اس سے اوپر نہیں تاہم اگر اوپر بھی تغیر و تبدل واقع ہوتا ہو تو اللہ تعالیٰ کے لیے کون سی مشکل بات ہے کہ وہ کسی فرد کو تغیرات سے مستثنیٰ کر دے۔ اصحاب کہف اور عزیر علیہ السلام کے واقعات زندہ مثالیں موجود ہیں۔ بہر حال نیند سے بیدار ہونے کے بعد جب اصحاب کہف اس مادی جہان میں واپس آئے تو انہیں بھوک بھی محسوس ہوئی۔ چنانچہ جیسا کہ آگے ذکر آ رہا ہے، انہوں

نے سامان خورد و نوش حاصل کرنے کے لیے اپنے میں سے ایک آدمی کو شہر روانہ کیا۔

کتے کے خواص

تین سو سالہ خوابیدگی کے دوران جو حالات اصحاب کہف پر گزرے رہی حالات اُن کے کتے پر بھی وارد ہوئے اور وہ اُن کے ساتھ ہی محو خواب رہا اور غار کے دھانے پر بازو پھیلائے بیٹھا رہا۔ جیسا کہ میں نے گذشتہ درس میں عرض کیا تھا کہ کتا کوئی پسندیدہ جانور نہیں ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ شوقیہ کتا رکھنے والے کے اعمال سے ہر روز دو قیراط نیکیاں کم ہوتی رہتی ہیں۔ البتہ حفاظت یا شکار کے لیے کتا پالا جائے تو اس کا حکم دوسرا ہے ویسے کتوں سے محبت کرنا اچھی بات نہیں ہے کیونکہ اسے شیطان کے ساتھ زیادہ مناسبت ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ نمازی کے سامنے سے گدھا، عورت یا کتا گزرے تو نماز میں خلل واقع ہوتا ہے لہٰذا نماز پڑھتے وقت حسب ضرورت اپنے سامنے سترہ رکھ لیا کرو۔

کتا اگرچہ ناپسندیدہ جانور ہے مگر ذی روح ہونے کی حیثیت سے اس کی تکلیف کا احساس کرنا نیکی میں داخل ہے۔ حضور علیہ السلام نے ایک واقعہ بیان فرمایا کہ کوئی شخص راستہ چل رہا تھا۔ راستے میں اس نے ایک کنوئیں پر پیاس بجھائی۔ پاس ہی ایک کتا بھی پیاس کے مارے ہانپ رہا تھا۔ اس شخص کے پاس پانی نکالنے کے لیے کوئی ڈول وغیرہ تو نہیں تھا، اس نے اپنے جوتے میں پانی نکال کر کتے کو پلا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ عمل قبول کیا۔ اور اس شخص کو بخش دیا۔ صحابہ کرامؓ نے حضور سے دریافت کیا کہ اگر ہم جانوروں کے ساتھ نیکی کریں تو کیا ہمیں اس کا فائدہ ہوگا؟ فرمایا، ہر جگر رکھنے والی چیز کے ساتھ احسان کرو گے تو یہ صدقہ میں داخل ہوگا۔ جب جانوروں کے ساتھ حسن

سلوک سے نجات حاصل ہو سکتی ہے تو انسانوں کے ساتھ احسان کرنا تو بہت زیادہ مفید ہوگا

نیند کا عرصہ

الغرض! اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کی نیند سے بیداری کو اس طرح بیان فرمایا ہے وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ اور اسی طرح ہم نے ان کو اٹھایا یعنی نیند سے بیدار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انہیں اپنی قدرت کاملہ سے لمبی نیند سلا دیا تھا۔ اسی طرح انہیں بیدار بھی کر دیا۔ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ تاکہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے اس نیند کے متعلق سوال کریں چنانچہ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا كَمْ لَبِثْتُمْ بھلا بتاؤ تو تم یہاں کتنا عرصہ ٹھہرے ہو، یعنی کتنی دیر سوئے ہو۔ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ انہوں نے جواب دیا کہ ہم ایک دن یا دن کا کچھ عرصہ ٹھہرے ہیں۔ ظاہر ہے کہ غار کے اندر جب ان پہ نیند طاری ہوئی تو دن کا ابتدائی حصہ تھا اور جب وہ بیدار ہوئے تو دن کا آخری حصہ تھا بعض نے سمجھا کہ ابھی سورج غروب نہیں ہوا لہٰذا انہوں نے کہا کہ ہم ابھی پورا دن بھی نہیں سوئے اور جنہوں نے گمان کیا کہ سورج غروب ہو چکا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم ایک پورا دن سوئے رہے ہیں۔ قَالُوْا انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس معاملہ میں زیادہ بحث مباحثہ کی ضرورت نہیں رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ تم کتنا عرصہ سوئے رہے ہو۔ کہنے لگے اس معاملہ کو اللہ پر ہی چھوڑ دو۔

غیر ضروری تفصیلات

جیسا کہ کسی گذشتہ درس میں عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس قسم کے واقعات کی تمام جزئیات بیان نہیں فرمائیں بلکہ صرف اتنا حصہ ہی بیان کیا ہے جو انسانوں کی عبرت کے لیے کافی ہے۔ اصحاب کہف کی تعداد کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے کوئی حتمی بات

بیان نہیں کی۔ آگے آرہا ہے کہ لوگ ان کی تعداد کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں۔ تاہم مفسرین نے مختلف شواہد کی بنا پر اصحاب کہف کا تعین کیا ہے۔ مثلاً بعض مفسرین نے ان کی سات تعداد کے متعلق یہ استدلال پیش کیا ہے کہ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ میں کہنے والا یعنی عرصہ نیند کے متعلق سوال کرنے والا ایک شخص ہے۔ اور آگے جواب میں لَبِثْنَا جمع کا صیغہ ہے جو کم از کم تین افراد پر بولا جاتا ہے۔ آگے پھر قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ میں جمع کا صیغہ ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ ایک سائل اور دو دفعہ تین تین آدمی جواب دینے والے، کل مل کر سات بنتے ہیں۔ لہٰذا اصحاب کہف کی تعداد سات ہے۔

بہرحال تعداد کا تعین کوئی ضروری امر نہیں ہے جس میں ضرور ہی کرید کی جائے۔ اسی طرح کتے کے نام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس پر بحث کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ امام ابن جریر طبریؒ اور امام جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ اس قسم کی غیر ضروری تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کے عقیدے، عزیمت اور استقامت کا ذکر کر دیا ہے۔ ہمارے لیے اتنی تفصیل ہی کافی ہے کہ یہ چند نوجوان تھے جنہوں نے کفر و شرک کو ترک کیا اور اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے غار میں پناہ حاصل کر لی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو عظیم بزرگی عطا فرمائی۔

امام ابن کثیرؒ نے تاریخ ابن عساکرؒ کے حوالے سے امام حسن بصریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے جو قربانی کے لیے مینڈھا پیش کیا گیا اس کا نام جریر تھا۔ اس طرح سلیمان علیہ السلام کے ہدہد کا نام الفند تھا۔ اصحاب کہف کے کتے کا نام قطمیر بتایا جاتا ہے جس بچھڑے کی بنی اسرائیل نے پوجا کی تھی اس کا نام محمود تھا۔ اسی طرح یہ روایت بھی مشہور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ہندوستان

ہیں اور مائی حوّا کو جدہ میں اتار گیا۔ پھر سانپ کو اصفہان میں اور شیطان کو
بیسان میں نازل کیا گیا۔ یہ سب سریانی یا عبرانی روایات ہیں جو قابل اعتماد
نہیں ہیں۔ ہمیں ایسی چیزوں کی تفصیل میں جانے کی کوئی ضرورت ہے
اور نہ کوئی اس میں فائدہ ہے۔ امام ابن کثیرؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام
نے فرمایا مَا مِنْ شَیْءٍ یُقَرِّبُکُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ
وَیُبَاعِدُکُمْ مِّنَ النَّارِ یعنی جنت سے قریب کرنے
والی اور دوزخ سے دور کرنے والی کوئی چیز نہیں جو میں نے تمہیں بتلا
نہ دی ہو۔ لہٰذا اب غیر ضروری باتوں میں کرید کرنے کی کوشش نہ کرو۔

کھانے کا انتظام

بہرحال نیند سے بیداری کے بعد اصحاب کہف کو بھوک محسوس ہوئی
تو کہنے لگے فَابْعَثُوْا اَحَدَکُمْ بِوَرِقِکُمْ هٰذِهٖ اِلَى
الْمَدِیْنَةِ اپنے میں سے کسی ایک کو یہ سکہ دے کر شہر میں بھیجو۔ یہاں
پہ لفظ واحد کی بجائے احد استعمال کیا گیا ہے۔ عربی زبان میں واحد کا اطلاق
رئیس پر ہوتا ہے۔ اگر لفظ واحد آتا تو مطلب ہوتا کہ اپنے میں سے
بڑے آدمی کو بھیجو مگر احد سے مراد یہ ہے کہ اپنے میں سے کسی
ایک آدمی کو بھیجو۔ ورِق چاندی کو کہتے ہیں وہ سکے کی شکل میں ہو یا ویسے
ہی ڈلی ہو۔ قدیم زمانے میں سونے کا دینار اور چاندی کا درہم ہوتا تھا۔
اس لیے محض ورق سے مراد چاندی کا سکہ ہی لیا جاتا تھا۔ پرانے زمانے
میں تو یہ سکے خالص سونے چاندی کے ہوتے تھے۔ برصغیر کا روپیہ بھی
خالص چاندی کا ہوتا تھا مگر اب ان سکوں میں دیگر دھاتوں کی ملاوٹ
بھی کر دی گئی ہے اور دنیا بھر میں بڑی رقوم کے لیے سکوں کی بجائے
کاغذی نوٹ استعمال ہوتے ہیں۔ بہرحال انہوں نے کچھ سکے دے کر
ایک آدمی کو کھانا لانے کے لیے بھیجا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ گھر سے
نکلتے وقت یہ لوگ کچھ نقدی بھی ہمراہ لے گئے تھے تاکہ بوقت ضرورت
کام آسکے۔ چنانچہ وہ طویل نیند سونے سے پہلے بھی اس نقدی کو استعمال

کھانے کے کھانے پینے کی اشیاء منگواتے رہے اور بیدار ہونے کے بعد بھی انہوں نے ایسا ہی کرنا چاہا۔

مفسرین کرام نے اس سے بعض ضمنی مسائل بھی اخذ کیے ہیں۔ امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ جس رقم سے اصحاب کہف کھانا وغیرہ لاتے تھے، ظاہر ہے کہ وہ سب کی مشترکہ پونجی تھی اگرچہ ان کا حصہ اس میں برابر برابر نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ چند آدمی مل کر ایک فنڈ قائم کر سکتے ہیں جو سب کی طرف مشترکہ طور پر منسوب ہوگا۔ اسی طرح وہ خورد و نوش میں بھی اشتراک کر سکتے ہیں اگرچہ ان میں سے ہر ایک ایک جتنا تو نہیں کھاتا ہوگا بلکہ ہر آدمی اپنی طلب کے مطابق کھانا کھاتا ہے۔ تو اس طرح اگر کھانا کھانے میں کمی بیشی ہو جائے تو اس سے مشترکہ فنڈ میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ البتہ قحط کے زمانے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس معاملہ میں خاص ہدایات دیں۔ آپ بعض آدمیوں کو اکٹھا کھانا کھاتے دیکھ کر تلقین فرماتے تھے کہ حضور علیہ السلام نے دو دو کھجوروں کا ایک ایک لقمہ بنانے سے منع فرمایا ہے تاکہ دوسرے کا حق ضائع نہ ہو۔ ہاں اگر مل کر کھانے والے اجازت دے دیں کہ ہر شخص کو حسب خواہش کم و بیش کھانے کی اجازت ہے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔

بہر حال اصحاب کہف نے اپنے میں سے ایک کو وکیل بنا کر سکہ اس کے حوالے کیا کہ یہ لے کر شہر میں جائے فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا اور دیکھے کہ کون سا کھانا پاکیزہ ہے۔ ازکیٰ کا معنی اچھا اور صاف ستھرا بھی ہو سکتا ہے، مگر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اَحَلُّ وَاَطْيَبُ ہے یعنی جو حلال ہو۔ یہ مومن آدمی ہیں اور حرام کھانا استعمال نہیں کر سکتے۔ اگر غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا گوشت

ہوتو وہ بھی سردار کے حکم میں آ لے گا۔ اور حلال نہیں ہوگا۔ اسی طرح غصب شدہ مال سے حاصل کیا گیا یا چوری کا کھانا بھی درست نہیں ہوگا۔ اسی لیے فرمایا کہ جا کر دیکھے کون سا کھانا حلال اور طیب ہے فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ پس اس میں سے کچھ کھانا لے آئے۔

اور ساتھ یہ بھی کہا وَلْيَتَلَطَّفْ اور چاہیے کہ وہ آدمی نرمی اختیار کرے اور کوئی ایسی بات یا حرکت شہر میں جا کر نہ کرے جس سے اُن کے راز فاش ہو جانے کا خطرہ ہو۔ مطلب یہ تھا کہ ان کا نمائندہ ایسی تدبیر کیساتھ اشیاء خریدے کہ کسی کو شبہ نہ پڑے اور لوگ اسے اجنبی مسافر ہی سمجھیں۔ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا اور اُسے چاہیے کہ تمہارے متعلق کسی شخص کو کوئی خبر نہ دے۔ سارا کام بڑی احتیاط سے کرے۔ تاکہ ہماری روپوشی کے متعلق کسی کو علم نہ ہو سکے۔ یہ حفاظتی تدابیر تھیں کہ ایک آدمی کو شہر میں بھیجا گیا۔ کہتے ہیں کہ اُن میں سے یملیخا زیادہ ہوشیار آدمی تھا اس لیے اس کام پر انہوں نے اس کو مامور کیا۔ یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ بیداری کے بعد انہوں نے اپنے اجسام میں کوئی غیر معمولی تغیر نہیں پایا تھا بعض روایات میں آتا ہے کہ اُن کے بال اور ناخن بہت بڑھ چکے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ایک آدمی کو شہر بھیجنے سے پہلے اس بات کا ضرور نوٹس لیتے کہ اس حالت میں لوگ اسے دیکھیں گے تو ان کا راز کھل جائے گا۔ انہوں نے کوئی ایسی چیز محسوس کیے بغیر اُس طرح آدمی کو شہر بھیجا جس طرح وہ سونے سے پہلے بھیجتے رہے تھے۔

شہر میں پیش آمدہ حالات

جب یملیخا پونجی لے کر شہر پہنچا تو اُسے وہاں پر اجنبیت محسوس ہوئی، اُس کی جانی پہچانی کوئی شکل و صورت وہاں نظر نہ آئی۔ شہر کی ہیئت بھی بہت حد تک بدل چکی تھی۔ وہ قدرے حیران ضرور ہوا۔ تاہم اس نے اپنی مرضی کا کھانا خریدنے کے لیے جب دکاندار کو سکہ دیا تو اس نے

کہا کہ یہ تو کھوٹا ہے - اُس نے دوسرا سکہ دیا تو وہ بھی ایسا ہی تھا - تین سو سال
میں بادشاہوں کے ساتھ سکے بھی تبدیل ہو چکے تھے - سکے پر قیصر دقلیانوس
کی تصویر دیکھ کر دکاندار مزید حیران ہوا - اتنے میں بہت سے لوگ
جمع ہو گئے - بعض کہنے لگے کہ اس شخص کو کوئی پرانا خزانہ مل گیا ہے
انہوں نے کہا کہ سچ سچ بتا دو یہ سکے کہاں سے لیے ہیں - ورنہ تمہیں
پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا - یملیخا سخت پریشان ہوا - اور اُس کے
دل میں آئی کہ اب اُسے ظالم بادشاہ کے روبرو پیش ہونا پڑے گا - اور
اُن کا راز کھل جائے گا - اُس شخص نے اپنے والدین اور بعض عزیزوں کے
نام بھی لیے مگر تین سو سال پہلے کے آدمیوں کو اُس وقت کون جانتا تھا
بہر حال چاروناچار اس نے ساری بات کہہ دی اور لوگوں نے پکڑ کر اُسے
بادشاہ وقت کے سامنے پیش کر دیا - اس نے بادشاہ کو ساری بات بتا
دی کہ وہ اور اس کے ساتھی فلاں غار میں پناہ گزیں ہیں - اس پر سرکاری
ریکارڈ سے وہ تختیاں نکالی گئیں جن پر اُن کے نام اور کوائف درج تھے
اور اُن کی روپوشی کے بعد محفوظ کر دی گئی تھیں - بادشاہ عیسائی مذہب
رکھتا تھا اور رحمدل بھی تھا - وہ ساری بات سمجھ گیا کہ یہ وہ وہی لوگ
ہیں جو تین سو سال پہلے ظالم اور مشرک بادشاہ کے ڈر سے غار میں چھپ
گئے تھے - بادشاہ نے اُسے تسلی دی اور ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا - پھر
بادشاہ کے کہنے پر وہ شخص غار کی نشاندہی کے لیے چل پڑا - اس کے
ساتھ لوگوں کا ایک بڑا ہجوم بھی تھا - جب غار کے قریب پہنچے تو غار کے اندر
موجود نوجوانوں نے محسوس کیا کہ اُن کا راز فاش ہو چکا ہے اور ان کا تعاقب
کیا جا رہا ہے - چنانچہ انہوں نے نماز شروع کر دی - اتنی دیر میں یملیخا خود
غار کے اندر داخل ہوا اور اپنے ساتھیوں کو حالات سے آگاہ کیا - اور
ساتھ یہ بھی بتلا دیا کہ یہ لوگ ہمارے دشمن نہیں ہیں بلکہ ہماری زیارت کے

سے لیے آئے ہیں۔

اصحاب کہف کی موت

اس کے بعد کی روایات میں اختلاف ہے۔ عام مشہور یہ ہے کہ جب اصحاب کہف کو لوگوں کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ وہیں لیٹ گئے اور اللہ نے اسی وقت ان پر موت طاری کر دی۔ اللہ تعالے نے اپنی قدرت کا نمونہ دکھانا تھا جو دکھا دیا۔ اللہ تعالی نے اس واقعہ سے یہ بھی واضح کر دیا کہ بعث بعد الموت برحق ہے۔ جس طرح اللہ نے ان لوگوں کو تین سو سال کے بعد دوبارہ کھڑا کر دیا، اسی طرح وہ پوری نوع انسانی کو قیامت کے دن زندہ کر کے اپنے سامنے کھڑا کر لے گا۔

آگے اللہ نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اصحاب کہف نے اپنے راز کی پردہ پوشی کے لیے تمام تر حفاظتی تدابیر کیوں اختیار کیں اور اپنے ساتھی کو محتاط رویہ اختیار کرنے کی کیوں تلقین کی، اس کی وجہ انہوں نے یہ بتلائی إِنَّهُمْ إِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ اگر یہ لوگ تم پر غالب آ گئے اور تم پکڑے گئے يَرْجُمُوكُمْ تو وہ تمہیں سنگسار کر دیں گے۔ پتھر مار مار کر ہلاک کر دینا سخت ترین سزا ہے جو شادی شدہ زانی کے لیے مقرر ہے۔ کہنے لگے یا تو تمہیں یہ سزا دیں گے أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ یا وہ تمہیں اپنے دین میں واپس لے جائیں گے۔ یعنی تمہاری جان کی امان اسی صورت میں ممکن ہو گی کہ تم شرک اور کفر والا پرانا دین اختیار کر لو، اور اگر ایسا کرو گے وَلَن تُفْلِحُوا إِذًا أَبَدًا تو تم کبھی فلاح نہیں پا سکو گے، نجات سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤ گے۔ اس لیے اپنے ساتھی سے کہا کہ نہایت حفاظتی تدابیر اختیار کرنا کہ کہیں پکڑے نہ جاؤ۔

وَكَذَٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ ۖ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُنْيَانًا ۖ رَّبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ ۚ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا ﴿٢١﴾ سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۖ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۗ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا ﴿٢٢﴾

ترجمہ:- اور اسی طرح ہم نے مطلع کیا (اصحاب کہف کے بارے میں) دوسرے لوگوں کو تاکہ وہ جان لیں کہ بیشک اللہ کا وعدہ برحق ہے، اور بیشک قیامت کہ نہیں شک اس میں۔ جب کہ وہ جھگڑا کرتے تھے اپنے درمیان اپنی بات پر تو انہوں نے کہا کہ تعمیر کرو اُن کے اُوپر ایک عمارت۔ اُن کا رب خوب جانتا ہے اُن کی حالت کو۔ کہا اُن لوگوں نے جو غالب تھے اپنے معاملے میں کہ

ہم ضرور بنائیں گے ان کے اوپر ایک مسجد (۲۱) کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تین تھے اور چوتھا اُن کا کتا تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ پانچ تھے اور چھٹا اُن کا کتا تھا۔ یہ سب باتیں بغیر نشانے کے تیر چلانے والی بات ہے۔ اور کہتے ہیں کہ وہ سات تھے اور آٹھواں اُن کا کتا تھا۔ (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے، میرا پروردگار خوب جانتا ہے اُن کی گنتی کو۔ نہیں جانتے اُن کو مگر بہت تھوڑے لوگ۔ پس نہ جھگڑا کریں آپ ان کے بارے میں مگر سرسری جھگڑا اور نہ دریافت کریں آپ اُن کے بارے میں ان میں سے کسی سے (۲۲)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اصحاب کہف کے بہت سے حالات بیان ہو چکے ہیں کہ وہ اپنے ایمان کے بچاؤ کی خاطر اپنے شہر سے بھاگ کر غار میں پناہ گزین ہو گئے۔ پھر اللہ نے ان پر تین سو سال تک کے لیے نیند طاری کر دی۔ دوران نیند بھی اُن کا حال ذکر کیا۔ پھر جب بیدار ہوئے تو انہیں بھوک محسوس ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے کچھ سکے دے کر اپنے ایک ساتھی کو شہر میں بھیجا تاکہ کھانے پینے کی چیزیں لے آئے۔ اور ساتھ اُسے تاکید کر دی کہ شہر میں جا کر نہایت احتیاط سے کام لینا کہیں اُن کا راز ہی فاش نہ ہو جائے کیونکہ اگر لوگوں کو تمہاری موجودگی کا پتہ چل گیا تو پھر دین بدل لینے کی وجہ سے یا وہ تمہیں سنگسار کر دیں گے یا پھر اپنے دین میں واپس آجانے پر مجبور کر دیں گے اور ایسی صورت میں تم ہمیشہ کے لیے ناکام ہو جاؤ گے۔

جب اصحاب کہف میں سے ایک آدمی شہر پہنچا تو اس نے وہاں کی ہر چیز میں اجنبیت محسوس کی۔ اُسے شہر کی بیشتر چیزیں بدلی ہوئی معلوم ہوئیں اور کوئی شناسا چہرہ بھی نظر نہ آیا۔ جب اس نے کھانا خریدنے کے لیے سکہ پیش کیا تو لوگوں کو شک گزرا کہ اس

شخص کو کہیں سے پرانا دفینہ مل گیا ہے جو بیہ قیصر ڈیسس کے زمانے کا سکہ سے آیا ہے جسے گزرے ہوئے تین سو سال بیت چکے ہیں اور اس عرصہ میں کئی سلطنتیں اور نسلیں بدل چکی ہیں۔ چنانچہ جب شہر کے لوگوں نے سختی کے ساتھ پوچھ گچھ کی تو اس نے انہیں حقیقت حال سے آگاہ کر دیا۔ اُسے بادشاہ وقت کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ صحیح الخیال تھا اُس نے اُس شخص کو تسلی دی اور پھر خود غار میں جا کر اصحاب کہف سے گفتگو بھی کی۔ یہاں پر مؤرخین اور مفسرین میں بہت سے اختلافات ہیں لہذا یقین سے کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔ تاہم بادشاہ اور لوگوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ وہی لوگ ہیں جو تین سو سال قبل روپوش ہو گئے تھے ان کے نام اور کوائف وغیرہ سرکاری ریکارڈ میں محفوظ تھے، اس دفتر سے بھی ان کی تصدیق ہو گئی۔ سب لوگوں کے لیے یہ بڑا حیرت انگیز واقعہ تھا مگر اللہ تعالیٰ کے لیے تو کوئی چیز بعید نہیں۔ اسی لیے تو اللہ نے ابتدائے سورۃ میں ہی واضح کر دیا ہے کہ کیا تم خیال کرتے ہو کہ اصحاب کہف کا واقعہ بڑے اچنبھے کی بات ہے؟ حالانکہ اللہ کی قدرت کے اس کے علاوہ بھی بے شمار واقعات ہیں جو انسانی عقل سے باہر ہیں۔ لہذا یہ کوئی اپنی نوعیت کا واحد واقعہ نہیں ہے۔

وقوع قیامت پر دلیل

دراصل اُس زمانے میں لوگوں میں وقوع قیامت کے متعلق اختلاف پایا جاتا تھا۔ بعض وقوع قیامت پر ایمان رکھتے تھے اور بعض اس کا انکار کرتے تھے۔ بادشاہ بھی اس معاملہ میں متردد تھا اور اس ضمن میں کسی حتمی دلیل کا متلاشی تھا۔ اسی دوران میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کو تین سو سالہ نیند سے بیدار کر دیا۔ شہر کے لوگ اُن کے حالات پر مطلع ہوئے اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بیان کیا ہے کہ جس طرح لمبی نیند طاری کرنا اور اُس سے بیدار کر دینا اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں

سے ہے۔ اسی طرح لوگوں کا اصحاب کہف کے حالات پر مطلع ہونا بھی نشانات قدرت میں سے ہے۔ فرمایا وَكَذَٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ اور اسی طریقے سے ہم نے ان پر مطلع کر دیا لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ برحق ہے۔ اصحاب کہف کا لمبی نیند سے بیدار ہو جانا اس بات کی دلیل تھی کہ جس طرح وہ تین سو سال کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اسی طرح مرنے کے بعد سب لوگ ایک دن دوبارہ جی اٹھیں گے۔ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا اور بیشک وقوع قیامت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے، وہ ضرور برپا ہوگی۔

موت کے بعد دوبارہ زندگی کا واقعہ سورۃ البقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ بنی اسرائیل میں ایک قتل ہو گیا مگر قاتل کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ پھر اللہ کے حکم سے ایک گائے ذبح کر کے گوشت کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم پر لگایا گیا تو اس نے زندہ ہو کر اپنے قاتل کی نشاندہی کر دی۔ اس موقع پر بھی اللہ نے فرمایا ہے كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ (البقرۃ۔ ۷۳) اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت کو سب مردوں کو زندہ کر دے گا اور وہ تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کو بیدار کر کے یہ دلیل قائم کر دی کہ اسی طرح قیامت کو بھی سب لوگ دوبارہ جی اٹھیں گے۔

اصحاب کہف کی یادگار

اب جب کہ اصحاب کہف کا سارا بھید کھل گیا اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ زیادہ دیر تک زندہ نہ رہے بلکہ اللہ نے ان کو موت دے دی، تو لوگوں نے ان کی یادگار قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس ضمن میں مختلف آراء تھیں۔ کچھ لوگ ان کے نام پر عجائب گھر بنانا چاہتے ہوں گے بعض کوئی خصوصی طرز کی عمارت تعمیر کرنے کے حق میں ہوں گے اور بعض کوئی کتبے وغیرہ کندہ کرنا چاہتے ہوں گے۔ بہرحال اللہ نے اس بات

کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ
جب وہ اس معاملہ میں آپس میں جھگڑ رہے تھے فَقَالُوا ابْنُوا
عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا تو انہوں نے کہا کہ یہاں پر یادگار کے طور پر عمارت
تعمیر کر دی جائے۔ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ اللہ تعالیٰ اُن کی حالت
کو خوب جانتا ہے۔ پھر کیا ہوا؟ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰی
اَمْرِهِمْ اُس وقت جو لوگ اس معاملہ میں غالب تھے یعنی صاحب الرائے
لوگوں نے یہ کہا لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا کہ ہم تو اس مقام
پر یادگار کے طور پر عبادت خانہ تعمیر کریں گے۔ اصحاب کہف بڑے
برگزیدہ لوگ تھے جنہوں نے اپنا ایمان بچانے کے لیے تکالیف اٹھائیں
اللہ نے ان کو بڑا شرف عطا کیا اور ان کو تین سو سال کے بعد دوبارہ زندہ کر کے
اپنی قدرت کا کرشمہ دکھلایا۔ لہٰذا ان کی شایانِ شان یہ ہے کہ یہاں پر مسجد
تعمیر کی جائے جہاں پر لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا فریضہ انجام دیا کریں۔
اور انہیں پتہ چلے کہ ایمان سب سے بڑی حقیقت ہے اور اسی کی بدولت
اللہ نے ان لوگوں کو عالی مرتبہ عطا کیا۔

قبر پر تعمیر وغیرہ کا مسئلہ

قبروں کو پختہ کرنے، ان پر عمارات تعمیر کرنے اور وہاں پر نماز پڑھنے
سے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشادِ مبارک ہے وَلَا تَجْلِسُوْا عَلَى
الْقُبُوْرِ وَلَا تُصَلُّوْا اِلَيْهَا یعنی نہ تو قبروں پر بیٹھو اور نہ ان کی
طرف رُخ کر کے نماز پڑھو (مسلم شریف)[1] بیٹھنے کے کئی مطلب ہو
سکتے ہیں۔ مثلاً وہاں پاؤں رکھ کر نہ بیٹھو کہ یہ بے ادبی میں داخل ہے
دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہاں بول و براز کے لیے مت
بیٹھو کہ اس سے گندگی پھیلتی ہے۔ یہ بھی سخت مکروہ ہے۔ دوسری
حدیث میں آتا ہے نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
اَنْ يُّجَصَّصَ الْقَبْرُ وَاَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ وَاَنْ يُّقْعَدَ

[1] مسلم صفحہ ۳۱۲ ج ۱ (فیاض)

عَلَيۡہِ حضور علیہ السلام نے اس بات سے منع فرمایا کہ قبر کو پختہ بنایا جائے (یہ اسراف ہے) اور مکروہ تحریمی ہے) قبر پر عمارت (گنبد وغیرہ) بنائی جائے اور اس پر بیٹھا جائے۔

حضور علیہ السلام مرض الوفات میں مبتلا تھے۔ آپ نے کمبل اوڑھا ہوا تھا۔ تلخی کی وجہ سے آپ کبھی کمبل چہرے سے ہٹا لیتے اور کبھی منہ پر لے لیتے۔ جب آپ منہ ننگا کرتے تو فرماتے لَعۡنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الۡیَھُوۡدِ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوۡا قُبُوۡرَ اَنۡبِیَآئِھِمۡ مَسَاجِدَ یُحَذِّرُ مَا صَنَعُوۡا (صحیحین) یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ حضور علیہ السلام اپنی امت کے لوگوں کو اس کارگزاری سے ڈرانے کہ کہیں وہ بھی ایسا ہی نہ کرنے لگیں۔ امام احمد، ابو داؤد، ابن ماجہ، ترمذی وغیرہ نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے لَعَنَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ زَائِرَاتِ الۡقُبُوۡرِ وَالۡمُتَّخِذِیۡنَ عَلَیۡھَا الۡمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ حضور علیہ السلام نے اُن عورتوں پر لعنت کی ہے جو قبروں پر جاتی ہیں اور ان لوگوں پر بھی لعنت کی ہے جو قبروں کو سجدہ گاہ بناتے ہیں اور ان پر چراغاں کرتے ہیں۔

مسند احمد میں یہ روایت بھی موجود ہے اِنَّ مِنۡ شِرَارِ النَّاسِ مَنۡ تُدۡرِکُھُمُ السَّاعَۃُ وَھُمۡ اَحۡیَآءٌ وَالَّذِیۡنَ یَتَّخِذُوۡنَ الۡقُبُوۡرَ مَسَاجِدَ لوگوں میں زیادہ شریر قسم کے لوگ وہ ہوں گے جو قیامت برپا ہونے کے وقت زندہ ہوں گے کیونکہ نیک لوگ تو پہلے ہی ختم ہو چکے ہوں گے اور قیامت اس وقت آئے گی جب صرف برے لوگ ہی دنیا میں رہ جائیں گے۔ فرمایا، دوسری قسم کے شریر لوگ وہ ہوں گے جو قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیں گے۔ اسی لیے بعض حضرات فرماتے ہیں کہ قبروں کے قریب مسجدیں نہیں بنانی چاہئیں اور بعض کہتے ہیں کہ قبروں کے نزدیک مسجدیں بنانے کی ممانعت

نہیں بلکہ قبروں پہ سجدہ کرنے کی ممانعت ہے۔ مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی رہ اور مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ عام قبرستان یا کسی بزرگ کی قبر کے قریب مسجد بنانا صرف اسی صورت میں روا ہوگا جب کہ لوگوں کے شرک میں مبتلا ہو جانے کا خدشہ نہ ہو۔ اگر اس قسم کا احتمال ہو کہ مسجد بنانے سے وہاں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوں گی۔ تو پھر ایسی جگہ پہ مسجد بنانا روا نہیں ہوگا۔ اسی لیے قبرستان میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ اگر قبر سامنے نظر آ رہی ہو تو ایسی جگہ پہ نماز نہیں پڑھنی چاہیئے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر کسی ایسی جگہ پہ نماز پڑھنے کی نوبت آ ہی جائے تو نمازی اور قبر کے درمیان سترہ ہونا چاہیئے تاکہ قبر نظر نہ آئے۔ اور اگر نماز با جماعت ادا کرنا ہو تو صرف امام کے آگے سترہ کافی نہیں ہوگا۔ بلکہ ہر نمازی کے آگے سترہ ضروری ہے کیونکہ قبرستان کا معاملہ بڑا نازک ہے۔ اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کہ کہیں کوئی خرابی نہ پیدا ہو جائے اور آئندہ آنے والے لوگ اسے وجہ جواز نہ بنا لیں۔

اصحاب کہف اللہ کے نیک بندے تھے مگر مشرکین نے ان کو بھی حاجت روا اور مشکل کشا بنا لیا۔ چنانچہ بعض علاقوں میں اصحاب کہف کی نذر کے طور پہ سات روٹیاں اور آٹھویں روٹی کتے کے نام پہ دی جاتی ہے۔ جس طرح گیارہویں شریف اللہ کے نام کی بجائے حضرت پیران پیرؒ کے نام کی دی جاتی ہے، اسی طرح بعض لوگوں نے اصحاب کہف کی نیاز شروع کر دی، اسی قسم کی خرابیاں ہیں جو بزرگوں کے نام سے منسوب کر دی جاتی ہیں۔ بہر حال اس وقت کے معتبر آدمیوں نے کہا کہ ہم اصحاب کہف کی یادگار کے طور پہ یہاں پہ عبادت گاہ تعمیر کریں گے۔

اصحاب کہف کی تعداد

اصحاب کہف کی تعداد کے متعلق بھی اختلاف رہا ہے تاہم

اللہ تعالیٰ نے اس ضمن میں اصولی تعلیم بیان کر دی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے
سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ لوگ کہتے
ہیں کہ اصحاب کہف تعداد میں تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ وَ
يَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ
اور بعض کہتے ہیں کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔ فرمایا
رَجْمًا بِالْغَيْبِ یہ تو بغیر نشانے کے تیر چلانے والی بات ہے۔
رجم کا معنیٰ پتھر یا تیر چلانا اور بالغیب سے مراد بغیر دیکھے ہے۔ گویا
اصحاب کہف کی تعداد کے متعلق مختلف باتیں کرنا بغیر دیکھے تیر چلانے
والی بات ہے کہ وہ نشانے پر لگتا بھی ہے یا نہیں۔ ہمارے محاورے
میں اسے "اندھے کنوئیں میں ڈول ڈالنا" بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ
کہ اس قسم کی باتیں لاابالی میں کہی جاتی ہیں۔

اب آگے اسلوب کلام بدل گیا ہے۔ رجماً بالغیب کی بات
ختم ہو گئی وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ
اور کہتے ہیں کہ اصحاب کہف تعداد میں سات تھے اور آٹھواں ان
کا کتا تھا۔ فرمایا، اے پیغمبر! قُلْ رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ
آپ کہہ دیں کہ میرا رب ہی ان کی تعداد کو بہتر جانتا ہے۔ مَا
يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ انہیں نہیں جانتے مگر بہت تھوڑے
لوگ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے
فرمایا کہ میں بھی ان تھوڑے لوگوں میں شامل ہوں جو اصحاب کہف
کی تعداد کو جانتے ہیں۔ گویا انہوں نے بھی اس آخری بات کو
اختیار کیا ہے کہ وہ سات نیکوکار آدمی تھے اور آٹھواں ان کے
ساتھ کتا تھا۔

اس مقام پر تعلیم یہ دی گئی ہے فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ

إِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا آپ نہ جھگڑا کریں ان کی تعداد کے بارے میں مگر سرسری۔ اس معاملہ میں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے جب بھی ذکر ہو تو اتنی ہی بات کافی ہے جتنی اللہ نے وحی کے ذریعے بتلائی ہے اس سے زیادہ بحث مباحثہ میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے اور ساتھ یہ بھی خیال رکھیں وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا اور اصحاب کہف کے بارے میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین سے بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے ان کے پاس کوئی یقینی علم نہیں ہے بلکہ وہ محض اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں۔ سب سے یقینی علم وحی الٰہی کا ہے جو آپ کے پاس ہے آپ اسی پر اکتفا کریں اور ان لوگوں سے مزید کچھ نہ پوچھیں۔

ویسے بھی یہ لوگ کیا حق رکھتے ہیں کہ اصحاب کہف کے متعلق ان سے دریافت کیا جائے جب کہ یہ تو مشرک ہیں اور اصحاب کہف موحد اور اللہ کے نیک بندے تھے۔ انہوں نے ایمان اور توحید کی خاطر قوم اور وطن کو چھوڑا اور غار میں روپوش ہوگئے۔ ان مشرکین کو اصحاب کہف کے بارے میں کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ ان کے تو راستے ہی الگ الگ ہیں۔ اللہ نے پہلے ہی فرمادیا "إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى" (آیت۔ ۱۳) وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر صحیح ایمان لائے۔ وہ شرک سے بیزار تھے۔ اللہ نے ان کے دلوں کو مضبوط کیا اور ان کی ہدایت میں اضافہ کیا۔ بھلا یہود و نصاریٰ کا ان سے کیا تعلق؟ عرب کے مشرکین تو ویسے ہی کافر تھے، یہود و نصاریٰ بھی عقیدۂ ولدیت میں مبتلا ہو کر مشرک بن گئے۔ اسی لیے تو فرمایا کہ قرآن اور اس سورۃ کا ایک مقصد یہ بھی ہے "وَيُنذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا" (آیت۔ ۴) تاکہ اس کے ذریعے یہود و نصاریٰ کو ڈرایا جائے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنالیا ہے۔

فرمایا، نہ جھگڑا کریں آپ اصحاب کہف کے بارے میں۔ مگر سرسری اور نہ ہی یہود و نصاریٰ یا مشرکین سے اس بارے میں کچھ دریافت کریں۔ ان میں سے کسی کو بھی صحیح بات معلوم نہیں ہے۔ یہ سب جنتکی باتیں کرتے ہیں۔ ان میں سے حقیقی علم کسی کے پاس نہیں ہے۔ حقیقی علم وہی ہے جو اللہ نے آپ کو وحی کے ذریعہ بتلا دیا ہے۔

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّي فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾ وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

ترجمہ :۔ اور نہ کہیں آپ کسی چیز کے بارے میں کہ کرنے والا ہوں میں اس کو کل ﴿۲۳﴾ مگر یہ کہ اللہ چاہے ۔ اور یاد کریں آپ اپنے پروردگار کو جب آپ بھول جائیں ، اور آپ کہیں کہ اُمید ہے کہ راہنمائی فرمائیگا میرا پروردگار اس سے زیادہ قریب تر نیکی کے راستے کی ﴿۲۴﴾ اور ٹھہرے وہ (اصحاب کہف) اپنے غار میں تین سو سال ۔ اور زیادہ کیا انہوں نے نو ﴿۲۵﴾ آپ کہہ دیجئے ، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جتنی دیر وہ ٹھہرے ۔ اسی کے لیے ہے غیب آسمانوں کا اور زمین کا ۔ وہ خوب دیکھتا ہے اور سنتا ہے ۔ نہیں ہے ان کے لیے اللہ کے سوا کوئی کارساز ، اور نہیں شریک بناتا وہ اپنے

فیصلے میں کسی کو ㉖

شانِ نزول

گذشتہ آیت میں اصحابِ کہف کی تعداد کا ذکر تھا۔ اس بارے میں زیادہ کرید کرنے سے منع فرمایا گیا کہ ایسے معاملہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سونپنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ آج کے درس میں اصحابِ کہف کے غار میں ٹھہرنے کی مدت کا بیان ہے۔ البتہ درمیان میں ایک بات نصیحت کے طور پر فرمائی گئی ہے کہ کسی کام کا ارادہ کرتے وقت ساتھ انشاء اللہ کہہ کر اسے اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا چاہیئے کیونکہ اس کی مشیئت کے بغیر کوئی کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس بات کا تعلق اصحابِ کہف کے واقعہ کے ساتھ بھی ہے۔ گذشتہ دروس میں بیان کیا جا چکا ہے کہ مشرکین نے یہودیوں کے ایما پر حضور علیہ السلام سے روح، اصحابِ کہف اور ذوالقرنین کے متعلق تین سوال کیے تھے۔ حضور علیہ السلام نے خیال فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کے جوابات سے جلدی ہی آگاہ کر دیگا، لہٰذا آپ نے مشرکین سے فرمایا کہ ان سوالات کا جواب کل دوں گا۔ مگر ساتھ انشاء اللہ نہ کہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف روایات کے مطابق چند دن یا پندرہ دن یا اٹھارہ دن کے لیے وحی کا سلسلہ منقطع رہا اور آپ مشرکین کے سوالات کا جواب نہ دے سکے۔ اس پر انہوں نے آپ کے خلاف پراپیگنڈا کرنا شروع کر دیا۔ تمسخر اڑایا اور طعنہ زنی کی کہ آپ کا کل کب آئے گا؟ آج کی پہلی دو آیات کا تعلق اسی واقعہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس ضمن میں نصیحت فرمائی ہے۔

مشیتِ الٰہی کے ساتھ وابستگی

ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَقُولَنَّ لِشَاْیۡءٍ اِنِّیۡ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا آپ کسی چیز کے بارے میں یوں نہ کہیں کہ میں اسے کل کرنے والا ہوں اِلَّآ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰهُ بلکہ یوں کہیں کہ اگر اللہ نے چاہا۔ گویا اپنے مستقبل کے فعل کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع کر دینا

چاہیئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو میں فلاں کام انجام دوں گا۔ سورۂ تکویر میں بھی اللہ نے واضح فرمادیا ہے۔ "وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ" (التکویر۔ ۲۹) تمہارے چاہنے سے کوئی بات نہیں بنتی جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔ انسان کوئی بھی پلاننگ کرے۔ جب تک اللہ کی مشیت نہیں ہوگی، کوئی کام بھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا اپنے تمام امور کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ ہی منسلک کرنا چاہیئے۔

ان شاء اللہ کے ساتھ بعض فقہی مسائل بھی وابستہ ہیں۔ مثلاً کسی شخص نے کسی کام کے لیے قسم اٹھائی اور ساتھ ان شاء اللہ کہہ دیا تو اس نے وہ کام اللہ کے سپرد کر دیا۔ اب اگر وہ اپنی قسم پوری نہیں کر پاتا تو حانث ہو کر ماخوذ نہیں ہوگا کیونکہ یہ سمجھا جائے گا کہ اس کام کی تکمیل میں اللہ تعالیٰ کی مشیت شامل نہیں تھی۔ اور اگر بغیر ان شاء اللہ کے قسم اٹھائی ہے تو عدم تکمیل پر حانث سمجھا جائے گا اور اسے قسم کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سو بیویاں تھیں انہوں نے قسم اٹھائی کہ میں ایک ہی رات میں تمام بیویوں کے پاس جاؤں گا اور ان سے پیدا ہونے والے تمام بچوں کو اللہ کی خاطر جہاد میں لگاؤں گا۔ آپ نے ساتھ ان شاء اللہ نہ کہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تکمیلِ عمل کے باوجود صرف ایک بیوی کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور وہ بھی فالج زدہ جس سے جہاد میں شمولیت کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ "وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ" (صٓ۔ ۳۴) اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اگر سلیمان علیہ السلام قسم اٹھاتے وقت ان شاء اللہ کہہ دیتے تو آپ کی مراد پوری ہوتی، سو بچے پیدا ہوتے جو سارے کے سارے خدا کے راستے میں جہاد

کرنے مگر اس بھول کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے
غرضیکہ کوئی بھی کام ہو اسے ان شاء اللہ کہہ کر مشیت ایزدی کے ساتھ
منسلک کر دینا چاہیئے۔

انشاء اللہ کے فقہی مسائل

مفسرین، مجتہدین اور فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ کسی
کام کا ارادہ کرنے کے کتنی دیر بعد تک ان شاء اللہ کہنا کارآمد ہے حضرت
عبداللہ بن عباسؓ، حضرت مجاہدؒ، سعید بن جبیرؒ، ابوالعالیہؒ اور بعض دوسرے
مفسرین فرماتے ہیں کہ کسی کام کا ارادہ کرنے کے ایک سال بعد تک
بھی اگر کوئی شخص انشاء اللہ کہہ دیتا ہے تو اسے اس کام کے ساتھ
منسلک سمجھا جائے گا۔ البتہ امام حسن بصریؒ، امام طاؤسؒ وغیرہ فرماتے
ہیں کہ جس مجلس میں کسی کام کا ارادہ کیا ہے اگر اسی مجلس کے دوران انشاء اللہ
کہہ دے تو درست ہے، ورنہ مجلس برخواست ہونے کے بعد انشاء اللہ
کہنا اس کام کے ساتھ مطابقت نہیں رکھے گا۔ علاوہ ازیں امام ابوحنیفہؒ،
امام ابراہیم نخعیؒ، عطاؒ، اور امام شعبیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ انشاء اللہ صرف
اسی صورت میں درست تسلیم ہوگا جب یہ کسی کام کا ارادہ کرنے کے
ساتھ متصلاً کہہ دیا جائے۔ اگر انشاء اللہ کا لفظ وقفے کے ساتھ کہا تو یہ معتبر
نہیں ہوگا۔

امام صاحبؒ کے کسی مخالف نے خلیفہ منصور کے پاس شکایت
کی کہ آپ کے جد امجد حضرت عبداللہ بن عباسؓ تو کسی کام کے ارادے
سے ایک سال بعد تک بھی انشاء اللہ کہنے کو روا سمجھتے تھے مگر امام
ابوحنیفہؒ اس کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ صرف وہی انشاء اللہ
معتبر ہوگا جو کسی کام کے ارادے سے متصلاً کہا گیا ہو۔ خلیفہ نے
امام صاحبؒ کو طلب کر کے وضاحت چاہی تو آپ نے فرمایا
ہاں میرا مسلک یہی ہے جو آپ نے بیان کیا ہے۔ مگر آپ جب

بات پر اصرار کرتے ہیں وہ آپ کے خلاف جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ لوگ
جب آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے آپ کی اطاعت کا عہد کرتے ہیں
تو اس کے ساتھ ان شاء اللہ تو نہیں کہتے، لہٰذا یہ حتمی بات ہوتی ہے
اور اس کے خلاف کرنے سے آدمی قابل مواخذہ ہو جاتا ہے۔ اگر ان شاء اللہ
کہنا عہد کے ایک سال بعد تک موخر کیا جانا روا سمجھا جاتا تو پھر لوگ
آپ کی بیعت کرنے کے بعد گھر جا کر ان شاء اللہ کہہ سکتے ہیں۔ اور
اس طرح وہ کسی وقت بھی اس بیعت سے نکل سکتے ہیں اور آپ انہیں
اس بیعت پر قائم رہنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے کیونکہ انہوں نے
ان شاء اللہ کہہ کر معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا، لہٰذا اگر اللہ چاہے گا تو وہ آپ کی
اطاعت میں رہیں گے۔ ورنہ نکل جائیں گے۔ یہ بات خلیفہ کی سمجھ میں
آ گئی اور اس نے شکایت کنندہ کو دربار سے نکال دیا کہ تم فضول باتیں
کرتے ہو۔

بھول جانے کی صورت میں

غرضیکہ جس کام کا بھی ارادہ کیا جائے یا کوئی قسم اٹھائی جائے تو اسے
ان شاء اللہ کے ساتھ فوراً منسلک کر دینا چاہیئے۔ اگر ایسا کرے گا تو وعدہ
خلافی کی صورت میں جھوٹا نہیں ہوگا۔ اور قسم کی صورت میں حانث نہیں
ہوگا۔ اللہ نے حضور کو بھی یہی بات سکھلائی کہ آپ یوں نہ کہیں کہ میں یہ
کام کل کروں گا بلکہ ساتھ ان شاء اللہ کہہ کر اسے اللہ کی مشیت پر موقوف
کر دیا کریں کیونکہ قادر مطلق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اس کی منشاء
ہوگی تو کوئی کام پایۂ تکمیل تک پہنچے گا، ورنہ نہیں۔ اللہ نے ساتھ یہ
بھی فرمایا وَاذْكُرْ رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ اور اگر آپ عین موقع
پر ان شاء اللہ کہنا بھول جائیں تو جس وقت یاد آئے اسی وقت اعادہ کر
لیں بھول جانے کا قانون یہ ہے کہ یاد آوری کے بعد ان الفاظ کو ادا کر لے
بھول کر نماز چھوڑ دینے کے متعلق بھی یہی حکم ہے کہ جس وقت یاد آئے

فوراً ادا کرلے۔ اگر نماز کا وقت ابھی باقی ہے تو وہ نماز ادا تصور ہوگی اور
اگر وقت گزر چکا ہے تو پھر قضا کے حکم میں آئیگی۔ اگر کوئی شخص سو گیا ہے
اور نماز کا وقت نکل گیا ہے تو بیداری پر فوراً ادا کرلے۔ اس قسم کا واقعہ
خود حضور علیہ السلام کے ساتھ بھی دوران سفر دو یا زیادہ مرتبہ پیش آیا۔
ایک مقام پر ٹکنے سے رات گزارنے کا ارادہ کیا۔ رات کو پہریدار بھی
مقرر کیے جو صبح نماز کے وقت جگا دیں مگر پہریدار خود بھی سو گئے جس کی
وجہ سے تمام صحابہؓ کی نماز فجر قضا ہوگئی۔ چنانچہ آپ نے یہ نماز بعد میں پڑھی
انشاء اللہ کہنے کا بھی یہی مسئلہ ہے کہ اگر بھول گیا تو جب یاد آئے فوراً کہہ لے۔

نبوت و رسالت کی دلیل

اور دوسری بات یہ وَقُلْ عَسٰٓى أَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ
لِأَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا کہ آپ یہ بھی کہہ دیں کہ امید ہے کہ
میرا پروردگار راہنمائی فرمائے گا۔ اس سے زیادہ قریب تر نیکی کے راستہ کی۔
دراصل یہ حضور علیہ السلام کی نبوت و رسالت کی صداقت کی دلیل بیان کی جا
رہی ہے۔ آپ کا اصحاب کہف کا واقعہ ٹھیک ٹھیک بیان کر دینا ہی
آپ کی صداقت کی دلیل ہے کیونکہ یہود و مشرکین نے یہ سوال کرکے آپ
کا امتحان لینا چاہا تھا۔ جب آپ نے صحیح جواب دے دیا تو اس کا مطلب
یہ ہے کہ آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں اور اُسی کے بتلانے سے ہی
آپ نے اصحاب کہف کا واقعہ بیان کیا ہے۔ یہ تو سینکڑوں سال پرانا
واقعہ تھا۔ اللہ تعالیٰ قریبی زمانہ کے کسی واقعہ کو بھی آپ کی رسالت کی
دلیل کے طور پر پیش کر سکتا تھا۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کی ہجرت کا واقعہ ایسا
ہے جو اس سورۃ کے نزول سے کچھ عرصہ بعد پیش آیا۔ جس طرح
اصحاب کہف تین سو نو سال تک غار میں پناہ گزین رہے، اسی طرح حضور
علیہ السلام سفر ہجرت کی ابتداء میں تین دن تک غار ثور میں ٹکے رہے۔ تمام تر
کوشش کے باوجود کفار آپ کو تلاش نہ کر سکے۔ تین دن کے بعد آپ

غارِ ثور سے نکل کر مدینہ کے راستے پر چل نکلے۔ تو گویا یہ تین دن کا واقعہ تین سو سال واقعہ سے تو قریب تر ہے اور حضور علیہ السلام کی نبوت و رسالت کی دلیل ہے۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ مخالفین کی ایذا رسانیاں اور اللہ کے بندوں کی روپوشی اور گرفتاری کے واقعات دنیا میں ہمیشہ رونما ہوتے آئے ہیں۔ جب انگریزوں نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی اور ہمارے بزرگوں کی گرفتاری کا حکم دیا تو اس قسم کے کئی واقعات پیش آئے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح کو سزائے موت کا حکم ہو چکا تھا۔ آپ روپوش ہو گئے اور پھر مکہ مکرمہ ہجرت کر گئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی رح بھی تین دن تک روپوش رہنے کے بعد باہر نکل آئے۔ اللہ نے ان کی حفاظت فرمائی اور وہ گرفتار نہیں کیے جا سکے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی رح آٹھ زمانہ تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر کے رہا ہوئے۔ حاجی صاحب نے انگریزوں کے ساتھ آخری ٹکر لی تھی مگر اللہ تعالیٰ کو برصغیر میں انگریزوں کا اقتدار مزید سو سال تک منظور تھا۔ اس لیے آپ کو کامیابی نہ ہو سکی۔

غار میں ٹھہرنے کی مدت

انشاء اللہ کا مسئلہ بیان کرنے کے بعد آگے پھر اصحاب کہف کا ذکر ہے۔ اس آیت کریمہ میں ان کے غار میں قیام کی مدت کا تذکرہ ہے فرمایا وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وہ اپنی غار میں تین سو سال ٹھہرے رہے وَازْدَادُوا تِسْعًا اور زیادہ کیا انہوں نے اس پر نو سال۔ اس طرح کل تین سو نو سال ہوئے۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ان کے غار میں رہنے کی مدت تو تین سو سال ہی تھی۔ البتہ بعض لوگوں نے بیان کرنے میں نو سال کا اضافہ کر دیا۔ یہ حضرات نو سال کو مبالغہ آرائی پر محمول کرتے ہیں۔ تاہم زیادہ تر مفسرین یہ فرماتے ہیں کہ نو سال کا فرق شمسی اور قمری سالوں کے لحاظ سے ہے۔ اصحاب کہف

شمسی سال کے حساب سے تین سو سال ٹھہرے ۔ جبکہ قمری سالوں کے حساب سے ان کی تعداد تین سو نو سال بن جاتی ہے کیونکہ ہر شمسی صدی میں قمری لحاظ سے تین سال بڑھ جاتے ہیں ۔

فرمایا قُلِ اے پیغمبر! آپ جواب میں کہہ دیں ۔ اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ اصحاب کہف کتنی مدت ٹھہرے رہے ۔ تاریخی اور تفسیری روایات میں تو بہت سی باتیں ملتی ہیں جنکی صحت کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا ۔ لہٰذا اللہ نے جتنی بات بتا دی ہے وہی درست ہے ۔ اس بات کا تعلق علم غیب سے ہے جو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ۔ یہاں پر بھی اللہ نے وضاحت فرما دی ہے ۔ لَہٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمانوں اور زمین کا غیب اُسی کے پاس ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات سے تو کوئی چیز پردہ غیب میں نہیں ہے ۔ البتہ جو چیز آسمانی مخلوق کی نظروں میں غیب ہے ، اللہ تعالیٰ اُس کو بھی جانتا ہے اور جو اشیاء زمینی مخلوق انسان ، جن ، فرشتوں وغیرہ کی نظروں میں غیب ہے اللہ تعالیٰ ان سے بھی خوب واقف ہے ۔ اسی لیے فرمایا کہ آسمانوں اور زمین کا غیب اسی کے لیے ہے ۔ اس صفت میں اس کا کوئی شریک نہیں ۔ ذرے ذرے کا علم صرف خدا تعالیٰ کے پاس ہے کیونکہ "اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ" علیم کل صرف وہی ذات ہے ۔

خدائی بصارت اور سماعت

فرمایا اَبْصِرْ بِہٖ اللہ تعالیٰ خوب دیکھتا ہے وَاَسْمِعْ اور وہ خوب سنتا ہے ۔ خدا تعالیٰ کا دیکھنا اور سننا بھی عجیب و غریب ہے جو انسان کی عقل میں نہیں آسکتا ۔ انسانوں اور دوسری مخلوق کو دیکھنے کے لیے آنکھوں اور سننے کے لیے کانوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اسی طرح اور دیگر مادی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کے ذریعے کوئی آواز کان تک پہنچتی ہے ۔ اسی طرح دیکھنے کے لیے روشنی کا ہونا اور پھر کسی چیز کا

نگاہ کے سامنے ہونا ضروری ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ ہر قسم کے آلے سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ سننے کے لیے نہ کانوں اور دیگر لوازمات کا محتاج ہے اور نہ دیکھنے کے لیے اُسے روشنی کی ضرورت ہے وہ ہر چیز پر حاوی اور محیط ہے اس لیے وہ ہر چیز کو ہر آن سن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے۔ اس کے دیکھنے اور سننے کی کیفیت انسانی فہم میں نہیں آسکتی۔

فرمایا مَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن وَلِيٍّ بندوں کے لیے اللہ کے سوا کوئی کارساز نہیں ہے جو کسی کی بگڑی بنا سکے۔ اس کے علاوہ تصرف کی مالک کوئی ذات نہیں۔ وہی کارساز مطلق ہے اس صفت کو کہیں ولی کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے اور کہیں وکیل کے ساتھ۔ ہر چیز کا ولی اور وکیل فقط خدا تعالیٰ ہے۔ اسی لیے فرمایا لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا (المزمل - ۹) اُس کے سوا کوئی معبود نہیں لہٰذا اُسی کو اپنا کارساز بناؤ۔ ہر چیز اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ نافع و ضار، علیم کل، قادر مطلق، متصرف اور مدبر صرف وہی ہے اچھی اور بُری پوری مخلوق میں اس کے سوا کوئی کارساز نہیں۔

بلاشرکت غیرے فیصلہ

فرمایا وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا وہ اپنے فیصلے اور حکم میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتا۔ وہ کسی کا محتاج نہیں، لہٰذا ہر چیز کا فیصلہ بھی وہ خود کرتا ہے۔ گذشتہ سورۃ میں بھی گزر چکا ہے کہ اس کا کوئی معاون اور مددگار نہیں ہے اور آگے اس سورۃ میں بھی آرہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی معاملہ میں کوئی معاون نہیں اور نہ ہی اُس کو ضرورت ہے، اُس کا ہر فیصلہ اپنی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے فیصلے میں کسی دوسری ذات کو شریک بنائے گا، تو وہ مشرک بن جائے گا کیونکہ یہ بات إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (الانعام - ۵۷) کے خلاف ہے۔ حکم صرف اللہ کا ہوتا ہے۔ وہ

جو بھی فیصلہ کرے اس میں کسی مخلوق کو شریک نہیں بناتا۔ وہ خود مختار ہے
اور ہر فیصلہ کرنے پر مکمل قدرت رکھتا ہے۔ اصحاب کہف کا واقعہ
اس کی مشیت اور فیصلے کی مثال ہے۔ اس کے سوا کون ہے جو کسی
جاندار کو سینکڑوں سال تک بغیر کھائے پیئے زندہ رکھ سکے؟ یہ تو اللہ
نے اپنی قدرت کی نشانی ظاہر فرمائی ہے۔ وہ ایسا احکم الحاکمین ہے
جو اپنے فیصلے میں کسی کو شریک نہیں کرتا

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

ترجمہ:۔ آپ پڑھیں اس چیز کو جو وحی کی گئی ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی کتاب۔ نہیں ہے کوئی تبدیل کرنے والا اس کے کلمات کو، اور ہرگز نہ پائیں گے آپ اس کے سوا کوئی جائے پناہ ﴿۲۷﴾ اور آپ صبر کریں اور روکے رکھیں اپنے نفس کو اُن لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے پروردگار کو صبح اور پچھلے پہر۔ چاہتے ہیں اس کی رضا۔ اور نہ آپ دور کریں اپنی آنکھوں کو اُن سے۔ کیا آپ دنیا کی زندگی کی زینت چاہتے ہیں؟ اور آپ نہ مانیں بات اس شخص کی جس کے دل کو ہم نے غافل کر دیا ہے اپنی یاد سے، اور اُس نے اپنی خواہش کی پیروی کی ہے، اور اس کا معاملہ حد سے بڑھا ہوا ہے ﴿۲۸﴾

کتاب الٰہی کی حقانیت

اصحاب کہف کا واقعہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے وحی الٰہی یعنی قرآن پاک کی اہمیت کا ذکر کیا ہے اور معترضین کے اعتراضات کا علاج تجویز کیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔ وَاتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ کِتَابِ رَبِّکَ آپ پڑھیں اس چیز کو جو وحی کی گئی ہے آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی کتاب۔ صحیح بات تو اسی کتاب میں ہو گی۔ جو لوگ اس کے خلاف باتیں کرتے ہیں، وہ یقینی نہیں ہیں قطعی اور یقینی علم نہ تو لوگوں کی سنی سنائی باتوں میں ہے، نہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہے۔ آپ اس کتاب پر اعتماد رکھیں، اس کی تلاوت کریں اور اسی کو اپنا نصب العین بنائیں۔

قرآن پاک وحی جلی اور ہر چیز کی بنیاد ہے۔ باقی تمام چیزیں اس کی تشریح و توضیح ہیں۔ جو چیزیں اللہ نے اپنے پیغمبر کے قلب مبارک پر اتاری ہیں۔ وہ وحی خفی ہے اور اس کتاب کی تشریح ہے۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں وَالسُّنَّۃُ تُفَسِّرُ الْقُرْاٰنَ وَتُبَیِّنُہٗ سنت ایک ایسی چیز ہے جو قرآن پاک کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ گزشتہ پیوستہ درس میں اصحاب کہف کے متعلق اللہ کا فرمان گزر چکا ہے فَلَا تُمَارِ فِیْھِمْ آپ اس معاملہ میں ان لوگوں سے جھگڑا نہ کریں وَلَا تَسْتَفْتِ فِیْھِمْ اور نہ ان میں سے کسی سے پوچھیں۔ اصل بات وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتلائی ہے، لہٰذا تمام معاملات میں اسی کتاب پر اعتماد ہونا چاہیئے۔

کتاب الٰہی کی حفاظت

فرمایا اس کتاب کی حیثیت اس قدر قطعی اور یقینی ہے لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ کہ اس کے کلمات کو کوئی تبدیل کرنے والا نہیں ہے اس کتاب میں اللہ نے اپنے سچے دین کو غالب کرنے کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ یقیناً پورا ہو کر رہا، حالانکہ مشرکین اور اہل کتاب ہمیشہ اس دین کو مٹانے

کی کوشش کرتے رہے ہے۔ دلیل اور برہان کے اعتبار سے تو یہ دین تمام ادیان پر ہر وقت غالب ہے، تاہم اللہ نے سیاسی طور پر بھی دینِ اسلام کو دنیا میں غالب کرکے اپنے وعدے کی تکمیل کر دی۔

غیر مسلم اقوام نے اللہ کے اس آخری پیغام میں تغیر و تبدل کی لاکھ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ اس سلسلے میں یہودی ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ ابھی قریبی زمانہ میں جب اسلام کی روشنی افریقی ممالک میں پھیلی تو قرآن پاک کے نسخوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہودیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قرآن حکیم کے تحریف شدہ نسخے وہاں پہنچائے تاکہ لوگوں کو اِن کے ذریعے اسلام سے منحرف کیا جا سکے مگر اُن کی یہ سازش کامیاب نہ ہو سکی۔ اللہ تعالیٰ نے مصر کے ناصر مرحوم کو توفیق بخشی جس نے قرآن کریم کے صحیح نسخے چھپوا کر لاکھوں کی تعداد میں افریقی ممالک میں تقسیم کیے اور اس طرح یہودیوں کی سازش ناکام ہو گئی۔ یہ لوگ تراجم میں گڑبڑ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، نیز تحقیق کے نام پر مسلمانوں میں قرآن پاک سے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ہر دور میں ایسے بندے پیدا کرتا رہا ہے جو اس قسم کی سازش کو بے نقاب کرکے قرآن کا اصل پیغام لوگوں تک پہنچاتے رہے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ہر آنے والے دور میں ایسے عادل لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جو باطل پرستوں اور غالیوں کی غلط تاویلات کا تعاقب کرتے رہیں گے۔ فرمایا کسی دور میں بھی گمراہ لوگوں کو ایسا غلبہ کبھی حاصل نہیں ہوگا کہ حق بالکل ہی معدوم ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی حفاظت کا ذمہ خود اٹھا رکھا ہے اور اس کا جو مفہوم حضور علیہ السلام اور صحابہ کرام نے سمجھا وہ آج تک محفوظ ہے۔ بہرحال اللہ نے فرمایا کہ اس کتاب کے کلمات کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔

قرآن پاک کی حفاظت کا انتظام اللہ نے مختلف طریقوں سے کر رکھا ہے۔ اس کے الفاظ، اعراب اور قرأت کی حفاظت ہوئی، ہر زمانے میں اس کی تفسیر و توضیح ہوتی رہی۔ مسلمانوں نے صرف و نحو جیسے علوم ایجاد کیے جن کے ذریعے قرآن پاک کی ٹھیک ٹھیک وضاحت ہوتی رہی۔ قرآن پاک کے کلمات اور صیغوں کی حفاظت ہوئی، اور اس کی قرأت میں کوئی غلطی واقع نہ ہوا۔ فقہ اور اصول فقہ جیسے علوم و فنون مدون ہوئے تاکہ قرآن پاک کے معانی و مطالب کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ فصاحت و بلاغت کے علوم کے ذریعے قرآن کی عبارت کو عمدگی سے سمجھنے میں مدد ملی۔ پھر دین میں غلط باتوں کے در آنے کی نشاندہی ہوئی، صحیح کو ضعیف سے ممتاز کیا گیا۔ فقہائے کرام نے اجتہاد کے ذریعے مسائل کا استنباط کیا اور اس طرح قرآن حکیم کو صحیح طور پر سمجھنے میں مدد ملی۔

قرآن پاک کے اصول ایسے پائیدار ہیں کہ اللہ نے فرمایا وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (البینۃ ۵) یہ مضبوط اور مستحکم دین ہے، اس میں ایسی کوئی لچک نہیں کہ کوئی شخص اس کی حرام کردہ چیز کو حلال یا حلال کو حرام کر دے، اس کے بتائے ہوئے حلت و حرمت کے قوانین ایسے مضبوط ہیں کہ کوئی فرد واحد، جماعت یا حکومت ان کو تبدیل نہیں کر سکتی، اس سلسلے میں ساری مخلوق عاجز ہے اور اس کے کلمات کو کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔

اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں

فرمایا وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا اور آپ ہرگز نہ پائیں گے اس کے سوا کوئی جائے پناہ۔ اللہ تعالیٰ کے احکام و فرامین کی نافرمانی کرنے والے مجرمین کو کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ ملتحداً لحد کے مادے سے ہے جس کا معنی بغلی قبر ہوتا ہے۔ لحد دراصل قبر کا انتہائی کنارہ ہوتا ہے، اور دین میں الحاد بھی انتہائی کنارہ ہی ہوتا ہے جب انسان

گمراہی میں پہنچ جاتا ہے۔ تو اس کا معنیٰ وہ آخری کنارہ ہے جہاں کوئی انسان پناہ پکڑ لے۔ مگر فرمایا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے سوا کہیں سہارا اور پناہ گاہ میسر نہیں آسکے گی جس نے اللہ کی حکم عدولی کی اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اب اس کے لیے کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔

ضعفاء کیساتھ ہم نشینی

کفار و مشرکین کمزور اور غریب لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اُن کے ساتھ بیٹھنا اپنی توہین تصور کرتے تھے، اس لیے وہ حضور علیہ السلام سے کہتے کہ جب تک سلمان فارسیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ صہیبؓ، عمار بن یاسرؓ وغیرہ جیسے غریب لوگ آپکی مجلس میں موجود ہیں۔ ہم آپ کے پاس نہیں بیٹھ سکتے۔ اگر آپ ہمیں اپنی بات سنانا چاہتے ہیں تو ان غلاموں یا آزاد شدہ غلاموں کو اپنی مجلس سے اٹھا دیں اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو ان اولین جانثاران اسلام کی قدر و قیمت سے آگاہ فرمایا اور ان ضعفا کی ہم نشینی کسی صورت میں بھی ترک نہ کرنے کی تلقین فرمائی۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ آپ صبر کریں اور اپنے آپ کو روکے رکھیں اُن لوگوں کے ساتھ جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں۔ یعنی اسلام کے ان جانثاروں کو اپنی مجلس سے الگ نہ کریں۔ دوسرے مقام پر ہے کہ اگر آپ نے ان کو الگ کیا تو آپ زیادتی کرنے والے ہو جائیں گے۔ دیکھو! نوح علیہ السلام کی قوم کے امراء نے بھی آپ کے متبعین کے متعلق یہی بات کی تھی مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ (ھود - ۲۷) ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کے متبعین گھٹیا قسم کے لوگ ہیں جن کی کوئی حیثیت نہیں۔ آپ کا پیروکار کوئی بڑا آدمی تو نہیں ہے۔ سب کمین لوگ ہیں۔ بھلا ان کی موجودگی میں ہم آپ کے ساتھ کیسے

بیٹھ سکتے ہیں وہاں بھی اللہ نے نوح علیہ السلام کی زبان سے یہی کہلوایا کہ میں ان غریب لوگوں کو اپنی مجلس سے دھکیل دوں گا تو میں ظلم کرنے والوں میں سے بن جاؤں گا۔ یہاں بھی اللہ نے فرمایا کہ صبح و شام اللہ کا ذکر کرنے والوں کو اپنی مجلس سے دور نہ کریں یہی لوگ آپ کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ جو اُس وقت ایمان لائے جب مخالفت اور ایذا رسانیوں کی تند و تیز آندھیاں چل رہی تھیں۔

رضائے الٰہی کی طلب

فرمایا یہ ایسے لوگ ہیں یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے طالب ہیں۔ ان کے پیش نظر کوئی دنیاوی مقصد نہیں ہے بلکہ ہمیشہ خدا تعالیٰ کی خوشنودی کی تلاش میں رہتے ہیں جو کہ بلند ترین مقام ہے یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں معزز ترین لوگ ہیں کیونکہ ان کا مقصد بلند و اعلیٰ و ارفع ہے۔ جس سے اللہ راضی ہو گیا اُسے سب کچھ مل گیا۔ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ اللہ کی رضا تو سب سے بڑھ کر ہے کسی فرد جماعت یا قوم کی فلاح اسی میں ہے۔

اکثر لوگ دنیا کی ترقی کے پیچھے ہی پڑے رہتے ہیں۔ اسلام اس کا مخالف تو نہیں لیکن دنیا میں منہمک ہو کر اگر انسان کا اصل مقصد ہی فوت ہو گیا تو پھر اس مادی ترقی کا کیا فائدہ؟ لوگ امریکہ اور دوسرے امیر ملکوں پر رشک کرتے ہیں کہ انہیں دنیا کی تمام ضروریات با فراط میسر ہیں اور وہ عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مگر اس چند روزہ زندگی کے بدلے اگر ابدی زندگی خراب ہو گئی تو بڑے ہی نقصان کا سودا ہے اگرچہ ترقی یافتہ لوگ بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں مگر ان میں بھی حقیقت کا فقدان ہوتا ہے۔ کیا امریکہ اور برطانیہ میں غریب لوگ نہیں ہیں۔؟ روس کا دعویٰ بھی غلط ہے کہ سب کو ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہیں۔ وہاں بھی بعض کو اچھے مواقع مل جاتے ہیں اور بعض محروم رہ جاتے ہیں

بعض عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بعض تنگی میں گزر اوقات کرتے ہیں۔ ان کے ضمیر کچلے ہوئے ہیں۔ آزادیٔ فکر حاصل نہیں، وہ تو جانوروں کی طرح مجبور محض ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ قیصر و کسریٰ کے زمانے میں انسانوں سے بیلوں اور گدھوں کی طرح کام لیا جاتا تھا مگر انہیں اتنا وقت نہیں تھا کہ اپنی عاقبت کے متعلق بھی کچھ سوچ سکیں۔ جو وقت محنت مزدوری سے بچ جاتا ہے وہ لعب و لہو کی نذر ہو جاتا ہے۔ اللہ کی رضا نہ ان کا مقصود ہے اور نہ وہ اس کے لیے کوشش کرتے ہیں بہرحال اللہ نے ان غریب اہل ایمان کی تعریف فرمائی ہے کہ وہ اللہ کی خوشنودی کے طلبگار رہتے ہیں۔

درمیانی حالت ہی بہتر ہے

حضور علیہ السلام کے صحابہ کے بارے میں اللہ نے اجتماعی طور پر فرمایا ہے یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا (الفتح-۲۹) کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی خوشنودی تلاش کرتے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ کی اصطلاح میں فضل کا معنی ارتفاق یعنی دنیوی زندگی اچھے طریقے سے بسر کرنے کا طور طریقہ ہے۔ اور رضوان سے مراد خدا تعالیٰ کا قرب ہے جسے وہ مختلف طریقوں سے حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح ایمانداروں کے پاس بہتر طور پر زندگی بسر کرنے کا طریقہ بھی ہونا چاہیئے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ انسان کی تین حالتیں ہیں۔ بالکل معمولی حالت میں تنگی کی زندگی بسر کرنے کو تقشف کہتے ہیں۔ اس کو بھی پسند نہیں کیا گیا دوسری حالت رفاہیت بالغہ کی ہے جس کا مطلب ہے کہ انسان کو انتہائی درجے کی خوشحالی حاصل ہو، وہ بہترین مکان میں رہائش اختیار کرے بہترین لباس پہنے، خوراک بھی بہترین ہو اور سواری بھی نہایت عمدہ ہو۔ یہ حالت بھی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُہَا درمیانی حالت ہی اچھی ہے۔ لباس ہر شخص کو ملنا چاہیئے مگر نہ

بہت کم تر اور نہ زیادہ شان و شوکت والا۔ اگر جائز ذرائع سے کسی کو اچھا لباس میسر آتا ہے تو بیشک استعمال کرے مگر ہر وقت اچھے سے اچھے لباس، مکان، سواری اور عیش و عشرت کے پیچھے پڑے رہنا رفاہیت بالغہ اور ملوکیت کی علامت ہوگا۔ اس سے غریبوں کا حق تلف ہو کر سوسائٹی میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ دنیا کے بہترین لوازمات حاصل کرنے کی بجائے انسان درمیانی حالت پر اکتفا کرے، اجتماعی نظام اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ جس بستی کی آبادی دس ہزار نفوس کی ہو جائے وہاں مختلف پیشوں (OCCUPATIONS آکوپیشن) میں توازن قائم کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ صحیح پیشوں کی حوصلہ افزائی اور غلط پیشوں کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیئے تاکہ معاشرے میں اونچ نیچ ختم ہو اور سب کو ترقی و تعلیم کے یکساں مواقع میسر ہوں۔ انسانوں کو جانوروں کی طرح کام پر نہیں لگانا چاہیئے بلکہ انہیں اتنا وقت ضرور ملنا چاہیئے جس میں وہ اپنی عاقبت کی بہتری کے لیے سوچ و بچار کر سکیں۔ "وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا" (المزمل ۸) اور کچھ دیر کے لیے اپنے پروردگار کے ساتھ بھی لو لگا سکیں۔ بہرحال اللہ نے فرمایا کہ اے پیغمبر! آپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روک رکھیں جو صبح شام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور اس کی رضا کے متلاشی رہتے ہیں۔

غرباء کی طرف نگاہ شفقت

اللہ نے اپنے پیغمبر کو یہ بھی فرمایا وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ آپ اپنی نگاہ شفقت ایسے مخلص لوگوں سے دور نہ کریں بلکہ ہر وقت ان پر نگاہ شفقت رکھیں تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا کیا آپ دنیا کی زندگی چاہتے ہیں؟ یہ مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اصل مقصود اللہ کی رضا ہے اور اسی کی فکر کرنی چاہیئے۔ جب کبھی حضور کے دل میں ذرا بھی خیال پیدا ہوا کہ ان ضعفا کو تھوڑی دیر کے لیے علیحدہ کر کے

امراء کو بھی اسلام کی حقانیت سے خبردار کیا جائے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی نفی کر دی۔ فرمایا آپ یہ نہ خیال کریں کہ امراء کے ایمان قبول کر لینے سے اسلام پر بڑی رونق آ جائے گی۔ نہیں، بلکہ ایمان کی رونق تو اللہ تعالیٰ کی یاد سے آئے گی۔ محض مال و دولت سے اسلام ترقی نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر حضور علیہ السلام نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میری امت میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے ساتھ ہم نشینی کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ ہمیشہ انہی لوگوں میں بیٹھا پسند کرتے تھے۔

ابو داؤد طیالسی نے اپنی مسند میں اس حدیث کو بیان کیا ہے۔ جس کا ذکر امام ابن کثیرؒ نے بھی کیا ہے۔

لَأَنْ أُجَالِسَ قَوْمًا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ صَلٰوةِ الْغَدَاةِ إِلٰى طُلُوْعِ الشَّمْسِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ

یہ کہ میں بیٹھ جاؤں اُن لوگوں کے ساتھ جو صبح کی نماز سے لے کر طلوعِ سورج تک اللہ کا ذکر کرتے ہیں یہ میرے نزدیک اُن تمام چیزوں سے بہتر ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے

آپ نے یہ بھی فرمایا۔

وَلَأَنْ أَذْكُرَ اللّٰهَ مِنْ صَلٰوةِ الْعَصْرِ إِلٰى غُرُوْبِ الشَّمْسِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أُعْتِقَ ثَمَانِيَةً مِّنْ وُّلْدِ إِسْمٰعِيْلَ دِيَةُ كُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ اِثْنَا عَشَرَ أَلْفًا

یہ کہ میں نمازِ عصر سے لے کر غروبِ شمس تک بیٹھ کر اللہ کا ذکر کروں یہ میرے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ میں اولادِ اسماعیل علیہ السلام کے آٹھ غلام آزاد کروں جن میں سے ہر ایک کی دیت بارہ ہزار ہو۔

خدا تعالیٰ کا ذکر اتنی بلند چیز ہے اور یہ غریب لوگ ہی ہیں جو اللہ کا ذکر کرتے

ہیں اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ آپ ان کے ساتھ بیٹھنے کی کوشش کریں، اور یہ نہ خیال کریں کہ بڑے لوگوں کو اہمیت دینے سے اسلام کی ترقی ہو جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے نبیوں پر اولین ایمان لانے والے ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوئے ہیں۔ بڑے لوگ تو بالکل آخر میں آتے ہیں جب اُن کے بچنے فرار کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ ابوسفیانؓ اور دیگر بڑے بڑے اکابرین فتح مکہ کے بعد ہی ایمان لائے۔ اور جو لوگ روزِ اول سے تکالیف برداشت کر رہے تھے اُن کا مرتبہ بہت زیادہ ہے۔ وہ ہر امتحان میں کامیاب ہوئے، مال و جان قربان کیا، ہجرت کی صعوبتیں برداشت کیں، وطن چھوڑا مگر دین کو سینے سے لگائے رکھا۔ اللہ نے انہی کے ساتھ ہم نشینی کی ہدایت کی ہے۔

یادِ الٰہی سے غفلت

مزید ارشاد ہوا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا اور آپ اُس شخص کی بات نہ مانیں جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو حضور علیہ السلام کے بدترین دشمن تھے۔ فرمایا ہم نے انہیں اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ نے اُن کی ضد اور عناد کی وجہ سے سزا کے طور پر انہیں اپنی یاد سے غافل کر دیا۔ یہودیوں کے متعلق بھی فرمایا وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً (المائدۃ - ۱۳) اُن کی نافرمانی کی وجہ سے ہم نے اُن کے دلوں کو سخت کر دیا ہے اور یہ حق کی طرف رجوع ہی نہیں کرتے۔

بعض فرماتے ہیں کہ اَغْفَلْنَا کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس کے دل کو غفلت کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ نسبت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے کمیت شاعر نے کہا ہے ؎

ـ طَائِفَةٌ قَدْ اَكْفَرُوْنِيْ بِحُبِّكُمْ
وَطَائِفَةٌ قَالُوْا مُسِيْئٌ وَّمُذْنِبٌ

تمہاری محبت کی وجہ سے ایک گروہ نے مجھے کفر کی طرف منسوب کیا ہے اور دوسرے گروہ نے مجرم اور گنہگار کہا ہے۔ جس طرح اکفرونی کا مطلب کفر کی طرف منسوب کرنا ہے۔ اسی طرح اغفلت سے غفلت کی طرف منسوب کرنا ہے۔

مثل السامی والے امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ مَنْ اَغْفَلْنَا کا معنی صَادَفْنَا قَلْبَهٗ غَافِلًا ہے یعنی جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل پایا ہے۔ غافل کیا نہیں بلکہ غافل پایا ہے۔ غفل اُس تیر کو بھی کہتے ہیں جس پر کوئی نشان نہ ہو۔ زمانہ جاہلیت میں جوئے کے دس تیر استعمال کیے جاتے تھے جن میں سے سات تیروں پر ایک سے سات تک نمبر لکھے ہوئے تھے اور باقی تین تیر خالی ہوتے تھے، وہ غفل کہلاتے تھے اور یہاں مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے اور ایمان سے غفل یعنی خالی پا دیا ہے آپ اُس کی بات نہ مانیں۔ بعض مفسرین اغفلنا کا معنی رسوا کر دینا کرتے ہیں۔ اور جملے کا مطلب یہ کہ جو شخص اللہ کی یاد سے غفلت برتتا ہے، وہ ذلیل و رسوا ہو جاتا ہے

خواہشات کا اتباع

فرمایا ایسا شخص وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ اپنی خواہش کے پیچھے چلتا ہے وہ شخص حق کا متلاشی نہیں ہوتا، نہ کسی صحیح اصول کا طالب ہوتا ہے بلکہ ہمیشہ اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل چاہتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ (البقرۃ - ۱۶۸) شیطان کے نقش قدم پر مت چلو، کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے عقائد باطلہ اور بدعات کی پیروی دراصل شیطان ہی کا اتباع ہے۔ کیونکہ اللہ کی خوشنودی کا راستہ تو صرف وہی ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بتلایا ہے۔ ہر خوشی اور غمی میں وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر خواہشات

کے پیچھے چلو گے تو تباہ ہو جاؤ گے اور خدا کی خوشنودی حاصل نہیں ہو سکے گی۔ غرضیکہ فرمایا کہ آپ اُس شخص کی بات نہ مانیں جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل پایا اور اس نے اپنی خواہشات کی پیروی کی۔

فرمایا وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ایسے شخص کا معاملہ تو حد سے بڑھا ہوا ہے۔ وہ افراط و تفریط کا شکار ہے جو کہ بڑی ہی مذموم چیز ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر خاتم النبیین کو بھی یہ ادب سکھلایا ہے اور پھر آپ کے واسطے سے باقی امت کو بھی کہ وہ غریب اور نادار اہل ایمان کو حقیر نہ سمجھیں بلکہ اُن کے ساتھ ہم نشینی اختیار کریں، اُن کے ساتھ اظہار ہمدردی کریں۔ دولت مندوں کی خوشامد نہ کریں اور غرباء کو نظر انداز نہ کریں۔ حضور علیہ السلام نے دعا میں بھی یہ الفاظ سکھلائے ہیں اَللّٰهُمَّ أَحْيِنِي مِسْكِينًا وَأَمِتْنِي مِسْكِينًا وَاحْشُرْنِي فِي زُمْرَةِ الْمَسَاكِينِ اے اللہ! مجھے مسکین ہی زندہ رکھ اور مسکین کی حالت میں ہی وفات دے اور میرا حشر بھی مسکینوں کے ساتھ ہی فرما۔ آپ علیہ السلام نے حُبَّ الْمَسَاكِينِ کی بھی دعا فرمائی، یعنی باری تعالیٰ مجھے مسکینوں کے ساتھ محبت رکھنے کی توفیق عطا فرما۔ الغرض! اللہ نے امراء کی نسبت غرباء کو ترجیح دی ہے اور انہیں کے ساتھ روابط قائم رکھنے کی تلقین فرمائی ہے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۚ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ ۚ بِئْسَ الشَّرَابُ ۗ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِــِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۗ نِعْمَ الثَّوَابُ ۗ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۳۱﴾ ع

ترجمہ :- (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیں کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے . پس جو چاہے ایمان لائے ، اور جو چاہے کفر اختیار کرے . بیشک ہم نے تیار کر رکھی ہے ظلم کرنے والوں کے لیے آگ . گھیرا ان کو اس آگ کے پردوں نے . اور اگر وہ فریاد کریں گے تو ان کی فریادرسی کی جائیگی پانی کے ساتھ جو گارا (تلچھٹ)

کی طرح ہو گا اور چہروں کو جلا ڈالے گا۔ یہ بہت ہی
بُرا مشروب ہو گا، اور بہت ہی بُرا آرام ہو گا (۲۹) تحقیق
جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام
دیئے، بیشک ہم نہیں ضائع کرتے بدلہ اس کا جس
نے اچھا عمل کیا (۳۰) یہ وہ لوگ ہیں کہ اِن کے لیے
باغات ہیں رہائش کے جن کے سامنے نہریں بہتی ہونگی
پہنائے جائیں گے ان (بہشتوں) میں کنگن سونے کے اور
پہنیں گے یہ کپڑے سبز باریک اور موٹے ریشم کے
تکیے لگائے ہوئے اُن میں تختوں پر بہت ہی اچھا بدلہ
ہے اور کیا ہی خوب آرام ہے (۳۱)

ربطِ آیات

اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کا واقعہ بیان کرنے کے بعد وحی الٰہی یعنی
قرآن پاک کی تلاوت کا حکم دیا۔ یہ ایک ایسی قطعی اور یقینی کتاب ہے جس کے کلمات
کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی شخص اس پر اعتقاد رکھنے اور اس پر عمل کرنے کی بجائے
اس کے خلاف چلے گا تو مجرم بن جائے گا اور کسی مجرم کے لیے خدا تعالیٰ کے
سوا کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ اللہ نے اُن مجرمین کا بھی رد فرمایا جو اپنے مالی تفوق
کی بناء پر غریب ایمانداروں کو حقیر سمجھتے تھے اور اُن کے ساتھ مجلس میں بیٹھنا بھی
گوارا نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ آپ ایسے مخلص ایمانداروں
سے علیحدگی اختیار نہ کریں بلکہ انہیں اپنے پاس بٹھائیں اور خود اُن کی مجلس میں بیٹھیں
جو صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور اُن کا مطلوب و مقصود رضائے الٰہی ہے۔
ایسے لوگوں سے اپنی نگاہِ شفقت نہ ہٹائیں۔ آپ اہلِ ثروت کو اسلام کی رونق کا
ذریعہ نہ سمجھیں بلکہ دینِ اسلام کی اصل رونق تو انہی غرباء کے دم قدم سے ہے، جو
مخلص مسلمان ہیں اور جنہیں کمتر سمجھا جاتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک

تو یہ ہے کہ اَلْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَّسَیَعُوْدُ غَرِیْبًا فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَآءِ[1] یعنی اسلام کے اولین ماننے والے غریب لوگ ہی تھے اور آخر میں بھی دین غریبوں میں ہی لوٹ آئے گا، اس لیے غریب لوگ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ فرمایا جن لوگوں کے دل ہماری یاد سے غافل ہیں، وہ اپنے مادی وسائل میں ہی سرمست ہیں۔ آپ ایسے لوگوں کی بات نہ مانیں اور جو لوگ حد سے بڑھے ہوئے ہیں، آپ ان کی طرف بھی توجہ نہ دیں۔

انسان فاعل مختار ہے

اب اگلی بات اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمائی ہے وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے۔ وحی الٰہی، کتاب، دین، شریعت، احکام سب تمہارے پروردگار کی طرف سے ہیں، ان میں کسی نبی کا ذاتی دخل نہیں ہے فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ پس جس کا جی چاہے ایمان قبول کر لے اور جس کا جی چاہے کفر کا راستہ پکڑے اللہ تعالیٰ نے حق کو واضح کر دیا ہے اور اب وہ کسی کو صحیح راستہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرتا اَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰہُ لَہَدَی النَّاسَ جَمِیْعًا (الرعد - ۳۱) اگر اللہ چاہے تو سب کو ہدایت دے کر تیر کی طرح سیدھا کر دے مگر یہ چیز اس کی حکمت اور مصلحت کے خلاف ہے اس کا اصول یہ ہے لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (البقرۃ - ۲۵۶) دین میں جبر نہیں ہے۔ ہدایت اور گمراہی کا راستہ واضح ہو چکا ہے۔ اللہ نے اسے انسانوں کے اختیار پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اللہ نے اپنے نبی کو بھی کہہ دیا لَسْتَ عَلَیْہِمْ بِمُصَیْطِرٍ (الغاشیۃ - ۲۲) آپ لوگوں پر داروغہ تو نہیں ہیں جو انہیں ایمان لانے پر مجبور کر دیں گے آپ تبلیغ دین کا کام کرتے ہیں، اور قبولیت ہدایت کی ذمہ داری انہی

[1] مسلم ص۸۴ ج ۱ (فیاض)

کو سونپ دیں، وہ خود اس کے ذمہ دار ہیں۔ اگرچہ ہر چیز کی توفیق اللہ کی طرف سے ہی ہوتی ہے، ایمان لانے کی توفیق بھی اللہ کی طرف سے ہی ملتی ہے اور انسان کفر بھی اللہ کی دی ہوئی طاقت سے ہی اختیار کرتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس حد تک اختیار دے دیا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جونسا راستہ چاہے اختیار کرلے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو تمام قویٰ عطا کرکے اور اپنی معرفت کے تمام ذرائع مہیا کرکے اس کا امتحان لینا چاہتا ہے اور امتحان کے لیے ضروری ہے کہ جس کا امتحان مطلوب ہے اس کو خاص حد تک اختیار بھی دیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کسب اعمال انسان کے لئے اختیار میں رکھا ہے۔ فرمایا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط (البقرۃ ۲۸۶) انسان کے لیے اس کی اپنی اچھی کمائی ہی مفید ہوگی اور اس کا برا عمل اسی کے خلاف جائے گا۔ لہٰذا اب یہ اس کی اپنی مرضی ہے کہ ایمان لے آئے یا کفر کا راستہ اختیار کرلے۔

ظالموں کے لیے آگ

البتہ اللہ نے اس سے بھی آگاہ فرمایا اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا یقیناً ہم نے تیار کر رکھی ہے ظالموں کے لیے آگ۔ جو لوگ ظلم کا راستہ اختیار کریں گے، کفر و شرک کے راستہ پر چلیں گے اور عقل کے خلاف کام کریں گے تو پھر ان کی قسمت میں دوزخ کی آگ ہوگی جس کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ دنیا کی آگ سے ستر گنا تیز ہوگی۔ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا گھیر لیا ہے ان کو اس آگ کے پردوں نے۔ سرادق پردوں کو کہا جاتا ہے جیسے خیمہ یا قنات کے پردے ہوتے ہیں۔ یہ پردے تو کپڑے کی چند تہوں کے ہوتے ہیں مگر ترمذی شریف کی روایت میں آگ کے پردوں کی موٹائی چار دیواروں کے برابر ہوگی اور ان میں سے ہر دیوار اتنی موٹی ہے کہ انسان چالیس سال تک چلتا رہے تو اسے طے نہ کرسکے۔ اس سے اندازہ لگالیں کہ اللہ کے نافرمانوں کو گھیرنے والی

آگ کی تپش کتنی تیز ہوگی۔

فرمایا وَاِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا اور اگر اہلِ دوزخ فریاد کریں گے کہ ہمیں کھانے پینے کے لیے کچھ عطا کیا جائے۔ یُغَاثُوْا بِمَآءٍ کَالْمُهْلِ تو اُن کی فریاد رسی کی جائے گی اُس پانی کے ساتھ جو گار یا تلچھٹ کی طرح ہوگا۔ مہل اُس تلچھٹ کو کہتے ہیں جو زیتون کے تیل کے نیچے جمع ہو جاتی ہے۔ اس کا اطلاق پگھلے ہوئے تانبے پر بھی ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دوزخیوں کو دیا جانے والا پانی سخت گرم ہوگا یَشْوِی الْوُجُوْهَ جونہی وہ چہروں کے قریب لائیں گے، وہ انہیں جلا ڈالے گا۔ سورۃ محمد میں فرمایا کہ دوزخیوں سے کہا جائیگا سُقُوْا مَآءً حَمِیْمًا لو یہ کھولتا ہوا پانی پی کر اپنی پیاس بجھا لو، مگر جونہی وہ اس کا ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتاریں گے فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ (آیت - ۱۵) تو وہ انکی آنتیں کاٹ کر نیچے پھینک دیگا۔ پھر اُن کو دُور سے جنتیوں کا حال بھی دکھایا جائے گا کہ دیکھو وہ کیسے آرام میں ہیں جہاں انہیں ہر طرح کی نعمت میسر ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ دوزخ والے جنتیوں سے کہیں گے کہ اللہ کے عطا کردہ پانی میں سے ہمیں ایک گھونٹ ہی پلا دو۔ تو اُدھر سے جواب آئے گا۔ "اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَی الْکٰفِرِیْنَ" (آیت - ۵۰) جنت کا کھانا پینا اللہ نے کافروں پر حرام کر دیا ہے۔ وہ تو اس کی بُو تک نہیں پا سکتے۔ بہر حال فرمایا کہ انہیں اس قسم کا گرم پانی دیا جائے گا بِئْسَ الشَّرَابُ جو بہت ہی بُرا مشروب ہوگا وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا اور بہت ہی بُرا آرام ہوگا۔ آرام کیا ہوگا، وہاں تو ہر قسم کا دکھ تکلیف اور مصیبت ہی ہوگی۔

ایمانداروں کے لیے اجر

یہ تو کفر، شرک اور ظلم کا راستہ اختیار کرنے والوں کا ذکر تھا۔ اب ذرا اہلِ ایمان کے انعامات بھی سن لیں۔ قرآن پاک کا یہ اسلوب بیان ہے

کو ترغیب اور ترہیب ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا جو لوگ اس دنیا میں رہ کر ایمان لے آئے، انہوں نے اللہ کی وحدانیت
کو اپنے دلوں میں جگہ دی۔ اللہ کے انبیاء، اس کی کتابوں اور قیامت کی تصدیق
کی، اس کے فرشتوں پر ایمان لائے اور اللہ اور اس کے رسول کے بتائے
ہوئے راستے پر چل نکلے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
انہوں نے نیک اعمال بھی انجام دیئے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے
ہیں کہ قرآن کے مطابق نجات کا مدار دو چیزوں پر ہے۔ ایک ایمان اور دوسری
اعمال صالحہ۔ ایمان کی حقیقت تو واضح ہو گئی اور اعمال صالحہ کے متعلق
فرماتے ہیں کہ نہایت غور و خوض کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بنیادی
طور پر اعمال صالحہ میں چار عبادات داخل ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج
حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد جو آدمی یہ چار عبادات
ادا کرے گا، وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ البتہ فقہائے کرام نے پانچویں
نمبر پر جہاد کو بھی شامل کیا ہے۔ یہ پانچ بنیادی عبادات ہیں باقی تمام مالی،
بدنی، قولی اور فعلی عبادات ان کے ضمن میں آجاتی ہیں۔

فرمایا، جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے اعمال انجام دیئے
اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا تو ہم نہیں ضائع کرتے
بدلہ اس شخص کا جس نے اچھا عمل کیا۔ اچھا عمل چھوٹے سے چھوٹا
بھی ہوگا تو قیامت کے دن پیش کیا جائے گا۔ فرمایا فَمَنْ یَّعْمَلْ
مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ (زلزال) ہر شخص اپنا قلیل ترین اچھا عمل بھی پا
لیگا اور اسی طرح ہر برا عمل بھی محفوظ ہے وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ (زلزال)
اور وہ اپنا ذرہ برابر برا عمل بھی دیکھ لیگا۔ بہرحال اہل ایمان اور اعمال صالحہ کے مرتکبین کے متعلق
فرمایا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے
باغات ہیں رہائش کے۔ سرسبز و شاداب باغات کے اندر ہی ان کے
رہنے کے لیے عالیشان محلات ہوں گے جن میں زیب و زینت

اور آرام و آسائش کے تمام سامان مہیا ہوں گے۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ان کے سامنے نہریں بہتی ہوں گی۔ باغات اور نہروں کا تصور انسانی زندگی کے لیے پورے آرام و راحت کا تصور پیش کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت کی زندگی میں انہیں ہر طرح کا آرام اور سکون حاصل ہوگا۔

سونے کے کنگن — زیب و زینت کی اشیاء میں سے زیورات کو خاص اہمیت حاصل ہے اور جنتی لوگ جنت میں زیورات سے محروم نہیں رہیں گے۔ فرمایا یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ ان کو جنت میں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ اس دنیا میں تو مردوں کے لیے سونا اور ریشم حرام ہیں، لیکن جنت میں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جنتیوں کو یہ چیزیں مہیا فرمائے گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مردوں کا کنگن پہننا تو اس دنیا کے لحاظ سے بھی کوئی اچھی چیز معلوم نہیں ہوتا، مگر اللہ نے اس کا اپنی نعمت کے طور پر ذکر کیا ہے۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ یہ تو دنیا کے مختلف زمان و مکان میں رواج کی بات ہے۔ بعض مقامات پر اس کا رواج ہے اور بعض پر نہیں ہے۔ قدیم زمانے میں بادشاہوں کے کنگن، ہار، انگوٹھیاں اور تاج پہننے کا ذکر ملتا ہے اور انہیں معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کسریٰ کا تاج جو مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا۔ اس پر زر و جواہر کا کام کیا ہوا تھا اور وہ بڑا قیمتی تاج تھا۔ اس کے موتی اور جواہرات کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ بڑے قیمتی قالین میسر آئے تھے۔ مگر حضرت عمرؓ نے کاٹ کر ان کے مصلے بنا لیے اور مجاہدین میں تقسیم کر دیے آپ نے ایسی چیزوں کے لیے کوئی عجائب گھر نہیں بنایا کہ وہاں یادگار کے طور پر رکھ دی جائیں۔ اسلام میں یہ تصور نہیں۔ اور جہاں اس قسم کا تصور پایا جاتا ہے، اس کی انتہا یہ ہے کہ حضورؐ کے کسی میوزیم میں کسی صورت کا

پاجامہ بھی رکھا ہوا ہے ۔ بہرحال زیورات پہننے کا رواج بعض جگہوں پر ہوتا تھا ۔ اور بعض مقامات پر ایسا تصور نہیں تھا ۔ اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ جنت میں جانے والا ہر شخص بادشاہ ہوگا ۔ ایسے بادشاہوں والی تمام سہولتیں حاصل ہوں گی ۔ اگر دنیا کے بعض بادشاہ سونے کے کنگن پہنتے رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ جنتیوں کو بھی یہ نعمتیں عطا کرے گا ۔

بہترین لباس

اچھے سے اچھا لباس بھی انسان کی پسندیدہ چیزوں میں سے ہے اللہ تعالیٰ اہل جنت کو بہترین لباس بھی عطا فرمائے گا ۔ فرمایا وَيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ وہ پہنائے جائیں گے لباس باریک اور موٹی ریشم سرسبز و شاداب باغات میں ان کے مکان ہوں گے اور پھر لباس بھی سبز رنگ ہی کا ہوگا ۔ جو ان کی زینت میں مزید اضافے کا باعث بنے گا ۔ سندس باریک ریشم کو استبرق موٹی ریشم کو کہتے ہیں ۔ اگرچہ دنیا میں مردوں کے لیے ریشم پہننا بھی جائز نہیں مگر جنت میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ چیز عطا کرے گا ۔ فرمایا مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ جنتی لوگ جنت میں صوفہ سیٹوں پر تکیہ لگا کر بیٹھیں گے ۔ ارائک ، اریکہ کی جمع ہے جس سے بیٹھنے کی آرام دہ چیزیں مراد ہیں ۔ لہٰذا اس کا ترجمہ کرسی ، صوفہ سیٹ ، بنچ یا پلنگ وغیرہ کیا جا سکتا ہے ۔

زندگی میں آرام و راحت کی چیزوں میں بیوی بھی شامل ہے ۔ چنانچہ جنت میں اہل جنت کو پاک بیویاں بھی حاصل ہوں گی ۔ سورۃ الدخان میں ہے ۔ "وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (آیت ۔ ۵۴) ہم پاکیزہ حوریں ان کے نکاح میں دے دیں گے ۔ یہ تو ساری مادی نعمتوں کا ذکر ہے ، اللہ نے فرمایا جنتیوں کے لیے اس سے بڑھ کر نعمتیں بھی موجود ہوں گی ۔ یہ لوگ پاکیزہ مجلسوں میں شریک ہوں گے ۔ انہیں خدا تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا ۔ جو بلند ترین

نعمت ہے۔ وہاں پر ہر قسم کی اشیاء کے بازار ہوں گے۔ جنتی جو چیز پسند کرے گا۔ بلا قیمت میسر ہوگی۔

آخر میں فرمایا نِعْمَ الثَّوَابُ یہ کتنا اچھا بدلہ ہے، خدا تعالےٰ اس کے انبیاء، کتب اور معاد پر ایمان لانے اور نیک اعمال انجام دینے والوں کے لیے نہایت ہی اچھا بدلہ ہے وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا اور کتنا ہی اچھا آرام ہے۔ ان نعمتوں کے تصور سے ہی کتنی راحت ہوتی ہے۔ پھر جب یہ فی الواقع مل جائیں گی تو کتنا آرام و سکون میسر ہوگا۔ غرضیکہ اللہ نے کفار و مشرکین کا حال بھی بیان کر دیا ہے اور پھر اہل ایمان کا ذکر بھی ہو گیا ہے اللہ نے دونوں کا موازنہ کر کے ترغیب و ترہیب کی بات مکمل کر دی ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿۳۳﴾ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿۳۵﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾

ترجمہ:۔ اور (اے پیغمبر!) آپ بیان کر دیں اِن لوگوں کے سامنے مثال دو شخصوں کی کہ ہم نے بنائے اُن میں سے ایک کے لیے دو باغ انگوروں سے، اور گھیر لیا ہم نے اِن دونوں کو کھجوروں کے درختوں کے ساتھ اور بنائی ہم نے اُن کے درمیان کھیتی ﴿۳۲﴾ دونوں باغ دیتے تھے اپنا پھل اور نہیں کمی کرتے تھے اس میں سے کسی چیز کی۔ اور چلائی ہم نے دونوں باغوں کے درمیان نہر ﴿۳۳﴾ اور اُس شخص کے لیے پھل تھا، پس وہ کہنے

لگا اپنے ساتھی سے ، اور وہ اُس کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا کہ میں زیادہ ہوں تجھ سے مال میں اور غالب ہوں تجھ سے تعداد میں (۳۴) اور داخل ہوا وہ اپنے باغ میں اس حال میں کہ وہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا ۔ کہنے لگا کہ میں نہیں گمان کرتا کہ یہ (باغ) ہلاک ہو کبھی (۳۵) اور میں نہیں گمان کرتا کہ قیامت برپا ہونے والی ہے ۔ اور اگر میں لوٹایا گیا اپنے پروردگار کے پاس ، تو پاؤں گا میں بہتر اس سے وہاں پلٹنے کی جگہ (۳۶)

ربط آیات — اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کا واقعہ بیان فرمایا ۔ پھر وحی الٰہی کی قطعیت کو بیان فرما کر اُس کے اتباع کا حکم دیا ۔ کافر، مشرک، مغرور اور متکبر لوگوں کا رد فرمایا ۔ کمزور ایمانداروں کو حقیر سمجھنے والوں کی مذمت کی اور پیغمبر اسلام کو حکم دیا کہ آپ اُن لوگوں کی مجلس اختیار کریں ۔ جو صبح اور پچھلے پہر اپنے پروردگار کو یاد کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی رضا کے طالب ہیں ۔ فرمایا ان پر اپنی نگاہ شفقت رکھیں ۔ آپ ان لوگوں کی بات نہ مانیں جنہیں اللہ نے اپنی یاد سے غافل پایا ہے ، جو اپنی خواہشات پر چلتے ہیں اور اُن کا معاملہ حد سے بڑھا ہوا ہے ۔ ایمان لانا یا نہ لانا انسانوں کی اپنی مرضی پر موقوف ہے ، جو ایمان لائے گا اس کو اچھا بدلہ نصیب ہوگا اور جو کفر کا راستہ اختیار کرے گا ، اس کے لیے اللہ نے سزا بھی تیار کر رکھی ہے ۔ اُن کے لیے جہنم کی آگ ہوگی جسے پردوں نے گھیر رکھا ہوگا ۔ ظالموں کے پینے کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا جو پگھلے ہوئے تانبے کی مانند ہوگا ۔ اس کے بعد اللہ نے ایمان لانے کے بعد نیک اعمال انجام دینے والے لوگوں کے متعلق فرمایا کہ اُن کو اُن کے اعمال کا بہتر بدلہ ملے گا ۔ خدا تعالیٰ انہیں ایسے باغوں میں جگہ دیگا ۔ جو رہائش کے قابل ہوں گے اور اُن کے سامنے نہریں جاری ہوں گی ۔ زیب و زینت کے لیے انہیں سونے کے کنگن اور باریک و دبیز ریشم کا لباس پہنایا جائے گا وہ

لوگ نہایت ہی عمدہ تختوں پر بیٹھ کر آرام کریں گے ۔
کنگن کا ذکر حدیث شریف میں بھی آتا ہے کہ اگر جنت کا ادنیٰ سے ادنیٰ زیور اس دنیا میں ظاہر کر دیا جائے تو وہ دنیا کے تمام اعلیٰ سے اعلیٰ زیورات پر غالب آجائے ــــــــــــ ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ جنتیوں کے کنگن ایسے نفیس ہوں گے کہ اگر ان میں سے صرف ایک کنگن اس دنیا میں ظاہر کر دیا جائے تو اس کے مقابلے میں سورج کی روشنی ماند پڑ جائے ۔ ترمذی شریف کی روایت[1] میں آتا ہے کہ جنت کی عورتوں کا ایک دوپٹہ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا دنیا اور اس کے تمام خزانوں سے قیمتی ہوگا ۔

دو شخصوں کی مثال

کفار کی سزا اور اہل جنت کے انعامات کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مومن اور کافر دو شخصوں کی مثال بیان فرمائی ہے ۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جن دو شخصوں کی مثال بیان کی جا رہی ہے ، یہ واقع میں بھی ہو سکتے ہیں اور محض تمثیل بھی ہو سکتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بعض چیزیں تمثیل کے ساتھ بھی سمجھائی ہیں ۔ مثلاً داؤد علیہ السلام کے واقعہ میں ننانوے اور سو دنبیوں کا قصہ ایک تمثیلی بات ہے ۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ جن دو شخصوں کی مثال بیان کی گئی ہے ان کا مونہہ نمونہ سکے میں موجود تھا ۔ ایک دولت مند کافر تھا جب کہ اس کا مومن بھائی غریب آدمی تھا ۔ بعض فرماتے ہیں کہ پہلے زمانے میں ایک دولتمند شخص فوت ہو گیا جس نے اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑے ۔ دونوں وارثان نے باپ کی جائیداد تقسیم کر لی اور ہر ایک کے حصے میں چار چار ہزار دینار آئے ان میں سے ایک بھائی کافر تھا جس نے اپنی رقم سے دو باغ خریدے جن کی مثال اللہ نے اس مقام پہ بیان فرمائی ہے ۔ دوسرا شخص مومن تھا ، اس نے اپنا سارا حصہ اللہ کی راہ میں صرف کر دیا اس کا ذکر بھی

[1] ترمذی ص ۲۵۵ و بخاری ج ۱ ص ۳۹۲ (فیاض)

اگلے درس میں آرہا ہے۔

دو باغوں کا مالک

ارشاد ہوتا ہے اے پیغمبر! وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ آپ ان لوگوں کے سامنے دو شخصوں کی مثال بیان کریں۔ ان مشرکین مکہ اور مشرکین عرب کو یہ مثال سنائیں تاکہ نصیحت حاصل کریں۔ فرمایا ان دو آدمیوں میں سے جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ ایک کے لیے ہم نے انگوروں کے دو باغ بنائے وَحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ اور ان دونوں کو ہم نے کھجور کے درختوں کی باڑھ سے گھیر لیا تھا۔ باغوں کی حفاظت کے لیے اکثر لوگ ان کے اردگرد دیوار کھینچ لیتے ہیں۔ خاردار تار لگا دیتے ہیں یا کانٹے دار جھاڑیاں اگا دیتے ہیں مگر ان دو باغوں کے اردگرد اللہ نے کھجور کے درخت پیدا کر دیے تھے جو بیک وقت باغ کے لیے باڑھ کا کام بھی دیتے اور خود بھی اعلیٰ قسم کا پھل دیتے۔ کھجور کے درخت عام طور پر لمبے ہوتے ہیں اور زمین پر ان کے سائے کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان کے نیچے خالی جگہ پر کاشتکاری بھی ہو سکتی ہے اسی لیے اللہ نے فرمایا وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا اور ہم نے دونوں باغوں کے درمیان کھیتی کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ غرضیکہ باغوں کے مالک کو بیک وقت تین فوائد حاصل تھے، اصل باغات انگوروں کے تھے، ان کے اردگرد کھجور کے درخت بطور باڑھ تھے اور خود بھی پھل دیتے تھے۔ اس کے علاوہ باغات کے درمیان خالی جگہ پر کاشتکاری بھی ہوتی تھی۔

فرمایا كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا دونوں باغ خوب پھل دیتے تھے وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا اور نہیں کم کرتے تھے اس میں سے کوئی چیز۔ موسم کے مطابق دونوں باغ خوب پھل دیتے تھے۔ فرمایا وَفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا اور ان دونوں کے درمیان

ہم نے نہر جاری کر دی تھی۔ پھل، اناج اور سبزی کا دارومدار پانی پر ہوتا ہے اللہ نے وہ بھی مہیا کر دیا تھا۔ خود انسانوں اور جانوروں کے پینے کے لیے بھی پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نہر جاری کر کے یہ ساری ضرورتیں پوری کر دی تھیں۔ بعض مفسرین نے اس نہر کا تعین بھی کیا ہے فرماتے ہیں کہ یہ نہر فلسطین میں رملہ نامی بستی کے قریب سے گزرتی تھی اس نہر کے کنارے وہ بستی ہے جس میں یہ دو شخص رہتے تھے۔

فرمایا وَكَانَ لَهُ ثَمَرٌ باغوں کے مالک کے ہاں دوسرے پھل بھی تھے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں ثمر سے مراد محض پھل نہیں بلکہ دوسرے ذرائع آمدنی بھی ہو سکتے ہیں۔ انسان تجارت کرتا ہے صنعت، دستکاری یا حرفت کا پیشہ اختیار کرتا یا کوئی دیگر کام کرتا تو وہ اس کا ذریعہ آمدنی ہوتا ہے اور ایسے کسی شخص کا حاصل یا پھل بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کی مثال مکہ کے بعض دولت مند لوگ ہیں جن کے طائف میں باغات تھے اور وسیع تجارتی کاروبار بھی تھا، انہوں نے ہزاروں دینار کی سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے بکریوں کے ریوڑ تھے کام کاج اور خدمت کے لیے غلام تھے۔ آرام و آسائش کا پورا سامان اور رفاہیت حاصل تھی۔ اللہ نے اولاد بھی کثرت سے عطا فرمائی تھی جیسے ولید بن مغیرہ کے دس بیٹے تھے جن پر وہ فخر کیا کرتا تھا۔ سورۃ القلم میں اللہ نے اس کی مذمت بیان فرمائی ہے۔ ان میں سے تین بیٹے اسلام لائے۔ ایسی ہی چیزوں کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ اس کے لیے پھل تھا۔

صاحب مال کا تکبر

فرمایا فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ اس نے اپنے ساتھی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا میں تجھ سے مال میں بھی زیادہ ہوں اور تعداد میں بھی غالب ہوں۔ میری اولاد ہے۔ لونڈیاں اور غلام ہیں، نوکر چاکر ہیں، برخلاف اس کے تمہارے

لہ قرطبی ص۴۰۳ ج۱۰ و خازن ص۱۷۵ ج۳ (فیاض)

پاس کچھ بھی نہیں۔ اس قسم کی باتیں وہ لوگوں کے سامنے فخر یہ طور پر کیا کرتا تھا۔ قرآن پاک میں دوسرے مقامات پر موجود ہے کہ اکثر نافرمان، کافر اور مشرک لوگ ایسی ہی چیزوں پر فخر کرتے ہیں، تو اس شخص نے بھی اپنے مال اور اولاد پر تکبر کا اظہار کیا۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهُ اسی حالت میں وہ اپنے باغ میں داخل ہوا۔ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ اس حال میں وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والا تھا۔ کفر اور شرک بجائے خود ظلم ہے جسے اس شخص نے اختیار کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے دماغ میں غرور و تکبر کا نشہ بھی موجود تھا اور وہ اپنے غریب مسلمان بھائی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ خدا کی قدرت پر یقین نہیں رکھتا تھا اور اپنی بڑائی کا اظہار کرتا تھا۔ یہ ساری چیزیں اپنی جان پر ظلم کرنے کے مترادف ہیں کیونکہ آخرت میں ان کا وبال اسی کی جان پر پڑے گا۔ بہر حال اسے اپنے مال و اولاد پر بڑا فخر تھا۔ قَالَ کہنے لگا۔ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا میں نہیں گمان کرتا کہ یہ سب کچھ کبھی ہلاک بھی ہو جائے گا۔ اس کے زعم میں یہ بات تھی کہ جب تک میں موجود ہوں میرا یہ مال و اولاد اور باغات بھی موجود ہیں۔

قیامت کا انکار

وہ شخص قیامت کا بھی منکر تھا، کہتا تھا۔ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً میں تو خیال نہیں کرتا کہ قیامت بھی واقع ہو گی۔ وقوع قیامت اور محاسبہ اعمال سب بناوٹی باتیں ہیں جن کی کچھ حقیقت نہیں۔ اس نے اللہ کے تمام انعامات کو اللہ تعالیٰ کے فضل کی طرف منسوب کرنے کی بجائے، اسے اپنے ذاتی کمال کا نتیجہ جانا۔ البتہ وہ اپنے پروردگار کو مانتا تھا جیسا کہ اگلے جملے سے واضح ہے۔ کہنے لگا وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا بھی گیا لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا تو وہاں پر مجھے اس سے بھی بہتری حاصل ہو گی جس طرح یہاں

باغات اور مال و دولت حاصل ہے ایسے ہی آخرت میں بھی یہ چیزیں بلکہ اس سے بہتر چیزیں حاصل ہوں گی۔ یہ بھی شرک کی ایک بدترین قسم ہے کہ دنیا کے لوازمات کو خدا تعالیٰ کی عطا سمجھنے کی بجائے اسے اپنی عقل و علم، ہنر، سائنس اور ٹیکنالوجی کا کمال سمجھا جائے۔ یہی الحادی شرک قارون میں بھی پایا جاتا تھا جس نے کہا تھا إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي (القصص ۔ ۷۸) میرے یہ تمام مال و خزانے میرے علم کی وجہ سے ہیں۔ مجھ پر کسی کا کیا احسان ہے جو میں اس کے نام پر اس میں سے خرچ کروں۔ آجکل اکثر تاجروں کا بھی یہی حال ہے۔ وہ ہیرا پھیری کر کے مال کماتے ہیں اور پھر اس کو اپنا کمال سمجھتے ہیں نہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کا احسان سمجھتے ہیں اور نہ اس کے قائم کردہ حقوق کی پابندی کرتے ہیں۔

بہر حال آج کے اکثر مشرکوں کا بھی یہی حال ہے۔ وہ اس دنیا کی حالت کو ہمیشگی پر محمول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم یہاں آسودہ حال ہیں تو آخرت میں بھی ایسے ہی ہوں گے۔ غرضیکہ اس مالدار شخص نے اپنے غریب بھائی کے ساتھ فخر و تکبر کی بات کی اور اس کو حقیر جانا۔ اب اگلے درس میں اللہ تعالیٰ نے دوسرے مسلمان بھائی کا جواب ذکر کیا ہے اور اس شخص پر جو آزمائش ڈالی تھی اس کو بیان کر کے مالدار شخص کی حسرت کو بیان کیا ہے۔

قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّاكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾ لَّٰكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا ﴿۳۸﴾ وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ إِن تَرَنِ أَنَا أَقَلَّ مِنكَ مَالًا وَوَلَدًا ﴿۳۹﴾ فَعَسَىٰ رَبِّي أَن يُؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّن جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاءِ فَتُصْبِحَ صَعِيدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾ أَوْ يُصْبِحَ مَاؤُهَا غَوْرًا فَلَن تَسْتَطِيعَ لَهُ طَلَبًا ﴿۴۱﴾ وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلَىٰ مَا أَنفَقَ فِيهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا ﴿۴۲﴾ وَلَمْ تَكُن لَّهُ فِئَةٌ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مُنتَصِرًا ﴿۴۳﴾ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ ۚ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾

ترجمہ: کہا اس (کفر کرنے والے) سے اس کے صاحب نے (جو مومن تھا) اور وہ اس کی بات کا جواب دے رہا تھا،

کیا تو نے کفر کیا ہے اُس ذات کے ساتھ جس نے تجھے پیدا
کیا ہے مٹی سے ، پھر قطرہِ آب سے ، پھر برابر کیا ہے تجھے
ایک مرد (۳۷) لیکن (میں تو کہتا ہوں) وہ اللہ ہی میرا رب ہے
اور میں نہیں شریک بناتا اُس کے ساتھ کسی کو (۳۸) اور تو نے
ایسا کیوں نہیں کیا کہ جب تو داخل ہوا تھا اپنے باغ میں
تو کہتا جو چاہے اللہ تعالیٰ ، نہیں طاقت مگر اللہ کے ساتھ
اگر تو دیکھتا ہے مجھے کہ میں کم ہوں تجھ سے مال میں
اور اولاد میں (۳۹) پس اُمید ہے کہ میرا پروردگار دے گا
مجھے بہتر تیرے باغ سے اور وہ بھیجے گا اس کے اُوپر عذاب
آسمان سے پس ہو جائیگا وہ باغ چٹیل اور صاف میدان (۴۰)
یا ہو جائے گا اس کا پانی بہت گہرا ۔ پس نہیں طاقت
رکھے گا تو اس کو تلاش کرنے کی (۴۱) چنانچہ گھیر لیا گیا
اُس کے پھل کو ، پس ہو گیا وہ کہ ملتا تھا اپنے ہاتھ اُس
چیز پر جو اُس نے خرچ کیا تھا اُس (باغ) میں اور وہ گرا
پڑا تھا اپنے چھپروں پر ، اور وہ شخص کہتا تھا ، کاش کہ میں
نہ بناتا شریک اپنے رب کے ساتھ کسی کو (۴۲) اور نہیں
تھا کوئی گروہ جو اس کی مدد کرتا اللہ کے سوا ، اور نہ ہی
تھا وہ خود کسی طرح انتقام لینے والا (۴۳) یہاں پر ہی سب
اختیار اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو برحق ہے ۔ وہ بہتر ہے
ثواب دینے کے اعتبار سے ، اور بہتر ہے انجام کے اعتبار
سے (۴۴)

ربطِ آیات

اصحابِ کہف کا واقعہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جزائے عمل کے

سلسلے میں ایک دولت مند مشرک اور ایک ایماندار مومن کی مثال بیان فرمائی ہے امیر آدمی نے اپنے باغ میں داخل ہوتے وقت کہا کہ یہ تو کبھی فنا نہیں ہوگا۔ قیامت کا کوئی تصور نہیں ہے اور اگر یہ برپا بھی ہوگئی تو میں اس دنیا کی طرح وہاں بھی خوشحال ہی رہوں گا۔ وہ شخص اپنے باغ اور مال و دولت کو اپنا ذاتی کمال سمجھتا تھا اور اسے اللہ تعالیٰ کا احسان نہیں مانتا تھا۔ پھر اُس نے اپنے غریب مگر مومن بھائی کو طعن کیا کہ میں تم سے مال اور تعداد میں بہتر ہوں۔ وہ غریب مومن اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر چکا تھا مگر امیر آدمی اپنے مال و دولت پر اترا رہا تھا۔

مومن بھائی کا جواب

غریب بھائی نے امیر بھائی کی بات کو توجہ سے سُنا قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ یُحَاوِرُهٗ اور اپنے بھائی کو جواباً کہا اَكَفَرْتَ بِالَّذِیْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ کیا تو اُس ذات کے ساتھ کفر کرتا ہے جس نے تجھے پیدا کیا مٹی سے۔ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ اور پھر قطرۂ آب سے۔ یعنی نوع انسان کے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے ہی پیدا فرمایا جیسا کہ اُس کا ارشاد ہے "خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ" (آل عمران - ۵۹) اللہ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا۔ اور پھر باقی نوع کو قطرۂ آب سے پیدا کیا۔ دوسری جگہ "مَآءٍ مَّهِیْنٍ" یعنی حقیر پانی کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ مٹی ایک گرد و غبار ہے جس سے اللہ تعالیٰ اناج پیدا کرتا ہے جو انسان کی خوراک ہے اور اسی گرد و غبار سے اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ مٹی سے پیدا ہونیوالا انسان جب مٹی کی پیداوار بطور غذا استعمال کرتا ہے تو اس سے مادہ تولید پیدا ہوتا ہے جس سے نسلِ انسانی آگے چلتی ہے۔

مومن بھائی نے کہا، کیا تو اُس ذات کے ساتھ کفر کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر قطرۂ آب سے پیدا کیا۔ اور پیدا کر کے یونہی

نہیں چھوڑ دیا ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا بلکہ تجھے مکمل مرد کی صورت
میں برابر کر دیا۔ ذرا اپنے اعضاء کی طرف تو دھیان دے لَقَدْ خَلَقْنَا
الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (التین۔ ۴) ہم نے انسان کو
بہترین شکل و صورت دے کر پیدا کیا۔ اس کے تمام اعضاء اور قد کاٹھ کو
موزوں کر کے حسین و جمیل انسان بنا دیا۔ یہ موزونیت اور حسن ہی انسان
کو باقی مخلوق سے ممتاز کرتا ہے۔ اور کہنے لگا تو اپنے پروردگار کا انکار کرتا
ہے۔ تو سمجھتا ہے کہ یہ سارا مال و دولت تیری اپنی کمائی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کا
احسان نہیں مانتا۔ تو جو چاہے اپنا عقیدہ وضع کر لے لَّٰكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي
مگر میں تو یہی کہوں گا کہ میرا رب تو وہی اللہ ہے وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي
أَحَدًا میں تو اس کے ساتھ کسی کو شریک بنانے کے لیے تیار نہیں۔
لَٰكِنَّا دراصل لَٰكِنْ أَنَا أَقُولُ ہے، اسی لیے اس کا ترجمہ کیا
گیا کہ میں تو کہتا ہوں کہ وہ اللہ ہی میرا رب ہے۔ جو تمام قوتوں کا سرچشمہ
خالق، ربوبیت کا مالک، مدبر اور متصرف ہے۔ وہ وحدہ لاشریک ہے
مخلوق کو جب کوئی چیز ملتی ہے۔ تو وہ محض اس کی ہوشیاری اور ہنرمندی
سے نہیں بلکہ مشیت ایزدی سے ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" وَمَا
تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ
(التکویر۔ ۲۹) تمہاری چاہت اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی
جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے جو کہ تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ بہرحال
مومن بھائی نے اپنے عقیدے کا اظہار کر دیا کہ میرا رب اللہ ہے، میں
کسی کو اس کے ساتھ شریک نہیں بناتا، نہ صفت میں، نہ عبادت میں،
نہ نذر و نیاز میں اور نہ مشیت میں۔

پھر مومن بھائی نے اپنے کافر بھائی کو نصیحت بھی کی اور کہا وَلَوْلَا
إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ جب تم

اپنے باغ میں داخل ہوئے تو تم نے کیوں نہ کہا "جو اللہ چاہے، نہیں طاقت مگر اللہ ہی کے ساتھ۔ تم تو اپنے باغ، اولاد اور مال و دولت کو دیکھ کر کہتے تھے کہ کبھی ہلاک نہیں ہوں گے اور کم از کم میری زندگی تک یونہی رہیں گے تم قیامت کا بھی انکار کرتے تھے، تم نے ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیوں نہ کیا کہ وہ چاہے گا تو سب کچھ ہوگا۔ اور تمام قوتوں کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

ان کلمات کی فضیلت کے ضمن میں حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کیا میں تمہیں عرش اور جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ نہ بتاؤں؟ اور وہ ہے لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ یعنی برائی سے بچنے اور نیکی کرنے کی توفیق نہیں ہے جب تک اللہ نہ چاہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر انعام کرے تو اُسے یوں کہنا چاہیئے۔ مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ یہ کلمات کہنے سے اللہ تعالیٰ اُسے حوادثات اور پریشانیوں سے محفوظ رکھے گا۔ کیونکہ یہ بندہ اخلاص کے ساتھ عقیدہ توحید پر کاربند ہے اور سارے معاملات کو اللہ تعالیٰ کی طرف تفویض کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ پر توکل کا یہ کمال درجے کا کلمہ ہے۔ امام مالکؒ کا تکیہ کلام ہی یہ تھا۔ مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ نے اپنے مکان کی پیشانی پر یہ کلمہ کندہ کرایا ہوا تھا۔ کسی نے آپ سے کہا۔ حضرت! قرآن میں تو یہ کلمہ باغ کے بارے میں آیا ہے اور آپ نے اسے اپنے مکان پر لکھ دیا ہے۔ فرمایا، میرا یہ گھر اور میری اولاد میرا باغ ہی تو ہے، میں ان سب کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں، میں اس کی توحید کا قائل ہوں اور اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں۔

مومن کا حسن ظن

اب اس مومن شخص نے اپنے بھائی کے طعن کا جواب بھی دیا۔

کہا اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا اگر تو دیکھتا ہے کہ میں تجھ سے مال اور اولاد میں کم ہوں، تو کوئی بات نہیں ہے کیونکہ فَعَسٰى رَبِّىْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ مجھے اُمید ہے کہ میرا پروردگار مجھے تیرے باغ سے بہتر عطا فرمائیگا کیونکہ میرا مال اسی کی راہ میں خرچ ہوا ہے۔ اللہ تعالےٰ قادرِ مطلق اور مہربان ہے، میں اس کی توحید کا قائل اور اس کی عبادت کرنے والا ہوں۔ میں قیامت پر یقین رکھتا ہوں۔ لہٰذا مجھے وہ بہتر بدلہ عطا فرمائیگا

باغ کی تباہی

مومن بھائی نے یہ بھی کہا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ تمہارا مال، اولاد اور باغ ہمیشہ تمہارے پاس رہیں گے۔ تم اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا۔ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، ہوسکتا ہے وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ وہ بھیج دے گا اُس (باغ) پر عذاب آسمان سے۔ حُسْبَانًا کا لفظی معنی محاسبے والی چیز اور مراد کوئی آفت یا عذاب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا طوفان، آندھی یا بجولہ بھیج دے جس سے یہ سارا باغ تباہ ہوجائے فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا اور یہ جگہ چٹیل میدان بن کر رہ جائے۔ اس قسم کی کارگزاری کا اشارہ اللہ نے ابتدائے سورۃ میں بھی دیا ہے وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ہم زمین کی تمام چیزوں کو ملیامیٹ کر کے چٹیل میدان بنانے والے ہیں۔

اُس مردِ مومن نے اپنے بھائی کو اس طرح بھی خوف دلایا کہ باغ کے درمیان بہنے والی جس نہر پر تم غرور کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا اس نہر کے پانی کو بہت گہرا کر دے اور وہ تمہارے باغات تک پہنچ ہی نہ سکے۔ فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا اور تو اسے تلاش کرنے کی طاقت بھی نہ رکھے۔ پانی اتنی دور چلا جائے کہ تمہاری کوئی مشینری اور کوئی ٹیوب ویل اسے برآمد نہ کرسکے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے اور وہ سزا کے طور بھی ایسا کرنے

پر قادر ہے اس قسم کا مضمون سورۃ الملک کی آخری آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَاءٍ مَعِينٍ بھلا دیکھو تو اللہ تعالیٰ تمہارے پانی کو بہت گہرا لے جائے، تو پھر کون ہے جو تمہارے پاس صاف ستھرا اور شیریں پانی لے آئے۔ بہر حال اُس مردِ مومن نے اپنے دوسرے بھائی کو خبردار کر دیا کہ وہ مال و دولت پر اترائے نہیں کیونکہ جو خدا تعالیٰ یہ چیزیں دے سکتا ہے، وہ واپس لینے پر بھی قادر ہے۔

اور پھر ایسا ہوا، خدا تعالیٰ نے ایسی افتاد بھیجی وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ اُس کے پھل کو گھیر لیا گیا بمطلب یہ کہ اس کا باغ تباہ و برباد ہو گیا اور وہ شخص کفِ افسوس ملنے لگا۔ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلَىٰ مَا أَنْفَقَ فِيهَا اور وہ اپنے ہاتھ ملتا تھا اُس چیز پر جو اُس نے خرچ کیا تھا وہ شخص نہ صرف باغ کی برداشت سے محروم ہو گیا بلکہ اُس نے باغ کی ترقی کے لیے جو سرمایہ کاری کی تھی، وہ بھی ڈوب گئی۔ ایسی ہی مثال اللہ نے سورۃ القلم میں بھی بیان فرمائی ہے۔ وہاں باغ کے مالک کئی بھائی تھے جب پھل کی برداشت کا وقت آتا تو موقع پر غربا بھی جمع ہو جاتے اور انہیں بھی کچھ حاصل ہو جاتا۔ اُن بھائیوں نے کہا کہ یہ غریب لوگ خواہ مخواہ ہمارے مال سے حصہ لے جاتے ہیں، کیوں نہ ہم علی الصبح باغ کا پھل لیتے وقت میں اٹھالیں کہ غربا کو وہاں پہنچنے کا موقع ہی نہ ملے۔ چنانچہ وہ صبح صبح منہ اندھیرے باغ پر پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں باغ کا نام و نشان تک نہ تھا اور وہ کفِ افسوس ملتے رہ گئے۔ جس باغ کا ذکر یہاں پر کیا گیا ہے اُس کا بھی یہی حال ہوا۔ اللہ نے باغ کی جگہ چٹیل میدان بنا دیا اور باغ کا مالک منہ دیکھتا رہ گیا۔

انگوروں کی بیلیں عام طور پر لکڑی کے چھپروں یعنی فرمیوں پر چڑھا دی

جاتی ہیں تاکہ ان کا پھل ٹھیک آئے اور محفوظ رہے۔ مگر اس شخص کے باغ کی بیلیں وَھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا اپنے چھپروں پر گری پڑی تھیں۔ کوئی ایسا طوفان بادو باراں آیا تھا کہ ساری چھتریاں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں اور بیلیں زمین پر آگری تھیں جس کی وجہ سے سارا پھل تباہ ہو چکا تھا۔ وَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُشْرِکْ بِرَبِّیْٓ اَحَدًا پھر وہ شخص کہنے لگا، کاش میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے غرور و تکبر کا نتیجہ ظاہر ہو گیا تھا۔ قرآن پاک میں آتا ہے کہ اس طرح قیامت کو بھی مشرک لوگ افسوس کا اظہار کریں گے مگر اس وقت ان کا افسوس کرنا بے سود ہوگا۔

فرمایا، پھر اس شخص کا یہ حال تھا وَلَمْ تَکُنْ لَّہٗ فِئَۃٌ یَّنْصُرُوْنَہٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اللہ کے سوا اس کی مدد کرنے والا کوئی گروہ نہ تھا۔ وَمَا کَانَ مُنْتَصِرًا اور نہ ہی وہ کسی طرح انتقام لینے کے قابل تھا۔ بھلا خدا تعالیٰ سے کون انتقام لے سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے موحد اور مشرک کی مثال بیان کر کے شرک کا رد کر دیا ہے۔ خدا تعالیٰ کی مشیت کا انکار کر کے اپنے علم و ہنر پر اترانے والوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ جو اللہ نے اس باغ والے کا بیان فرمایا ہے۔

حاصل کلام

فرمایا هُنَالِکَ الْوَلَایَۃُ لِلّٰہِ الْحَقِّ اسی مثال سے یہ بات سمجھ لو کہ سارا اختیار اللہ کے پاس ہے جو برحق ہے۔ ولایت کا معنے اختیار اور تصرف ہے اور ولایت سے مراد حکومت یا اقتدار بھی ہوتا ہے یہ دونوں باتیں درست ہیں۔ تمام اختیارات اور تصرف بھی اللہ تعالیٰ ہی کا ہے اور حکومت اور اقتدار اعلیٰ بھی خداوند قدوس ہی کا ہے۔ اسی طرح اگر

اَلْحَقِّ پڑھا جائے تو اس سے مراد اختیار ہے اور اَلْحَقُّ پڑھا جائے، تو حکومت ہے۔ یہ دونوں قرأتیں درست ہیں اور دونوں کا اطلاق اللہ تعالےٰ کی ذات پر ہوتا ہے۔

فرمایا سارا تصرف اور حکومت اللہ کی ہے ھُوَ خَیْرٌ ثَوَابًا بدلہ دینے کے اعتبار سے بھی بہتر ہے، اپنے بندوں کے نیک اعمال کے بدلے میں کمی نہیں کرتا، بلکہ بڑھا چڑھا کر دیتا ہے وَخَیْرٌ عُقْبًا اور وہ انجام کے لحاظ سے بھی بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں توحید پرست نیکوکاروں کا انجام بھی بہت اچھا ہوگا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مقام میں داخل ہوں گے۔

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنزَلْنٰهُ
مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ
هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ
رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ
وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ
اَحَدًا ﴿۴۷﴾ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ۗ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا
كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۢ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ
نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى
الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ
يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً
وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا
حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾ ع

ترجمہ:۔ اور بیان کریں ان کے سامنے مثال دنیا کی زندگی
کی جیسا کہ ہم نے پانی اتارا آسمان کی طرف سے پس

رل گیا اُس کے ساتھ زمین کا سبزہ، پھر ہو گیا وہ خشک چورا
اڑاتی ہیں اس کو ہوائیں، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے
والا ہے (۴۵) مال اور بیٹے زینت ہیں دنیا کی زندگی کی، اور
باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں تیرے پروردگار کے پاس بلحاظ
بدلے کے، اور بہتر ہیں بلحاظ اُمید رکھنے کے (۴۶) اور جس
دن ہم چلائیں گے پہاڑوں کو، دیکھے گا تو زمین کو بالکل
کھلی ہوئی اور ہم اکٹھا کریں گے ان کو۔ پس نہیں چھوڑیں
گے ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی (۴۷) اور پیش کیے
جائیں گے یہ تیرے پروردگار کے سامنے صف در صف
البتہ تحقیق آئے ہو تم ہمارے پاس جیساکہ ہم نے پیدا
کیا تھا تم کو پہلی مرتبہ۔ بلکہ تم گمان کرتے تھے کہ ہم تمہارے
لیے نہیں مقرر کریں گے وعدے کا وقت (۴۸) اور رکھی
جائے گی کتاب، پس دیکھے گا تو مجرموں کو کہ ڈرنے
والے ہوں گے اس چیز سے جو اس کے اندر ہے۔ اور
کہیں گے افسوس ہمارے لیے! کیا ہے اس کتاب کو کہ یہ
نہیں چھوڑتی کسی چھوٹی چیز کو اور نہ بڑی چیز کو مگر اس
نے اُسے سنبھال رکھا ہے۔ اور پائیں گے یہ لوگ جو
انہوں نے عمل کیا اپنے سامنے، اور نہیں زیادتی کرے گا
تیرا پروردگار کسی پر بھی (۴۹)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایک دنیادار مشرک اور ایک ایماندار غریب آدمی کی مثال بیان فرمائی، اُن کی آپس میں گفتگو کا تذکرہ ہوا۔ مشرک بڑا مغرور تھا اور ایمان دار آدمی کو قلتِ مال اور قلتِ اولاد کا طعنہ دیتا تھا۔ ایماندار آدمی نے اُس

مشرک سے کہا کہ تو اس پروردگار کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے پہلے مٹی سے بنایا اور پھر قطرۂ آب سے تخلیق کی، تجھے انسان بنایا، اچھی شکل و صورت عطا فرمائی۔ تو جو چاہے عقیدہ اختیار کر، مگر میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ میرا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا تمہارا فرض یہ تھا کہ باغ میں داخل ہوتے وقت تمہاری زبان پر یہ کلمات ہوتے مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ یعنی جو اللہ چاہے۔ نیکی کرنے اور برائی سے بچنے کی توفیق اللہ تعالیٰ ہی عطا فرماتا ہے۔ کہنے لگا تیرا فرض یہ تھا کہ تو خدا تعالیٰ کی توحید پر ایمان لاتا اور تمام قوتوں کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہی کو جانتا۔ اس کی بجائے تو نے سمجھا کہ میرا باغ ہمیشہ یونہی رہے گا۔ اور قیامت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ بالفرض اگر قیامت آ بھی گئی تو میں آخرت میں بھی آسودہ حال ہی رہوں گا جیسا کہ اس دنیا میں ہوں اس مرد مومن نے کہا کہ خدا تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ اس باغ کو تباہ و برباد کر دے جس پر تمہیں ناز ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے باغ پر ایسی آفت نازل فرمائی کہ اسے ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ پھر وہ شخص اپنے کفر و شرک پر پچھتایا مگر وقت گزر چکا تھا کہنے لگا، کاش میں شرک نہ کرتا، مجھ پر میرے شرک ہی کی نحوست پڑ گئی ہے۔ پھر آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اختیار، حکومت اور تصرف تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ثواب کے اعتبار سے بھی اور انجام کے اعتبار سے بھی صرف اسی کی ذات بہتر ہے جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ انسان کو اسی پر ایمان رکھنا چاہیئے اور اس کی توحید میں شرک کی ملاوٹ نہیں کرنی چاہیئے کہ ایسا کرنا بہت بڑے ظلم کی بات ہے۔

دنیوی زندگی کی مثال

مومن اور کافر کی مثال بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے دنیوی زندگی کی بے ثباتی کی مثال بھی بیان کی ہے جس کی خاطر اکثر لوگ شرک میں مبتلا ہوتے

اور قیامت کا انکار کرتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے۔ وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ آپ ان کے سامنے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کریں جو کہ پانی کی مانند ہے۔ اور پانی کی حقیقت یہ ہے أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ جسے ہم نے آسمان کی طرف سے نازل کیا۔ عربی زبان میں چھت، فضا، نیلگوں آسمان اور بادل وغیرہ سب پر سماء کا اطلاق ہوتا ہے۔ بادل چونکہ اوپر فضا میں ہوتا ہے جس کے ذریعے بارش ہوتی ہے اس لیے یہاں پر سماء کا لفظ آیا ہے۔ تاہم اس لفظ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ بارش برسانے میں اوپر سے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کا دخل ہوتا ہے اور اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔

بہرحال اللہ نے دنیا کی اس عارضی اور فانی زندگی کی مثال پانی کے ساتھ دی ہے کہ ہم نے آسمان کی طرف سے پانی نازل فرمایا فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ پھر وہ پانی زمین کے پودوں کے ساتھ مل گیا۔ پانی زمین میں خلط ملط ہوا تو اس سے طرح طرح کی سبزیاں، پھل اور اناج پیدا ہوا۔ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا پھر وہ ہو گیا ... پھر کر چورہ چورہ ہو گیا تَذْرُوهُ الرِّيَاحُ جسے ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں۔ جس طرح مینہ برسنے سے تروتازہ سبزہ پیدا ہوتا ہے، پھر وہ اپنے وقت پر مرجھا جاتا ہے۔ پھر خشک ہو کر ہوائیں اسے اڑائے جاتی ہیں۔ اور وہاں کچھ بھی نہیں رہتا۔ اسی طرح انسان بڑا نرم و نازک حالت میں پیدا ہوتا ہے۔ پھر جوان ہوتا ہے۔ زندگی کی تمام آسائشیں حاصل کرتا ہے، زندگی کے بہترین حصے سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ پھر بوڑھا اور کمزور ہو جاتا اور آخر مر کر مٹی میں مل جاتا ہے لہٰذا زندگی کی اس عارضی اور پُرفریب تروتازگی پر مفتون نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے اپنے زوال سے بھی باخبر ہونا چاہیئے۔ زندگی ایک بالکل عارضی چیز ہے۔ اگر اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آخرت کے لیے

کوئی اچھا کام نہ کیا تو پھر آخرت کی دائمی زندگی میں ہمیشہ خسارا اٹھانا پڑے گا۔ لہذا زندگی کی عارضی چیزوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے۔

انسانی زندگی کی ناپائیداری

شیخ سعدیؒ نے اس عارضی زندگی کا نقشہ اپنے اشعار میں کچھ اس طرح کھینچا ہے۔

خوش است عمر دریغا کہ جاودانی نیست
پس اعتماد بریں پنج روز فانی نیست

ترجمہ:۔ عمر بہت اچھی چیز ہے لیکن افسوس کہ یہ ہمیشہ رہنے والی نہیں ان پانچ فانی ایام پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے۔

دلا رفیق بریں کارواں سرائے مبند
کہ خانہ ساختن آئین کاروانی نیست

ترجمہ:۔ اے دوست! اس فانی سرائے میں مستقل ٹھکانا پکڑنا عقلمندی کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ کاروانوں والے گھر نہیں بنایا کرتے۔

جہاں بر آب نہادست و زندگی برباد
غلام ہمت آنم کہ دل بدو نہ نہاد

ترجمہ:۔ خدا نے جہان کی بنیاد پانی پر رکھی ہے جب کہ زندگی کی بنیاد ہوا پر ہے میں تو اس شخص کی ہمت کا غلام ہوں جس نے ان پر دل نہیں رکھا۔

کس را بقائے دائم و عہدِ مقیم نیست
جاوید پادشاہی و دائم بقائے تست تو

ترجمہ:۔ کسی کے لیے بقائے دائم اور عہد مقیم نہیں ہے۔ اے پروردگار ہمیشہ رہنے والی بادشاہی اور دائم عہد صرف تیری ذات ہی کا ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگی کی مثال پانی کے ساتھ دے کر سمجھائی ہے وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا اللہ تعالیٰ

ہر چیز پر قادر ہے جس طرح اللہ تعالیٰ سبزہ کو پیدا کرتا ہے، پھر اسے خشک کر کے چورا چورا کر دیتا ہے اور ہوائیں اسے اُڑائے جاتی ہیں، اسی طرح انسانی زندگی میں بھی اسی قسم کے مراحل آتے ہیں اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے۔

مال و اولاد بمقابلہ صالحات

اللہ نے فرمایا جس چیز پر تم زیادہ مفتون ہوتے ہو۔ اس کی حقیقت بھی سن لو اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مال اور اولاد دنیا کی زندگی کی رونقیں ہیں وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ اور باقی رہنے والی نیکیاں ہیں خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّکَ ثَوَابًا جو بہتر ہیں تیرے پروردگار کے پاس ثواب کے اعتبار سے وَخَیْرٌ اَمَلًا اور بہتر ہیں اُمید اور توقع کے اعتبار سے۔ باقیات الصالحات کے سلسلے میں حدیث شریف میں کئی چیزوں کا ذکر آتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کے کلمات سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ ط وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ باقیات الصالحات میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کلمات کا ورد کرنے والے اور ان کے مصداق پر یقین رکھنے والے شخص کے لیے دائمی نیکیوں کا ذخیرہ بنا رہتا ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ باقی رہنے والی نیکیوں میں دین کی تعلیم، کسی اچھی رسم کا اجراء جس پر دوسرے بھی عمل کر کے فلاح پا سکیں، مسجد کی تعمیر، ضرورت کے مقام پر رفاہ عامہ کے لیے پانی کا انتظام کر دینا، سرائے تعمیر کرنا۔ وغیرہ ایسی نیکیاں ہیں جن کا اجر انسان کو مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔ اگر نیک اولاد پیچھے چھوڑی ہے تو وہ بھی باقیات الصالحات میں شمار ہوگی کہ یہ بھی صدقہ جاریہ ہے۔ امام حسن بصری رح کی روایت کے مطابق اگر بیٹیوں کی اچھی تعلیم و تربیت کی جائے تو بھی والدین کے حق میں باقیات الصالحات ہیں حالانکہ بیٹوں کے مقابلے

میں بیٹیوں کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ خمسہ، روزے، زکوٰۃ، حج، عمرہ، جہاد سب باقیات الصالحات ہیں۔ ان کے ضمن میں آنے والے سنن اور نوافل بھی اسی مد میں شمار ہوں گے۔ بہرحال باقیات الصالحات وہ نیکیاں ہیں جن سے انسان کو دائمی فائدہ حاصل ہوتا ہے اور جن سے اچھی توقع اور امید رکھی جاسکتی ہے۔

خدا کے حضور پیشی

آج تو انسان غرور و تکبر کی بنا پر قیامت کا انکار کرتا ہے۔ مگر اللہ نے فرمایا وہ وقت آنے والا ہے وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور وہ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ جیسے کوئی اونچ نیچ یا پہاڑی ٹیلہ نظر آئے گا، حتیٰ کہ زمین پہ کوئی درخت بھی باقی نہیں رہیگا۔ اُس وقت وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً تو دیکھے گا زمین کو کھلی ہوئی اور نمایاں۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے لَا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا (آیت - ۱۰۷) زمین میں نہ کوئی کجی ہوگی، نہ کوئی ٹیلہ اور نہ گڑھا۔ پوری کی پوری زمین ہموار ہو جائیگی۔

فرمایا وَحَشَرْنَاهُمْ اس دن ہم سب کو اکٹھا کر لیں گے فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا اور ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ ہر ایک کو حساب کتاب کے لیے جمع ہونا ہوگا۔ وَعُرِضُوا عَلَىٰ رَبِّكَ صَفًّا اور سب کے سب تیرے پروردگار کے سامنے پیش کیے جائیں گے قطار در قطار۔ ہر گروہ کے لوگوں کی الگ الگ قطار ہوگی، نمازیوں کی علیحدہ اور بے نمازوں کی علیحدہ۔ چور، شرابی، زناکار وغیرہ علیحدہ علیحدہ قطاروں میں پیش کیے جائیں گے۔ اور اجتماعی فیصلے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ لَقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ تحقیق تم آئے ہو ہمارے پاس جیسا کہ ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان پیدائش کے وقت

بالکل برہنہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ کے حضور پیشی کے وقت بھی سب لوگ برہنہ جسم اور بے ختنہ ہوں گے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا حضور! اس طرح تو بالکل بے پردگی ہوگی۔ فرمایا عائشہؓ! اس وقت معاملات بڑے سنگین ہوں گے۔ کسی کو کسی طرف دیکھنے کی ہوش ہی نہیں ہوگی۔ بلکہ ہر شخص اپنی اپنی فکر میں غلطاں ہوگا۔ اور یہ فکر اسے دوسروں سے بے نیاز کر دے گی۔ انہیں برہنگی کا احساس تک نہیں ہوگا۔ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حشر کے میدان میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا۔ جب کفار نے آپ کو آگ میں پھینکا تھا تو آپ کا لباس بھی اتروا لیا تھا۔ اور رسیوں سے باندھ کر آگ میں پھینکا تھا حشر کے میدان میں اللہ تعالیٰ آپ کی اس تکلیف کی قدر دانی کریں گے اور آپ کو سب سے پہلے لباس پہنائیں گے۔ البتہ ترمذی شریف کی روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قبر مبارک شق ہوگی اور آپ کو باہر نکالا جائے گا۔ اس وقت نیک دیندار اولیاء اور اتقیاء سب برہنہ ہوں گے۔ حضور نے فرمایا کہ اس وقت سب سے پہلے جنت سے ایک سوٹ لا کر مجھے پہنایا جائے گا۔

نامہ اعمال بطور کھلی کتاب

ارشاد ہوتا ہے بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا بلکہ تم لوگ گمان کرتے تھے کہ ہم تمہارے لیے وعدہ کا وقت ہرگز نہیں مقرر کریں گے۔ لیکن دیکھ لو اب وعدے کا وقت آ گیا ہے۔ پھر وَوُضِعَ الْكِتٰبُ کتاب یعنی ہر شخص کا نامہ اعمال کھول کر سامنے رکھ دیا جائے گا جسے ہر شخص خود پڑھ سکے گا۔ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ پھر تو دیکھے گا مجرموں کو بڑے خوفزدہ ہوں گے

اُس چیز سے جو اُن کے نامۂ اعمال میں درج ہے - اپنی زندگی بھر کا ریکارڈ دیکھیں گے وَيَقُولُونَ يَٰوَيْلَتَنَا مَالِ هَٰذَا ٱلْكِتَٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّآ أَحْصَىٰهَا اور کہیں گے، ہائے افسوس، ہماری خرابی یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ کسی چھوٹی چیز کو چھوڑتی ہے اور نہ بڑی کو اس نے سب کچھ شمار کر رکھا ہے - ہر چھوٹا بڑا، اچھا یا بُرا عمل اس میں لکھا ہوا ہے - ایک حدیث قدسی میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے ابن آدم! یہ تیرے ہی اعمال ہیں جن کو میں نے شمار کر کے رکھا ہوا ہے - اگر اپنے نامہ اعمال میں اچھائی پاؤ تو اللہ کا شکر ادا کرو، اور اگر برائی پاؤ تو یہ تمہارے ہی اعمال ہیں، ان کا بدلہ تمھیں مل کر رہے گا -

فرمایا وَوَجَدُوا۟ مَا عَمِلُوا۟ حَاضِرًا اور پائیں گے وہ اس چیز کو اپنے سامنے جو انہوں نے عمل کیا - ہر شخص کا ضمیر اس بات پر شاہد ہو گا کہ نامہ اعمال میں درج شدہ تمام اعمال اُسی کے ہیں - اللہ تعالےٰ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا اور تیرا پروردگار کسی پر ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرے گا - اللہ تعالیٰ کسی شخص کے برائی کا ارتکاب کیے بغیر اُس کے نامہ اعمال میں ذرہ بھر بھی برائی درج نہیں کرے گا اور نہ ہی کوئی معمولی سے معمولی نیکی بھی بغیر اجر دیئے چھوڑی جائیگی - ہر نیکی و بدی کا ٹھیک ٹھیک بدلہ دینا ہی عدل ہے اور اس کے خلاف کرنا ظلم ہے - اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ قطعاً زیادتی نہیں کرے گا. ہر شخص کی نیکی اور بدی اس کے سامنے ہو گی اور وہ اس کے مطابق بدلہ پائیگا.

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا إِلَّآ إِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهٖ ۭ أَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾ مَآ أَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلَا خَلْقَ أَنْفُسِهِمْ ۠ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا أَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾ ع

ع ۱۹

ترجمہ:- اور (اس بات کو یاد کرو) جب کہا ہم نے فرشتوں سے کہ سجدہ کرو آدم کے لیے، پس سجدہ کیا انہوں نے مگر ابلیس نے نہ۔ تھا (ابلیس) جنات میں سے۔ پس نافرمانی کی اس نے اپنے پروردگار کے حکم سے۔ پس کیا بناتے ہو تم اس (ابلیس) کو اور اس کی اولاد کو دوست میرے سوا حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔ بُرا ہے ظالموں کیلئے بدلہ ﴿۵۰﴾ میں نے نہیں حاضر کیا ان کو آسمانوں اور زمین کے پیدا

کرنے کے وقت ، اور نہ خود اُن کی جانوں کے پیدا کرنے کے وقت ۔ اور نہیں ہوں میں بنانے والا گمراہوں کو مددگار (۵۱) اور جس دن وہ فرمائیگا ، بلاؤ میرے اُن شریکوں کو جن کے بارے میں تم گمان کرتے تھے ، پس وہ پکاریں گے اُن کو ، پس وہ جواب نہیں دیں گے ، اور بنائیں گے ہم اُن کے درمیان ہلاکت کی جگہ (۵۲) اور دیکھیں گے مجرم (دوزخ کی) آگ کو ، پس وہ یقین کریں گے کہ وہ اس میں پڑنے والے ہیں ۔ اور نہیں پائیں گے وہ اس سے پھرنے کی کوئی جگہ (۵۳)

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ نے مومن اور مشرک آدمی کی بات ذکر فرمائی ۔ پھر دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کیا اور مال و اولاد کو دنیا کی زینت کا سامان تبلایا ۔ پھر قیامت کے محاسبے کا ذکر کیا کہ ہر چھوٹی بڑی چیز نامہ اعمال میں درج ہوگی ۔

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ دولت مند مشرک آدمی اپنے مال و دولت اور کثرت اولاد کی بناء پر اپنے مومن اور نادار بھائی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس طرح مغرور و متکبر کا مرتکب ہوتا تھا ۔ مومن آدمی نے اُسے سمجھایا کہ خدا تعالیٰ قادر ہے وہ اگر چاہے تو تیرے باغ ، مال اور اولاد کو ضائع کر دے اور تجھے قلاش بنا دے ، لہٰذا اس عارضی مال و اولاد پر تکبر نہیں کرنا چاہیے کہ یہ تو بڑی ہی نادانی کی بات ہے ۔

اسی تکبر ہی کے ضمن میں اب اللہ تعالیٰ نے ابلیس کا ذکر کیا ہے ۔ اس نے بھی تکبر کی بناء پر ہی سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا اور بالآخر ذلیل و خوار اور ہمیشہ کے لیے مردود ٹھہرا ۔ اللہ تعالیٰ نے ضمناً یہ بات بھی سمجھا دی ہے کہ کفر و شرک اور معصیت کے مرتکب لوگ ہمیشہ شیطان کے چنگل میں آجاتے ہیں حالانکہ شیطان اور اس کی ذریت بنی نوع انسان کی دشمن اور انہیں ہر طریقے سے گمراہ کرنے کی کوشش کرتی ہے ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ

سے منقول ہے کہ عام گناہ سے تو انسان کسی وقت بھی توبہ کر لیتا ہے لیکن
جو گناہ تکبر کی بنا پر کیا جاتا ہے اُس سے توبہ کی توفیق بھی نہیں ملتی، لہذا
آپ نے فرمایا کہ ایسے شخص سے بھلائی کی اُمید نہیں رکھنی چاہیئے۔

ابلیس سے دوستی

ارشاد ہوتا ہے وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ
اُس بات کو اپنے دھیان میں لاؤ جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم
علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرو۔ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ پس انہوں
نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے كَانَ مِنَ الْجِنِّ ابلیس جنات
میں سے تھا فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ پس اُس نے
اپنے پروردگار کے حکم کی نافرمانی کی، اور آدم کے سامنے سجدہ کرنے سے
انکار کر دیا۔ سورۃ البقرہ میں آتا ہے أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ
مِنَ الْكَافِرِينَ (آیت ۳۴) اُس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور
وہ کافروں میں ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی کارگزاری کا ذکر کر کے انسان
کو مخاطب کر کے فرمایا أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ
دُونِي کیا تم ایسے راندۂ درگاہ کو اور اس کی اولاد کو میرے سوا اپنا رفیق اور
دوست بناتے ہو؟ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ حالانکہ وہ تمہارے دشمن
ہیں۔ یہ تو بڑی ہی نادانی کی بات ہے فرمایا بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا
ظالموں کے لیے بہت بُرا بدلا ہے۔ ابلیس خود تو اپنے تکبر کی وجہ سے
جہنم واصل ہوا، اس کی دوستی کا دم بھرنے والے بھی اُسی قبیل کے ظالم ہیں
اور ظالموں کا بدلہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے فارسی والے بھی کہتے ہیں۔

بقول دشمن پیمانِ دوست بشکستی
ببیں از کہ بریدی و با کہ پیوستی

تو نے دشمن کے کہنے پر اپنے دوست کے عہد و پیمان کو توڑا۔ ذرا دیکھ
تو سہی کہ تم کس سے کٹ گئے اور کس کے ساتھ جُڑ گئے۔ خدا تعالیٰ سے

قطع تعلقی کر کے ابلیس کی دوستی اختیار کرنا کس قدر باعث نقصان ہے
ابلیس: ابلاس یا بلس مایوسی کا معنیٰ دیتا ہے۔ اس میں ذلیل اور محروم
ہونے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ دوسری جگہ کافروں کے لیے مُبْلِسُونَ
کا لفظ بھی آتا ہے یعنی جب اُن سے کچھ بن نہیں پڑے گا تو غمگین ہو
کر خاموش ہو جائیں گے۔ تاہم اس کا زیادہ تر معنیٰ رحمت سے بُعد کے ہیں
چونکہ ابلیس اللہ کی رحمت سے دُور اور مایوس ہو چکا ہے، اس لیے
اس کو یہ نام دیا گیا ہے۔

سجدے سے انکار

ابلیس تمام شیطانوں کا سردار تھا۔ اگرچہ اس کا تعلق جنات کی نوع
سے ہے مگر یہ فرشتوں کے درمیان رہتا تھا اور انہی کے ساتھ رُل مل
چکا تھا، اللہ کی بڑی عبادت کرتا تھا۔ خواجہ شمس الدین یحییٰ منیریؒ ساتویں صدی
کے بزرگ ہیں جنہوں نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے کہ ابلیس نے ستر
لاکھ سال عبادت کی۔ فضا میں اس کو اقتدار حاصل تھا، جہاں چاہتا بلا روک
چلا جاتا۔ مگر جیسا کہ سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ جب اسے سجدے کا
حکم دیا گیا تو اس نے غرور و تکبر کی بنا پر کہہ دیا کہ میں آدم علیہ السلام کے سامنے
کیسے سربسجود ہو سکتا ہوں جب کہ میں اس سے افضل ہوں خَلَقْتَنِي
مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (آیت -۱۲) مجھے تو نے
آگ سے پیدا کیا جب کہ آدم کو مٹی سے۔ آگ مٹی سے برتر ہے۔ لہٰذا
میں آدم کے سامنے سجدہ نہیں کر سکتا۔ جہاں تک فرشتوں اور ابلیس کے
باہمی تعلق کی بات ہے ابلیس فرشتہ تو نہیں تھا۔ بلکہ جنات میں سے تھا
اکثر مقامات پر سجدہ کے لیے لِلْمَلٰٓئِكَةِ کا لفظ آتا ہے یعنی اللہ
نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ سجدہ کرو، مگر ساتھ ہی ابلیس کے انکار کا ذکر
آتا ہے حالانکہ وہ فرشتہ نہیں تھا۔ سورۃ اعراف کے الفاظ سے معلوم
ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے علاوہ ابلیس کو بھی سجدے کا حکم

دیا تھا۔ اللہ نے اُسے مخاطب کر کے فرمایا مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (آیت - ۱۲) اے ابلیس! تجھے کس چیز نے سجدے سے منع کیا جب کہ میں نے تمہیں اس کا حکم دیا تھا۔

اس آیت کریمہ میں ابلیس کی کارگزاری میں فَسَقَ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا معنٰے ہم نے "نافرمانی" کیا ہے۔ فسق کا معنٰی اطاعت سے ... باہر نکل جانا ہے اور اس کا اطلاق کفر، نفاق اور باقی گناہوں پر بھی ہوتا ہے کافروں، یہودیوں اور منافقوں کو فاسق کہا گیا ہے۔ اور جس شخص کا عقیدہ صحیح ہو مگر گنہگار ہو، اُس کو بھی فاسق کہا گیا ہے۔ فسق کی اصطلاح عام ہے اور موقع کی مناسبت سے اس کو مختلف معانی پر محمول کیا جاتا ہے۔ لہٰذا عربی لغت میں جب مغز چھلکے سے باہر نکل جائے تو اُس کو فسق کہتے ہیں یعنی اس کا خروج ہو گیا۔ اسی لحاظ سے جب کوئی شخص اپنے رب کی اطاعت سے باہر نکل جاتا ہے تو اس پر فسق کا اطلاق ہوتا ہے۔

ملائکہ کے طبقات

فرشتے اللہ تعالیٰ کی برگزیدہ اور پاکیزہ مخلوق ہیں۔ حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا فرمان ہے خُلِقَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ نُوْرٍ وَخُلِقَتِ الْجَآنُّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ فرشتوں کو نورانی مادے سے پیدا کیا گیا جب کہ جنات کو آگ کے شعلے سے۔ شعلہ دراصل آگ اور ہوا دو عناصر کا مجموعہ ہوتا ہے مگر اس میں آگ کو غلبہ حاصل ہوتا ہے اسی حدیث میں آتا ہے خُلِقَ اٰدَمُ مِمَّا وُصِفَ لَكُمْ اللہ نے آدم علیہ السلام کو اُس مادے سے پیدا فرمایا جس کو تمہارے سامنے بیان کر دیا گیا ہے یعنی خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ اللہ نے اُس کو مٹی سے پیدا فرمایا۔ اسی لیے انسان کو خاکی کہا گیا ہے کہ یہ خاک کی پیداوار ہے۔ انسان کا وجود بہت سے عناصر کا مجموعہ ہے تاہم اس میں مٹی غالب ہے لہٰذا اس کی تخلیق مٹی کی طرف ہی منسوب کی جاتی ہے۔

آدم علیہ السلام کی تخلیق اور پھر اس کے ساتھ فرشتوں اور ابلیس کا ذکر قرآن پاک کے مختلف مقامات پہ مختلف عنوانات سے آیا ہے۔ ملائکہ کے ساتھ اجمعین کا لفظ بھی آیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو سجدے کا حکم دیا۔ تاہم امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور بعض دوسرے محقق مفسرین فرماتے ہیں کہ سجدہ پہ مامور فرشتوں سے مراد علیین کے ملائکہ نہیں بلکہ ملائکہ عنصریین ہیں۔ جیسا کہ مفسرین کرام بیان کرتے ہیں پہلے درجے میں ملاءِ اعلیٰ کے فرشتے ہیں جن کی آگے دو جماعتیں ہیں۔ ملاءِ اعلیٰ کے اہم حَآفِّیْنَ حَوْلَ الْعَرْشِ فرشتے ہیں جو عرش کے گرد طواف کرتے رہتے ہیں۔ پھر ملاءِ سافل کے آگے کئی طبقات ہیں۔ پھر علیین والے فرشتے ہیں۔ پھر آسمانوں والے، اس کے بعد فضا میں رہنے والے اور پھر ارضی فرشتے ہیں۔ بہر حال جن فرشتوں کو سجدہ کا حکم ہوا وہ ملائکہ عنصریین ہیں۔ فرشتوں کے مختلف طبقات کا مادہ تخلیق بھی الگ الگ ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں کی تخلیق ایسے لطیف مادہ سے ہوئی ہے۔ جیسے وہ آگ تھی جو موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر نظر آئی تھی۔ جب آپ اُس کے قریب گئے تو معلوم ہوا کہ یہ آگ نہیں بلکہ کوئی لطیف چیز ہے یہ حجاب نوری تھا یا حجاب ناری تھا۔ بہر حال شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عالمِ مثال کے فرشتوں کو لطیف عناصر سے پیدا فرمایا۔ پھر باقی نچلے طبقات کے فرشتوں کو مزید لطیف مادے سے تخلیق کیا۔ اس کے برخلاف جنات کی تخلیق آگ کے غلبہ والے عناصر سے ہوئی۔ آگے جنات کے بھی مختلف طبقات ہیں۔ شیاطین کی تخلیق سڑاند سے جیسے گندے نالے سے ہوئی۔ جہاں گندگی پھینکی جاتی ہے اس جگہ پہ تعفن پیدا ہو کر جو بخارات اٹھتے ہیں شیاطین کا مادہ تخلیق ایسا ہی غلیظ ہوتا ہے۔

ابلیس کی ریشہ اندازی

فرمایا کیا تم ابلیس اور اس کی ذریت کو اپنا رفیق بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے کھلے دشمن ہیں۔ ابلیس اپنے پورے لاؤ لشکر سمیت انسانوں

کو ورغلانے کے لیے حملہ آور ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ
ابلیس سمندر پر اپنا تخت بچھا کر اپنے حواریوں کو جمع کرتا ہے اور پھر انہیں
کائنات میں گمراہی پھیلانے کے مختلف امور پر مامور کرتا ہے۔ اس حدیث
میں دو باتوں کا خاص طور پر ذکر ہے۔ ابلیس کی ذریت میں سے جب
کوئی آکر یہ رپورٹ پیش کرتا ہے کہ میں فلاں میاں بیوی کے دلوں
میں وسوسہ اندازی کرتا رہا حتیٰ کہ اُن کے درمیان جدائی ڈال دی، تو ابلیس بہت
خوش ہوتا ہے اور اپنے حواری کو شاباش دیتا ہے کہ تو میرا اچھا بیٹا ہے، تو
نے اپنا فرض محنت کے ساتھ نبھایا۔ پھر دوسرا شیطان آکر یہ رپورٹ دیتا ہے
کہ میں فلاں شخص کے پیچھے پڑا رہا حتیٰ کہ اُس سے شرک کا ارتکاب کرانے میں
کامیاب ہوگیا۔ اس پر بھی ابلیس بہت مسرور ہوتا ہے اور کہتا ہے۔ اَنْتَ
اَنْتَ تو ٹھیک اور کامیاب ہے۔ غرضیکہ ابلیس نے گمراہی کے لیے مختلف
محکمے قائم کر کے وہاں پر مختلف شیاطین کو مقرر کر دیا ہے ان میں بعض
خصوصی ماہرین (SPECIALIST ، سپیشلسٹ) بھی ہوتے ہیں جو اپنی
کمال مہارت سے لوگوں کو گمراہ کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

شیاطین کے مختلف نام

حدیث شریف میں مختلف کاموں پر مامور شیاطین کے مختلف
ناموں کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً جو شیطان وضو کے دوران وسوسہ اندازی کرتا
ہے اس کو ولہان کہا گیا ہے۔ اور جو شیطان نماز کے دوران وسوسہ ڈالتا
ہے، وہ خنزب کہلاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کے شاگردوں
میں مجاہدؒ، حسن بصریؒ، ضحاکؒ، قتادہؒ وغیرہ جلیل القدر بزرگ ہوئے ہیں
جنہوں نے قرآن پاک کی بڑی خدمت کی ہے۔ ان میں سے حضرت
مجاہدؒ کا بیان ہے کہ انہوں نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے تین مرتبہ
قرآن پاک کی تفسیر پڑھی، آپ کا بیان ہے کہ شیاطین کی بہت سی قسمیں
ہیں۔ چنانچہ امام طبریؒ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ بازار میں اپنا جھنڈا گاڑتے

والے شیطان کا نام زلنبور ہے ۔ یہ شیطان تاجروں سے جھوٹے وعدے اور
جھوٹی قسمیں دلواتا ہے ۔ سودے میں دھوکہ فریب کرواتا ہے ۔ مال کے
عیب کی ستر پوشی کرواتا ہے ۔ اپنے کام میں ماہر ہونے کی بنا پر وہ
تاجروں کو ہر ممکن طریقہ سے گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔

فرماتے ہیں کہ جو شیطان کسی شخص کو مصیبت کے وقت گمراہ کرتا
ہے وہ ثبیر کہلاتا ہے ۔ ایسے مواقع پہ وہ لوگوں کو روتے پیٹنے، جزع فزع
اور واویلا کرنے کی تعلیم دیتا ہے ۔ اسی طرح زنا پر ابھارنے والے شیطان
کا نام اعور ہے، اور جو جھوٹی خبروں کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے
وہ مسوط کہلاتا ہے ۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص گھر میں داخل
ہوتے وقت اپنے گھر والوں کو سلام نہیں کرتا اس پر داسم نامی خاص قسم
کا شیطان داخل ہو جاتا ہے ۔ جب کوئی شخص گھر میں داخل ہوتے وقت
سلام نہیں کہتا تو شیطان کہتا ہے کہ اب مجھے گھر میں داخل ہونے
کا موقع مل گیا ہے ۔ پھر اگر وہ گھر میں اللہ کا ذکر نہیں کرتا تو شیطان
کہتا ہے، اب مجھے یہاں رات گزارنے کا موقع بھی مل گیا ہے ۔ پھر وہ
اہل خانہ کے قلوب میں اپنے اثرات ڈالتا رہتا ہے اور انہیں ہر طریقے
سے گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی بے نیازی

اللہ نے فرمایا کہ تم اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ اور نہ ان کے وسوسے
میں آؤ بلکہ ان سے بچنے کی کوشش کرو ۔ تم خواہ مخواہ ان کو کارگزار سمجھتے
ہو حالانکہ مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں نے
تو انہیں آسمان و زمین کی تخلیق کے وقت حاضر نہیں کیا تھا وَلَا خَلْقَ
اَنْفُسِهِمْ اور نہ انہیں ان کی اپنی جانوں کی پیدائش کے وقت حاضر
کیا تھا کہ دیکھ لو میری تخلیق میں کوئی نقص تو نہیں رہ گیا ۔ فرمایا ایسی بات
نہیں ہے ۔ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا اور نہ

ہیں۔ شیاطین جیسے گمراہوں کو اپنا معاون بنانے والا ہوں۔ مجھے کسی امداد کی ضرورت نہیں ہے جو میری تخلیق کی تصدیق کرے۔ کیا خدا تعالیٰ (العیاذ باللہ) محتاج ہے کہ ایسے مواقع پر شیاطین سے مدد طلب کرے۔ وہ تو بے نیاز ہے اُسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ تو کیا وہ ایسے باغیوں، سرکشوں اور نافرمانوں سے مدد چاہے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ تو بے عقلی کی باتیں ہیں۔ بھلا تم لوگ کیوں شیطان کے بہکاوے میں آتے ہو اور اُسے اپنا دوست بناتے ہو؟

شرکاء کی بے بسی

اللہ نے اگلی آیت میں فرمایا وَيَوْمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَائِيَ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ اور جس دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ بلاؤ میرے اُن شریکوں کو کہ جن کے متعلق تم گمان کرتے تھے کہ وہ تمہاری حاجت روائی اور مشکل کشائی کرتے ہیں۔ تم اُن کے نام کی دہائی دیتے تھے اور انہیں نذرانے پیش کرتے تھے، ذرا اُن کو اس مصیبت کے وقت بلاؤ فَدَعَوْهُمْ پس وہ اُن کو بلائیں گے، آوازیں دیں گے کہ آج ہماری مدد کرو فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ مگر وہ باطل معبود اُن کی کسی بات کا جواب نہیں دیں گے۔ اللہ نے فرمایا وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَوْبِقًا ہم بنا دیں گے ان کے درمیان ہلاکت کی جگہ وہ تابع اور متبوع دونوں ہلاکت کے مقام میں دھکیل دیے جائیں گے۔ دونوں گروہوں کو سزا کے ایک ہی مقام پر رکھا جائے گا۔

فرمایا، یہ ایسا وقت ہوگا وَرَأَى الْمُجْرِمُونَ النَّارَ کہ مجرم لوگ دوزخ کی آگ کو دیکھیں گے فَظَنُّوا أَنَّهُمْ مُوَاقِعُوهَا اور انہیں یقین ہو جائے گا کہ وہ اس آگ میں پڑنے والے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جہنم کی آگ چالیس سال کی مسافت سے نظر آ جائے گی تو اپنی کرتوتوں کی وجہ سے مجرمین کو یقین آ جائے گا کہ اب اس

سے بچ نہیں سکتے۔ وَلَمْ یَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا اور وہ اس سے
پھر جانے کی کوئی جگہ نہیں پائیں گے۔ دوزخ سے بچ کر وہ کسی دوسری
جگہ پناہ نہیں لے سکیں گے بلکہ انہیں ہمیشہ کے لیے اسی آگ میں
رہنا ہوگا۔

درس پانزدہم ۱۵ — آیت ۵۴ تا ۵۹

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ
وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ
اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ
اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ
قُبُلًا ﴿۵۵﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ
وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ
وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ
مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا
قَدَّمَتْ يَدٰهُ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ
يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى
الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ
ذُو الرَّحْمَةِ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ
لَهُمُ الْعَذَابَ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ
دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿۵۸﴾ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا
ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾ ع

ترجمہ :- اور البتہ تحقیق ہم نے پھیر پھیر کر مختلف طریقوں

سے) بیان کی ہیں اس قرآن میں لوگوں کے لیئے ہر قسم کی مثالیں اور ہے انسان زیادہ جھگڑالو ۵۴ اور نہیں روکا لوگوں کو ایمان لانے سے جب کہ اُن کے پاس ہدایت آگئی، اور بخشش طلب کریں اپنے پروردگار سے، مگر اس بات نے کہ آئے اُن کے پاس دستور پہلے لوگوں کا، یا آجائے اُن کے پاس عذاب بالکل سامنے ۵۵ اور نہیں بھیجتے ہم رسولوں کو مگر خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے۔ اور جھگڑتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا باطل کے ساتھ تاکہ وہ گرادیں اسکے ساتھ حق کو۔ اور بنایا انہوں نے میری آیتوں کو اور اس چیز کو جس کے ساتھ اُن کو ڈرایا گیا تھا۔ ٹھٹھا ۵۶ اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جس کو نصیحت کی گئی اس کے رب کی آیتوں کے ساتھ، پس اس نے اعراض کیا ان سے، اور بھول گیا اُس چیز کو جو اُس کے ہاتھوں نے آگے بھیجی ہے۔ بیشک ہم نے کر دیئے اُن کے دلوں پر پردے، اس بات سے کہ یہ اُس کو سمجھیں۔ اور اُن کے کانوں میں بوجھ ہیں۔ اور اگر آپ اُن کو بلائیں گے ہدایت کی طرف تو وہ ہرگز ہدایت نہیں پائیں گے کبھی بھی ۵۷ اور تیرا پروردگار بہت بخشش کرنے والا اور رحمت والا ہے اگر پکڑے اِن کو ان کی کمائی کی وجہ سے تو البتہ جلدی کردے ان کے لیے عذاب بلکہ اِن کے لیے ایک وعدہ ہے ہرگز نہیں پائیں گے یہ اُس کے ورے کوئی جائے پناہ ۵۸ اور یہ بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کیا ہے جب کہ

انھوں نے ظلم کیا ، اور ٹھہرایا ہم نے ان کی ہلاکت کے
لیے ایک وعدہ (۵۹)

ربطِ آیات

گذشتہ سے پیوستہ درس میں اللہ تعالیٰ نے مال اولاد کو دنیا کی زندگی کی رونق سے تعبیر کیا تھا اور تلقین کی تھی کہ ان چیزوں میں منہمک ہو کر اپنے مقصودِ حقیقی سے غافل نہ ہو جانا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں باقیات الصالحات ہی بہتر ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کا ذکر اور تسبیح کے کلمات ، تمام عبادات اور نیکی کے کام باقیات الصالحات میں داخل ہیں۔ مفسر قرآن اور مشہور تابعی حضرت عطاؒ فرماتے ہیں کہ نیک نیتی بھی باقیات الصالحات میں شامل ہے۔

اس کے بعد گذشتہ درس میں اللہ تعالیٰ نے شیطان کی گمراہی کا ذکر کیا اور انسانوں کو آگاہ کیا کہ ابلیس اور اس کی اولاد تمہاری دشمن ہے ، انہیں اپنا دوست مت بناؤ۔ ابلیس نے تکبر کی بنا پر خدا تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی اور اس پر محرومی اور لعنت پڑی۔ اس سے پچھلی آیت میں محاسبۂ اعمال کا ذکر بھی ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ ہر شخص کا نامۂ اعمال اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا۔ یَا مَلٰٓئِکَتِیْ اَقِیْمُوْا عِبَادِیْ عَلٰی اَطْرَافِ اَنَامِلِ اَقْدَامِھِمْ لِلْحِسَابِ اے میرے فرشتو! میرے بندوں کو پاؤں کی انگلیوں پر حساب کتاب کے لیے کھڑا کر دو۔ حشر کے میدان میں اتنا ہجوم ہو گا کہ پاؤں رکھنے کی جگہ بھی نہیں ہو گی اور لوگ پاؤں کی انگلیوں پر کھڑے ہوں گے۔

اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی ہدایت اور راہنمائی کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ تذکرہ اس سورۃ میں اس سے پہلے بھی دو مرتبہ ہو چکا ہے۔ سورۃ کی ابتداء میں فرمایا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں ۔

اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ" جس نے اپنے بندے پر یہ قرآن پاک نازل فرمایا جس میں کوئی کجی نہیں ہے۔ یہ کتاب خلافِ واقع امور سے پاک ہے اور اس کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو بشارت سنائی جائے اور عام لوگوں کو خدا تعالیٰ کی شدید گرفت سے ڈرایا جائے۔ پھر اللہ نے چوتھے رکوع میں فرمایا اے پیغمبر! آپ اس کتاب کو لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنائیں۔ یہ ایسی کتاب ہے۔ "لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ" کہ اس کے کلمات کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اس کا قانون اور ضابطہ بالکل اٹل ہے۔

آج کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے نتائجِ اعمال کا ذکر بھی کیا ہے پھر انبیاء علیہم السلام کے فرائض کا ذکر کیا ہے جس سے عام لوگوں کے فرائض کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہلاکت کے اسباب کا ذکر بھی کیا ہے کہ انسان ظلم کرنے کی وجہ سے تباہ ہوتے ہیں۔

قرآن پاک اور انسان

قرآن پاک کی حقانیت اور صداقت کے متعلق ارشاد ہوتا ہے "وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ" اور البتہ تحقیق ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثالیں پھیر پھیر کر بیان کی ہیں۔ ہر طریقے سے لوگوں کو اللہ کی وحدانیت، اس کی قدرت کاملہ اور محاسبہ اعمال کی بات سمجھائی ہے مگر "وَکَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا" مگر انسان اکثر جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ یہ دلائلِ قدرت، اللہ کی کتاب، انبیاء اور اس کے ملائکہ کو ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا بلکہ بات بات میں جھگڑے پر اتر آتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک رات حضور علیہ السلام حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کے گھر تشریف لے گئے، وہ آرام کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا تم رات کے وقت نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ اس پر حضرت علیؓ کی زبان سے یہ ادا

ہوا کہ حضرت! ہماری جانیں اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں
اِنَّ نُفُوْسَنَا بِیَدِ اللّٰہِ لہٰذا اگر خدا چاہے تو ہمیں رات کو بیدار کر
دیتا ہے اور ہم نماز ادا کر لیتے ہیں، ورنہ سوئے رہتے ہیں۔ آپ غصے کی
حالت میں واپس آ گئے۔ آپ اپنی ران پر افسوس کی وجہ سے ہاتھ مار رہے
تھے، اس وقت آپ کی زبان پر یہی الفاظ تھے وَکَانَ الْاِنْسَانُ
اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا انسان عام طور پر جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ دراصل
حضور علیہ السلام کو حضرت علیؓ کا جواب پسند نہیں آیا تھا۔ انہوں نے یہ فلسفہ
قائم کیا تھا کہ ہماری جانیں اللہ کے قبضہ میں ہیں اور اگر وہ اٹھا دیتا تو نماز
پڑھ لیتے ہیں، ورنہ نہیں، ان کا جواب تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ اگر اللہ کی
توفیق شامل ہوگی تو ضرور رات کو اٹھ کر نماز پڑھیں گے۔ لمبا چوڑا فلسفہ
چھانٹنے کی ضرورت نہ تھی۔ بہرحال فرمایا کہ انسان جھگڑالو واقع ہوا ہے
حالانکہ ہم نے اس کے سامنے ہر قسم کی مثالیں بیان کر کے بات واضح کر دی ہے

تہذیب انسانی

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف مثالیں بیان کرنے کا مقصد یہ ہے
کہ فطرت انسانی کی اصلاح ہو جائے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں،
جب تک انسان کفر، شرک، ظلم اور بداخلاقی سے باز نہ آ جائے۔ شیخ
عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ اگر انسان کے باطن میں شرک کی نجاست
موجود ہے تو نئے اور اچھے کپڑے پہننے کا کیا فائدہ؟ آپ نے یہ
بھی فرمایا اِذَا خَرَجَتْ نُوْرٌ دَخَلَ نُوْرٌ انسان کی فطرت میں اس
وقت تک نور داخل نہیں ہوتا جب تک کہ اس سے جھوٹ خارج نہیں
ہو جاتا۔ گویا انسان کی تہذیب اور شائستگی اس وقت ممکن ہوگی جب اس
سے شرک، ظلم اور بداخلاقی دور ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں قرآن پاک
انسان کی راہنمائی کرتا ہے کہ انسان کس طرح مہذب بن سکتا ہے۔ جب
بھی اللہ کی کتاب نے لوگوں کو مہذب بنانے کی کوشش کی انہوں نے

احکامِ الٰہی کو ماننے کی بجائے بیہودہ فرمائشیں شروع کر دیں۔ مثلاً متکبر مشرک کہتے تھے کہ ہم آپ کی مجلس میں اُس وقت تک نہیں بیٹھ سکتے۔ جب تک آپ ان غریب اور حقیر اہلِ ایمان کو یہاں سے اٹھوا نہ دیں۔ اللہ نے اپنے نبی کو فرمایا کہ آپ ایسی بات ہرگز نہ کریں، ان کا تو کام ہی حجت بازی ہے اور یہ جھگڑالو لوگ ہیں، آسانی سے ماننے والے نہیں ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے اکابرین نے بھی یہی عذر پیش کیا تھا کہ ہم ان کمین لوگوں کے ساتھ آپ کی مجلس میں نہیں بیٹھ سکتے۔ مگر نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر میں ان مخلص اہلِ ایمان کو اپنی مجلس سے دُور کر دوں تو میں ظلم کرنے والا بن جاؤں گا۔ فرمایا ہمیں تو اللہ نے ظلم کے خلاف ہی مبعوث فرمایا ہے۔ بھلا ہم خود کیسے ظلم کر سکتے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انبیاء کی بعثت کا ایک مقصد "رَفْعُ التَّظَالُمِ مِنْ بَیْنِ النَّاسِ" یعنی لوگوں کے درمیان سے ظلم کو ہٹانا بھی ہے[1]۔ پہلے درجے میں کفر اور شرک کا ارتکاب ظلم ہے اور پھر مخلوق کے ساتھ ہر قسم کی زیادتی بھی ظلم میں داخل ہے۔ غرضیکہ انسانی تہذیب اُس وقت مکمل ہو گی جب ان تمام قباحتوں کا قلع قمع ہو کر انسان میں اچھے خصائل پیدا ہو جائیں۔

ایمان لانے میں رکاوٹ

اب اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان نہ لانے کی وجوہات بیان فرمائی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اور نہیں روکا لوگوں کو ایمان لانے سے اِذْ جَآءَھُمُ الْھُدٰی جب کہ اُن کے پاس ہدایت آ گئی۔ ایک تو ایمان لانے سے روکا اور دوسرا وَیَسْتَغْفِرُوْا رَبَّھُمْ اپنے پروردگار سے بخشش مانگنے سے بھی روکا۔ ایمان اور بخشش طلبی سے رکنے کی دو وجوہات اللہ نے بیان فرمائی ہیں۔ پہلی یہ ہے اِلَّآ اَنْ تَاْتِیَھُمْ سُنَّۃُ الْاَوَّلِیْنَ کہ اُن کے پاس پہلے لوگوں کا دستور آ جائے۔ پہلے لوگوں کا دستور یہ رہا

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۳۳ (فیاض)

ہے کہ انہوں نے اللہ کی وحدانیت کا انکار کیا۔ اللہ کے انبیاء کا تمسخر اڑایا، کتب سماویہ کو تسلیم نہ کیا اور معاد کا انکار کر دیا، پھر یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا اور انہیں مکمل طور پر صفحہ ہستی سے نابید کر دیا۔ گویا وہ ایمان لانے کے لیے عذاب کے منتظر ہیں۔

فرمایا ایمان نہ لانے کی دوسری وجہ یہ ہے اَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا کہ یا عذاب بالکل اُن کے سامنے آجائے۔ یعنی وہ اس بات کے انتظار میں ہیں کہ اُن پہ عذاب نازل ہو جائے تو پھر وہ ایمان لائیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کی طرف سے عذاب آجاتا ہے تو اُس وقت کا ایمان لانا مفید نہیں ہوا کرتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو کر رہتا ہے۔ غرضیکہ اللہ نے مکذبین کی یہ خصلت بیان کی ہے کہ وہ ایمان لانے اور بخشش طلب کرنے کے لیے اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ یا تو اُن پہ حکم عذاب آجائے اور یا پھر وہ عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ایمان لے آئیں۔ فرمایا یہ اُن کی خام خیالی ہے ایسی صورت میں وہ خدا کی سزا سے بچ نہیں سکتے

انبیاء کا فرض منصبی

آگے ارشاد ہے وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ اور نہیں بھیجتے ہم رسولوں کو مگر اس لیے کہ وہ فرمانبرداروں کو اچھے انجام کی خوشخبری سنا دیں اور نافرمانوں کو اُن کے بُرے انجام سے ڈرا دیں۔ تمام کافر، مشرک، بد اعمال اور بد اخلاق لوگ جان لیں کہ وہ نہایت ہی بُرے انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔ انبیاء کا فرض منصبی یہ ہے نہ کہ لوگوں کی بیہودہ فرمائشیں پوری کرنا۔ فرمایا کافر لوگوں کا حال یہ ہے وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ اور کافر لوگ باطل کو ساتھ لے کر جھگڑا کرتے ہیں لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ تاکہ اس باطل کے ذریعے حق کو گرا دیں۔ کفار کی اس کارگزاری کے ثبوت

ہیں تاریخ عالم گواہ ہے۔ جب اللہ کے انبیاء ان کے پاس آتے رہے تو یہ لوگ ان کو جھٹلاتے رہے، انبیاء کی مذمت کی، اُن کے معجزات کو سحر کہہ کر رد کر دیا۔ وَاتَّخَذُوٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا اور میری آیتوں اور ڈرانے والی چیز یعنی خدا کی گرفت اور عذاب کے ساتھ ٹھٹھا کیا، اس کی مثالیں قرآن میں جگہ جگہ موجود ہیں۔ مشرکین مکہ کہتے تھے اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ (انفال۔ ۳۲) اے اللہ! اگر محمد کا دین برحق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا دے، ہم تو اس دین کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ قیامت کے متعلق کہتے مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (الملک۔ ۲۵) اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ کب پورا ہوگا۔؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کا عذاب آیا اور وہ خدا کی زمین سے ناپید ہو گئے۔

آیاتِ الٰہی سے اعراض

ارشاد ہوتا ہے۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہے جسے اُس کے پروردگار کی آیتوں کے ساتھ نصیحت کی جائے تو وہ اُن سے اعراض کرے۔ آیات میں احکام، دلائل، معجزات اور نشانیاں سب کچھ شامل ہے جس شخص کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی یہ تمام چیزیں پیش کی جائیں اور وہ پھر بھی ان سے اعراض کرے تو وہ بڑا ہی ظالم اور نامراد ہے۔ ایسے شخص کا حال یہ ہے وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ کہ وہ بھول چکا ہے جو کچھ اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔ اُس نے کبھی غور ہی نہیں کیا کہ میں اعمال کے ذریعے کیا چیز آگے بھیج رہا ہوں اُس نے اپنی بُرائی پر کبھی نگاہ ہی نہیں ڈالی اور اس طرح آیاتِ الٰہی کو فراموش کر دیا۔ درحقیقت یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو تعصب اور عناد

کی بنا پر ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق اللہ نے فرمایا اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ہم نے انکے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں جس کی وجہ سے یہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں اور انکے کانوں میں بوجھ ہیں اللہ نے دوسری جگہ فرمایا خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ (البقرۃ ۔ ۷) اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہیں سورۃ نساء میں ہے بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر ٹھپے لگا دیے ہیں۔ سورۃ المطففین میں فرمایا "بَلْ سكتہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ" ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے۔ "مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ" اس وجہ سے جو وہ کماتے تھے۔ وہ کفر اور شرک کا ارتکاب کرتے تھے شرکیہ رسوم میں ڈوبے ہوئے تھے لہذا ان کے دل اس طرح خراب ہو گئے جس طرح زنگ لوہے کو کھا جاتا ہے۔ فرمایا وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى اگر آپ انہیں ہدایت کی طرف دعوت دیں فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا تو وہ کبھی ہدایت قبول نہیں کریں گے۔ یہ آیات الٰہی سے اعراض کا نتیجہ ہے کہ وہ ہدایت سے بکسر محروم ہو چکے ہیں۔

قانون امہال و تدریج

فرمایا وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ تیرا پروردگار بخشش کرنے والا اور رحمت والا ہے۔ یہ اس کی رحمت ہے کہ مجرموں کو پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ موقع دیتا رہتا ہے۔ اس کے ہاں قانون امہال و تدریج کام کرتا ہے۔ فرمایا لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا اگر اللہ تعالیٰ ان کی بری کمائی کی وجہ سے انہیں پکڑنا چاہے لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ تو ان کے لیے جلدی عذاب لے آئے۔ مگر یہ اس کی بخشش اور رحمت ہے کہ وہ مہلت دیتا رہتا ہے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب میں گرفت کرنے پر آتا ہوں تو اس طریقے سے پکڑتا ہوں جو کسی کے وہم و گمان میں نہیں ہوتا۔ فرمایا "اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ" (اعراف - ۱۸۳) میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔ اس سے کون باہر نکل سکتا ہے؟ سورۃ البروج میں ہے "اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ" بیشک تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ سورۃ الرحمٰن میں جنوں اور انسانوں سے خطاب کرتے فرمایا "اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا" اگر تم زمین و آسمان کے کناروں سے نکل جانے کی طاقت رکھتے ہو تو بھاگ کر دکھاؤ مگر تم نہیں بھاگ سکتے۔

فرمایا، اگر اللہ تعالیٰ ان کی کارگزاری کی وجہ سے انہیں پکڑنا چاہے تو فوراً عذاب نازل کر دے "بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ" بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے لیے وعدے کا ایک وقت مقرر ہے۔ پھر جب وہ وقت آجائے گا تو وہ گرفت میں آجائیں گے "لَنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا" اور وہ اللہ کے سوا کہیں جائے پناہ بھی نہیں پا سکیں گے۔ ہر فرد، جماعت، گروہ، قوم، ملک اور بستی کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ اس وقت تک مہلت ملتی رہتی ہے، پھر مقررہ وقت پر گرفت آجاتی ہے اور لوگ صفحۂ ہستی سے مٹا لیے جاتے ہیں۔

ظالموں کی ہلاکت

ارشاد ہوتا ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی "وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا" یہ ہیں بستیاں جن کو ہم نے ہلاک کیا جب کہ انہوں نے ظلم کیا۔ پانچویں رکوع میں مالدار مشرک کا ذکر ہو چکا ہے جس کے دو باغات تھے جن پر وہ غرور کرتا تھا اور انہیں اپنے کمال کا صلہ سمجھتا تھا وہ اپنے باغ میں داخل ہوا "وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ" اور وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والا تھا۔ اس کا ظلم یہی تھا کہ وہ مادیت کے شرک میں

مبتلا تھا، وہ اپنی جائیداد کو ہی اوّل و آخر سمجھتا تھا اور خدا تعالیٰ کی ذات پر اسے قطعاً اعتماد نہیں تھا۔ چنانچہ جب وہ اپنے باغ میں داخل ہوا تو کہنے لگا۔ "مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا" مجھے یقین ہے کہ یہ باغ کبھی ضائع نہیں ہوگا بلکہ ہمیشہ ایسے ہی رہے گا۔ اس کے برخلاف مومن کا عقیدہ یہ ہے "مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" ہوتا وہ ہے جو اللہ چاہے کیونکہ اس کی توفیق کے بغیر کوئی طاقت نہیں۔ تمام قوتوں کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ بہر حال اللہ نے فرمایا کہ ہم نے ان بستیوں کے مکینوں کو ان کے ظلم کی وجہ سے ہلاک کیا۔ سب سے بڑا ظلم شرک اور کفر ہے۔ جیسے فرمایا "اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" (لقمان - ۳) شرک ظلم عظیم ہے۔ نیز فرمایا "وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" (البقرۃ - ۲۵۴) کافر ہی ظالم ہیں۔ کفر و شرک کے بعد پھر حق تلفی، ایذا رسانی، قتل تمام بڑے بڑے جرائم ظلم میں داخل ہیں۔

فرمایا بستیوں کی ہلاکت ان کے ظلم کی وجہ سے ہوتی ہے مگر یہ اندھا دھند نہیں ہوتی بلکہ "وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا" ان کی ہلاکت کے لیے ہم نے ایک وعدہ یعنی وقت مقرر کر رکھا ہے اس وقت سے پہلے ہم کسی بستی کو ہلاک نہیں کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہلاکت کا ایک قانون تو وہ تھا جو سابقہ اقوام پر نافذ العمل تھا کہ جب ان کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو پھر آخر میں یکدم عذاب آیا اور ساری قوم ہلاک ہو گئی "فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ" (الحاقہ - ۸) کے مصداق ان میں سے ایک بھی باقی نہ بچا۔ ہلاکت کا دوسرا طریقہ امہال و تدریج کا قانون ہے کہ جہاں ظلم و زیادتی ہوگی وہاں تباہی آئے گی۔

قانون
حالت زار

یہ تباہی مختلف خطوں میں جرم کی نوعیت کے مطابق مختلف طریقوں سے آتی ہے۔ آج دنیا میں مسلمان ایسی ہی تباہی کا شکار ہو رہے ہیں۔

افغانستان، ایران، عراق، فلسطین، قبرص، فلپائن اور مصر کے مسلمان اپنی مظالم کی وجہ سے ہلاک ہو رہے ہیں۔ یہ سب ہمارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ ہم نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔ کفر و شرک کا راستہ اختیار کیا، خدا کے نافرمانوں کا ساتھ دیا، رسومات باطلہ کو اختیار کیا۔ جس کے نتیجے میں بتدریج بربادی آئی۔ ہم روزمرہ اسی تباہی کا مشاہدہ کر رہے ہیں گذشتہ پانچ سال میں افغانستان میں تیس لاکھ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ فلسطین میں بیس لاکھ آدمی مارے جا چکے ہیں۔ اور باقی در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں مگر ہمارے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ یہ خود ہمارے اپنے ہاتھوں کے کرتوت ہیں۔ بادشاہ ظالم اور عیاش ہیں۔ انہوں نے اپنے معاملات میں کافروں کو دخیل بنا رکھا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، روس سب گندی سیاست چمکا رہے ہوئے ہیں۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے یہ بے گناہ لوگوں کو کچل رہے ہیں۔ اگر ہم ظلم سے باز آجائیں تو اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ کسی کو ہلاک نہیں کرتا وَاَھْلُھَا مُصْلِحُوْنَ جب تک لوگ اصلاح کنندہ ہوں جونہی ظلم کا دور دورہ ہوگا، ہلاکت آئے گی، اب اللہ کا یہی قانون ہے کہ ظلم کے نتیجے میں لوگ فتنوں کا شکار ہونگے اور ان پر ہلاکت و تباہی آئے گی۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِىَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِى الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿۶۱﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۫ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَاۤ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّىْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۫ وَمَاۤ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِى الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰۤى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۴﴾

ترجمہ:- اور (اس واقعہ کو یاد کرو) جب کہ کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے نوجوان سے کہ میں نہیں باز آؤں گا یہاں تک کہ میں پہنچ جاؤں دو دریاؤں کے سنگم پر، یا میں چلتا جاؤں مدتِ دراز تک ﴿۶۰﴾ پس جب پہنچے وہ دونوں کے اکٹھا ہونے کی جگہ پر تو بھول گئے اپنی مچھلی، پس پکڑ لیا اُس نے اپنا راستہ پانی میں سرنگ بنا ﴿۶۱﴾ جب وہ آگے بڑھے تو کہا (موسیٰ علیہ السلام نے) اپنے نوجوان سے، لاؤ ہمارے پاس ہمارا کھانا۔ البتہ

تحقیق ہم نے پائی ہے اس سفر میں مشقت (۶۲) وہ نوجوان بولا آپ دیکھیں جب ہم نے جگہ پکڑی تھی پتھر کے پاس پس بیشک میں بھول گیا مچھلی ۔ اور نہیں فراموش کرائی مجھ سے مگر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کرتا ۔ اور بنا لیا اُس (مچھلی) نے اپنا راستہ پانی میں عجیب (۶۳) کہا (موسیٰ علیہ السلام نے) یہی تو وہ جگہ تھی جس کو ہم تلاش کر رہے تھے ۔ پھر پلٹے وہ دونوں اپنے پاؤں کے نشانات پر چلتے ہوئے (۶۴)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اُن نافرمانوں کا ذکر کیا جو قرآن کریم کی تعلیمات سے روگردانی کرتے ہیں اور حق کو گرانے کے لیے باطل کو ہمراہ لے کر جھگڑا کرتے ہیں فرمایا یہ محض اللہ کی مہربانی ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو جلدی ہلاک نہیں کرتا بلکہ اپنے قانون کے مطابق مہلت دیتا ہے ۔ اللہ نے ہلاکت کا سبب ظلم و زیادتی کو قرار دیا ۔ قرآن پاک میں سابقہ اقوام عاد ، ثمود ، قوم فرعون ، قوم لوط ، اہل مدین وغیرہ کا حال بھی مذکور ہے جب انہوں نے کفر و شرک کی انتہا کر دی ۔ ظلم و زیادتی کو مستقل وطیرہ بنا لیا تو پھر اللہ کی گرفت آئی اور نافرمان لوگ صفحہ ہستی سے ناپید کر دیے گئے ۔ گذشتہ آیات میں باغ والے مغرور شخص کا حال بھی بیان ہو چکا ہے جس پر بربادی آئی ۔ پھر اللہ نے ابلیس کے تکبر کا ذکر فرمایا ۔ مکے والوں کے غرور کا حال بھی بیان ہو چکا ہے کہ وہ اہل ایمان کو حقیر سمجھتے تھے اور حضور علیہ السلام سے کہتے تھے کہ آپ ان لوگوں کو اپنی مجلس سے اٹھا دیں تو ہم آپ کی بات سننے کے لیے تیار ہیں ۔

آج کی آیات کو بھی اسی موضوع کے ساتھ مناسبت ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندے غرور و تکبر سے دور رہتے ہیں ، وہ تو اللہ کے سامنے ہمیشہ

عاجزی کا اظہار کرتے ہیں اور مخلوق کے ساتھ بھی تواضع سے پیش آتے ہیں۔ ہاں! اگر کسی لغزش کی بنا پر اس ضمن میں کچھ کوتاہی ہو جائے تو پھر وہ اس کی تلافی کر لیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایک معمولی سی لغزش ہو گئی تھی جس سے کسی حد تک تکبر کی عکاسی ہوتی تھی۔ تو اللہ نے اس پر فوراً تنبیہ کر دی اور موسیٰ علیہ السلام کو ابتلا میں ڈال دیا۔

موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا جو واقعہ ان آیات میں بیان ہو رہا ہے وہ بلاشبہ عجیب و غریب اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی ہے۔ اس واقعہ کو اصحاب کہف کے واقعہ کے ساتھ بھی مناسبت ہے کیونکہ وہ بھی عجیب واقعہ ہے۔ اس واقعہ کو بیان کرنے سے پہلے اللہ نے فرمایا تھا اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْکَہْفِ وَالرَّقِیْمِ کَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا (آیت ۔ ۹) کیا آپ سمجھتے ہیں کہ صرف اصحاب کہف کا واقعہ ہی ہماری قدرت کی نشانیوں میں عجیب و غریب واقعہ ہے؟ نہیں، بلکہ اس جیسے اور بھی بہت سے واقعات کائنات میں رونما ہو چکے ہیں۔ چنانچہ موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا واقعہ بھی انہی عجائبات قدرت میں سے ہے۔ گویا اس واقعہ کا تعلق مذکورہ بالا آیت کے ساتھ بھی ہے۔

واقعہ کا پس منظر

اس واقعہ کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی موقع پر اپنی قوم سے خطاب کر رہے تھے کہ کسی شخص نے سوال کیا کہ کیا اس وقت روئے زمین پر آپ سے کوئی بڑا عالم بھی موجود ہے؟ آپ نے نفی میں جواب دیا۔ اگرچہ یہ جواب صحیح تھا۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے دور میں اللہ کے سب سے بڑے نبی اور صاحب کتاب رسول تھے اور اس لحاظ سے آپ اس وقت کے سب سے بڑے عالم بھی تھے کہ شریعت کا علم آپ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے

کو یہ بات پسند نہ آئی کہ اُس کا نبی اپنی زبان سے اپنے آپ کو سب سے زیادہ عالم تصور کرے۔ اُس شخص کے سوال کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام کو چاہیے تھا کہ وہ معاملے کو اللہ کی طرف سونپتے ہوئے کہتے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ سب سے زیادہ عالم کون ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ اے موسیٰ علیہ السلام! ہمارے بندوں میں ایک بندہ ایسا بھی ہے جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ آپ پریشان ہو گئے اور اللہ سے عرض کیا، اے پروردگار! کَیْفَ السَّبِیْلُ اِلٰی لُقْیَہٖ میں اس بندے سے کیسے ملاقات کروں تاکہ اس سے فیض حاصل کر سکوں، تو اللہ نے فرمایا کہ فلاں سفر پہ روانہ ہو جاؤ۔ توشہ کے طور پہ ایک بھونی ہوئی مچھلی لے لو، جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے گی، ہمارا بندہ تمہیں اُسی جگہ مل جائے گا۔

امام بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ بعض روایات میں اس واقعہ کا پس منظر یہ ذکر کیا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے خود اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا، اے مولا کریم! اَیُّ عِبَادِكَ اَحَبُّ اِلَیْكَ تیرے بندوں میں سے تجھے کون سا بندہ زیادہ محبوب ہے تو اللہ نے فرمایا اَلَّذِیْ یَذْكُرُنِیْ وَلَا یَنْسَانِیْ میرا محبوب بندہ وہ ہے جو میرا ذکر کرتا ہے اور مجھے کسی وقت فراموش نہیں کرتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر عرض کیا۔ اے پروردگار! اَیُّ عِبَادِكَ اَقْضٰی تیرے بندوں میں سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا کون ہے؟ اللہ نے فرمایا اَلَّذِیْ یَقْضِیْ وَلَا یَتَّبِعُ الْهَوٰی جو فیصلہ کرتا ہے مگر خواہش کی پیروی نہیں کرتا۔ ایسا جج جو رشوت کی بجائے حق و انصاف کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے تیسرا سوال یہ کیا۔ اے پروردگار! تیرے بندوں میں زیادہ علم والا کون ہے؟ اللہ نے فرمایا اَلَّذِیْ یَبْتَغِیْ عِلْمَ النَّاسِ اِلٰی عِلْمِهٖ یعنی وہ شخص جو لوگوں سے علم حاصل کر کے اپنے پاس موجود علم کے ساتھ ملا

لہذا ہے تاکہ بوقت ضرورت وہ اس تکوینی علم سے مستفید ہو سکے۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے اس اہل علم بندے سے ملاقات کی درخواست کی تو اللہ نے اس کا ذریعہ یہ بتایا جو اس واقعہ میں بیان ہوا ہے۔ بخاری اور مسلم کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! تم فلاں سفر پر روانہ ہو جاؤ اور اپنے ساتھ ایک تلی ہوئی مچھلی توشے کے طور پر لے لو۔ جس مقام پر یہ مچھلی گم ہو جائے گی اسی جگہ پر تمہیں میرا وہ بندہ مل جائے گا جس کے علم کا تذکرہ ہوا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نوجوان

اپنے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے موسیٰ علیہ السلام نے ایک نوجوان کا انتخاب کیا جو آپ کا ہم سفر ہو اور دوران سفر آپ کی خدمت کر سکے اس نوجوان کا نام یوشع بن نون تھا۔ آپ موسیٰ علیہ السلام کے شاگرد تھے آپ کو اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ہی نبوت عطا فرمائی پھر موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد آپ ان کے جانشین ہوئے۔ بنی اسرائیل نے آپ کی قیادت میں جہاد کر کے فلسطین کو فتح کیا۔ آپ افرائیم بن یوسف علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام تو نہیں لیا بلکہ فتیٰ کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا عام فہم معنی نوجوان ہے۔ اس لفظ کا اطلاق غلام اور لونڈی پر بھی ہوتا ہے جو کہ خدمت کے لیے ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ نوجوان بھی ہوں تو حق خدمت زیادہ بہتر طریقے سے انجام دے سکتے ہیں۔

مجمع البحرین کا سفر

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے سفر کے واقعہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے نوجوان یعنی حضرت یوشع بن نون علیہ السلام سے کہا لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ میں نہیں ہٹوں گا یہاں تک کہ دو دریاؤں کے سنگم پر پہنچ جاؤں۔ جہاں پر اللہ تعالیٰ نے

اپنے بندے سے ملاقات کی نشاندہی کی ہے۔ میں وہاں ضرور جاؤنگا
اور مضی حقبا خواہ مجھے مدت دراز تک چلنا پڑے۔ حقب کے معنی
زمانے کے ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ایک حقب اسی سال کا ہوتا
ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی مراد یہی تھی کہ مجھے کتنا لمبا سفر اختیار کرنا پڑے یا
کتنی مدت تک چلنا پڑے، میں اس اللہ کے بندے سے ضرور ملاقات
کروں گا۔

دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے بعض
مفسرین نے اسے بحر روم اور بحر فارس پر محمول کیا ہے۔ مگر اس روایت
میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دو سمندر تو آپس میں ملتے ہی نہیں کیونکہ ان
کے درمیان خشکی حائل ہے۔ چونکہ یہ دونوں قریب قریب ہیں۔ اس
لیے ہوسکتا ہے کہ اس قربت کو ملاپ سے تعبیر کیا گیا ہو۔ بعض مفسرین
نے بحرین سے بحر قلزم اور اردن کا دریا مراد لیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دو
دریاؤں سے مراد میٹھا اور کڑوا پانی ہے اور جہاں پر یہ دونوں قسم کے
پانی ملتے ہیں، وہی مجمع البحرین ہے بعض حضرات نے اس کو مجازی معنی
پہنائے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ بحرین سے مراد حقیقی دریا یا سمندر نہیں بلکہ
موسیٰ علیہ السلام ظاہری علم یعنی شریعت اور احکام الٰہی کے سمندر ہیں اور
خضر علیہ السلام باطنی علم کے سمندر ہیں، یہ دونوں حضرات جس مقام پہ بھی
ملیں گے، وہی مجمع البحرین ہے۔ آگے ذکر آئے گا کہ جب موسیٰ اور
خضر علیہما السلام کی ملاقات ہوگئی تو خضر علیہ السلام نے فرمایا، اے موسیٰ
علیہ السلام! اللہ نے تجھے وہ علم دیا ہے جسے میں نہیں جانتا ہوں اور
مجھے اس علم سے نوازا ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ بہرحال اس
واقعہ سے علم کی فضیلت بھی واضح ہوتی ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا استقلال
بھی۔ انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے تازیست لمبے سفر پہ

روانہ ہونے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سفر میں توشہ ساتھ رکھنا خلافِ توکل نہیں بلکہ سنت انبیاء ہے۔ نیز سفر میں اپنے شاگرد یا خادم کو خدمت کے لیے ساتھ رکھنا بھی جائز ہے

علمی سفر

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ سفر رحلۃ العلمیۃ یعنی علمی سفر تھا کیونکہ اپنے سے زیادہ عالم شخص سے اکتساب فیض کے لیے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَطْلُبُ الْعِلْمَ فِيهِ سَلَكَ اللهُ بِهِ طَرِيقَ الْجَنَّةِ جو شخص حصولِ علم کی خاطر کسی راستے پر چلتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے جنت کے راستے پر چلا دیتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی فرمان ہے کہ جو لوگ خلوصِ نیت کے ساتھ علمِ دین حاصل کرنے کے لیے نکلتے ہیں۔ اِنَّ الْمَلٰٓئِكَةَ لَتَضَعُ اَجْنِحَتَهَا اللہ کے فرشتے اُن کے پاؤں کے نیچے پر بچھاتے ہیں۔ تاریخ اسلام میں ایسے ایسے محدثین اور بزرگان کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے حصولِ علم کی خاطر چالیس چالیس ہزار میل کا سفر طے کیا۔ یہ اُس قدیم زمانے کا ذکر ہے جب اونٹ، گھوڑے، خچر وغیرہ کے علاوہ کوئی سواری میسر نہ ہوتی تھی بلکہ لوگ تو پا پیادہ ہی سفر کرتے تھے۔ اُس زمانے میں آج کی سہولتوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ آج تو ساری دنیا تیز ترین سفری سہولتوں کی وجہ سے ایک گھرانے کی طرح سمٹ چکی ہے۔ کراچی سے صرف اڑھائی گھنٹے میں جدہ اور چوبیس گھنٹے میں امریکہ پہنچ جاتے ہیں۔ اب تو افریقہ کا ناقابلِ عبور وسیع و عریض صحرا بھی پانچ دس گھنٹوں میں عبور کرلیا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں سفر کرنا جان جوکھوں کا کام تھا، اس کے باوجود ہمارے بزرگوں نے بڑے طویل سفر اختیار کئے۔ امام احمدؒ، عبدالرزاقؒ، ابن صمامؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، ابن ماجہؒ، وغیرہم اُس زمانے کے تمام متمدن

شہروں میں حصولِ علم کے لیے پہنچے اور بہت سے اساتذہ سے فیض حاصل کیا۔ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے اٹھارہ سو اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ اسی طرح امام ابو حنیفہؒ نے کم و بیش چار ہزار اساتذہ سے فیض حاصل کیا جن میں بڑی بڑی جلیل القدر ہستیوں کے نام آتے ہیں۔

مچھلی کا واقعہ

بہر حال موسیٰ علیہ السلام اپنے خادم حضرت یوشع بن نون کے ہمراہ سفر پر روانہ ہو گئے۔ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا پھر جب وہ دو دریاؤں کے ملاپ کی جگہ پر پہنچے نَسِيَا حُوتَهُمَا تو وہ دونوں اپنی اس مچھلی کو بھول گئے جو انہوں نے بھون کر توشہ کے طور پر تھیلے میں رکھی ہوئی تھی۔ یہاں پر بھولنے کی نسبت دونوں کی طرف کی گئی ہے حالانکہ مچھلی کے واقعہ کو صرف یوشع علیہ السلام ہی بھول گئے تھے اور موسیٰ علیہ السلام کو ابھی اس واقعہ کا علم ہی نہیں تھا۔ ہوا یہ کہ دونوں ساتھی ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ چلتے رہے حتیٰ کہ انہوں نے ایک بڑے پتھر یا چٹان کے قریب تھوڑی دیر کے لیے آرام کیا۔ یوشع علیہ السلام تو وہیں بیٹھے رہے البتہ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بعض روایات میں آتا ہے کہ سو گئے اور بعض میں آتا ہے کہ قضائے حاجت کے لیے ذرا دور چلے گئے۔ اس دوران میں یہ واقعہ پیش آیا کہ تھیلے میں بند بھنی ہوئی مچھلی نے فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا اپنا راستہ سمندر میں سرنگ کی صورت میں بنا لیا، یعنی وہ مچھلی تھیلے سے نکل کر سمندر میں کود گئی اور جس جگہ سے پانی میں داخل ہوئی وہ جگہ سوراخ یا سرنگ کی شکل میں واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔

وہ تلی ہوئی مچھلی زندہ کیسے ہو گئی؟ اس کے متعلق قرآن پاک کی کسی آیت یا حضور علیہ السلام کے فرمان سے کچھ ثابت نہیں، البتہ امام بخاریؒ نے امام سفیان ثوریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ جس پتھر

کے قریب ان دو ساتھیوں نے آرام کیا تھا، وہاں آبِ حیات کا چشمہ تھا اس چشمہ کے متعلق مشہور ہے کہ جو شخص اس چشمہ کا پانی پی لے اسے حیاتِ دوامی حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر یہ بھی مشہور ہے کہ سکندر یہ پانی نہ پی سکا مگر حضرت خضر علیہ السلام کی قسمت میں تھا۔ انہیں نصیب ہو گیا۔ بہرحال اس چشمے کے پانی کا کوئی چھینٹا اس تلی ہوئی مچھلی پر پڑ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اُسے زندہ کر دیا اور وہ تھیلے میں سے کود کر سمندر میں چلی گئی۔

یہ سارا واقعہ یوشع علیہ السلام کے سامنے پیش آیا مگر جب کچھ دیر آرام کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے یا وہ قضائے حاجت سے واپس آئے تو انہوں نے خادم کو کہا کہ چلو اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیں یہ وہ موقع تھا جب یوشع علیہ السلام کو چاہیے تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیتے کہ کھانے کے لیے رکھی ہوئی مچھلی سمندر میں کود گئی ہے، مگر وہ بھول گئے اور دونوں ساتھی ایک دفعہ پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔

کھانا طلبی

فرمایا فَلَمَّا جَاوَزَا جب وہ آگے بڑھے قَالَ لِفَتٰهُ تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے نوجوان سے کہا اٰتِنَا غَدَآءَنَا ہمارا کھانا لاؤ کہ بھوک لگ رہی ہے لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا تحقیق ہم نے اس سفر میں بڑی مشقت اٹھائی ہے، ہم تھک چکے ہیں، آؤ ناشتہ کر لیں۔ اس موقع پر بزرگانِ دین نے یہ کلام کیا کہ موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر تشریف لے گئے تو وہاں تو آپ کو تھکاوٹ محسوس نہیں ہوئی تھی مگر اس سفر میں آپ نے تھکاوٹ کی شکایت کی۔ اس کے جواب میں بزرگ فرماتے ہیں کہ کوہ طور کا سفر خالق کی طرف تھا۔ اس لیے آپ نے وہاں تھکاوٹ محسوس نہیں کی، جب کہ یہ سفر مخلوق کی طرف تھا، اللہ کے خاص بندے سے ملاقات کے لیے جا رہے تھے۔ اس لیے یہاں تھکاوٹ محسوس ہوئی۔

بہر حال جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے کھانا طلب کیا تو اس وقت خادم کو یاد آیا کہ کھانے کی مچھلی تو سمندر میں کود گئی تھی چنانچہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو جواب دیا قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّىْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ حضرت دیکھئے! جب ہم اس چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو میں آپ کو مچھلی والی بات بتانا بھول گیا کہ وہ زندہ ہو کر پانی میں چلی گئی تھی۔ پھر ساتھ ہی اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ دراصل مچھلی کا ذکر کرنا مجھے شیطان نے بھلا دیا اور میں وہاں آپ کو یہ بات نہ بتا سکا۔

اس آیت میں اس واقعہ کو بھلا دینے کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی ہے حالانکہ حقیقت میں تو اللہ ہی نے بھلا دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی اکثر و بیشتر باتیں شیطان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر دوران نماز نکسیر پھوٹ پڑے یا عورت کو حیض شروع ہو جائے تو یہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ حالانکہ نکسیر کا پھوٹنا تو کسی جسمانی بیماری کی وجہ سے ہوتا ہے اور حیض بھی ایک طبعی امر ہے جو وقفے وقفے سے آتا رہتا ہے، مگر اسے بھی شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ بغرضیکہ جب بھی کسی مومن کے امر خیر میں خلل واقع ہوتا ہے تو اسے شیطان ہی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، لہٰذا یہاں پر مچھلی کے واقعہ کے نسیان کی نسبت شیطان ہی کی طرف کی گئی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ مجھے شیطان نے مچھلی کا ذکر کرنا بھلا دیا وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِى الْبَحْرِ عَجَبًا بات یہ ہے کہ مچھلی نے اپنا راستہ سمندر میں بنا لیا، اور یہ بڑی عجیب بات ہے کہ تلی ہوئی مچھلی زندہ ہو کر سمندر میں کود گئی۔

قَالَ موسیٰ علیہ السلام نے کہا ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ اللہ کے

بندے! یہی تو وہ جگہ تھی جس کی تلاش میں ہم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے سے ملاقات کے لیے یہی نشانی بتلائی تھی کہ جس مقام پہ جا کر مچھلی گم ہو جائے گی، میرے بندے سے تمہاری وہیں ملاقات ہو گی۔ فرمایا ہمیں تو وہیں چٹان کے پاس رک جانا چاہیے تھا، ہم خواہ مخواہ آگے نکل آئے۔ بہر حال فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا دونوں ہم سفر اپنے پاؤں کے نشانات پہ چلتے ہوئے واپس اسی جگہ پہ پلٹ آئے۔ نامعلوم وہ کتنا زائد سفر کر چکے تھے جہاں سے انہیں پھر واپس آنا پڑا۔ آگے اس مقام پہ اللہ کے بندے خضر علیہ السلام کی ملاقات کا ذکر آ رہا ہے۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾ قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْئَلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾ ع

ترجمہ:- پس پایا اُن دونوں نے ایک بندے کو ہمارے بندوں میں سے کہ دی تھی ہم نے اُس کو رحمت اپنی طرف سے، اور سکھلایا تھا ہم نے اس کو اپنے پاس سے ایک علم (۶۵) موسیٰ علیہ السلام نے اُسے کہا کیا میں تیری پیروی کروں اس شرط پر کہ سکھائے تو مجھے اُس میں سے کہ سکھلائی گئی ہے تجھے بھلائی (۶۶) کہا اُس شخص نے بیشک تو ہرگز طاقت نہیں رکھتا میرے ساتھ صبر کی (۶۷) اور کیسے صبر کر سکے گا تو اُس بات پر کہ جس کی خبر کا تجھے احاطہ نہیں (۶۸) کہا (موسیٰ علیہ السلام نے) آپ پائیں گے مجھے اگر اللہ نے چاہا صبر کرنے والا، اور میں نہیں

نافرمانی کروں گا آپ کے حکم کی (۶۹) اُس (خضر علیہ السلام) نے
کہا کہ اگر تو میری پیروی کرتا ہے تو نہ پوچھنا مجھ سے کسی
چیز کے بارے میں یہاں تک کہ میں خود ظاہر کروں تیرے
سامنے اس کا ذکر (۷۰)

ربط آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک معمولی سی لغزش ہوگئی تھی جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انہیں ابتلا میں ڈال دیا اور فرمایا کہ ہمارے بندوں میں سے ایک ایسا بندہ ہے جو تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا، مولا کریم! میں تیرے اس بندے تک کیسے رسائی حاصل کر سکتا ہوں تاکہ اُس سے کچھ حاصل کر سکوں۔ اللہ نے حکم دیا کہ آپ فلاں سفر پر روانہ ہو جائیں اور ایک تلی ہوئی مچھلی اپنے ہمراہ لے لیں جس مقام پر وہ مچھلی گم ہو جائے گی، میرا خاص بندہ تمہیں وہیں مل جائے گا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ایک شاگرد اور خادم حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو ہمراہ لیا اور سفر پر روانہ ہوگئے۔ پھر ان دونوں نے ایک پتھر کے پاس آرام کیا۔ موسیٰ علیہ السلام سو رہے تھے۔ جب کہ آپ کے خادم بیدار تھے، اُن کے سامنے تلی ہوئی مچھلی تھیلے سے کود کر سمندر میں چلی گئی جب موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے تو انہوں نے آگے چلنے کا حکم دیا، مگر خادم مچھلی کی گمشدگی کے متعلق آپ کو مطلع کرنا بھول گیا، اور وہ آگے چل پڑے۔

حدیث شریف میں اُن کے اگلے سفر کے متعلق آتا ہے بَقِيَّةَ يَوْمِهِمَا وَلَيْلَتِهِمَا کہ اُن دونوں نے دن کا باقی حصہ اور پھر اگلی رات بھر سفر کیا۔ اس دوران وہ سخت تھک چکے تھے۔ صبح ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام نے ناشتہ کرنے کا ارادہ کیا اور خادم سے توشہ لانے کے لیے کہا۔ حضرت یوشع کو اُس وقت یاد آیا کہ اُن کی مچھلی تو وہیں سمندر میں چلی گئی تھی۔ جہاں انہوں نے گذشتہ روز دوپہر کو آرام کیا تھا۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے مچھلی والا واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا کہ اسی جگہ کے تو ہم متلاشی تھے، چنانچہ وہ اپنے قدموں کے نشانات پر واپس لوٹ پڑے۔

حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات

جب وہ دونوں ساتھی واپس اس پتھر کے قریب پہنچے جہاں انہوں نے آرام کیا تھا فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا تو انہوں نے پایا ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا جسے ہم نے اپنی مہربانی عطا فرمائی تھی وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا اور سکھے ہم نے اپنی طرف سے خاص علم یعنی علم لدنی عطا فرمایا تھا۔ بہرحال جب پہلی ملاقات ہوئی فَسَلَّمَ موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام کو سلام کیا۔ خضر علیہ السلام نے جواب دیا۔ اَنّٰی بِاَرْضِكَ سَلَامٌ وَاَنّٰی بِاَرْضِیْ سَلَامٌ یہاں تمہاری اس سرزمین میں یا میری اس سرزمین میں سلام کہاں یعنی یہاں یہ سلام کہنے کا کونسا موقع ہے یہاں تو کوئی آبادی ہی نہیں ہے، بالکل ویران جگہ ہے اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں گرد و نواح میں سب کفار و مشرکین آباد ہیں، تو یہاں کیسے سلام ہوا؟ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے خضر علیہ السلام نے یہ بھی کہا مَنْ اَنْتَ کہ تو سلام کہنے والا کون آدمی ہے؟ تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا اَنَا مُوْسٰی یعنی میں موسیٰ ہوں خضر علیہ السلام نے پھر پوچھا اَمُوْسٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کیا بنی اسرائیل والے موسیٰ؟ تو آپ نے کہا، ہاں۔

حافظ ابن حجرؒ اس جملے پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں فِیْهِ دَلِیْلٌ عَلٰٓی اَنَّ الْاَنْبِیَآءَ وَمَنْ دُوْنَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ مِنَ الْغَیْبِ اِلَّا مَا عَلَّمَهُمُ اللّٰهُ لَوْ کَانَ الْخِضْرُ یَعْلَمُ کُلَّ غَیْبٍ یَعْرِفُ مُوْسٰی قَبْلَ اَنْ یَّسْئَلَهٗ یعنی انبیاء اور اولیاء وغیرہ غیب کی اتنی ہی بات جانتے ہیں جتنی اللہ انہیں بتلا دیتا ہے اگر خضر علیہ السلام غیب دان ہوتے تو موسیٰ علیہ السلام کو بغیر پوچھے ہی پہچان لیتے۔

یہاں پر بعض لوگوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا ان آیات میں مذکور موسیٰ وہی ہیں جو اللہ کے صاحب کتاب نبی ہیں؟ قرآن میں تو مزید تصریح موجود نہیں، البتہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کسی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے ذکر کیا کہ نوف بکالی کہتا ہے کہ جس شخص کے ساتھ خضر علیہ السلام کی ملاقات ہوئی تھی، وہ بنی اسرائیل والے اللہ کے جلیل القدر نبی نہیں تھے۔ بلکہ موسیٰ ابن میشا تھے۔ اگرچہ ان کا تعلق بھی بنی اسرائیل سے تھا مگر یہ صاحب تورات موسیٰ نہیں تھے۔ یہ سن کر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کَذَبَ عَدُوُّ اللّٰہِ دشمن خدا نے جھوٹ بولا ہے کیونکہ میرے سامنے ابی ابن کعبؓ نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ خضر علیہ السلام سے ملاقات کرنے والے صاحب تورات موسیٰ ہی ہیں۔

علیہ السلام
[illegible]

دراصل آپ کا اصل نام بلیا، کنیت ابوالعباس اور لقب خضر تھا آپ کا سلسلہ نسب اس طرح بیان کیا جاتا ہے، بلیا بن ملکان بن فالغ بن عامر بن شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوح۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح یہ بھی سامی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا زمانہ بھی حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے قریب ہی ہے۔ خضر کا معنیٰ ہرا بھرا یا سرسبز و شاداب ہونا ہے۔ بخاری شریف میں اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ خضر علیہ السلام صاف چٹیل زمین پر بیٹھتے تو سرسبز ہو جاتی۔ حدیث کے الفاظ ہیں فَصَارَتْ خَضْرَاءَ۔ دوسری وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے اِذَا صَلّٰی اِخْضَرَّ مَا حَوْلَهٗ جب آپ نماز پڑھتے تو آپ کا ارد گرد سرسبز ہو جاتا۔ تاریخی روایات کے مطابق خضر علیہ السلام فریدوں کے زمانہ میں ہوئے ہیں بعض کہتے ہیں کہ آپ ذوالقرنین یعنی سکندر اعظم کے وزیر تھے۔ تاہم یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا سوائے اس بات کے جو حضور علیہ السلام نے بیان کر دی ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام انسانوں میں سے نہیں بلکہ ملائکہ میں سے تھے۔ مولانا مودودی صاحب نے اسی قول کو اختیار کر کے غلطی کا

ارتکاب کیا ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ملائکہ میں سے ہونے کا نظریہ غلط ہے۔ خضر علیہ السلام انسان تھے اور سلسلہ نسب رکھتے تھے۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ امام نوویؒ سے بھی یہی بات منقول ہے اور حدیث شریف سے بھی یہی متبادر ہوتا ہے۔

حیات خضر علیہ السلام

حیات خضر کے مسئلہ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ وفات پا چکے ہیں۔ اشکال یہ ہے کہ اگر آپ زندہ ہوتے تو ان کا فرض تھا کہ وہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں آپ کی مدد کرتے مگر اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنی وفات سے ایک ماہ پہلے فرمایا تھا کہ اس وقت روئے زمین پر موجود لوگوں میں سے ایک سو سال گزرنے کے بعد کوئی بھی باقی نہیں ہوگا لہذا اگر خضر علیہ السلام آپ کے زمانہ میں بھی زندہ تھے تو سو سال کے بعد تو لامحالہ ان کی زندگی باقی نہیں رہی۔ تاہم محدثین کرام اس کی توجیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ خضر علیہ السلام تو زمین کی بجائے فضا اور پانی پر بھی چلتے تھے اور ہو سکتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے مذکورہ فرمودہ کے وقت آپ زمین پر موجود ہی نہ ہوں۔ اس سلسلہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ وہ ــــ آسمان پر زندہ ہیں، لہذا ان پر حضور علیہ السلام کی پیش گوئی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ بایں ہمہ امام احمدؒ، امام بخاریؒ، ابن تیمیہؒ، ابن قیم، مجدد الف ثانیؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام کا دنیا کا دور ختم ہو چکا ہے۔

البتہ اکثر علماء، صوفیا اور نیکی والے لوگ، محدث ابن صلاح، امام نوویؒ اور محدثین کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام زندہ ہیں۔ بعض شرح میں لکھا ہوا ہے کہ قریب قیامت میں دجال ایک شخص کو قتل کرنے کے بعد پھر زندہ کرے گا اور اس سے پوچھے گا کہ کیا اب مجھے خدا تسلیم کرتا ہے ؟ نہیں وہ شخص جواب دیگا کہ اب مجھے حق الیقین ہو گیا ہے کہ تو دشمن خدا

دجال ہے۔ اس گواہی کو اَعْظَمُ شَهَادَةً عِنْدَ اللّٰہِ کہا گیا ہے یعنی یہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑی گواہی ہوگی۔ یہ شہادت دینے والا خضر علیہ السلام ہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے دجال کو قتل کرنے کے لیے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر زندہ رکھا ہوا ہے، اسی طرح اگر اس نے اس عظیم شہادت کے لیے خضر علیہ السلام کو اپنی قدرت سے زندہ رکھا ہو تو کون سی عجیب بات ہے۔

تفسیری روایات میں آتا ہے کہ خضر علیہ السلام سمندروں پر زندہ ہیں اور آبی راستوں کے بھٹکے ہوئے مسافروں کو راہ بھی دکھاتے ہیں۔ اسی طرح حضرت الیاس علیہ السلام کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں اور اُن کا گزران جنگلوں میں ہے۔ وہ بھی بعض اوقات بھٹکے ہوؤں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ تاہم یہ باتیں کسی حدیث سے ثابت نہیں ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ بعض نیک لوگوں کی حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کی یہ توجیہ بیان کرتے ہیں کہ خضر علیہ السلام دنیا کا دَور تو ختم کر چکے ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اُن کی مثالی صورت ظاہر کر دیتا ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ وہ مثالی صورت میں بھولے بھٹکوں کی راہنمائی کرتے ہوں۔ مثالی صورت خواب میں بھی نظر آسکتی ہے اور بیداری میں بھی۔ بعض اوقات نیک آدمی خواب میں نظر آتے ہیں اور کوئی اچھی بات بھی بتلا دیتے ہیں حالانکہ اُس بندے کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کہاں ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ خواب میں مثالی وجود دکھانے پر قادر ہے۔ اسی طرح بیداری میں بھی ایسا ہو سکتا ہے۔

خضر علیہ السلام کا علم

جمہور علماء اس بات کے قائل ہیں کہ خضر علیہ السلام اللہ کے نبی تھے اور علم معرفت باطن رکھتے تھے یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو باطنی امور کا علم عطا فرمایا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کا علم ظاہری عوامل یعنی حلال و حرام اور عبادات کے متعلق ہے جب کہ خضر علیہ السلام کا علم باطنی امور کے بارے میں تھا۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ

جب موسیٰ علیہ السلام کی خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو مؤخر الذکر نے کہا۔
اے موسیٰ! وَ اَنْتَ عَلٰی عِلْمٍ۔ تم ایک ایسے علم پر ہو جسے میں نہیں
جانتا، اور میں ایک ایسے علم پر ہوں جسے آپ نہیں جانتے۔ غرضیکہ موسیٰ
علیہ السلام کا علم دین، شریعت، اور ظاہری احکام کے متعلق تھا جب کہ
خضر علیہ السلام کو اللہ نے تکوینی امور کا علم عطا کیا تھا۔

مسلم شریف میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ کہ
ایک خارجی نے بذریعہ خط آپ سے دریافت کیا کہ جنگ میں عورتوں
اور بچوں کو قتل کرنا جائز ہے یا نہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ اگر تم وہ علم
رکھتے ہو۔ جو خضر علیہ السلام رکھتے تھے، تو بیشک عورتوں اور بچوں کو قتل
کر سکتے ہو، ورنہ کسی عورت اور بچے کا قتل روا نہیں۔ اس سے معلوم ہوا
کہ خضر علیہ السلام بعض باطنی امور کے متعلق قطعی علم رکھتے تھے جن کا ظاہری
احکام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔

بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، کہتے
ہیں اللہ نے مجھے وِعَائَیْنِ مِنَ الْعِلْمِ علم کے دو برتن عطا
کیے ہیں۔ ان میں سے ایک علم کو تو میں نے پھیلا دیا ہے۔ جس کا تعلق
عقائد، حلال و حرام اور عبادات سے ہے۔ اور اگر میں دوسرے علم کو
بھی ظاہر کر دوں لَقُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ تو یہ گردن کٹ جائے۔ اس
خاص علم کی پیچیدگیاں اور باطنی باتیں ہرگز برداشت نہیں ہو سکیں
گی۔ حضرت علیؓ سے بھی منقول ہے یَا رُبَّ جَوْهَرِ عِلْمٍ لَوْ اَبُوْحُ
لَقِیْلَ اَنْتَ مِمَّنْ یَّعْبُدُ الْوَثَنْ علم کے بہت سے
جوہر ایسے ہیں کہ اگر میں ان کو ظاہر کر دوں تو تم مجھ پر کفر کا فتویٰ
لگا دو گے وَلَاسْتَحَلَّ رِجَالٌ الْمُسْلِمُوْنَ دَمِیْ یَرَوْنَ
اَقْبَحَ مَا یَاْتُوْنَهٗ حَسَنًا اور کئی مسلمان میرے خون کو حلال سمجھے

لگیں گے جو خود بُرے سے بُرا عمل کرتے ہیں اور اُسے اچھا خیال کرتے ہیں۔

علمِ لدنّی

علم فرشتے کے ذریعہ بھی سکھایا جاسکتا ہے، اشارے سے بھی ایسا ہوتا اور علم قلب میں ڈالا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذرائع سے اپنے بندوں کو علم عطا کرتا ہے۔ علمِ لدنی وہ علم ہے جس میں اچھے کام کی توفیق یا خذلان یعنی رسوا کرنے کی طرف اشارہ ہوتا ہے ایسا علم بغیر کسب اور اور تلقین کے حاصل ہوتا ہے اور اسے علمِ وہبی بھی کہتے ہیں۔ اس کو کشف اور الہام کے ساتھ بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ تاہم خضر علیہ السلام کا علم انبیاء والا علم تھا اگرچہ آپ تشریعی نبی تھے بلکہ اللہ نے تکوینیات کے سلسلے میں کچھ علوم سکھائے تھے۔ اس علم کے متعلق مولانا رومیؒ اور دوسرے لوگ کہتے ہیں۔ ؎

علم چوں بر دل زند یارے شود
علم چوں بر گِل زند بارے شود

جس علم کی چوٹ دل پہ لگتی ہے وہ انسان کے لیے مفید ہوتا ہے اور جس علم کا تعلق مٹی یا جسم سے ہوتا ہے، وہ انسان کے لیے بطور بوجھ ہی ہوتا ہے دوسرے شعر میں ہے ؎

"علم را بر تن زنی مارے بود"

جس علم کی چوٹ دل کی بجائے جسم پر پڑتی ہے، وہ علم انسان کے لیے بطور سانپ کے ہوتا ہے کہ اس سے نقصان کی توقع ہی کی جاسکتی ہے بہر حال علم لدنی وہ ہے جس سے قلب کی صفائی ہو اور تعلق باللہ درست ہو جائے۔ اس قسم کا علم انبیاء کو تو قطعی نص سے ہوتا ہے۔ البتہ کسی حد تک اولیاء اللہ کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ شاعر لوگ کہتے ہیں کہ اگر انسان کو سربلندی اور تفوق کا باعث بننے والا علم حاصل نہ ہو تو وہ خسارے میں رہتا ہے اردو زبان کے شاعر آزاد کا شعر بھی ہے۔

سب صنعتیں جہاں کی آزاد ہم کو آئیں
ملا وہ یار جس سے ایسا ہنر نہ آیا

شیخ ابن عربیؒ نے بھی کہا ہے مَا لَذَّةُ الْعَيْشِ إِلَّا صُحْبَةُ الْفُقَرَاءِ هُمُ السَّلَاطِينُ وَالسَّادَاتُ وَالْأُمَرَاءُ فقرا کی صحبت کے بغیر کمال درجے کی مجلسی زندگی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی لوگ ہیں جو سلاطین بھی ہیں، سادات بھی ہیں اور امرا بھی ہیں۔ ان کے قلوب پر ہمیشہ اللہ کی تجلیات نازل ہوتی رہتی ہیں اور انہی کو علم لدنی حاصل ہے اگر ان لوگوں کی رفاقت نصیب ہو جائے تو بڑے کمال کی بات ہے

خضر و مسیحا

مجاز کی زبان میں ذوق نے بھی کہا ہے ؎

کسی ہمدم دیرینہ سے ملنا بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

اس کا ظاہری معنی تو کفر پر دلالت کرتا ہے۔ اگر کسی دراز مدت اور دراز عمر آدمی سے انسان ملتا ہے تو اس سے کہیں بہتر ہے کہ انسان کو ہمدم دیرینہ حاصل ہو خضر علیہ السلام کی عمر بڑی لمبی ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کی بھی، لہذا یہاں صرف مجازی معنی لیا گیا ہے۔ اس سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ مطلقاً عالم، شیخ یا بزرگ کی ملاقات کے لیے جانا جائز ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے لَا تَشُدُّوا الرِّحَالَ إِلَّا إِلَىٰ ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ تین مسجدوں کے علاوہ کجاوے نہ کسو اور وہ تین مسجدیں مسجد الحرام، مسجد بیت المقدس اور مسجد نبوی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان مساجد کے علاوہ کسی جگہ کے لیے سفر اختیار نہ کرو کیونکہ یہ تین مقامات اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخصوص ہیں اور حضور علیہ السلام نے بھی فرمایا ہے کہ ان مقامات پر نماز پڑھنے کا اجر بہت زیادہ ہے۔ عام مساجد کی نسبت مسجد حرام میں نماز پڑھنے کا ثواب ایک لاکھ گنا ہے جب کہ بیت المقدس اور مسجد نبوی میں ادا کی جانے والی نماز کا ثواب پچاس پچاس ہزار نمازوں کے برابر

ہے۔ ان کے علاوہ کسی دوسری مسجد کے لیے کوئی نص موجود نہیں۔ لہٰذا ہم نہیں کہہ سکتے کہ کسی فلاں مسجد میں نماز کی ادائیگی زیادہ اجر کا باعث ہو گی لہٰذا کسی مکان کی طرف اس نیت سے سفر نہ کیا جائے۔ ہاں کسی اچھے مقصد کے لیے سفر کرنا درست ہے اور منجملہ اس میں شیخ کی ملاقات بھی شامل ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے پیش نظر بھی یہی مسئلہ تھا۔ انہوں نے صاف کہا، اے پروردگار! اس بندے کے ساتھ ملاقات کی کیا صورت ہو سکتی ہے تو اللہ نے وہ نشانی بھی بتلا دی جہاں ملاقات ممکن تھی۔ آپ نے کہا میں وہاں ضرور جاؤں گا یہاں تک کہ اس سے ملاقات ہو جائے یا میں مدت دراز تک چلتا رہوں۔ فارسی والے بھی کہتے ہیں ؎

دست از طلب نہ دارم تا کام من برآید
یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

مطلب یہ ہے کہ میں اپنی مطلوبہ چیز سے دست کش نہیں ہوں گا چاہے میرے جسم سے جان ہی نکل جائے۔

پیٹ اور معرفت الٰہی

شیخ عبدالعزیز دباغؒ مادر زاد ولی اور باطنی نسبت کے باکمال بزرگ تھے۔ اللہ نے آپ کی زبان پر بڑی بڑی باتیں جاری کیں۔ سید احمد شہید بریلویؒ کی طرح زیادہ لکھے پڑھے نہیں تھے مگر اللہ نے بڑا روشن دل عطا فرمایا تھا یہی حال حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا ہے۔ ظاہری علم کم تھا مگر مولانا گنگوہیؒ اور مولانا نانوتویؒ جیسے لوگ آپ کے مرید تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ گزشتہ صدی میں پوری دنیا میں اتنا بڑا ولی اللہ نہیں گزرا، تو یہ بات غلط نہیں ہو گی۔ بہرحال شیخ عبدالعزیز دباغؒ نے ایک نکتہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جس مقام پر موسیٰ علیہ السلام کی مچھلی گم ہوئی اسی مقام پر ان کا مطلوب حاصل ہوا مچھلی پیٹ کا معاملہ تھا، تو جہاں پیٹ کا معاملہ ختم ہوا۔ وہاں معرفت

حاصل ہوگئی۔ اسی طرح فرماتے ہیں کہ جب تک انسان کے ساتھ پیٹ کا دھندا غالب ہوگا خداتعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔

تعلیم و تعلّم کے لیے شرائط

بہرحال جب موسیٰ علیہ السلام کی خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوگئی قَالَ لَهُ مُوسَىٰ تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا کیا میں اس شرط پر آپکی پیروی کر سکتا ہوں کہ آپ اللہ کی سکھلائی ہوئی چیز میں سے کچھ مجھے بھی سکھلائیں؟ خضر علیہ السلام نے کہا قَالَ إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا کہ تو میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکے گا۔ پھر بے صبری کی وجہ بھی بیان کی وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا بھلا آپ اس چیز پر کیسے صبر کر سکیں گے جس خبر کا آپ کو احاطہ ہی نہیں۔ مطلب یہ کہ جس بات کی حقیقت کا آپ کو علم ہی نہیں آپ اس میں ضرور بے صبری کا اظہار کرتے ہوئے دخل اندازی کریں گے موسیٰ علیہ السلام نے یقین دلایا قَالَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا آپ انشاء اللہ مجھے صابر پائیں گے یعنی میں آپ کے معاملہ میں مداخلت نہیں کروں گا اور دوسری بات یہ وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا اور میں آپ کے کسی حکم کی نافرمانی بھی نہیں کروں گا۔ اس قدر تسلی دلانے کے بعد خضر علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ساتھ رکھنے اور اللہ کے عطا کردہ علم میں سے کچھ سکھانے کے لیے آمادہ ہوگئے مگر اس شرط کے ساتھ قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَن شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا خضرؑ نے کہا اگر آپ میری پیروی کرتے ہیں تو آپ مجھ سے کسی چیز کے بارے میں سوال نہیں کریں گے حتیٰ کہ میں خود ہی اسے تمہارے سامنے ظاہر کر دوں۔

مطلب یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے حصول مقصد کے لیے استاد اور شاگرد کے درمیان بعض شرائط طے ہوگئیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی شرط تھی

کہ وہ خضر علیہ السلام کی معیت کے دوران صبر کا دامن نہیں چھوڑیں گے اور ان کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ اُدھر خضر علیہ السلام کی شرط یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام اُن سے کسی چیز کے متعلق کوئی سوال نہیں کریں گے حتیٰ کہ وہ خود ہی اُس کو بیان کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ استاد اور شاگرد کے درمیان بعض شرائط پر تعلیم و تعلم کا انتظام کرنا درست ہے اُستاد کہے کہ میں ان شرائط کے تحت پڑھاؤں گا اور شاگرد کہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے میری شرائط یہ ہوں گی۔ بہرحال ملاقات کے بعد ان دونوں صاحبان کے درمیان رفاقت اور تعلیم کی شرائط طے ہو گئیں اور وہ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے جس کا ذکر اگلی آیات میں آرہا ہے۔

فَانْطَلَقَا حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِى السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ۭ قَالَ
اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـــًٔا اِمْرًا ﴿۷۱﴾
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا ﴿۷۲﴾
قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِىْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِىْ مِنْ
اَمْرِىْ عُسْرًا ﴿۷۳﴾ فَانْطَلَقَا حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ
قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ لَقَدْ جِئْتَ
شَيْـــًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ
تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَىْءٍۢ
بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِىْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّىْ عُذْرًا ﴿۷۶﴾
فَانْطَلَقَا حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِۨ اسْتَطْعَمَآ
اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا
يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ
عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِىْ وَبَيْنِكَ ۚ
سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۷۸﴾

الجزء السادس عشر

ترجمہ:۔ (خضر اور موسیٰ علیہما السلام) دونوں چلے یہاں تک کہ جب
وہ کشتی میں سوار ہوئے تو اس (اللہ کے بندے) نے اس

(کشتی) کو پھاڑ دیا۔ کہا (موسیٰ نے) کیا تو نے اس کو پھاڑ دیا ہے تاکہ تو غرق کر دے اس میں موجود لوگوں کو، البتہ تحقیق کی ہے تو نے ایک چیز بھاری (۷۱) کہا خضر (علیہ السلام) نے کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ تو ہرگز صبر نہ کر سکے گا میرے ساتھ (۷۲) کہا (موسیٰ نے) نہ مؤاخذہ کریں مجھ سے اس (چیز) پر جو میں بھول گیا ہوں۔ اور نہ ڈالیں آپ مجھ پر میرے معاملے میں دشواری (۷۳) پھر وہ دونوں چلے یہاں تک کہ دونوں ملے ایک لڑکے سے۔ پس قتل کیا (خضر نے) اس (لڑکے) کو۔ کہا (موسیٰ نے) کیا تو نے قتل کر دیا ہے ایک نفس بے گناہ کو بغیر کسی جان کے عوض۔ البتہ تحقیق کی ہے آپ نے نامعقول بات (۷۴) کہا (اس شخص نے) کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ تم ہرگز صبر نہیں کر سکو گے میرے ساتھ (۷۵) کہا (موسیٰ نے) اگر میں نے پوچھا آپ سے کسی چیز کے بارے میں اس کے بعد، پس آپ مجھے اپنی رفاقت میں نہ رکھنا۔ تحقیق پہنچ چکے ہیں آپ میری طرف سے عذر کو (۷۶) پس چلے وہ دونوں یہاں تک کہ آئے ایک بستی والوں کے پاس۔ ان دونوں نے اُن سے کھانا طلب کیا، پس انہوں نے انکار کیا اس بات سے کہ وہ انہیں مہمان بنائیں۔ پس پائی اس (بستی) میں ایک دیوار جو گرنا چاہتی تھی۔ پس اُس (خضر) نے اُس کو سیدھا کر دیا۔ کہا (موسیٰ نے) اگر آپ چاہتے تو لے لیتے اس پر مزدوری (۷۷) کہا (خضر نے) یہ ہے جدائی میرے اور تیرے درمیان۔ میں تمہیں بتلا دونگا حقیقت اُس چیز کی جس

پر آپ صبر نہیں کر سکے (۷۸)

ربط آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اپنی علمیت کے معاملہ میں ذراسی لغزش ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو آزمائش میں ڈال دیا۔ اللہ نے فرمایا کہ تجھ سے زیادہ عالم ہمارا ایک بندہ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اُس سے ملاقات کی خواہش کی تو اللہ نے فرمایا کہ فلاں سمت سفر اختیار کرو تو ہمارا وہ بندہ تمہیں مجمع البحرین کے قریب مل جائے گا۔ اللہ نے نشانی کے طور پر فرمایا کہ جہاں تمہاری تلی ہوئی مچھلی گم ہو جائے گی، ہمارا وہ خاص بندہ اسی مقام پر مل جائے گا۔ بہرحال موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم حضرت یوشع بن نون کے ہمراہ سفر کیا، جہاں پر مچھلی گم ہوئی تھی وہیں پر اللہ کے خاص بندے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات بھی ہو گئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام کے ساتھ رہ کر اُن سے کچھ سیکھنا چاہا۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ میں آپ کے حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ساتھ رکھنے کے لیے یہ شرط پیش کی کہ آپ مجھ سے کسی چیز کے متعلق سوال نہیں کریں گے یہاں تک کہ میں خود تمہیں اُس کی حقیقت سے آگاہ کر دوں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے یہ بھی کہا کہ تم میرے ساتھ رہتے ہوئے صبر نہیں کر سکو گے تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ آپ مجھے انشاء اللہ صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔

موسیٰ اور خضر کا سفر

اب موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام نے سفر کا آغاز کیا۔ پہلے انہوں نے کشتی کے ذریعے بحری سفر کیا جس کے دوران ایک واقعہ پیش آیا اور اس کے بعد انہوں نے خشکی کے راستے سفر اختیار کیا۔ اس دوران اُن کو دو واقعات پیش آئے۔ اِن تینوں واقعات کا ذکر آج کے درس میں آ رہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے فَانْطَلَقَا پھر وہ دونوں یعنی موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام چل پڑے۔ یہ تثنیہ کا صیغہ ہے اور اس سے دونوں اصحاب

مراد ہیں۔ مگر اُن کے ساتھ تیسرا آدمی حضرت یوشع بن نون بھی تو تھا۔ مگر اُن کی رفاقت کا قرآن پاک نے ذکر نہیں کیا۔ اس ضمن میں مفسرین کرام کا اختلاف ہے ایک گروہ کہتا ہے کہ تیسرے آدمی بطور خادم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شریک سفر تھے اور خادم اپنے آقا کے احکام کے تابع ہوتا ہے اس لیے اُن کا ذکر نہیں کیا گیا۔ تعلیم و تعلم چونکہ انہی دو بزرگوں کے درمیان مقصود تھی، لہٰذا اِن دو کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔ البتہ امام بغویؒ اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کی ملاقات ہو گئی اور ہم سفری کی شرائط طے ہو گئیں تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم یوشع بن نون کو اپنی قوم کے پاس واپس بھیج دیا تھا۔ اب یہ دونوں بزرگ کتنا عرصہ اکٹھے رہے اور انہوں نے کتنا لمبا سفر اختیار کیا، اس بات کا تو کوئی تذکرہ نہیں ملتا جب تک اللہ کو منظور تھا، ان کی رفاقت قائم رہی اور تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔

کشتی کا سفر

بہر حال وہ دونوں چل دیئے۔ پہلے کچھ خشکی کا سفر کیا ہوگا۔ پھر آگے دریا آ گیا۔ حَتّٰۤى اِذَا رَكِبَا فِى السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا حتیٰ کہ جب وہ دونوں یعنی موسیٰ اور خضر علیہما السلام کشتی میں سوار ہوئے تو خضر علیہ السلام نے اُس کشتی کو پھاڑ دیا۔ تفصیلات کے مطابق جب یہ دونوں حضرات دریا کے کنارے پر پہنچے تو وہاں پر کشتی تیار تھی۔ یہ بھی دریا عبور کرنا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے کشتی والوں سے کشتی میں سوار کرانے کے لیے کہا مگر اہلِ کشتی متردد ہوئے۔ بعض نے کہا کہ انہیں کشتی میں سوار نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ معلوم نہیں یہ کس کردار کے لوگ ہیں۔ تاہم بعض دوسروں نے کہا کہ یہ تو نورانی شکلوں والے اللہ کے نیک بندے ہیں، انہیں ضرور سوار کر لینا چاہیئے۔ صحیحین کی روایت میں آتا ہے۔ فَعَرَفُوا الْخَضِرَ فَحَمَلُوْهُمْ فِىْ سَفِيْنَتِهِمْ بِغَيْرِ نَوْلٍ انہوں نے خضر علیہ السلام کو پہچان لیا۔ اور انہیں بغیر کرایہ کشتی میں سوار کر لیا۔ آگے

اسی روایت میں آتا ہے وَوَقَعَ عُصْفُوْرٌ عَلٰی حَرْفِ السَّفِیْنَۃِ فَغَمَسَ مِنْقَارَہٗ فِی الْبَحْرِ ایک چڑیا کشتی کے کنارے پر آکر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے اپنی چونچ سمندر میں ڈالی تو خضر نے موسیٰ سے کہا میرے اور تمہارے علم کی نسبت اللہ تعالیٰ کے علم سے اس قدر ہے جتنی اس چڑیا کی چونچ کی تری کو سمندر سے اصل میں یہ خدا کی جانب سے تربیت تھی۔ کیونکہ اسی مسئلہ میں موسیٰ علیہ السلام پر ابتلاء آئی تھی کہ مجھ سے زیادہ عالم کوئی نہیں ہے۔ غرضیکہ خضر علیہ السلام نے واضح کر دیا کہ اے موسیٰ علیہ السلام ! میرا اور تیرا علم مِثْلُ مَا نَقَصَ ھٰذَا الْعُصْفُوْرُ مِنْ ھٰذَا الْبَحْرِ اتنا معمولی ہے جتنا اس چڑیا نے چونچ ڈال کر اس سمندر میں کمی کر دی ہے۔

کشتی کو توڑنے کے متعلق بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے قَدْ قَلَعَ لَوْحًا مِّنْ اَلْوَاحِ السَّفِیْنَۃِ بِالْقَدُوْمِ خضر علیہ السلام نے کلہاڑے سے کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ دیا۔ مفسرین بیان کرتے ہیں کہ خضر علیہ السلام نے اس سوراخ میں شیشے کا پیوند لگا دیا تھا جس کی وجہ سے پانی کشتی میں نہیں آتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ان کا معجزہ تھا کہ کشتی میں سوراخ ہونے کے باوجود پانی اوپر نہیں چڑھتا تھا۔ پھر جب خطرہ ٹل گیا تو خضر علیہ السلام نے اکھاڑا ہوا تختہ دوبارہ اسی جگہ نصب کر دیا۔

بہرحال جب خضر علیہ السلام نے تختہ اکھاڑ دیا تو موسیٰ علیہ السلام سے صبر نہ ہو سکا اور وہ بول اٹھے قَالَ اَخَرَقْتَھَا لِتُغْرِقَ اَھْلَھَا کیا تو نے کشتی کو پھاڑ دیا ہے تاکہ اس میں سوار لوگوں کو ڈبو دے ؟ ان لوگوں نے ہم پر بڑی مہربانی کی ، پہلے کشتی میں سوار کرایا اور ہم سے کرایہ بھی نہ لیا مگر تم نے ان کے احسان کا یہ بدلہ دیا ہے کہ ان کی کشتی ہی توڑ دی ہے۔ لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا اِمْرًا آپ نے تو بڑی مصیبت کھڑی کر دی ہے

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا خضر علیہ السلام نے کہا، اے موسیٰ! کیا میں نے تجھے نہیں کہا تھا کہ تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکے گا۔ اگرچہ دونوں حضرات کے درمیان معاہدہ میں یہ طے پا چکا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کوئی سوال نہیں کریں گے مگر انہوں نے بھول کر یہ سوال کر دیا۔ چنانچہ جب حضر علیہ السلام نے انہیں معاہدہ یاد کرایا تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو کہنے لگے قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ میری اس بھول پر مجھ سے مؤاخذہ نہ کرو۔ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا اور آپ میرے معاملے میں مجھ پر دشواری نہ ڈالیں۔ مطلب یہ کہ بھول چوک معاف ہوتی ہے لہٰذا اس دفعہ آپ در گزر کریں اور مجھ پہ سختی نہ کریں۔

عجیب وغریب ہرن

دونوں ساتھیوں نے کشتی کے ذریعے دریا پار کیا فَانْطَلَقَا پھر آگے چل دیئے۔ دریا سے پار صحرا تھا اس میں سفر شروع کر دیا۔ قوت القلوب والے کہتے ہیں کہ اس دوران میں موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خیال آیا کہ اس لق و دق صحرا میں ہمارے کھانے پینے کا کیا انتظام ہوگا۔ اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ ایک ہرن دوڑتا ہوا ان کی طرف آرہا ہے آپ نے دل میں خیال کیا کہ اگر یہ ہرن شکار ہو جائے تو ہماری خوراک بن سکتا ہے۔ جب وہ ہرن قریب آیا تو موسیٰ علیہ السلام یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہرن ذبح شدہ ہے اور اس کا گوشت دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصہ کچا ہے جب کہ دوسرا روسٹ شدہ ہے خضر علیہ السلام نے تلا ہوا گوشت اپنے سامنے کر لیا اور کچے کے متعلق موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم خود اسے بھون کر خوراک بنا لو۔ مطلب یہ کہ تمہیں اس سفر میں کھانے سے متعلق طرح طرح کے خیالات آرہے تھے جب کہ میری یہ حالت نہ ہوئی۔ مجھے تو اللہ نے بھونا ہوا گوشت بھیج دیا ہے اور تم خود اسے کھانے کے قابل بنا لو۔

بچے کا قتل

وہ دونوں ساتھی سفر کرتے رہے حَتّٰی اِذَا لَقِیَا غُلٰمًا یہاں تک کہ اُن کی ملاقات ایک لڑکے سے ہوئی۔ فَقَتَلَهٗ تو خضر علیہ السلام نے اُس بچے کو قتل کر دیا۔ حدیث شریف میں اس قتل کے متعلق آتا ہے فَاَخَذَ الْخَضِرُ رَاْسَهٗ بِیَدِهٖ فَاقْتَلَعَهٗ بِیَدِهٖ فَقَتَلَهٗ خضر علیہ السلام نے اُس بچے کا سر پکڑ کر گردن سے اکھاڑ دیا۔ یہ تو بہت ہی خطرناک معاملہ تھا۔ ایک بے گناہ لڑکے کا سر تن سے جدا کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام یہ دیکھ کر رہ نہ سکے اور فوراً بول اٹھے قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِیَّةًۢ بِغَیْرِ نَفْسٍ کیا تو نے ایک بے گناہ جان کو بغیر جان کے بدلے قتل کر دیا ہے لَقَدْ جِئْتَ شَیْـًٔا نُّكْرًا تو نے تو بڑی نامعقول بات کر دی ہے۔ معصوم بچے کا قتل کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

لفظ "غلام" کے معانی میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس سے چھوٹا بچہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور نوجوان بھی۔ امام حسن بصریؒ اور مورخ کلبی وغیرہ کہتے ہیں کہ مقتول نوجوان تھا اور لوگوں کے گھروں میں اور مسافروں پر ڈاکے ڈالتا تھا۔ تاہم اکثر مفسرینؒ فرماتے ہیں نَفْسًا زَكِیَّةً سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چھوٹا بچہ تھا جو ابھی معصوم تھا کیونکہ جب جوان ہو جائے تو پھر زکیہ یعنی بے گناہ نہیں رہتا۔ حدیث شریف میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں اِذَا اَبْصَرَ الْخَضِرُ غُلٰمًا یَلْعَبُ مَعَ الْغِلْمَانِ خضر علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک بچہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہے تو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اُس کا سر مروڑ دیا۔ کھیل کود کا لفظ بھی بتلاتا ہے کہ وہ چھوٹا بچہ تھا۔

بہرحال جب موسیٰ علیہ السلام نے ایک بے گناہ بچے کے قتل پر اعتراض کیا قَالَ تو خضر علیہ السلام نے کہا اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ تم

میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے؟ موسیٰ علیہ السلام کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ انہوں نے دوسری مرتبہ معاہدہ کی کھلی خلاف ورزی کی تھی قَالَ کہنے لگے اِنْ سَأَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَاحِبْنِي اگر اس مرتبہ کے بعد میں نے آپ سے کوئی سوال کیا تو بیشک مجھے اپنی معیت میں نہ رکھنا قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَدُنِّي عُذْرًا تحقیق میری طرف سے آپ عذر کو پہنچ چکے ہیں مطلب یہ کہ اب حجت تمام ہو چکی ہے، اگر اب آپ مجھے اپنے سے جدا کر دیں گے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا کیونکہ شرط کی خلاف ورزی میری طرف سے ہوئی ہے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے پہلی دفعہ بھول کر سوال کیا تھا۔ آپ کا دوسرا اقرار تھا کہ اگر آئندہ ایسی غلطی ہو گی تو بیشک آپ مجھے علیحدہ کر دیں اور پھر تیسری مرتبہ کا سوال جو آگے آ رہا ہے، وہ بالکل جدائی کی نسبت سے تھا۔

بے بستی
[illegible]

ارشاد ہوتا ہے فَانْطَلَقَا یہ دونوں ساتھی اور آگے بڑھ گئے حَتّٰی اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةٍ یہاں تک کہ جب وہ ایک بستی والوں کے پاس پہنچے اِسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا تو اس بستی والوں سے کھانا طلب کیا سفر کر کے آ رہے تھے، بھوک سے نڈھال تھے، لہذا گاؤں والوں سے کہا کہ وہ مسافر ہیں اور انہیں کھانے پینے کے لیے کچھ دیا جائے یہ کون سی بستی تھی، یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض نے انطاکیہ کا نام لیا ہے جو کہ علاقہ شام میں واقع ہے۔ بہرحال جب انہوں نے کھانا مانگا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا تو بستی والوں نے ان دونوں کو مہمان بنانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے ان معزز مسافروں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا جو کہ ان کی کمینگی پر دلالت کرتا ہے۔ کمینگی کسی کی ذات نسل سے نہیں بلکہ اخلاق سے ظاہر ہوتی ہے۔ کمینے کام کرنے والے لوگ کمینے ہوتے ہیں، خواہ وہ کسی ذات اور نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔

یہ اس بستی والوں کی عمومی حالت تھی ورنہ ان میں کوئی اکا دکا اچھا آدمی بھی ہوگا۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ اس بستی کی عورت نے ان مہمانوں کو کھانے کے لیے کچھ پیش کیا تھا اور ان بزرگوں نے اس عورت کے حق میں دعا بھی کی تھی۔

بہرحال اس بستی میں ورود کے بعد فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا ان دونوں نے ایک دیوار دیکھی يُّرِيدُ أَنْ يَّنْقَضَّ جو گرا ہی چاہتی تھی بوسیدہ ہو کر ایک طرف کو جھک گئی تھی اور قریب تھا کہ وہ گر جائے فَأَقَامَهُ تو خضر علیہ السلام نے اس دیوار کو سیدھا کر دیا روایات میں آتا ہے کہ خضر علیہ السلام نے دیوار کو گرا کر دوبارہ تعمیر نہیں کیا تھا بلکہ کرامت کے طور پر اپنے ہاتھ سے سیدھا کر دیا تھا۔ یہ دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام بولے قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اجرت لے سکتے تھے مگر آپ نے تو یہ بالکل مفت کام کر دیا حالانکہ اس بستی والوں نے آپ کو کھانا بھی نہیں کھلایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے معاہدہ کی تیسری مرتبہ خلاف ورزی ہو چکی تھی قَالَ آپ خضر علیہ السلام نے کہا هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ اب میرے اور تیرے درمیان جدائی کی نوبت آچکی ہے۔ آپ میرے ساتھ رہ کر میری باتوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا آپ اپنی راہ پکڑیں، موسیٰ علیہ السلام تو پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ اگر اب کی دفعہ سوال کروں تو بیشک آپ مجھے الگ کر دیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ البتہ خضر علیہ السلام نے فرمایا سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا میں عنقریب تمہیں ان چیزوں کی حقیقت سے مطلع کر دوں گا جن پر آپ صبر نہیں کر سکے۔ یہ تینوں چیزیں تکوینی امور سے تعلق رکھتی تھیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے خضر علیہ السلام کو تو عطا کر رکھا تھا مگر موسیٰ علیہ السلام ان کی حقیقت

سے واقف نہیں تھے اس لیے وہ بار بار سوال کرتے تھے۔ ان تینوں کی حقیقت اللہ نے اگلی آیات میں خضر علیہ السلام کی زبان سے بیان فرمائی ہے۔ حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا یہ فرمان بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے کاش وہ کچھ دیر مزید صبر کرتے تو عجیب و غریب واقعات کا مشاہدہ کرتے۔ تاہم وہ ان تین عجائبات کو دیکھنے کے بعد اپنے مقام کی طرف واپس روانہ ہو گئے۔

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ﴿٧٩﴾

ترجمہ :- اور بہرحال کشتی ، پس وہ تھی چند محتاجوں کی جو دریا میں کام کرتے تھے ۔ پس میں نے ارادہ کیا کہ میں اس کشتی کو عیب ناک بنا دوں ، اور تھا ان کے آگے ایک بادشاہ جو پکڑ لیتا تھا ہر (صحیح) کشتی کو بزور ﴿٧٩﴾

ربط آیات

حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا جو واقعہ بیان ہو رہا ہے اس سے موسیٰ علیہ السلام کی تربیت مطلوب تھی ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی لغزش پر انہیں آزمائش میں ڈال دیا ۔ انہیں لمبا چوڑا سفر اختیار کرنا پڑا ، پھر خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو بعض شرائط کے تحت ان کی رفاقت منظور ہوئی مگر موسیٰ علیہ السلام ان شرائط پر قائم نہ رہ سکے ۔ خضر علیہ السلام کی معیت میں تین واقعات پیش آئے تو موسیٰ علیہ السلام وعدہ کے مطابق خاموش نہ رہ سکے انہوں نے پہلا اعتراض قبول کر لیا تھا ۔ پھر دوسرے اعتراض پر خود پیش کش کی کہ اس بار درگزر کیا جائے اور اگر آئندہ اعتراض کروں تو بیشک مجھے الگ کر دیا جائے ۔ چنانچہ تیسرے اعتراض پر خضر علیہ السلام نے صاف کہہ دیا کہ اب میرا اور تمہارا راستہ جدا جدا ہے البتہ میں ان تین چیزوں کی حقیقت واضح کیے دیتا ہوں جن پر آپ صبر نہیں کر سکے آج کے درس میں کشتی والے واقعہ کی حقیقت سے آگاہ کیا گیا ہے ۔ جب کہ باقی دو واقعات کے متعلق حقیقت اگلے درس میں بیان کی جائے گی ۔

واقعہ کشتی کی حیاتِ موسیٰ سے مناسبت

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ جب موسیٰ اور خضر علیہما السلام نے کشتی کا سفر

شروع کیا، تو خضر علیہ السلام نے اچانک کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ دیا جس سے کشتی کے مسافروں کی جانیں خطرہ میں پڑ گئیں۔ موسیٰ علیہ السلام اس پر صبر نہ کر سکے اور کہنے لگے اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا کیا آپ نے کشتی کو اس لیے توڑ دیا ہے کہ اس کے مسافر غرق ہو جائیں؟ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام خود اپنے ذاتی واقعہ کو بھول گئے جو انہیں ابتدائی زندگی میں پیش آیا تھا۔ اگر آپ اس واقعہ کو یاد کر لیتے تو پھر اس کشتی کے واقعہ پر بھی صبر کا دامن نہ چھوڑتے۔ جس زمانے میں موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی اس دور میں فرعون بنی اسرائیل کے نوزائیدہ بچوں کو قتل کرا دیتا تھا کیونکہ اسے انہی میں سے کسی کے ہاتھوں اپنی سلطنت کے چھن جانے کا خطرہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے آپکے قتل کے خوف سے آپ کو صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو نہ صرف فرعون کے مظالم سے بچایا بلکہ آبی لہروں کے درمیان بھی آپ کی حفاظت کی۔ آپ بڑے ہو گئے اور پھر فرعون کے زوال کا باعث بنے۔ تو یہاں پر موسیٰ علیہ السلام کو یہ تنبیہ مقصود تھی کہ آپ کشتی میں سوراخ دیکھ کر پریشان ہو گئے مگر آپ کو اس طرف دھیان کیوں نہ آیا کہ جو خداوند کریم آپ کو دریا کی لہروں سے بچا سکتا ہے، وہ اس کشتی کے سواروں کو بھی دریا سے پار لگانے پر قادر ہے، لہٰذا آپ کو زیادہ فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔

کشتی توڑنے کی حکمت

خضر علیہ السلام نے کشتی کو توڑنے کی حکمت اس طرح بیان کی اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ بہرحال کشتی چند مسکینوں کی تھی يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ جو دریا میں محنت مزدوری کر کے گزر اوقات کرتے تھے۔ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا تو میں نے ارادہ کیا کہ اس کو عیب دار بنا دوں یعنی اس کو صحیح سلامت نہ رہنے دوں

کیونکہ وَكَانَ وَرَآءَهُم مَّلِكٌ اُن کے آگے ایک بادشاہ تھا۔ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا جو چھڑ لیتا تھا ہر کشتی کو بزور اور ان سے چھین لیتا تھا۔ اللہ کی مشیت یہ تھی کہ ان مساکین کی کشتی غصب ہونے سے بچ جائے۔ لہٰذا خضر علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کشتی میں نقص پیدا کر دیا تاکہ بادشاہ اسے نکمی سمجھ کر چھوڑ دے۔ کسی دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے غصب کر لینا چوری، ڈاکے اور خیانت کی طرح حرام ہے۔ لہٰذا کسی مسلمان کے لیے روا نہیں کہ وہ دوسرے آدمی کا مال چھین لے خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ ہاں غیر مسلموں کے ساتھ جنگ میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا ہے۔ وہ جائز ہے اسی طرح زمانہ امن میں غیر مسلم ذمی یا معاہد سے ان کی جان و مال کی حفاظت کے طور پر جو جزیہ لیا جاتا ہے وہ بھی حلال ہے۔

مسکین اور فقیر کی اصطلاحات

قرآن پاک میں فقیر اور مسکین کی اصطلاحات اکثر مقامات پر استعمال ہوئی ہیں۔ تاہم مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ ہر دو قسم کے لوگوں میں سے کون زیادہ محتاج ہے۔ بعض فقیر کو زیادہ محتاج سمجھتے اور بعض مسکین کو۔ لفظ مسکین کا اطلاق اس شخص پہ ہوتا ہے جو بالکل تہی دست ہو۔ سورۃ البلد میں موجود ہے اَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ یعنی بالکل مٹی میں ملا ہوا جس کے پاس بالکل کچھ نہیں۔ دوسری طرف فقیر کا لفظ اس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس کے پاس کچھ نہ کچھ ذریعہ آمدنی موجود ہو مگر وہ اس کی جائز ضروریات کے لیے ناکافی ہو۔ بعض مفسرین ان اصطلاحات کے الٹ معنی کرتے ہیں یعنی فقیر وہ ہے جس کے پاس بالکل کچھ نہیں اور مسکین وہ ہے جس کے پاس تھوڑا بہت موجود ہے مگر اس کی گزر اوقات نہیں ہوتی۔ ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ فقیر کا لغوی معنی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اگر وہ ٹوٹ جائے تو آدمی بالکل ناکارہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا فقیر وہ شخص ہے جو بالکل بے یار و مددگار ہے

اور جس کے پاس ایک وقت کا کھانا بھی موجود نہیں ہے۔ بہرحال فقیر اور مسکین دونوں محتاج ہیں، اسی لیے سورۃ توبہ میں جہاں اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے خرچ کی مدات بیان کی ہیں۔ وہاں سب سے پہلے فقیر اور مسکین کو اس کا مستحق قرار دیا ہے۔ "اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ" (آیت ۶۰)

کشتی کی ملکیت

بعض مفسرین نے ان مساکین کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ وہ اس کشتی کے ذریعے محنت مزدوری کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کسی دوسرے شخص سے کرایہ پر لے رکھی ہو اور آمدن کا کچھ حصہ اصل مالک کو بھی ادا کرتے ہوں، تاہم بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کشتی خود انہی کی ملکیت تھی۔ وہ دس بھائی تھے۔ ان میں سے پانچ تندرست و توانا تھے اور کام کرتے تھے جب کہ پانچ بھائی لولے لنگڑے یعنی معذور تھے اور کام کاج کے قابل نہیں تھے، لہٰذا سارے کے سارے بھائیوں کی گزران اسی کشتی کی آمدنی پر تھی۔ ان حالات میں کشتی عیب دار کر دینا ان سب بھائیوں سے ذریعہ روزگار چھیننے کے مترادف تھا جس کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو سخت تشویش ہوئی اور انہوں نے فوراً اعتراض کر دیا۔

عیب دار کی مصلحت

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ خضر علیہ السلام کا کشتی کو عیب دار بنا دینا اس کی ہزار درستگی سے بہتر تھا کیونکہ مصلحت اسی میں تھی۔ اگر یہ کشتی صحیح سلامت رہتی تو پکڑی جاتی اور وہ مساکین ذریعہ آمدنی سے محروم ہو جاتے۔ مفسرین کی روایت کے مطابق جب کشتی پکڑے جانے کی حد سے گزر گئی تو خضر علیہ السلام نے خود اپنے ہاتھ سے ٹوٹے ہوئے تختے کو پھر درست حالت میں کر دیا۔ آپ صاحب معجزہ اور مامور من اللہ تھے، لہٰذا مصلحت خداوندی کے مطابق کشتی کا ٹوٹ جانا اور پھر خضر علیہ السلام کے

ہاتھوں سے درست ہو جانا کچھ عجیب بات نہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ خضر علیہ السلام نے کشتی کا تختہ توڑ کر اس کی جگہ شیشے کا پیوند لگا دیا تھا تاکہ کشتی بظاہر ٹوٹی ہوئی نظر آئے مگر اس میں پانی داخل نہ ہو۔ بہر حال کشتی کو عیب دار بنانے کی یہ وجہ تھی۔

اسلام اور جدید عصری تقاضے

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ ہمارے زمانے کے ذہین و فطین عالم گزرے ہیں۔ آپ صوبہ بہار کے ایک گاؤں گیلان کے رہنے والے تھے اور بیس پچیس سال قبل وہیں فوت ہوئے، آپ حیدر آباد دکن میں اسلامیہ یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے صدر تھے۔ آپ دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ آپ نے کشتی کے واقعے کے تناظر میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ جس طرح کشتی کی عیب ناکی ہی اس کی سلامتی کی ضمانت بنی اسی طرح متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جدید تعلیم سے بے بہرگی ہی دین کے حق میں مفید ثابت ہوئی۔

قیام پاکستان سے قبل برصغیر میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن واحد یونیورسٹی تھی جس کے تعلیم یافتہ لوگ اسلامی ذہن رکھتے تھے۔ یہ مولانا مناظر احسن گیلانی کی کاوش کا نتیجہ تھا، ورنہ دیگر تمام یونیورسٹیوں (علی گڑھ، کلکتہ، لاہور وغیرہ) کے تعلیم یافتہ لوگ الحاد کا شکار ہی رہے ہیں۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو گذشتہ ڈیڑھ صدی میں برصغیر کے بعض خضر صفت لوگوں نے بے سروسامانی کی حالت میں دینی تعلیم کا بیڑہ اٹھایا اور کفر و الحاد کے اندھیروں میں توحید و سنت کے چراغ روشن کیے۔ اس سلسلہ میں اولین کوشش حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تھی جنہوں نے دار العلوم دیوبند سے دینی مدارس کی ابتدا کی اور پھر اس کی شاخیں مراد آباد، سہارنپور اور دہلی تک پھیلا دیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں سب سے زیادہ نقصان بھی مسلمانوں کا ہی ہوا۔ انگریزوں نے ان سے خوب انتقام لیا اور ہزاروں علماء کو سولی پہ لٹکا دیا۔

مسلمانوں سے اقتدار چھین لیا گیا اور ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ ان حالات میں بزرگانِ دین نے دینی مدارس قائم کر کے الحاد کے آگے بند باندھ دیا۔

یہ مدرسے خالص دینی تعلیم کے داعی تھے اور انہیں جدید علوم سے جان بوجھ کر الگ رکھا گیا۔ یہ مدارس اس لحاظ سے عیب ناک تھے کہ ان کے فارغ التحصیل طلبا کے پاس حصولِ معیشت کے لیے کوئی ڈگری نہیں ہوتی تھی۔ بانیانِ مدارس اچھی طرح جانتے تھے کہ جن مدارس میں حکومت کا عمل دخل شروع ہو جائے اور ان کے پیشِ نظر عصری تقاضے بھی ہوں، وہاں دین کا پہلو کمزور ہو جاتا ہے، ان کا تجربہ تھا کہ حکومت سے امداد حاصل کرنے والے مدارس کو انگریزوں نے جلد ہی زیرِ تسلط کر لیا اور پھر انہیں اپنے غلط مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا۔ لہذا ان مدارس نے مالی وسائل کی پرواہ کیے بغیر دین کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا۔ چنانچہ گذشتہ ڈیڑھ صدی میں ان ٹوٹے پھوٹے شکستہ حال اور عصری تقاضوں سے بے نیاز مدارس نے دین کی بے مثال خدمت کی ہے۔ یہ انہی بزرگوں کی کاوش کا نتیجہ ہے کہ آج پاکستان میں پانچ سات سو دینی مدارس کام کر رہے ہیں خود ہندوستان کے سیکولر سٹیٹ ہونے کے باوجود وہاں پر ایسے مدارس کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ اسی طرح مسلم بنگال میں بھی یہ مدرسے دینی تعلیم کی اشاعت کا کام کر رہے ہیں۔ انگریزوں نے ایسے مدارس کی اس قدر حوصلہ شکنی کی کہ ایک عام پرائمری پاس تو ووٹ دے سکتا تھا مگر دینی مدرسے کے فارغ التحصیل کو ووٹ دینے کے حق سے محروم رکھا گیا تھا ۱۹۴۵ء میں اگرچہ میں دارالعلوم دیوبند کا سند یافتہ تھا مگر میں ووٹ کے حق سے اس لیے محروم رہا کہ نہ تو میرے پاس بائیس ہزار روپے کی جائداد تھی اور نہ پرائمری کی سند۔

دینی مدارس کی عیب ناکی

بہر حال جس طرح خضر علیہ السلام نے کشتی کو عیب دار بنا کر اللہ کے حکم سے اس پر کام کرتے والے مزدوروں کی معیشت کی حفاظت کی، اسی طرح ہمارے بزرگوں نے دینی مدارس کو عصری تقاضوں سے الگ رکھ کر دین کی ایسی عملی خدمت کی جس کا بدل آج تک نہیں مل سکا۔ پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ میں یہاں کی کوئی حکومت بھی ان مدارس کا بدل پیدا نہیں کر سکی۔ ان مدارس سے تربیت یافتہ لوگ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں، مصائب کو برداشت کرتے ہیں مگر مسلمانوں کی دینی ضروریات کو پورا کر رہے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں جدید تعلیم حاصل کرنے والوں پر فوراً جدت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتے کہ دین کے معاملہ میں ان پر انحصار کیا جا سکے۔ وہ خود خلافِ سنت کام کرتے ہیں لہٰذا ان کے پیچھے تو نماز بھی ادا نہیں کی جا سکتی۔ بہر حال ان مدارس کے تربیت یافتہ لوگوں نے ہی دین کا عملی نمونہ پیش کیا ہے اور جدید عصری تقاضوں سے دور رہنا ہی دین کی حفاظت کا سبب بنا ہے۔

اس وقت پاکستان میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور واحد یونیورسٹی ہے جس کے متعلق یہ دعوےٰ کیا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد دینی تعلیم پر رکھی گئی ہے مگر گزشتہ بیس سال کے دوران اس یونیورسٹی نے بھی دین کا کوئی عملی نمونہ پیش نہیں کیا۔ اس یونیورسٹی اور ملک کی باقی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ لوگوں میں کوئی فرق نہیں۔ وہاں بھی جدید علوم کے ساتھ ساتھ مخلوط تعلیم کا انتظام ہے، لہٰذا ایسے اداروں سے دین کی خدمت کی توقع عبث ہے۔ دین کے عملی نمونے کے لیے دارالعلوم دیوبند یا مظاہر العلوم سہارنپور کی طرز کے مدارس کی طرف ہی نظریں اٹھتی ہیں جو حکومت کی سرپرستی کے بغیر دین کو ترویج پر کمر بستہ ہیں۔ جس طرح واقعہ خضر میں کشتی کی عیب ناکی اس کی سلامت درستگی سے بہتر تھی، اسی طرح دینی مدارس کی جدید عصری تقاضوں سے علیحدگی کی عیب ناکی دین کے حق میں سلامتی سے بہتر ہے۔

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴿۸۰﴾ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾ وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۗ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۸۲﴾ ع

ترجمہ:- اور بہرحال وہ لڑکا، پس تھے اُس کے ماں باپ دونوں ایماندار، پس ہم نے معلوم کیا کہ ڈال دے گا وہ اُن دونوں کو سرکشی اور کفر میں ﴿۸۰﴾ پس ارادہ کیا ہم نے کہ تبدیل کر دے اُن کے لیے اُن کا پروردگار بہتر اس سے پاکیزگی میں اور زیادہ قریب شفقت میں ﴿۸۱﴾ اور بہرحال دیوار، پس تھی وہ دو یتیم لڑکوں کی شہر میں۔ اور تھا اُس کے نیچے خزانہ اُن کا۔ اور اُن دونوں کا باپ نیک آدمی تھا، پس ارادہ کیا تیرے پروردگار نے کہ وہ دونوں پہنچ جائیں اپنی جوانی تک اور نکال لیں اپنے خزانے کو۔ یہ

سب مہربانی ہے تیرے پروردگار کی طرف سے، اور نہیں کیا میں نے یہ کام اپنی مرضی سے۔ یہ ہے حقیقت اُس چیز کی کہ نہیں رکھتے تھے آپ اُس پر صبر کی طاقت (۸۲)

ربط آیات

خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کے تیسرے اعتراض پر کہا ھٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ وَ بَیْنِكَ اب میرے اور تمہارے درمیان جدائی ہے، البتہ پیش آمدہ تینوں واقعات کی حقیقت میں آپ پر واضح کیے دیتا ہوں۔ کشتی کے واقعہ کے متعلق فرمایا کہ وہ چند مساکین کی کشتی تھی جو کشتی کے ذریعے محنت مزدوری کر کے اپنی اور اپنے معذور بھائیوں کی پیٹ پروری کرتے تھے۔ اُن کی کشتی کو عیب دار بنانے کی وجہ یہ تھی کہ آگے ایک ظالم بادشاہ تھا جو تمام صحیح سلامت کشتیوں کو بیگار میں پکڑ رہا تھا۔ تو میں نے اس کشتی کو اس لیے توڑ دیا تاکہ یہ ظالم بادشاہ کے ہاتھوں غصب ہونے سے بچ جائے اور اُن مساکین کا ذریعہ روزگار برقرار رہے۔

قتل غلام کی حکمت

حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا دوسرا واقعہ ایک بچے کے قتل کا تھا۔ ایک بڑا اچھا بچہ دوسرے بچوں کے ہمراہ کھیل رہا تھا۔ جب ان دونوں حضرات کا وہاں سے گزر ہوا تو خضر علیہ السلام نے اُس بے گناہ بچے کا سر پکڑ کر دھڑ سے علیحدہ کر دیا۔ یہ دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام سخت گھبرائے اور بے اختیار اُن کی زبان سے نکلا کہ تو نے ایک معصوم بچے کو قتل کر دیا ہے۔ اس واقعہ کی حکمت یوں بیان کی گئی ہے۔ وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَیْنِ اور بیشک وہ بچہ کہ اس کے ماں باپ ایماندار لوگ تھے فَخَشِیْنَآ ہم نے خطرہ محسوس کیا اَنْ یُّرْهِقَهُمَا طُغْیَانًا وَّكُفْرًا کہ وہ اُن دونوں کو سرکشی اور کفر میں ڈال دے گا۔ اس بچے کے ساتھ والدین کو بڑی محبت ہے مگر وہ نہیں جانتے کہ بڑا ہو کر وہ اِن کے لیے وبالِ جان بن جائے گا اور یہ بات خود اُن کے حق میں نقصان دہ ہوگی فَاَرَدْنَآ اَنْ یُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَیْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا پس ہم نے ارادہ کیا کہ تبدیل کر دے، اُن

دونوں یعنی والدین کے لیے اس لڑکے سے بہتر پاکیزگی کے اعتبار سے اور شفقت و مہربانی میں زیادہ قربت کے لحاظ سے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ اس بچے کی بجائے اُس کے والدین کو دوسرا بہتر بیٹا عطا کرے اور اللہ کے حکم سے اس بچے کو راستے سے ہٹا دیا جائے اس بچے کے قتل کی یہ حکمت بیان کی۔

دنیا میں نیک و بد ہر طرح کے بچے پیدا ہوتے رہتے ہیں جو والدین کی نیک نامی کا باعث بھی بنتے ہیں اور بعض اپنے والدین کے لیے بدنامی اور تکلیف کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ اس قسم کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ بچوں کی وجہ سے والدین کو آرام و راحت یا تکلیف و پریشانی اٹھانا پڑی۔ تاہم اس بچے کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی خاص مصلحت تھی کہ وہ اس بچے کے والدین کو اس کے شر سے بچانا چاہتا ہے۔

صحیحین کی روایت میں آتا ہے اَمَّا الْغُلٰمُ فَطُبِعَ کَافِرًا اِس بچے کی استعداد اور صلاحیت اس قسم کی تھی کہ وہ بڑا ہو کر کافر ہی ہوتا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حکمت میں بچے کی بہتری اسی میں تھی کہ بچے کو مکلف ہونے کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دیا جائے تاکہ یہ کفر و سرکشی کی سزا سے بچ جائے اور ماں باپ کے حق میں بھی یہی بہتر تھا کیونکہ وہ بچے کے کفر کی وجہ سے خود بھی کفر میں پڑنے والے تھے مگر اللہ نے انہیں بچا لیا۔

انسان کی سرشت کے متعلق صاحب تفسیر مظہری اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کا ظہور اللہ تعالیٰ کے کسی اسم اور صفت کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ بعض لوگوں میں اللہ تعالیٰ کی صفت علم غالب ہوتی ہے اور وہ شخص عالم فاضل ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی طرح جس شخص میں صفت رحم کا غلبہ ہوتا ہے، وہ بڑا رحمدل واقع ہوتا ہے۔ گویا ایسے اشخاص

کا مبدأ تعین اللہ کی کوئی نہ کوئی صفت ہوتا ہے۔ اس مقتول بچے کا مبدأ تعین اللہ کی صفت "مُضِلّ" تھا، لہٰذا اس سے بڑا ہو کر اسی صفت کا ظہور متوقع تھا۔ یہ بچہ جوان ہو کر یقیناً کفر و گمراہی میں مبتلا ہوتا اور چونکہ والدین کو اس کے ساتھ بڑی محبت تھی، اس لیے وہ بھی اُس کے پیچھے لگ کر کفر و ضلالت کا شکار ہو جاتے۔ لہٰذا اُس کے قتل میں اللہ کی یہی حکمت کارفرما تھی کہ بچہ اور والدین دونوں سزا سے بچ گئے۔ اور اس صفتِ مُضِلّ والے بچے کی بجائے اللہ نے انہیں مومن بچہ عطا کر دیا۔

بچے کا نعم البدل

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُس مقتول بچے کی جگہ اُس کے والدین کو نیک اور اطاعت گزار بچہ عطا فرمایا۔ تاہم اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ بچے کی جگہ اللہ نے نہایت ہی صالح بچی عطا فرمائی۔ جب یہ بچی جوان ہوئی تو اس کا نکاح اللہ کے ایک نبی کے ساتھ ہوا، اور پھر اس سے آگے ایک نبی پیدا ہوا جس کی وجہ سے اللہ کی مخلوق میں سے ایک امت کو ہدایت نصیب ہوئی۔ بعض مفسرین تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ اس بچی کی نسل میں سے اللہ نے ستر نبی پیدا فرمائے۔ یہ تھا اُس مقتول بچے کا نعم البدل جس کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ ہم نے ارادہ کیا کہ اُن کا پروردگار اُن کے لیے پاکیزگی اور شفقت کے اعتبار سے بہتر بچہ تبدیل کر دے۔

لفظ خشینا کی تشریح

گذشتہ آیت کریمہ میں لفظ خَشِیْنَا اس لحاظ سے بحث طلب ہے کہ یہ خضر علیہ السلام کی طرف منسوب ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف۔ اگر یہ خضر علیہ السلام کا کلام ہو تو ظاہر ہے کہ انہیں خدشہ محسوس ہوا کہ یہ بچہ جوان ہو کر سرکشی اور کفر میں مبتلا ہو جائے گا۔ لہٰذا انہوں نے اُس کو راستے سے ہٹا دیا۔ چونکہ خَشِیْنَا اور اس آیت کا لفظ اَرَدْنَا جمع کے صیغے ہیں۔ لہٰذا ان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف معلوم ہوتی ہے ویسے

یہاں پر ادب کا تقاضا بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ جہاں کشتی کو عیب ناک بنانا مقصود تھا وہاں خضر علیہ السلام نے اس فعل کو اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے اَرَدْتُّ واحد کا صیغہ استعمال کیا کہ میں نے ایسا ارادہ کیا اور یہاں پر چونکہ فی الجملہ فساد والی اور فی الجملہ اصلاح والی دونوں باتیں ہیں۔ لہٰذا یہاں پر فَاَرَدْنَا جمع کا استعمال کیا ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ خَشِيْنَا اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اندیشہ کیا کہ بچہ والدین کو سرکشی اور کفر میں مبتلا کر دے گا۔ یہاں پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ خوف کا اطلاق مخلوق پر ہو سکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ تو ڈر خوف سے پاک ہے۔ چنانچہ مفسرین کرام خشیت کا اطلاق علم پر کرتے ہیں کیونکہ علم کا نتیجہ ہی خشیت ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے خَشِيْنَا کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم جانتے تھے کہ یہ بچہ جوان ہو کر والدین کو سرکشی میں ڈال دے گا۔ اس لیے ہم نے ارادہ کیا کہ اس کو ہٹا کر اس کا بہتر نعم البدل عطا کیا جائے۔ امام ابن جریرؒ اور صاحب مجمع البحرین وغیرہ کہتے ہیں فَخَشِيْنَا کا معنیٰ فَكَرِهْنَا ہے یعنی ہم نے اس بات کو ناپسند کیا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر اپنے ماں باپ کو سرکشی میں مبتلا کر دے لہٰذا ہم نے اس کی بجائے مومن بچہ عطا کرنے کا فیصلہ کیا۔

موسیٰؑ کے لیے تنبیہ

کسی شخص کا قتل بہت بڑا گناہ ہے مگر خضر علیہ السلام کے ہاتھوں بچے کا قتل موسیٰ علیہ السلام کے بھی حسب حال ہے۔ ایسا ہی قتل آپ کے ہاتھوں سے بھی ہوا تھا۔ جب ایک قبطی ایک بنی اسرائیل سے جھگڑ رہا تھا تو موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کو ایک مکا مارا جس سے وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ اگرچہ یہ قتلِ خطا تھا۔ مگر فرعون کے مظالم کے

خوف سے موسیٰ علیہ السلام گھبرا گئے اور مصر چھوڑ کر مدین چلے گئے۔ تو اس
بچے کے قتل کا واقعہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے تنبیہ بھی ہے کہ آپ نے
بھی تو ایک قبطی کو قتل کر دیا تھا، پھر بھلا خضر علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہونے
پر کیسے اعتراض کر دیا؟ آگے سورۃ القصص میں آتا ہے کہ قتل کرنے
کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ
یہ تو شیطانی حرکت ہے۔ ارادہ تو ایک مظلوم کے ساتھ خیر خواہی کا تھا۔
مگر قتل ہو گیا۔ خضر علیہ السلام نے اس بچے کو بھی اس کے والدین اور خود
اسکی خیر خواہی کے طور پر قتل کیا تھا۔ مگر یہاں پر موسیٰ علیہ السلام نے فوراً اعتراض کر دیا
اور انہیں اپنا قتل یاد نہ آیا۔ بہر حال اس واقعہ میں بھی موسیٰ علیہ السلام کی تربیت
اور تنبیہ مقصود تھی۔

دیوار کی درستگی کی حکمت

تیسرا واقعہ ایک بستی میں دیوار کی درستگی کے متعلق تھا۔ جب موسیٰ
اور خضر علیہما السلام اس بستی میں پہنچے تو انہیں بھوک لگ رہی تھی انہوں
نے بستی والوں سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے مہمان نوازی سے انکار
کر دیا۔ اسی بستی میں ایک شکستہ دیوار پر نظر پڑی جو گرنا ہی چاہتی تھی۔ خضر
علیہ السلام نے ہاتھ سے پکڑ کر اس دیوار کو سیدھا کر دیا۔ یہ دیکھ کر موسیٰ
علیہ السلام خاموش نہ رہ سکے اور فوراً بول اٹھے، آپ نے ان بے مروت
لوگوں کے ساتھ یہ احسان کیسے کر دیا جنہوں نے آپ کو کھانا بھی مہیا
نہیں کیا۔ آپ تو اس دیوار کی درستگی پر اجرت لے سکتے تھے۔ اس پر خضر
علیہ السلام نے دیوار کی درستگی کی یہ حکمت بیان کی وَاَمَّا الْجِدَارُ
فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ اور بہر حال
وہ دیوار شہر میں دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی۔ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ
لَّهُمَا اور اس دیوار کے نیچے ان یتیموں کا خزانہ تھا۔ تفسیر ہی ہے کہ

سونا چاندی زیر زمین دفن تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہاں کوئی تختی مدفون تھی جس پہ نصیحت کی بعض باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ بہر حال وہ مالی لحاظ سے یا پند و نصائح کے اعتبار سے قیمتی چیز تھی۔ راجح بات یہی ہے کہ سونا یا چاندی تھی۔ یا سونے کی تختی تھی۔ اگر وہ دیوار گر جاتی تو خزانہ ظاہر ہو جاتا اور یتیم بچوں کا مال گاؤں کے دوسرے لوگ ہتھیا لیتے۔

اور دوسری بات یہ تھی وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا اور ان دو یتیموں کا باپ نیک آدمی تھا اس کی نیکی کے صلہ میں فَأَرَادَ رَبُّكَ أَن يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا پس تیرے پروردگار نے ارادہ کیا کہ دونوں بچے سن بلوغت کو پہنچ جائیں وَيَسْتَخْرِجَا كَنزَهُمَا اور وہ اپنا خزانہ خود نکال لیں۔ اَشُدّ کی ایک منزل تو بلوغت سے جب آدمی ذرا سیانا ہو کر شرعی طور پر مکلف ہو جاتا ہے۔ البتہ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ پچیس سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد یتیم کا مال اس کے سپرد کر دینا چاہیئے خواہ وہ بے سمجھ ہی ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ چالیس سال کی عمر تک انتظار کرنا چاہیئے۔ کیونکہ انسان کو عقل اور قوت اس عمر میں جا کر حاصل ہوتی ہے۔

سونا چاندی زمین میں پیدائشی طور پر پایا جائے یا بعد میں دفن کیا گیا ہو۔ کنز ہی کہلاتا ہے۔ پھر جب وہ برآمد ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ کا خاص حکم لاگو ہوتا ہے جسے خمس کہا جاتا ہے یعنی کل مال کے چار حصے خزانے کے مالک کے ہوں گے اور پانچواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کیا جائے گا۔

والدین کی نیکی کا صلہ

جیسا کہ اس واقعہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے یتیم بچوں کے خزانہ کی حفاظت کا بندوبست ان کے باپ کی نیکی کے صلہ میں کیا۔ یہی قانون ہمارے لیے بھی نافذ العمل ہے۔ اگر کوئی نیک آدمی ہو تو اس کی اولاد کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیئے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ نیک آدمی

کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے اہل خاندان بلکہ ارد گرد کے رہنے والے لوگوں کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ ایک خارجی اور امام حسینؓ کی کسی موقع پر گفتگو شنید ہو گئی۔ امام حسینؓ نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان یتیم بچوں کے مال کی حفاظت کیوں کی تو خارجی نے جواب دیا کہ ان کے باپ کی نیکی کی وجہ سے۔ امام حسینؓ نے فرمایا کہ ان یتیموں کے والدین کی نسبت میرے والدین نیکی میں بڑھے ہوئے ہیں، پھر تم ان کی مخالفت کیوں کرتے ہو اور ہمارا خیال کیوں نہیں رکھتے؟ اس شخص سے کچھ جواب نہ بن پڑا تو کہنے لگا۔ تم خاندانِ قریش کے لوگ بڑے جھگڑالو واقع ہوئے ہو۔

خضر مامور من اللہ تھے

فرمایا ان یتیم بچوں کے ساتھ خضر علیہ السلام کی خیر خواہی رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ تیرے پروردگار کی مہربانی تھی۔ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي اور خیر خواہی کا یہ کام میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا۔ بلکہ یہ تو میں نے اللہ کے حکم سے کیا ہے کیونکہ اس کے حکم کا پابند ہوں۔ اسی طرح کشتی کی شکستگی اور بچے کے قتل میں بھی اللہ تعالیٰ ہی کا حکم کارفرما تھا کیونکہ میں تو مامور من اللہ ہوں۔ اس کے بعد خضر علیہ السلام نے فرمایا ذٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا یہ ہے حقیقت ان امور کی جن پر صبر کرنے کی آپ طاقت نہیں رکھتے تھے۔ اگرچہ یہ تینوں کام بظاہر خلاف واقع تھے مگر ان کی حقیقت کو اللہ ہی جانتا تھا اور اسی کے حکم سے میں نے یہ کام انجام دیئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کے علوم میں فرق تھا۔ صحیحین کی حدیث میں آتا ہے کہ خضر علیہ السلام نے کہا یَا مُوْسٰی اِنِّیْ عَلٰی عِلْمٍ مِّنْ عِلْمِ اللّٰهِ عَلَّمَنِیْهِ لَا تَعْلَمُهٗ اَنْتَ وَاَنْتَ عَلٰی عِلْمٍ مِّنْ عِلْمِ اللّٰهِ عَلَّمَكَ اللّٰهُ لَا اَعْلَمُهٗ اے موسیٰ! اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک علم دیا ہے جسے آپ نہیں جانتے اور اللہ نے آپ کو ایک علم دیا

ہے جسے میں نہیں جانتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے جسے جو چاہے دے دے
دونوں انبیاء کے محکمے الگ الگ تھے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام
کو شریعت کا علم عطا فرمایا تھا جب کہ خضر علیہ السلام کے پاس تکوینیات
کا محکمہ تھا اور آپ اسی سلسلے میں اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ
مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿٨٣﴾ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِى الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ
مِنْ كُلِّ شَىْءٍ سَبَبًا ﴿٨٤﴾ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٥﴾ حَتّٰٓى اِذَا
بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِىْ عَيْنٍ
حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ
اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿٨٦﴾
قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى
رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿٨٧﴾ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ
صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ
اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿٨٨﴾

ترجمہ:- اور لوگ آپ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں
آپ کہہ دیجئے کہ میں پڑھ کر سناتا ہوں تمہیں اس کا کچھ
ذکر (۸۳) بیشک ہم نے قدرت دی اس کو زمین میں، اور
دیا ہم نے اس کو ہر ایک چیز سے سامان (۸۴) پس چلا وہ
ایک راستے پر (۸۵) یہاں تک کہ جب وہ پہنچا سورج
غروب ہونے کی جگہ پر، تو پایا اس کو کہ وہ غروب ہوتا
ہے ایک سیاہ ندی میں۔ اور پایا اس نے اس کے پاس

ایک قوم کو۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین ! یا تم ان کو سزا دو اور یا ان میں نیکی پکڑو (۸۶) اس نے کہا جس شخص نے ظلم کیا پس عنقریب ہم اس شخص کو سزا دیں گے۔ پھر وہ لوٹایا جائے گا اپنے پروردگار کی طرف۔ وہ اس کو سزا دیگا سخت سزا (۸۷) اور جو شخص ایمان لایا اور اس نے اچھا عمل کیا، پس اس کے لیے بدلہ ہے اچھا۔ اور ہم بھی کہیں گے اس کے لیے اپنے معاملہ میں آسانی کی بات (۸۸)

تین واقعات تین اصول

یہ بات گذشتہ سورۃ اور اس سورۃ کے مضامین کے سلسلہ میں بیان ہو چکی ہے کہ مشرکین مکہ نے یہودیوں کے ایماء پر حضور علیہ السلام سے تین سوال کیے تھے۔ پہلا سوال روح کے بارے میں تھا۔ جس کا مختصر جواب اللہ تعالیٰ نے سورۃ بنی اسرائیل میں دیا ہے۔ باقی دو سوالات اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق تھے جن میں سے اصحاب کہف کی تفصیل اسی سورۃ کی ابتداء میں بیان ہو چکی ہے اور ذوالقرنین کے متعلق بعض انکشافات اب آ رہے ہیں۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سورۃ میں مذکور تین واقعات میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے تین بنیادی قوانین بیان فرمائے ہیں۔ اصحاب کہف کے واقعہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہمیں استقلال کا قانون سمجھایا ہے۔ اللہ کی وحدانیت پر ایمان لانے والے اصحاب کہف اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے اور نہایت بے سروسامانی کی حالت میں ایک غار میں پناہ گزین ہو گئے۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہر ایماندار شخص کو اصحاب کہف کے واقعہ سے استقلال کی تعلیم حاصل کر کے ایمان کے سلسلے میں ہمیشہ مستقل مزاج رہنا چاہیے۔ جس طرح اللہ نے اصحاب کہف کی حفاظت فرمائی اسی طرح وہ ہر استقلال اختیار کرنے والے شخص کی مدد فرمائے گا۔

دوسرا واقعہ حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا بیان ہوا ہے جس میں ہمارے لیے صبر کی تلقین ہے۔ انسان کو چاہیے کہ ناقابل فہم اور ناقابل برداشت امور میں صبر کا دامن تھامے رکھے۔ مذکورہ واقعہ میں موسیٰ علیہ السلام کو بڑی پریشانی اٹھانا پڑی۔ انہوں نے ہر چند برداشت کرنے کی کوشش کی مگر وہ خضر علیہ السلام کی رفاقت کو قائم نہ رکھ سکے۔ خضر علیہ السلام نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ میری معیت میں عجیب وغریب واقعات دیکھ کر صبر نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ ان تین واقعات کے علاوہ موسیٰ علیہ السلام مزید معلومات حاصل نہ کر سکے اور دونوں حضرات میں جدائی واقع ہو گئی۔ گویا اس واقعہ میں ہمارے لیے سبق یہ ہے کہ ہم صبر کا دامن کبھی نہ چھوڑیں۔ اسی طرح ذوالقرنین کے واقعہ میں ہمیں شکر کی تلقین کی گئی ہے جس طرح ذوالقرنین نے خدا تعالیٰ کی طرف سے انعامات پا کر اس کا شکر ادا کیا، اسی طرح ہمیں بھی ہمیشہ شکر کا التزام کرنا چاہیے۔

ذوالقرنین کا تعارف

ارشاد ہوتا ہے وَيَسْـَٔلُونَكَ عَن ذِى ٱلْقَرْنَيْنِ اے پیغمبر! لوگ آپ سے ذوالقرنین کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ وہ کون تھا اور اس نے کیا کارگزاری انجام دی؟ ذوالقرنین کی شخصیت کے متعلق لوگوں کے نظریات مختلف ہیں۔ بعض نے کہا کہ ذوالقرنین سے مراد سکندر یونانی ہے جس نے تیس پینتیس برس کی عمر میں آدھی دنیا کو فتح کر لیا تھا۔ تاریخ میں اس کا ذکر کثرت سے ملتا ہے اس کا وزیر ارسطاطالیس (ارسطو) تھا۔ یہ بہت بڑا حکیم تھا۔ منطق کا موجد تھا۔ اخلاق اور سیاسیات میں اس کی تصنیفات بڑی مشہور ہیں۔ ارسطو افلاطون کا شاگرد تھا۔ یہ سکندر ابن فیلقوس مسیح علیہ السلام سے تقریباً سوا تین سو سال پہلے گزرا ہے۔ تاریخ میں آتا ہے کہ یہ ٹیکسلا اور جہلم تک بھی آیا تھا۔ اس شخص پر ذوالقرنین کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ آدمی مشرک تھا۔

جب کہ جس ذوالقرنین کا ذکر قرآن پاک نے کیا ہے وہ مومن اور نیک آدمی تھا۔ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا تھا۔ اس نے خانہ کعبہ کا طواف بھی کیا۔ یہ سب تفسیری روایات میں آتا ہے۔ قرآن و حدیث سے یہ تفصیلات نہیں ملتیں۔ اس قیاس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ذوالقرنین سے مراد سکندر یونانی نہیں بلکہ ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کے قریب پیدا ہونے والا سکندر اول ہے

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین سے مراد ایرانی سلطنت کا بانی کیخسرو ہے جسے سائرس بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کے قریب گزرا ہے۔ اس کو ذوالقرنین اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے فارس اور میڈیا کی دو سلطنتوں کو یکجا کر دیا تھا مفسرین یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس شخص کی پیش گوئی پہلے انبیاء کی کتابوں میں بھی موجود تھی۔ وہاں بھی اسے دو سینگوں والا ہی کہا گیا تھا گویا یہ ایسا بادشاہ ہوگا کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ بعض مفسرین فریدون بادشاہ کا نام بھی لیتے ہیں جس کا ذکر فارسی تاریخ میں ملتا ہے بعض کہتے ہیں کہ ذو کا لقب عام طور پر یمن کی قوم تبع کے ساتھ لگتا ہے لہذا ہو سکتا ہے کہ اسی قوم کا کوئی بادشاہ ہو۔

ان تمام شواہد کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ ذوالقرنین سے مراد سکندر یونانی نہیں بلکہ ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کا سکندر اول ہے۔ بعض نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ شاید یہ نبی تھا مگر اکثر مفسرین نے اسے نبی کی بجائے نیک اور صالح انسان کہا ہے بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دنیا میں چار بادشاہ ایسے گزرے ہیں جنہیں مجموعی طور پر ساری دنیا پر تسلط حاصل رہا ہے ان میں سے دو بادشاہ کافر اور دو ایماندار تھے۔ پہلا بادشاہ ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کا نمرود تھا اور دوسرا بخت نصر تھا جس نے یہودیوں پر غلبہ حاصل کیا تھا۔ یہ دونوں کافر تھے۔ البتہ ایماندار بادشاہوں میں ایک سکندر

ذوالقرنین ہیں جن کا ذکر ہو رہا ہے اور دوسرے حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے مثالی حکومت کے لیے اس طرح دعا کی تھی ۔
هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ
(ص - ۳۵) یا اللہ ! مجھے ایسی حکومت عطا فرما ، جو میرے بعد کسی دوسرے کے حصے میں نہ آئے ۔ چنانچہ اللہ نے آپ کو ایسی ہی سلطنت عطا فرمائی ۔

قرنین کی وجہ تسمیہ

قرنین کا لغوی معنی ! دو سینگ ہیں ۔ اس کی ایک وجہ تو پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اس شخص نے فارس اور میڈیا کی دو سلطنتوں کو جوڑ کر ایک کر دیا تھا بعض فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ شخص دنیا کے دونوں مشرقی اور مغربی کناروں تک پہنچا اس لیے ذوالقرنین کہلایا ۔ بعض کہتے ہیں کہ قرن ایک صدی یا سنگت کو کہتے ہیں ۔ کسی قوم کی مجموعی عمر کو بھی قرن کہتے ہیں ۔ ذوالقرنین نے لمبی عمر پائی جس کے دوران میں دو صدیاں یا دو نسلیں گزر گئیں ، اس لیے اُسے ذوالقرنین کا لقب دیا گیا ۔

ذوالقرنین پر انعامات

ارشاد ہوتا ہے وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ آپ سے ذوالقرنین کے متعلق پوچھتے ہیں ۔ قُلْ اے پیغمبر ! آپ کہہ دیجئے سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا میں تم کو اس کا کچھ حال پڑھ کر سناتا ہوں ۔ اللہ نے فرمایا اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ ہم نے اُسے زمین میں ٹھکانا دیا ، یعنی اس کو خوب اقتدار عطا کیا وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا اور اُسے ہر قسم کا ساز و سامان بھی وافر دیا ۔ سبب سے مراد رسی بھی ہوتی ہے اور وسیلہ یا تعلق بھی ۔ اس سے راستہ بھی مراد لیا جاتا ہے ، آگے راستہ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے ۔ اس کا اطلاق سامان پر بھی ہوتا ہے ، اس میں علم بھی داخل ہے کیونکہ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جس چیز کے ذریعے انسان اپنے مقصود تک پہنچتا ہے ، وہ

سبب کہلاتا ہے اور اس میں ہر وہ چیز جیسے آلات اور علم بھی شامل ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو وہ تمام ضروریات فراہم کر دی تھیں جن کے ذریعے اتنی وسیع سلطنت کا انتظام و انصرام کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال کُلِّ شَیْءٍ سے مراد کائنات کی ہر بڑی چھوٹی چیز مراد نہیں بلکہ وہ تمام اشیا مراد ہیں جو اس زمانے کی ضروریاتِ مملکت کے لیے مطلوب تھیں۔

مغربی سفر

جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے، ذوالقرنین نے اپنی زندگی میں تین طویل سفر کیے۔ یہاں پہ پہلے مغربی سفر کا ذکر ہو رہا ہے۔ فَاَتْبَعَ سَبَبًا پھر وہ ایک راستے پر چلا۔ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ یہاں تک کہ جب وہ سورج غروب ہونے کی جگہ پر پہنچا وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ تو اسے ایک سیاہ ندی میں غروب ہوتا پایا۔ وہاں کا پانی اور مٹی سیاہ رنگ کی تھی۔ بعض نے اس سے بحرہ اسود مراد لیا ہے جس کی سرحد روس اور ترکی کے ساتھ ملتی ہے اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ سورج سیاہ دلدل میں ڈوب رہا ہے ایک قرأت میں عَیْنٍ حَامِئَةٍ بھی پڑھا گیا ہے جس کا مطلب گرم چشمہ ہے۔

دراصل سورج تو کہیں غروب نہیں ہوتا بلکہ اپنی منزل پر چوبیس گھنٹے اور بارہ مہینے رواں دواں رہتا ہے۔ اللہ نے سورج اور چاند کے متعلق فرمایا ہے کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (یونس-۴۰) سب اپنے اپنے مدار میں چل رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ زمین کا جو حصہ سورج کے سامنے آجاتا ہے، وہاں سورج طلوع ہوتا نظر آتا ہے اور جو حصہ زمین سورج کی دوسری طرف جا رہا ہوتا ہے، وہاں سورج غروب ہوتا نظر آتا ہے۔ انسان دنیا کے کسی بھی خطے میں موجود ہو اسے وہیں سورج طلوع اور غروب ہوتا نظر آئے گا اگر وہ کسی صحرا میں ہے تو وہ سورج کو زمین میں غروب ہوتا پائے گا اور اگر وہ سمندر کے کنارے پر

ہے یا سمندر میں سفر کر رہا ہے تو اُسے سورج پانی میں ڈوبتا نظر آئے گا۔ جب حاجی کراچی اور جدہ کے درمیان بحیرہ عرب کا بحری سفر اختیار کرتے ہیں تو وہ ہر روز سورج کو سمندر سے طلوع ہوتا اور اسی میں غروب ہوتا دیکھتے ہیں۔ بہرحال ذوالقرنین مغرب کی طرف چلتے چلتے ایسے مقام تک پہنچ گیا۔ جہاں کوئی ندی تھی یا بحر اسود تھا اس نے دیکھا کہ سورج پانی میں غروب ہو رہا ہے حَمِئَةٍ سے دلدل بھی مراد لی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں سیاہ رنگ کی دلدل ہو۔

مفسد قوم سے سلوک

جب ذوالقرنین اس مقام پر پہنچا وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا تو وہاں اس نے کچھ لوگوں کو پایا۔ یہ لوگ ایماندار نہیں تھے بلکہ سرکش اور فسادی تھے۔ اُن کی زبان اور معاشرت بھی مختلف تھی۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ وحشی قسم کے لوگ تھے جو چمڑے کا لباس پہنتے تھے اور مفسدے کی برائی میں مبتلا تھے۔ جب وہاں پہنچے تو اللہ نے فرمایا قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ، ہم نے کہا اے ذوالقرنین إِمَّآ أَنْ تُعَذِّبَ یا تو تم ان کو سزا دو وَإِمَّآ أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا اور یا ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ مفسد لوگوں کو اُن کی بری کارگزاری کی سزا بھی دی جا سکتی ہے اور بعض اوقات اگر اُن کے ساتھ حسن سلوک اختیار کیا جائے تو تب بھی وہ برائی سے باز آ جاتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو اختیار دیدیا کہ ان کے ساتھ جو چاہو سلوک کرو۔ قَالَ ذوالقرنین نے کہا أَمَّا مَنْ ظَلَمَ جو شخص ظلم کرے گا فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ تو ہم اُس کو سزا دیں گے کفر، شرک، ظلم اور تعدی کرنے والوں کو سزا دی جا سکتی ہے۔ یہ اصول بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ تعدی کرنے والوں کو معاف نہ کیا جائے۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اجتماعی نظام کے لیے ضروری ہے کہ اچھے لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے اور بدمعاشوں کی سرکوبی کی جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا۔

تو نظام سلطنت بگڑ جائے گا اور ملک میں بدامنی پیدا ہو جائیگی۔ البتہ انگریزی
قانون میں اِس اصول کی پابندی نہیں کی جاتی۔ وہاں تو مفاد کو دیکھا جاتا ہے
کہ وہ کس طرف ہے۔ بعض اوقات مفاد کی خاطر غنڈوں کو بھی سہولتیں
فراہم کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں فتنہ و فساد کا بازار گرم ہے
بہرحال سکندر ذوالقرنین نے کہا کہ ہم ہر ظالم کو اُس کے ظلم کی سزا دیں گے
ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ پھر وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا جائیگا۔
فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُّكْرًا پھر وہ اُس کو سخت سزا دے گا جب
آخرت میں خدا کی عدالت میں پیش ہو گا تو وہاں کا عذاب بھی چکھنا پڑیگا
ذوالقرنین نے کہا کہ دنیا کے قانون کی خلاف ورزی پر تو ہم سزا دیں گے
مگر حقیقی اور آخری سزا خدا تعالیٰ دے گا۔

اہل ایمان کے لیے جزا

ذوالقرنین نے یہ بھی کہا وَأَمَّا مَنْ آمَنَ اور جو شخص ایمان
لائے گا وَعَمِلَ صَالِحًا اور اچھے اعمال انجام دے گا۔ اچھے اعمال
میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج عبادات اربعہ ہیں۔ اس کے علاوہ جہاد،
قربانی، صدقہ، خیرات، سماحت، عدل وغیرہ سب نیک افعال ہیں۔
جن کو انجام دینے سے انسان نجات کا مستحق بنتا ہے۔ تاہم ان سب
اعمال کا مدار ایمان پر ہے کہ انسان اللہ کی وحدانیت پر ایمان لائے۔ اس کے
رسولوں، ملائکہ، کتب کو برحق مانے۔ تقدیر اور معاد پر یقین کرے۔ ایسا
شخص مومن ہوگا۔ اور اعمال صالحہ کی انجام دہی پر اللہ تعالیٰ کے ہاں بہتر اجر
کا مستحق ہوگا۔ فرمایا فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَىٰ اُس کے لیے اچھا بدلہ
ہوگا۔ اُس کا احترام کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کی نیکی کو ضائع نہیں
کرتا۔ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا اور ہم اپنے معاملہ
میں اُس کے لیے آسان بات کہیں گے۔ نیک اور ایماندار آدمی کے ساتھ
حسن سلوک ہی روا ہے۔ نیک شخص کے ساتھ بدسلوکی کرنا ظلم کے مترادف ہے

چنانچہ سکندر ذوالقرنین نے بھی یہی کہا کہ ایماندار اور نیک آدمی کے ساتھ ہم بھی آسانی کریں گے اور سرکش کو ضرور سزا دیں گے۔

ثُمَّ اَتۡبَعَ سَبَبًا ﴿٨٩﴾ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَطۡلِعَ الشَّمۡسِ وَجَدَهَا تَطۡلُعُ عَلٰی قَوۡمٍ لَّمۡ نَجۡعَلۡ لَّهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهَا سِتۡرًا ﴿٩٠﴾ کَذٰلِکَ ؕ وَ قَدۡ اَحَطۡنَا بِمَا لَدَیۡهِ خُبۡرًا ﴿٩١﴾ ثُمَّ اَتۡبَعَ سَبَبًا ﴿٩٢﴾ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ بَیۡنَ السَّدَّیۡنِ وَجَدَ مِنۡ دُوۡنِهِمَا قَوۡمًا ۙ لَّا یَکَادُوۡنَ یَفۡقَهُوۡنَ قَوۡلًا ﴿٩٣﴾ قَالُوۡا یٰذَا الۡقَرۡنَیۡنِ اِنَّ یَاۡجُوۡجَ وَ مَاۡجُوۡجَ مُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَهَلۡ نَجۡعَلُ لَکَ خَرۡجًا عَلٰۤی اَنۡ تَجۡعَلَ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَهُمۡ سَدًّا ﴿٩٤﴾

ترجمہ:- پھر وہ چلا ایک راستے پر (٨٩) یہاں تک کہ جب وہ پہنچا سورج نکلنے کی جگہ پر، پایا اس نے سورج کو کہ طلوع کرتا ہے ایسے لوگوں پر کہ نہیں بنایا ہم نے اُن کے لیے اُس (سورج) کے سامنے کوئی حجاب (٩٠) اسی طرح تھا (یہ معاملہ) اور تحقیق ہم نے احاطہ کیا اُس چیز کا جو اس کے پاس تھی خبر (٩١) پھر وہ چلا ایک راستے پر (٩٢) یہاں تک کہ جب وہ پہنچا دو پہاڑوں کے درمیان پایا اُن دونوں کے ورے ایک قوم کو، نہیں قریب تھے کہ وہ سمجھتے بات کو (٩٣) انہوں نے کہا اے ذوالقرنین! بیشک اقوام

یاجوج ماجوج فساد کرتے ہیں زمین میں۔ پس کیا ہم مقرر
کر دیں آپ کے لیے کوئی خراج اس پر کہ آپ بنا دیں
ہمارے درمیان اور اُن کے درمیان ایک رکاوٹ (۹۴)

ذوالقرنین کا مشرقی سفر

ذوالقرنین کے تین سفروں میں سے مغربی سفر کا حال گزشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے۔ اب آج کے درس میں مشرقی اور شمالی سفر کا حال بیان ہو رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا پھر وہ ایک راستے پر چلا جو کہ مشرق کی طرف تھا۔ تفسیری روایات کے مطابق یہ سفر بارہ سال میں مکمل ہوا۔ واللہ اعلم کم و بیش عرصہ بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالے نے ذوالقرنین کو خاص فضیلت بخشی تھی اور خصوصی قوت بھی عطا ہوئی۔ آپ سے خرق امور معجزانہ طور پر بھی سرزد ہوتے۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ یہ سفر کم تر عرصہ میں طے ہو گیا ہو۔ اللہ نے اس کی توفیق اپنی قدرت اور حکمت کے مطابق بخشی تھی۔ بہرحال انہوں نے مشرق کی طرف سفر اختیار کیا حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ یہاں تک کہ جب وہ سورج نکلنے کی جگہ پر پہنچا۔ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا وہاں اس نے پایا کہ سورج ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتا ہے کہ نہیں بنایا ہم نے اُن کے اور سورج کے درمیان کوئی حجاب۔ مطلب یہ ہے کہ وہ قوم بالکل بے حجاب تھی۔ انہوں نے کوئی مکان نہیں بنا رکھے تھے اور نہ وہ کسی پہاڑ وغیرہ کی آڑ میں زندگی بسر کرتے تھے۔ سورج کی تپش براہ راست اُن لوگوں کے اجسام پر پڑتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ مغربی لوگوں کی طرح یہ مشرقی لوگ بھی غیر متمدن ہوں۔ مغربی لوگوں کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو اختیار دے دیا تھا کہ چاہے تو اُن کو سزا دے دے یا اُن کے ساتھ رعایت برتے۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ مشرق کے رہنے والے بھی غیر متمدن ہوں اور مکان وغیرہ بنانے کی وہ ضرورت ہی محسوس نہ کرتے ہوں یا سکانیت کا وہاں رواج ہی نہ ہو۔

بعض کہتے ہیں کہ اس قوم کے لوگوں نے زیر زمین پناہ گاہیں بنا رکھی تھیں جب

سورج کی دھوپ تیز ہوتی تو ان پناہ گاہوں میں چلے جاتے۔ بعض کہتے ہیں کہ شدت کی گرمی کے دوران یہ لوگ پانی میں داخل ہو جاتے، جیسے بھینسیں وغیرہ پانی میں چلی جاتی ہیں اور جب دھوپ کی شدت میں کمی واقع ہوتی تو پھر باہر نکل آتے۔ یہ سب غیر یقینی باتیں ہیں جن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ صحیح بات اتنی ہی ہے جو قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ اللہ نے فرمایا کَذٰلِكَ معاملہ ایسا ہی تھا وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا اور تحقیق ہم نے ذوالقرنین کے ساتھ پیش آنے والے تمام حالات کا احاطہ کر رکھا ہے، وہ سب کچھ ہمارے علم میں ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے ان حالات و واقعات کی مزید تفصیل نہیں بتائی۔ مشرق اور مغرب میں ذوالقرنین جن مقامات تک پہنچا، اللہ نے تمام علاقوں پر آپ کو تسلط عطا کیا تھا۔ آپ کے لقب ذوالقرنین کی ایک وجہ تسمیہ یہ بھی ہے کہ آپ دنیا کے دونوں کناروں تک پہنچے۔ قرن کا معنی سینگ بھی ہوتا ہے اور کنارہ بھی۔

ذوالقرنین کا شمالی سفر

ارشاد ہوتا ہے ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا پھر وہ ایک راستے پر چلا یعنی تیسرا سفر اختیار کیا۔ مفسرین اور مورخین اپنے اندازے سے بتاتے ہیں کہ یہ سفر بجانب شمال تھا۔ حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ یہاں تک کہ جب وہ دو پہاڑوں کے درے میں پہنچا وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا تو اس نے پہاڑوں کی اس طرف ایک قوم کو پایا لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا وہ ذوالقرنین اُن لوگوں کی بات سمجھتے تھے اور نہ وہ لوگ ذوالقرنین کی زبان سے واقف تھے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اگلی آیات میں ذوالقرنین اور اس قوم کے درمیان مکالمے کا ذکر فرمایا ہے۔

ترجمان کی ضرورت

ظاہر ہے کہ یہ بات چیت کسی ترجمان کی وساطت سے ہوئی ہوگی۔ مختلف زبانیں جاننے والوں کے درمیان ترجمانی کا طریقہ قدیم زمانے سے رائج ہے اس کی مثال

حضور علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ملتی ہے۔ آپ نے دعوتِ اسلام کے جو خطوط
۶ ہجری میں مختلف سلاطین کو بھیجے تھے اُن میں ایک خط قیصرِ روم کے نام بھی
تھا جو حضور کے صحابی حضرت دحیہ ابن خلیفہ کلبیؓ کے ہاتھ بھیجا گیا۔ حضور
علیہ السلام نے دحیہ کلبیؓ کو رخصت کرتے وقت ہدایت کی تھی کہ یہ خط براہ راست
قیصر کے پاس نہ لے جانا بلکہ بصرے کے گورنر کو پیش کر کے کہنا کہ ہمارا یہ خط
قیصرِ روم تک پہنچا دو۔ دحیہؓ نے ایسا ہی کیا۔ گورنر نے وہ خط آگے قیصر کو
پہنچا دیا۔ اسی دوران قیصر اپنی نذر پوری کرنے کی خاطر عبادت کے لیے پاپیادہ
بیت المقدس گیا ہوا تھا واپسی پر اسے خط پیش کیا گیا اور خط پڑھنے کے
لیے ترجمان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ بیشتر اس کے کہ قیصر اُس خط کے
مندرجات سے آگاہی حاصل کرتا اس نے حکم دیا کہ اس کے علاقے میں اگر
کوئی عرب شخص موجود ہو تو اُسے بھی پیش کیا جائے تاکہ وہ اس سے خط
بھیجنے والے کے متعلق کچھ معلومات حاصل کر سکے۔ بادشاہ کے کارندے
فوراً قریبی شہروں میں روانہ ہو گئے تاکہ کسی عرب باشندے کو تلاش کر سکیں
اس وقت ابوسفیانؓ جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے، ایک تجارتی
قافلے کے ساتھ موجود تھے۔ شاہ کے کارندے اُن کو ساتھ لے گئے اور بادشاہ
کے دربار میں پیش کر دیا۔ بادشاہ نے ابوسفیان کی عزت افزائی کی۔ اُن کو
آگے بٹھایا اور اُن کے ساتھیوں کو پیچھے جگہ دی۔ پھر ترجمان کو بلایا گیا۔ جو عربی
اور رومی زبانوں سے واقف تھا اور ساری گفتگو اُس کے ذریعے ہوئی۔ قیصرِ روم
نے اُن اجنبیوں سے پوچھا کہ تم میں مدعیِ نبوت کے ساتھ قریبی تعلق رکھنے
والا کوئی آدمی بھی ہے۔ تو ابوسفیانؓ نے کہا کہ ہاں میں انہی کے خاندان سے
تعلق رکھتا ہوں، ہمارے پڑدادا ایک ہی تھے، نیز ابوسفیان کی بیٹی بھی حضور
علیہ السلام کے نکاح میں تھی۔ لہٰذا قربت کا یہ بھی ایک ذریعہ تھا۔ بہرحال یہ ساری
گفتگو ترجمان کے ذریعے ہوئی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین اور اُس شمالی

قوم کے درمیان گفتگو بھی کسی ترجمان کے ذریعے ہی ہوتی ہوگی کیونکہ دونوں فریق ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔

ذوالقرنین اور قوم کا معاملہ

ارشاد ہوتا ہے قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اُن لوگوں نے کہا اے ذوالقرنین! اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ بیشک اقوام یاجوج اور ماجوج زمین میں فساد کرنیوالے ہیں در اصل یاجوج ماجوج دو پہاڑوں کے درے سے اس طرف آیا کرتے تھے اور یہ قوم ادھر تھی۔ یاجوج ماجوج درے سے گزر کر اس قوم کی طرف آجاتے تھے اور یہاں آکر قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کرتے تھے۔ فصلیں تباہ کر دیتے اور جو کچھ ہاتھ آتا لے کر اپنے علاقے میں چلے جاتے۔ یہ قوم کمزور تھی اور یاجوج ماجوج کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھی لہٰذا یہ ان سے بڑے تنگ تھے۔ انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے ذوالقرنین کے سامنے اس طرح درخواست پیش کی۔ کہنے لگے اے ذوالقرنین! یہ فسادی لوگ ہیں فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا کیا ہم آپ کے لیے کوئی خراج یا ٹیکس مقرر کر دیں جو آپ کو باقاعدگی سے ادا کرتے رہیں اس کام کے عوض عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا کہ تو ہمارے اور یاجوج ماجوج کے درمیان اس پہاڑی درے میں رکاوٹ کھڑی کر دے تاکہ یہ لوگ ہماری طرف آکر ہمیں تنگ نہ کریں۔ ذوالقرنین نے اُن کی یہ درخواست قبول کر لی اور دو پہاڑوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جس کا ذکر اگلے درس میں آئے گا۔ انشاء اللہ۔

اقوام یاجوج و ماجوج

قرآن پاک میں یاجوج و ماجوج کا ذکر دو مقامات پر آیا ہے پہلا مقام تو یہی سورۃ الکہف ہے اور دوسرا مقام سورۃ الانبیاء میں ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے قیامت کی نشانی کے طور پر یاجوج ماجوج اقوام کا تذکرہ کیا ہے مفسرین اور مورخین نے ان اقوام کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے مگر صحیح

بات وہی ہے جو یا قرآن پاک میں آگئی ہے یا حضور علیہ السلام کے ارشادات میں ملتی ہے۔ باقی باتیں یا تو بالکل ڈھکوسلے ہیں یا پھر غیر یقینی ہیں۔ تاہم اتنا یقینی ہے کہ یاجوج وماجوج کا تعلق نسلِ انسانی سے ہے۔ کعب احبار کی روایت کے مطابق ان اقوام کا سلسلہ نسب حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچتا ہے مگر ان کا تعلق حضرت حوا سے قائم نہیں ہوتا۔ زیادہ صحیح اور راجح بات یہ ہے کہ یہ لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث کی اولاد سے ہیں اور اس طرح ان کا سلسلہ نسب آدم اور حوا دونوں تک پہنچتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت سے پہلے ساری دنیا پر یاجوج ماجوج کا غلبہ ہوگا۔ یہ لوگ بڑی تباہی مچائیں گے۔ حضور علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق کسی وبائی مرض (طاعون وغیرہ) میں مبتلا ہو کر ایک دم ہی ہلاک بھی ہو جائیں گے۔ کتاب الایمان میں حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد بھی موجود ہے کہ عام انسان اور اقوام یاجوج ماجوج کی آبادی کا تناسب ایک اور نو سو ننانوے (۹۹۹) کا ہے یہ تمام لوگ کفر و شرک میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جہنمی ہوں گے۔

اس آیت میں مذکورہ دو پہاڑوں اور ان کے درمیان درے کے مقام وقوع کے متعلق بھی بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بحر اخضر کے قریب یہ وہ جگہ ہے جو باب الابواب یا دربند کے نام سے مشہور ہے اس زمانے میں ایسی تعمیر بعض دوسرے بادشاہوں سے بھی ثابت ہے جیسے چینیوں نے پندرہ سو میل لمبی مشہور دیوار چین تعمیر کر لی تھی۔ بہرحال یاجوج ماجوج اور ان پہاڑوں کے محلِ وقوع کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ اقوام اس وقت نظروں سے اوجھل ہیں اور ان کا ظہور قیامت کے قریبی زمانے میں ہوگا۔ اس زمانے میں لوگ کہتے ہیں کہ آج کے سائنسی دور میں دنیا کا کوئی گوشہ نظروں سے اوجھل نہیں رہا مگر یاجوج وماجوج کہیں نظر نہیں آئے، تو یہ کوئی حتمی بات نہیں ہے

اگر اللہ تعالیٰ کسی چیز کو مخفی رکھنا چاہے تو وہ قادر مطلق ہے۔ ایسا کر سکتا ہے
تفسیری روایات کے مطابق یاجوج ماجوج چار ہزار اقوام پر مشتمل ہیں۔ ان میں
سے ہر مرنے والا شخص اپنے پیچھے کم از کم ایک ہزار قابل جنگ آدمی چھوڑ جاتا
ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان اقوام کی تعداد کس قدر کثرت
میں ہے۔ اب اگلی آیات میں ذوالقرنین کے بند باندھنے کا ذکر آرہا ہے

قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿٩٥﴾ آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انفُخُوا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿٩٦﴾ فَمَا اسْطَاعُوا أَن يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ﴿٩٧﴾ قَالَ هَٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّي ۖ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ ۖ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا ﴿٩٨﴾ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ ۖ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا ﴿٩٩﴾ وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكَافِرِينَ عَرْضًا ﴿١٠٠﴾ الَّذِينَ كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاءٍ عَن ذِكْرِي وَكَانُوا لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا ﴿١٠١﴾ ع

ترجمہ :- کہا (ذوالقرنین نے) جو اللہ نے مجھے قدرت دی ہے وہ بہتر ہے ، پس تم تعاون کرو میرے ساتھ جسمانی محنت کے ساتھ تاکہ میں بنادوں تمہارے درمیان اور اُن (یعنی یاجوج و ماجوج) کے درمیان ایک دیوار (۹۵) لاؤ مجھے لوہے کے تختے ، یہاں تک کہ جب

برابر کر دیا دو پہاڑوں کے درمیان بالائی حصے تک، تو کہا اُس نے پھونکو اس کو، یہاں تک کر جب کر دیا اُس کو آگ (کی طرح) تو کہا لاؤ میرے پاس کہ ڈال دوں میں اس پر پگھلا ہوا تانبا (۹۶) پس نہ طاقت رکھی انہوں نے کہ چڑھ جائیں اُس پر اور نہ طاقت رکھی انہوں نے اس میں سوراخ کرنے کی (۹۷) کہا اُس نے کہ یہ مہربانی ہے میرے رب کی۔ پس جب آئے گا میرے رب کا وعدہ، کر دے گا اس کو گرا کر ٹکڑے ٹکڑے۔ اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے (۹۸) اور ہم چھوڑیں گے بعض کو اس دن کہ وہ ایک دوسرے میں گھس رہے ہوں گے۔ اور پھونکا جائے گا صور میں۔ پس ہم جمع کریں گے ان سب کو (۹۹) اور ہم پیش کریں گے جہنم اُس دن کافروں کے لیے پیش کرنا (۱۰۰) وہ کہ جن کی آنکھوں میں پردے تھے میری یاد سے اور وہ نہیں سن سکتے تھے (ہماری آیات) (۱۰۱)

بند باندھنے کی پیش کش

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ جب سکندر ذوالقرنین انتہائی شمال میں ایک قوم کے پاس پہنچے تو اُن لوگوں نے شکایت کی کہ اس پہاڑی درے سے اُس طرف یاجوج ماجوج کی اقوام ہیں جو اس درے سے گذر کر ہمیں تنگ کرتے ہیں، لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہمارے اور اُن کے درمیان اس درے میں دیوار کھڑی کر دیں تاکہ وہ اِدھر نہ آسکیں۔ انہوں نے اس کام کے لیے معاوضے کی پیش کش بھی کی۔ اب آج کی آیات میں ذوالقرنین کا جواب آرہا ہے قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ کہا کہ میرے لیے اللہ کی عطا کردہ قدرت بہتر ہے یعنی خدا تعالیٰ

نے مجھے حکومت دی ہے، مال و اسباب خدا نے بہت دے رکھا ہے، لہٰذا مجھے تمہارے مال کی ضرورت نہیں ہے۔ تم صرف یہ کرو فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ تم جسمانی مشقت میں میرے ساتھ تعاون کرو۔ مجھے افرادی قوت کی ضرورت ہے جو مطلوبہ خام مال مہیا کرے۔ باقی سارا خرچ میری حکومت برداشت کرے گی۔ اور اگر تم افرادی قوت مہیا کرو أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا تو میں تمہارے اور اُن کے درمیان ایک بند باندھ دوں گا جس کو وہ مفسد قوم عبور نہیں کر سکے گی اور اس طرح تم اُن کے شر سے محفوظ ہو جاؤ گے۔ اس سے مفسرین کرام یہ بات بھی اخذ کرتے ہیں کہ کسی اچھی حکومت کے مناسب حال نہیں کہ وہ لوگوں سے بلاوجہ ٹیکس وصول کر کے اپنی عیاشی کے کاموں میں خرچ کرے، بلکہ اچھی حکومت وہ ہے جو سکندر ذوالقرنین کی طرح لوگوں کی بے لوث خدمت کرے۔

بند کی تعمیر

ذوالقرنین نے اُن لوگوں سے کہا کہ مطلوبہ بند کی تعمیر کے لیے آتُونِي زُبَرَ الْحَدِيدِ لاؤ میرے پاس لوہے کے تختے، لوہا وہاں کسی جگہ پر موجود ہوگا جس کو لانے کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ لوہا اُن پہاڑی درّے میں بھرنا شروع کیا گیا حَتَّىٰ إِذَا سَاوَىٰ بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ یہاں تک کہ جب وہ انتہائی کناروں تک برابر ہو گیا مطلب یہ کہ لوگ لوہے کے تختے لا لا کر دو پہاڑوں کے درمیان درّے کو پُر کرتے رہے۔ اس بات کی تصریح نہیں ہے کہ لوہے کے تختے انتہائی بلندی تک کس طرح جوڑے گئے۔ کیا اُن کے پاس کوئی خاص آلات تھے۔ ہو سکتا ہے کہ سکندر ذوالقرنین نے کرامت کے طور پر خود اپنے ہاتھوں سے جوڑ لیے ہوں۔ بہرحال حاصل وسائل کے ذریعے لوہے کے درّے کو تختوں سے پُر کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ ایندھن کا انتظام بھی کیا گیا۔ لوہے کو گرم کرنے کے لیے لکڑی، تیل، کوئلہ یا گندھک وغیرہ جو کچھ بھی میسر تھا، وہ بھی تختوں کے درمیان رکھ دیا گیا

اور آگ تپانے کے لیے اُن کے درمیان پھونکنیاں بھی لگائیں۔ جب یہ سارا سامان تیار ہوگیا قَالَ انْفُخُوا تو ذوالقرنین نے کہا کہ آگ جلا کر ان کو پھونکو تاکہ آگ بھڑک اٹھے اور لوہا پگھل کر یکجان ہوجائے۔ آج کل تو لوہے کو پگھلانے کے لیے فرنیس (بھٹیاں) کا کام کر رہی ہیں مگر اُس زمانے میں ذوالقرنین نے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا اور ایک کھلی جگہ میں لوہے کو اتنی آگ دی کہ اُس کے تمام تختے پگھل کر یکجان ہو گئے۔

فرمایا حَتّٰى إِذَا جَعَلَهُ نَارًا یہاں تک کہ جب اُس لوہے کو بالکل آگ کی طرح کر دیا۔ قَالَ ذوالقرنین نے کہا آتُونِي أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا میرے پاس تانبہ لاؤ تاکہ میں اس لوہے پر ڈال دوں۔ ظاہر ہے کہ تانبہ لوہے سے بھی زیادہ سخت ہے اور اسے پگھلانے کے لیے درجہ حرارت بھی زیادہ درکار ہوتا ہے۔ چنانچہ جب لوہا گرم ہو کر پگھل گیا تو پھر اُس پر پگھلا ہوا تانبا ڈال دیا گیا جس سے لوہے کی وہ دیوار مزید مضبوط ہو گئی اور اُس میں شگاف پڑنے کا اندیشہ تک نہ رہا۔ جب یہ درہ لوہے کی مضبوط دیوار سے بند ہوگیا تو پھر شرپسند قوم یاجوج ماجوج کے دوسری طرف جانے کا امکان ختم ہوگیا۔ کیونکہ اس درے کے اطراف میں بڑے دشوار گزار پہاڑ تھے جنہیں عبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سکندر ذوالقرنین نے یہ بہت بڑا کارنامہ انجام دے کر درے کے اس طرف رہنے والے لوگوں کو مفسدین کے شر سے محفوظ کر دیا۔ اللہ کا فرمان ہے۔ فَمَا اسْطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوهُ اب اُس مفسد قوم کے بس میں نہیں رہا تھا کہ وہ پہاڑ کے اُوپر چڑھ سکتے وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا اور نہ وہ طاقت رکھتے تھے کہ اُس مضبوط بند میں شگاف ڈال سکتے۔

یہ عظیم کام سرانجام دینے کے باوجود سکندر ذوالقرنین نے اُسے اپنا کمال نہیں جتلایا بلکہ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّي کہا یہ تو

میرے پروردگار کی مہربانی کا نتیجہ ہے ۔ میں نے یہ کام اس کی توفیق سے پورا کیا ہے ۔ اب یہ بند نہایت مضبوط اور ناقابل تسخیر ہے فَاِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ مگر جب پروردگار کا وعدہ آجائیگا تو وہ اس کی تمام تر مضبوطی کے باوجود اس کو توڑ دے گا ۔ بند میں شگاف پڑ جائیں گے اور یاجوج ماجوج کی قوم اپنے علاقے سے نکل کر پھیل جائیگی ۔ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا اور میرے پروردگار کا وعدہ بالکل برحق ہے وہ پورا ہو کر رہے گا ۔

یاجوج و ماجوج کی تلاش

جیسا کہ گذشتہ درس میں عرض کیا تھا اقوام یاجوج و ماجوج کے متعلق مختلف نظریات پائے جاتے ہیں ۔ مولانا ابوالکلام کا رجحان یہ ہے کہ اسلام کے ایک ہزار سال گزرنے کے بعد یاجوج ماجوج کا اظہار تاتاریوں کی شکل میں ہوا یہ ایک بہت بڑا فتنہ تھا جس نے پورے ایشیا میں پھیل کر بڑی تباہی مچائی دمشق، عراق اور خراسان وغیرہ میں تقریباً ایک کروڑ آدمیوں کو ذبح کر ڈالا لوٹ مار کی اور اس طرح جانی اور مالی نقصان کا باعث ہوا ۔ مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ یاجوج ماجوج سے روسی یا برطانوی اقوام مراد ہو سکتی ہیں ۔ بعض نے منگول اور ترکوں کو یاجوج ماجوج قرار دیا ہے ، مگر یہ سب احتمالات ہیں ۔ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔ صحیح روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج و ماجوج انسان ہیں ۔ ان کا سلسلہ نسب باپ کی طرف سے آدم علیہ السلام تک پہنچتا ہے مگر حوا تک نہیں پہنچتا ۔ بائیبل کی بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تو آدم علیہ السلام نے کہا کہ تو لعنتی ہو گیا ۔ اب تو اس زمین پر رہنے کے قابل نہیں رہا ، چنانچہ وہ اس متمدن زمین سے نکل کر کہیں دوسری جگہ چلا گیا تھا ۔ اس کی بیوی اور اولاد کا بھی پتہ چلتا ہے ۔ اسکی اولاد کے اوصاف کا ذکر بعض انبیاء کے صحیفوں میں بھی کیا گیا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ اقوام یاجوج و ماجوج اسی نسل سے ہوں مگر یہ بھی کوئی معتبر بات نہیں ہے ۔

بہرحال احادیث سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ روسی، برطانوی، ترکی یا منگول اقوام پر منطبق نہیں ہوتیں اگرچہ ان اقوام نے بھی دنیا میں بڑا شر و فساد پھیلایا ہے مگر یاجوج و ماجوج کوئی اور ہی مخلوق ہے جو اس وقت کسی خطہ میں بند ہے اور اس کا ظہور قرب قیامت میں ہو گا۔

اکثر لوگ سوال کرتے ہیں کہ اگر یاجوج و ماجوج نامی واقعی کوئی اقوام ہیں تو پھر وہ کہاں ہیں؟ اس ضمن میں مولانا شاہ اشرف علی تھانوی کی بات زیادہ اوقع ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں بعض باتیں قرآن پاک سے ظاہر ہوتی ہیں اور بعض احادیث سے۔ مثلاً قرآن پاک سے ثابت ہے کہ ذوالقرنین اللہ کا مقبول بندہ تھا۔ وہ جلیل القدر بادشاہ تھا۔ سد سکندری ایک آہنی دیوار تھی۔ دو پہاڑوں کے درمیانی درہ میں انتہائی بلندی تک بند باندھا گیا۔ اس درے سے دوسری طرف اقوام یاجوج و ماجوج کا مسکن تھا۔ اس کے علاوہ حضور علیہ السلام کے فرمودات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے زمانہ میں اس بند میں تھوڑا سا سوراخ ہو گیا تھا۔ ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی بیان کرتی ہیں کہ حضور علیہ السلام نیند سے بیدار ہوئے تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَيْلٌ لِّلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ عربوں کے واسطے ہلاکت ہے کہ ایک شر ان کے قریب آ چکا ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا فُتِحَ مِنْ رَدْمِ يَاجُوجَ وَمَاجُوجَ یعنی یاجوج و ماجوج کے بند کو تھوڑا سا کھول دیا گیا ہے آپ نے ہاتھ کی انگلیوں سے دس کا اور ایک روایت کے مطابق نوے کا سوراخ بھی بنا کر دکھایا کہ اس دیوار میں اتنا سوراخ ہو گیا ہے۔ ام المومنین نے عرض کیا حضور! اَنَهْلِكُ وَفِيْنَا الصَّالِحُوْنَ کیا ہم ہلاک کر دیئے جائیں گے جب کہ ہمارے درمیان نیک لوگ بھی ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ لوگ اس وقت ہلاک کر دیئے جائیں گے اِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ جب

خباثت اور فتنہ و فساد بڑھ جائے گا چاہے اُن میں نیک آدمی بھی موجود ہوں
ترمذی شریف کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج و ماجوج اس بند کو
دن بھر توڑتے رہتے ہیں مگر جب رات ہوتی ہے تو وہ بند یا دیوار پھر ویسے
کی ویسے مکمل ہو جاتی ہے۔ عیسٰی علیہ السلام کے دوبارہ نزول پر جب ان
اقوام کے خروج کا وقت آئیگا تو اس وقت ان کی زبان سے نکلے گا کہ ہم
انشاء اللہ کل اس دیوار کو توڑ دیں گے اور پھر اگلے دن دیوار میں شگاف
پڑ جائے گا۔ اور یاجوج و ماجوج وہاں سے نکل کھڑے ہوں گے یہ درجہ
دوئم کی روایت ہے۔

یاجوج و ماجوج کا خروج اور ہلاکت

بہر حال اقوام یاجوج و ماجوج کا خروج قربِ قیامت میں حضرت
عیسٰی علیہ السلام کے دور میں ہوگا۔ اللہ تعالٰی حضرت عیسٰی علیہ السلام سے
فرمائیں گے إِنِّي أَخْرَجْتُ عِبَادًا لِّي میں نے اپنے بندوں کو نکال
دیا ہے، اب کوئی بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس دوران میں یاجوج و ماجوج
ساری دنیا پر پھیل جائیں گے۔ بڑا شر و فساد مچائیں گے۔ سورۃ انبیاء میں موجود
ہے "حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُم مِّن
كُلِّ حَدَبٍ يَنسِلُونَ" (آیت - ۹۶) یاجوج ماجوج اقوام ہر
اونچے پہاڑ اور ٹیلے سے اچھلتے کودتے چلے آئیں گے اور ساری متمدن دنیا میں
پھیل جائیں گے۔

یاجوج و ماجوج کی علامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ لوگ بیت
المقدس کے قریب ایک پہاڑ پر آکر کہیں گے قَتَلْنَا مَن فِي
الْأَرْضِ ہم نے زمین پر سب کو قتل کر دیا ہے۔ آؤ اب آسمان والوں کو
بھی ختم کر دیں۔ پھر وہ بعض آلات کے ذریعے آسمان کی طرف تیر پھینکیں
گے جو خون آلود حالت میں واپس آئیں گے۔ پھر یہ لوگ نعرہ ماریں گے۔
کہ دیکھو ہم نے آسمان والوں کو بھی ختم کر دیا ہے۔ پھر عیسٰی علیہ السلام کو حکم

ہوگا کہ آپ میرے کچھ خاص بندوں کو لے کر کوہ طور پر چلے جائیں اور دعا میں مصروف ہو جائیں۔ عیسیٰ علیہ السلام ایسا ہی کریں گے۔ اس دوران میں یاجوج ماجوج ساری دنیا میں پھیل چکے ہوں گے اور بڑا شر و فساد برپا کریں گے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا کے نتیجے میں طاعون کی قسم کی وبائی مرض پیدا ہو گی جس سے یہ سارے یاجوج و ماجوج ہلاک ہو جائیں گے۔ اُن کی لاشیں جگہ جگہ بکھری پڑی ہوں گی۔ اُن سے تعفن پیدا ہونے کا خطرہ ہو گا۔ اللہ کے حکم سے بڑے بڑے پرندے آئیں گے اور وہ لاشوں کو اٹھا کر کہیں لے جائیں گے۔ پھر خوب بارش برسے گی جس سے تمام روئے زمین دھل جائے گی اور زمین ایک چٹیل میدان اور آئینے کی طرح صاف ہو جائے گی۔ حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ یاجوج ماجوج کے بعد لوگ حج اور عمرہ بھی ادا کریں گے۔ احادیث سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض احادیث پہلے درجے کی ہیں اور بعض دوسرے درجے کی ہیں۔

حرفِ آخر

دراصل یاجوجیت اور ماجوجیت انکارِ خدا اور ظلم و تعدی کا نام ہے۔ تاہم جن یاجوج و ماجوج اقوام کا ذکر یہاں ہو رہا ہے اُن کی اکثریت کفر و شرک میں مبتلا ہو گی۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر انہیں سے کچھ ایمان بھی لائیں گے تو شر و فساد میں بھی مبتلا ہوں گے۔ اقوام یاجوج و ماجوج اور سدِ سکندری کے محل وقوع کے متعلق لوگوں نے بہت سے سوال کیے ہیں اور ان کے جواب بھی دیے گئے ہیں، تاہم شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی بات توجہ طلب ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس ضمن میں پیدا ہونے والے مختلف سوالات اور اُن کے جوابات کے باوجود اس کی حقیقت کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ قوم عام جنوں اور انسانوں کے درمیان ایک برزخی مخلوق ہو۔ صاحبِ تفسیر روح المعانی علامہ آلوسی بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں تو ان اقوام اور سدِ سکندری کا محل وقوع معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے اور اُن کے درمیان بڑے

بڑے بڑے سمندر حائل ہوں۔ لوگوں کا یہ دعویٰ کہ ہم ساری خشکی اور تری پر محیط ہو چکے
ہیں، درست نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعض مقامات اور اشیاء اب بھی لوگوں
کی نظروں سے اوجھل ہوں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج سے پانچ سو سال
پہلے تک یہاں چوتھے براعظم کا علم نہیں تھا۔ ساری متمدن دنیا امریکہ سے
ناواقف تھی۔ جس طرح پورا براعظم دنیا کی نظروں سے اوجھل رہا اسی طرح ہو
سکتا ہے کہ یاجوج و ماجوج اور سد سکندری اب تک دنیا کی نظروں سے
غائب ہو۔ دنیا کے عجائبات میں سے آسٹریلیا کے شمال مشرقی ساحل پہ
واقع دیوار اعظم بھی ہے۔ ایک ہزار میل سے زیادہ لمبی، ایک ہزار فٹ
اونچی اور بعض مقامات پہ بارہ بارہ میل چوڑی اس دیوار پہ برطانوی سائنسدانوں
کی ایک ٹیم تحقیقات کر رہی ہے۔ اُن کی ایک سال کی رپورٹ سے
سمندر کے عجیب و غریب اسرار منکشف ہوئے ہیں، لہٰذا یہ کیسے دعویٰ
کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ دنیا کے لوگ دنیا کی ہر خشکی اور تری سے مکمل طور
پہ واقف ہو چکے ہیں۔ مطلب یہ کہ اپنی طرف سے کسی چیز کا تعین کرنا
جس میں تمام علامتیں نہ پائی جائیں، درست نہیں ہے۔

وقوع قیامت

ارشاد ہوتا ہے وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ
فِي بَعْضٍ اور ہم چھوڑ دیں گے بعض کو اس دن کہ وہ ایک دوسرے
پر گھس رہے ہوں گے۔ بعض نے اس کو بھی یاجوج و ماجوج پر محمول کیا ہے
حالانکہ اُن کے متعلق سورۃ انبیاء میں آ چکا ہے کہ وہ ہر اونچے پہاڑ اور ٹیلے
سے اچھلتے کودتے آئیں گے۔ چنانچہ صحیح بات یہ ہے کہ اس مقام پہ آیت
کا مصداق وقوع قیامت ہے۔ جب پہلا بگل بجے گا تو دنیا کی ہر چیز ختم
ہو جائے گی وَنُفِخَ فِي الصُّورِ پھر جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا
فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا تو ہم سب کو جمع کر لیں گے مخلوق زندہ ہو کر
حساب کتاب کے لیے میدان محشر میں جمع ہو جائے گی۔ اُس وقت

بڑا خلفشار ہوگا اور لوگ ایک دوسرے میں گھستے چلے جائیں گے۔ ان کی مثال
پروانوں کی ہوگی جن کی نہ کوئی مقررہ رفتار ہوتی ہے اور نہ کوئی سمت متعین
ہوتی ہے۔ اسی طرح تمام لوگ افراتفری کے عالم میں بھاگیں گے۔ اور
ایک دوسرے میں گھسیں گے۔

پھر کیا ہوگا؟ وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكَافِرِينَ
عَرْضًا اللہ نے فرمایا اس دن ہم جہنم کو کافروں کے سامنے کر دیں گے
وہ کافر الَّذِينَ كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاءٍ عَن
ذِكْرِي جن کی آنکھوں میں میری یاد سے پردے تھے۔ انہوں نے دنیا
میں کبھی مجھے یاد نہیں کیا تھا۔ اس طرف سے ان کی آنکھیں اندھی ہو چکی تھیں
یہ لوگ حساب کتاب کے بعد یقیناً جہنم میں جائیں گے۔ ان کی دنیا میں یہ
حالت بھی تھی وَكَانُوا لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا ان کو اچھی بات
سننے کی توفیق بھی نہیں ملتی تھی۔ یہ لوگ ہمیشہ غفلت میں پڑے رہے پیغمبروں
کی تعلیم کو انہوں نے اپنے کانوں میں کوئی جگہ نہ دی، لہٰذا اب یہ جہنم کا شکار
ہوں گے اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ آنکھوں پر پردے پڑنے کا یہ
مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ انسان آج تک یاجوج وماجوج کی اقوام کو
نہیں دیکھ سکے کہ وہ کہاں ہیں۔ جب اللہ کا حکم ہوگا تو وہ ظاہر ہو جائیں گے
اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ بعید نہیں کہ وہ کسی چیز کو انسانوں پر ایک مدت
تک مخفی رکھے۔ اس نے حضرت عزیر علیہ السلام کو سو سال تک لوگوں
کی نظروں سے اوجھل رکھا اور اصحاب کہف کو تین سو نو سال تک
غار میں سلائے رکھا اور اس عرصہ میں کسی انسان کی نظر ان پر نہیں پڑی۔

اللہ تعالیٰ نے قیامت کا تذکرہ بھی فرما دیا ہے۔ یاجوج وماجوج
کے خروج اور پھر ان کی ہلاکت کے بعد مسیح علیہ السلام مزید کچھ عرصہ
دنیا میں رہیں گے اور پھر وفات پا جائیں گے۔ نیک لوگ بھی کچھ مدت

تک دنیا میں موجود رہیں گے۔ پھر نہایت نرم ہوا چلے گی جو ہر نیک آدمی تک پہنچے گی اس سے نیکوکار لوگ مرتے چلے جائیں گے اور پھر روئے زمین پر بدترین قسم کے لوگ ہی رہ جائیں گے یہ گدھوں سے زیادہ بے شرم و بے حیا ہوں گے۔ گلی کوچوں میں بدکاری کریں گے۔ اس وقت قیامت کا بگل بجے گا اور وہ برپا ہو جائے گی۔

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِنْ دُونِي أَوْلِيَاءَ ۚ إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا ﴿١٠٢﴾ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ﴿١٠٣﴾ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ﴿١٠٤﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾ ذَٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا ﴿١٠٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿١٠٧﴾ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يَبْغُونَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿١٠٨﴾

ترجمہ:- کیا گمان کرتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ وہ ٹھہرائیں گے میرے بندوں کو میرے سوا اپنا کارساز۔ بیشک ہم نے کیا ہے جہنم کافروں کے لیے مہمانی (۱۰۲) (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے، کیا میں تمہیں بتلاؤں وہ لوگ جو سب سے زیادہ خسارے میں ہیں اعمال کے لحاظ سے (۱۰۳) یہ وہ لوگ ہیں جن کی ضائع ہو گئی کوشش دنیا کی زندگی

ہیں ، اور وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اچھی کارگزاری کر رہے ہیں (۱۰۴) یہی لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اپنے رب کی آیتوں کے ساتھ اور اس کی ملاقات کے ساتھ پس ضائع ہو گئے اُن کے اعمال ، پس نہیں ہم قائم کریں گے ان کے لیے قیامت والے دن وزن (۱۰۵) یہ بدلہ ہے اُن کا جہنم اسوجہ سے کہ انہوں نے کفر کیا اور بنایا انہوں نے میری آیتوں اور میرے رسولوں کو ٹھٹھا کیا ہوا (۱۰۶) بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے اعمال انجام دیئے ، ہو گی اُن کے لیے جنت الفردوس مہمانی (۱۰۷) ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس میں۔ نہیں تلاش کریں گے اس سے تبدیلی (۱۰۸)

خدا کی رحمت کا ذکر

اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور اولیاء کا ذکر فرما کر اُن کے ایک مشترکہ نظریہ کو بیان کیا ہے کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی رحمت کے اُمیدوار تھے اور انہوں نے اپنی ہر کارگزاری کو رحمتِ خداوندی پر محمول کیا۔ اس سورۃ میں پہلا واقعہ اصحابِ کہف کا بیان ہوا ہے۔ وہ اللہ کے برگزیدہ بندے اور اس کے دوست تھے جنہوں نے عقیدہ توحید پر قائم رہنے کے لیے اپنے گھر بار چھوڑ کر غار میں پناہ لی۔ انہوں نے اپنی قوم سے علیحدہ ہوتے وقت یہی کہا تھا کہ ہمارا تعلق صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کے ساتھ ہے يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وہ تمہارے لیے اپنی رحمت پھیلا دے گا۔ اور تمہارے معاملہ میں تمہارے لیے آسانی پیدا کر دیگا۔

آگے اسی سورۃ میں اللہ نے مومن اور کافر بھائی کا ذکر کیا ہے۔ کافر مالدار اور دو باغوں کا مالک تھا جبکہ مومن آدمی نادار تھا۔ پھر ایک دن باغ والے نے دیکھا کہ اُس کی ہر چیز تباہ ہو چکی ہے تو مومن بھائی نے اُس سے کہا کہ تو نے اپنے خالق کے ساتھ کفر کیا اور اس کی بجائے کہ وہ نعمت کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے اُسے اپنی عقل اور محنت کا

ثمرہ سمجھا بجائے اللہ کی رحمت پر محمول نہ کیا۔ تجھے چاہیئے تھا کہ جب باغ میں داخل
ہوتے تو یوں کہتے "مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" میں اگرچہ تم سے
مال میں کم ہوں مگر مجھے اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ مجھے بہتر بدلہ دیگا

اس کے بعد اللہ نے موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا واقعہ بیان فرمایا ہے ان
دونوں ساتھیوں کے سامنے جن میں تین واقعات کا ظہور ہوا انکی حقیقت موسیٰ علیہ السلام
پر واضح نہیں تھی، لہذا وہ ہر بار خضر علیہ السلام کو ٹوکتے رہے۔ پھر جب انکی
جدائی کا وقت آیا تو خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو تینوں واقعات کی حقیقت
اور حکمت سے آگاہ کیا اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ جو کچھ مجھ سے سرزد ہوا، اس میں
میرا کوئی کمال نہیں بلکہ "رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ" تیرے رب کی رحمت
اور مہربانی سے ہوا ہے۔ سکندر ذوالقرنین بھی اللہ کے نیک بندوں میں سے تھے اللہ نے انہیں دنیا کی سلطنت
عطا فرمائی اور انہوں نے مغرب، مشرق اور شمال کا سفر اختیار کیا پھر جب انہوں نے ایک
قوم کی فرمائش پر اقوام یاجوج و ماجوج سے بچاؤ کے لیے دیوار بنا دی تو اس فعل
کو بھی اللہ ہی کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا "هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ"
یہ تو میرے پروردگار کی رحمت ہے کہ اس نے میرے ہاتھوں سے مفسدوں
کا راستہ بند کروا دیا۔

کفار کا زعم باطل

آگے اللہ نے توحید کی بات سمجھائی ہے کہ جب اللہ کے مقربین
انبیاء اور اولیاء اللہ کی رحمت کے طلبگار رہے تو ان کافروں نے اللہ کو چھوڑ
کر غیروں کو اپنا دوست اور کارساز کیسے بنا لیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "اَفَحَسِبَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" کیا کافر لوگ یہ گمان کرتے ہیں "اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ
مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ" کہ میرے بندوں کو میرے
سوا اپنا کارساز بنا لیں گے۔ فرمایا یہ گمراہ کن اور باطل عقیدہ ہے۔ اس سورۃ
میں مذکور انبیاء اور اولیاء کا حال دیکھ لو، وہ تو کسی کی حاجت روائی اور مشکل کشائی
نہیں کرتے تھے مگر مشرک لوگ انہی انبیاء اور اولیاء کو دنیا میں اپنا کارساز
سمجھتے ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک سمجھتے ہیں

یہاں پر عبادی کا لفظ آیا ہے اور بندوں میں انبیاء اولیاء، فرشتے اور نیک و بد تمام لوگ آتے ہیں۔ اللہ نے اپنے نافرمان بندوں کے لیے بھی عباد کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل کی ابتداء میں اللہ نے فرمایا ہے "فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ" پس جب اُن میں سے پہلے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے تمہارے اوپر سخت لڑائی والے بندے بھیجے۔ غرضیکہ اللہ نے فرمایا کہ کیا کافر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ میرے کسی بھی بندے کو اپنا کارساز اور حاجتی بنا لیں گے۔ فرمایا اُن کا یہ خیال درست نہیں ہے۔ نیک لوگوں کا حال تو اس سورۃ مبارکہ میں بیان ہو چکا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور رحمت پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں مگر اُن کی پرستش کرنے والے انہی کو اپنا حاجتی اور کارساز سمجھتے ہیں ایک وقت آنے والا ہے جب عابد اور معبود سب اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونگے اُس وقت معبودوں کی حالت یہ ہوگی "سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا" (مریم - ۸۲) کہ وہ عبادت کرنے والوں کی عبادت سے انکار کر دیں گے اور اُن کے دشمن بن جائینگے وہ اللہ کے دربار میں عرض کریں گے کہ ہم نے تو انہیں نہیں کہا تھا کہ ہمیں اپنا معبود بنالو، ہم سے حاجتیں طلب کرو اور ہمیں نذر و نیاز پیش کرو۔ درحقیقت انہوں نے شیطان کا اتباع کیا اور اپنے نفس کی پیروی کی۔

نذر و نیاز میں شرک

دیکھیں! اصحاب کہف کا ذکر ہو چکا ہے۔ انہوں نے اللہ کی رحمت کے بھروسے پر غار میں پناہ لی مگر اب لوگ انہی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنے لگے ہیں۔ بعض علاقوں میں مشرک لوگ اصحاب کہف کے نام کی نیاز دیتے ہیں۔ سات روٹیاں اصحاب کہف کی اور آٹھویں اُن کے کتے کی مشہور ہیں جو نیاز میں دی جاتی ہیں۔ اگر ایصال ثواب مقصود ہو تو پھر

تو کوئی حرج نہیں اور اگر ان کو حاجت روا سمجھ کر نیاز دی جاتی ہے تو یہی
شرک بن جاتا ہے کیونکہ اللہ کے مقرب ترین بندے بھی کوئی اختیار
نہیں رکھتے اور نہ وہ کسی کی مشکل کشائی کر سکتے ہیں - یہ تو محض وسوسہ اندازی
اور گمراہی ہوتی ہے ۔ فرمایا جو لوگ میرے بندوں میں سے میرے سوا کسی
کو اپنا کارساز بنائیں گے إِنَّآ أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَٰفِرِينَ نُزُلًا
بیشک ہم نے ایسے کافروں کے لیے جہنم کی آگ بطور مہمانی تیار کر رکھی ہے
اُن کو وہاں پہ کوئی راحت نہیں ہوگی بلکہ طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہونگے

خاسر ترین لوگ

فرمایا اے پیغمبر! قُلْ آپ کہہ دیجئے هَلْ نُنَبِّئُكُم
بِٱلْأَخْسَرِينَ أَعْمَٰلًا کیا میں تمہیں بتلاؤں کہ ایسے لوگ اعمال
کے لحاظ سے سب سے زیادہ خسارے میں ہیں - اور وہ کون لوگ ہیں ۔
ٱلَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا
جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں ہی گم ہو گئی - یعنی دنیا میں جو کچھ کارگزاری انہوں
نے کی تھی ، وہ یہیں بھٹک کر رہ گئی ۔ ضَلَّ سَعْيُهُمْ کے دو مطلب
ہو سکتے ہیں - ایک یہ کہ اُن کی ساری کاوش صرف دنیا طلبی کے لیے تھی اور آخرت
سے اُن کو کوئی غرض نہ تھی ، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے دنیا میں جو
بھی عمل اختیار کیا ، وہ ضائع ہو گیا

ہم اس وقت دیکھ رہے ہیں کہ پوری دنیا کی اکثر آبادی بمع ارباب اقتدار
دنیا کی بہتری کے لیے ہی ساری تگ و دو کر رہے ہیں - روسی تو ویسے ہی منکر خدا
ہیں اور وہ عقیدہ خدا کو "افیون" سے تعبیر کرتے ہیں اُن کے نزدیک یہ مادی دنیا
ہی اول و آخر ہے ، خدا تعالیٰ ، اس کے رسول ، اس کی کتابیں ، وقوع قیامت ،
اور جزا و سزا سب بناوٹی باتیں ہیں اور لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے وضع
کی گئی ہیں ۔ سرمایہ داری نظام میں بھی عام لوگوں کو پھنسایا جاتا ہے اور امیر لوگ
غریبوں کا خون چوستے رہتے ہیں ، وہ بھی محض سرمایہ اکٹھا کرنے کے لیے اور

دنیا میں عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے کے لیے جائز و ناجائز ذرائع اختیار کرتے
ہیں۔ آخرت کا تصور اُن کے ہاں بھی برائے نام ہی ہے۔ جو لوگ چار و ناچار
خدا کا نام لیتے بھی ہیں اُن میں سے بھی کچھ مشرک ہیں اور کچھ تثلیث کے قائل
ہیں۔ امریکہ ہو یا برطانیہ، فرانس ہو یا جرمنی کسی کا منتہائے مقصود آخرت اور
رضائے الٰہی نہیں بلکہ اُن کی ساری بھاگ دوڑ، علم و ہنر، سائنس اور ٹیکنالوجی
محض دنیا کی خاطر ہے وہ ہمیشہ معیاری خوراک، معیاری لباس، معیاری رہائش اور
معیاری سواری کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ اُن کے تمام منصوبے، تمام کارخانے
اور تمام کمپنیاں دنیا کے آرام و راحت کے سامان مہیا کرنے پر کام کر رہے ہیں
ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اُن کے علم کی انتہا دنیا تک محدود ہے
نہ وہ کسی برزخ کے قائل ہیں، نہ آخرت کے۔ نہ کسی نبی کو مانتے ہیں اور نہ کسی
آسمانی کتاب کو۔ چین اور روس کے اکثر لوگ تو سرے سے منکرِ خدا ہیں، باقیوں
میں سے بھی اکثر ملحد ہیں، خاص طور پر امریکہ تو ملحدین کا گڑھ ہے۔ کمیونسٹ تو
کارل مارکس کی کتاب کو ہی صحیفۂ آسمانی سمجھتے ہیں جس میں صرف معاشی بہتری
کے اصول بتلائے گئے ہیں اور اس سے آگے کچھ نہیں۔ اسی لیے تو حضور
علیہ السلام نے دعا میں سکھلایا اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا اَكْبَرَ
هَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا اے اللہ! ہمارا منتہائے مقصود اور
مبلغ علم صرف دنیا کو ہی نہ بنا کہ ہم دنیا کے علاوہ آخرت سے آنکھیں موند لیں
قرآن پاک نے کفار و مشرکین اور دہریوں کی یہی صفت بیان کی ہے اِنَّ
هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا
ثَقِيْلًا (الدھر - ۲۷) یہ جلدی والی یعنی دنیا کی زندگی کو ہی پسند کرتے
اور آگے آنے والے بوجھل دن یعنی قیامت کو پسِ پشت ڈال دیتے
ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ انجام کے لحاظ سے سخت خسارے میں ہیں کیونکہ
جس مادی دنیا کے پیچھے لگے ہوئے ہیں وہ تو جلد ہی ختم ہو جائے گی اور
پھر سامنے خدا تعالیٰ کی گرفت ہے، اُن کے لیے کچھ نہیں ہو گا

اعمال کا ضیاع

خسارے کی دوسری صورت اعمال کا ضیاع ہے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں آرہا ہے "حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ" ان کے تمام اعمال ہی ضائع ہو گئے۔ انہوں نے دنیا میں اچھے کام بھی کیے، صدقہ خیرات کیا، غریبوں اور محتاجوں کی خبر گیری کی، سڑکیں اور ہسپتال بنوائے، کنوئیں کھدوائے اور دیگر رفاہ عامہ کے کام انجام دیے مگر ان کے کفر و شرک نے ان تمام نیکیوں کو ضائع کر دیا کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عمل کارآمد نہیں۔ اس مضمون کو سورۃ الغاشیہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے "عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً" (آیت ۳، ۴) بڑی بڑی عبادتیں اور ریاضتیں کر کے تھک چکے ہوں گے مگر بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل کیے جائیں گے کیونکہ کفر و شرک کی وجہ سے ان کے اعمال ضائع ہو چکے ہوں گے۔ مشرک کی نمازیں، روزے، حج، زکوٰۃ، صدقہ و خیرات سب برباد ہو جائیں گے کیونکہ اصول یہ ہے "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ" (الانبیاء - ۹۴) جو کوئی اچھے اعمال انجام دیگا، بشرطیکہ وہ مومن ہو تو اس کی محنت کی ناقدری نہیں کی جائیگی۔ ایمان بطور شرط ہے۔ اگر ایمان ہی نہیں تو کوئی عمل بھی قابل قبول نہیں۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ نماز کے لیے طہارت اور استقبال قبلہ شرائط ہیں اگر کوئی شخص بغیر طہارت کے نماز پڑھتا ہے یا قبلہ کی طرف رخ نہیں کرتا تو وہ ہزار رکعت بھی پڑھ جائے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح جس شخص میں ایمان کی شرط مفقود ہے اور کفر و شرک میں ملوث ہے اس کی کوئی عبادت و ریاضت یا کوئی بہبود کے کام کچھ مفید نہیں ہوں گے۔

اس کے باوجود ان کی حالت یہ ہے "وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا" وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اچھے اعمال انجام دے رہے ہیں۔ فرمایا "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ"

وَلِقَآئِهٖ یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں اور اس سے ملاقات کا انکار کیا۔ آیات سے اللہ تعالیٰ کے تمام احکام، کتب، معجزات، انبیاء، بعث بعد الموت وغیرہ مراد ہیں۔ ان لوگوں نے کسی حقیقت کو تسلیم نہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ کہ ان کے تمام نیک اعمال ضائع ہو گئے فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ہم ان کے لیے قیامت والے دن میزان بھی قائم نہیں کریں گے۔ وزن کرنے کی ضرورت تو تب پیش آئے گی جب برائیوں کے ساتھ نیک اعمال بھی ہوں گے اور اگر نیک اعمال ان کے کفر و شرک کی وجہ سے پہلے ہی ضائع ہو چکے ہیں تو اب ترازو لگانے کا کیا مطلب! ان کے لیے جہنم کا حکم ہو جائے گا۔ "فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ" (الرحمٰن ۴۱) لہٰذا انہیں سر اور پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹ کر دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ بعض کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اعمال تولے تو جائیں گے مگر وہ بالکل بے وزن ہوں گے اور ان کا کوئی اچھا نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ وزن کے متعلق حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ قیامت والے دن بڑے موٹے تازے لوگ آئیں گے، خوب کھایا پیا، جسم کو پالا پوسا ہوگا۔ مگر اللہ کی میزان میں ان کا وزن مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوگا۔

تمسخر کرنے والوں کیلئے سزا

فرمایا ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا ان کے کفر کی وجہ سے ان کا بدلہ جہنم کی آگ ہوگی۔ اور اس وجہ سے بھی وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا کہ انہوں نے میری آیتوں اور میرے رسولوں کو تمسخر کا نشانہ بنایا۔ ٹھٹھا اور تمسخر کی قباحت کا ذکر موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بھی آتا ہے۔ ایک شخص کے قتل پر جب موسیٰ علیہ السلام نے قوم سے کہا کہ گائے ذبح کر کے اس کے گوشت کا ٹکڑا مردے پر مارو تو وہ تمہیں اپنے قاتل کی نشاندہی کر دے گا، تو قوم کہنے لگی اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا اے موسیٰ علیہ السلام! کیا تو ہم

سے مذاق کرتا ہے "قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ" (البقرۃ ۔ ٦٧) پناہ بخدا کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ گویا ٹھٹھا مذاق تو نادانوں کا کام ہے میں ایسا کام کیوں کروں گا۔ سورۃ توبہ میں اللہ نے منافقوں کے متعلق بھی فرمایا ہے "قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ" (التوبہ ۔ ٦٥) اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ دیں بھلا تم اللہ، اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ ٹھٹھا کرتے ہو۔ یہ تو گناہ کبیرہ ہے اور بعض صورتوں میں کفر ہے۔ آج پوری دنیا میں دیکھ لیں جنسی مذاق کو کتنا عروج حاصل ہے۔ تمام فلمیں، ڈرامے، ناول، اخباری کارٹون وغیرہ کی بنیاد تمسخر پر ہی تو قائم ہے۔ ہر کام میں دوسروں کو خوش کرنے کے لیے نقالی کی جاتی ہے۔ خاص طور پر کارٹون سازی ایسی قباحت ہے جس سے بڑے سے بڑا آدمی بھی محفوظ نہیں۔ اخبار نویس قانونی طور پر مجاز ہیں کہ وہ کسی بھی آدمی کو کارٹون کا شکار بنا سکتے ہیں۔ فلم سازوں نے تو پیغمبروں کی نقالی کرنے میں بھی پس و پیش نہیں کیا۔ کہیں حضرت شمعون کی فلمبندی ہو رہی ہے تو کوئی سلیمان علیہ السلام کا پارٹ ادا کر رہا ہے کہیں امیر حمزہؓ کا پارٹ ادا کیا جا رہا ہے اور کوئی حضرت عمرؓ کے روپ میں ظاہر ہو رہا ہے۔ اسلام کے اولین جانثاروں کو ناول میں پیش کرنے پر سلمان رشدی کے خلاف ساری دنیا میں کیوں شور اٹھا، یہ نقالی اور جنسی مذاق کا نتیجہ ہے جس نے دنیا کو اس حد تک پہنچا دیا ہے۔

اب نیک لوگوں کا حال بھی سن لیں فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اعمال انجام دیے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ پر مداومت اختیار کی۔ جہاد میں حصہ لیا، صدقہ خیرات، محتاجوں کے حقوق ادا کیے، مظلوموں کی اعانت کی، حرام و حلال میں امتیاز برقرار رکھا، خدا کی کتاب کو پڑھا، اس کے نظام کے قیام کی کوشش کی۔ تعلیم و تبلیغ میں حصہ لیا، مساجد اور مدارس قائم کیے۔

شراب، جوا، فراڈ اور فحاشی سے اجتناب کیا۔ فرمایا ایسے لوگوں کے لیے
كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا جنت الفردوس میں مہمانی
ہوگی۔ فردوس رومی یا حبشی زبان کا لفظ ہے۔ جس کا معنیٰ باغ ہے۔
عربی زبان میں باغ کے لیے بستان اور جنت کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔
حضور علیہ السلام نے فردوس کو جنت کا اعلیٰ طبقہ قرار دیا ہے اسی
لیے فرمایا کہ جب اللہ سے مانگو فَاسْئَلِ اللّٰهَ الْفِرْدَوْسَ
تو جنت الفردوس کا سوال کیا کرو۔ اسی طبقہ سے تمام نہریں جاری ہوتی ہیں۔
جو جنت کے دوسرے طبقات میں پہنچتی ہیں۔ اسی جنت الفردوس کے اوپر
رحمان کا عرش ہے جس کی تجلی اعظم یہاں پڑتی رہتی ہے۔ فرمایا اہل ایمان کی
مہمانی جنت الفردوس میں ہوگی۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا جنتی لوگ اس میں ہمیشہ
رہنے والے ہوں گے۔ لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا وہ وہاں سے کسی
تبدیلی کے خواہش مند نہیں ہوں گے۔ یعنی جنت الفردوس ایسا مقام ہوگا۔
اور وہاں ایسی آسائشیں حاصل ہوں گی کہ دل میں کبھی اکتاہٹ پیدا نہیں
ہوگی کہ جنتی کسی دوسری جگہ کی خواہش کرے اور اللہ تعالیٰ کا یہ بھی وعدہ ہے
کہ جنتی وہاں سے نکالے بھی نہیں جائیں گے۔ ان کا داخلہ کسی خاص مدت
کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے ہوگا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾ ع۱۲

ترجمہ:۔ (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے ، اگر ہو جائے سمندر سیاہی تیرے رب کے کلمات کے لیے تو بیشک سمندر ختم ہو جائے گا قبل اس کے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں ، اور اگرچہ ہم اُس جیسا ایک اور بھی (سمندر) مدد کے لیے لے آئیں ﴿۱۰۹﴾ آپ کہہ دیجئے (اے پیغمبر!) کہ بیشک میں ایک انسان ہوں تمہارے جیسا ۔ وحی کی جاتی ہے میری طرف کہ بیشک تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے ۔ پس جو شخص اُمید رکھتا ہے اپنے رب کی ملاقات کی ، پس اُس کو چاہیئے کہ عمل کرے اچھا ، اور نہ شریک بنائے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو ﴿۱۱۰﴾

ملخصات علوم و حکمت

اس سورۃ کی ابتداء توحید کے بیان سے ہوئی تھی اور اب آخر میں بھی اللہ نے توحید ہی کا ذکر کیا ہے کیونکہ اکثر لوگ اسی مسئلہ میں ٹھوکر کھاتے ہیں اور پھر شرک میں مبتلا

ہو کر آخرت برباد کر لیتے ہیں۔ ابتدائے سورۃ میں عقیدہ ابنیت کی تردید کی گئی تھی اور آخر میں کلمات، علم و حکمت کا بیان ہے اور خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا تذکرہ ہے۔ گزشتہ درس کے آخر میں نیکوکاروں کے انعامات کے ضمن میں جنت الفردوس کا تذکرہ تھا کہ جنتی لوگ وہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے اور وہاں سے کسی تبدیلی کے خواہشمند نہیں ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنت میں خدا تعالیٰ کے کلمات علم و حکمت اور اُس کی صفات، کمال کا ظہور ہوگا، لہٰذا وہاں کے رہنے والوں کے مزاج میں کبھی اکتاہٹ پیدا نہیں ہو گی۔ بلکہ وہ کمال اطمینان اور سکون کے ساتھ وقت گزاریں گے۔

اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت کے کلمات کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَٰتِ رَبِّي اگر سمندر سیاہی بن جائے میرے رب کے کلمات کے لیے لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَٰتُ رَبِّي تو سمندر ختم ہو جائے گا پیشتر اس کے کہ میرے پروردگار کے کلمات ختم ہوں۔ مفسرین کرام فرماتے کہ یہاں پر کلمات سے مراد اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت کے کلمات ہیں اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز پر حاوی ہے وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ کیونکہ وہ ہر شے کو جانتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حکمت کے کلمات لیعنی بے انتہا ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر تمام سمندروں کا پانی سیاہی بن جائے اور اس سیاہی کے ساتھ میرے رب کے کلمات شروع کر دیے جائیں تو اتنی بڑی مقدار میں سیاہی بھی ختم ہو جائیگی جدید تحقیق کے مطابق کل دنیا پر تین حصے سمندر ہے جس کا کل رقبہ ۱۴ کروڑ مربع میل بنتا ہے اور صرف ایک حصہ خشکی ہے۔ فرمایا اس سمندر کے علاوہ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا اگر ہم اتنی سیاہی کی امداد کے لیے اس جیسا وسیع و عریض سمندر اور لے آئیں تب بھی اللہ کے علم و حکمت کے کلمات تحریر کرنے کے لیے سیاہی کم پڑ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت کے کلمات اور اُس کی صفات کا ظہور ہمیشہ ہوتا رہے گا جس کی وجہ سے جنتی لوگ جنت میں کبھی

اکتاہٹ محسوس نہیں کریں گے۔ انہیں ہر وقت وارد ہونے والی صفات و تجلیات کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ ترقی حاصل ہوتی رہے گی اور سکون و راحت کا زیادہ سے زیادہ سامان ملتا رہے گا۔

بعض فرماتے ہیں کہ کلمات سے مراد خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا کے کلمات بھی ہو سکتے ہیں۔ سورۃ لقمان میں موجود ہے وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ (آیت ۲۷) اگر روئے زمین کے تمام درخت قلمیں بن جائیں اور سارا سمندر سیاہی بن جائے پھر اس کے بعد اس جیسے سیاہی کے سات سمندر اور بھی مل جائیں۔ تو اللہ تعالیٰ کے کلمات ختم نہیں ہوں گے یعنی اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی ایک بات بھی ابھی ختم نہیں ہوگی کہ تمام سمندر ختم ہو جائیں گے۔

بشریت رسول

اگلی آیت میں پہلے رسالت اور پھر توحید اور معاد کا ذکر آرہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ لوگو! میں بھی تمہارے جیسا انسان ہی ہوں۔ مجھ میں تمام انسانی لوازمات اور ضروریات پائی جاتی ہیں، لیکن اللہ نے مجھے یہ امتیاز بخشا ہے يُوْحٰٓى اِلَيَّ کہ میری طرف وحی کی جاتی ہے اور یہ سب سے بڑا اعزاز ہے جو بعض انسانوں کو خالق ارض و سما کی طرف سے نصیب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس ہستی کو رسالت و نبوت کے لیے منتخب فرماتا ہے، اس کی طرف وحی بھی نازل فرماتا ہے اور اس کو شریعت کا قطعی اور یقینی علم بھی عطا کرتا ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا گیا کہ جب حضور علیہ السلام گھر میں ہوتے تو آپ کیا کام کرتے تھے۔ ام المومنین نے جواب دیا۔ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَشَرًا مِّنَ

الْبَشَرِ یعنی حضور انسانوں میں سے ایک انسان تھے۔ آپ انسانوں والے کام کرتے تھے۔ آپ کپڑے دھو لیتے یا مکان کی صفائی کر لیتے، بکری کا دودھ دوھ لیتے، جوتے کو ٹانکا لگا لیتے، کپڑے میں کوئی تکلیف دہ چیز کانٹا وغیرہ ہوتا تو اُسے نکال دیتے اور پھر آرام بھی فرماتے۔

حضور علیہ السلام کا تعلق نوعِ انسانی کے ساتھ تھا۔ آپ کسی دوسری جنس میں سے نہیں تھے۔ اسی مقام پر آکر لوگ دھوکا کھاتے اور بھٹک جاتے ہیں اور آپ کو نوعِ انسانی سے ہی خارج کر دیتے ہیں۔ بحیثیت انسان آپ کی بیویاں تھیں، اولاد تھی، والدین اور آباؤ اجداد تھے آپ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت زیادہ فضیلت عطا فرمائی "وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا" (النساء - ۱۱۳) اور یہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم تھا۔ تاہم آپ نسلِ انسانی میں سے تھے۔ ملائکہ، جنات یا کسی دوسری مخلوق میں سے نہیں تھے۔ انسان ہونا باعثِ شرف ہے۔ اللہ نے فرشتوں سے فرمایا "اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ" (ص - ۷۱) میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ نبی کو انسان کہنے سے (نعوذ باللہ) اس کی توہین ہو جاتی ہے۔ بھائی! ایسی بات نہیں ہے۔ انسان انسان میں بڑا فرق ہے۔ ایسے لوگوں کے سامنے اپنے جیسے انسانوں کا نمونہ ہوتا ہے جو ہر لمحہ نافرمانی کرتے اور فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اگر حضور علیہ السلام کو بھی ایسا ہی انسان تصور کیا جائے تو بلاشبہ باعثِ توہین ہوگا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاص امتیاز بخشا ہے۔ اللہ کا ہر نبی معصوم عن الخطا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں گارنٹی حاصل ہوتی ہے کہ اُن سے گناہ نہ سرزد ہونے دیا جائے۔ اگر کوئی معمولی سی لغزش ہو بھی جائے تو فوراً تنبیہ ہو جاتی ہے۔ مگر تمام انبیاء انسان ہی ہوتے ہیں اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

تو سید البشر اور سید الانبیاء ہیں۔ آپ پوری نوع بشر کے امام ہیں۔ آپ کو نسل انسانی
سے خارج کرکے نورٌ مِّن نُّورِ اللّٰہ کا عقیدہ رکھنا غلط ہے اور
یہ خدا کا جزو بنانے کے مترادف ہے۔ اللہ نے فرمایا وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ
عِبَادِهِ جُزْءًا ۚ إِنَّ الْإِنسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ (الزخرف۔ ۱۵)
بعض مشرکوں نے اللہ کے بندوں میں سے اس کا جزو بنایا ہے بیشک
انسان تو کھلا ناشکر گزار ہے اسی لیے ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں یا مسیح اور
عزیر علیہما السلام کو خدا کا بیٹا کرنا خدا کے لیے اولاد ثابت کرتا ہے اور
یہی کفر کی بات ہے۔ چنانچہ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے خود حضور علیہ السلام
سے بشریت کا اعلان کروا دیا ہے تاکہ کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

عقیدۂ توحید

فرمایا میری طرف وحی کی جاتی ہے أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ
تمہارا معبود برحق صرف ایک ہی معبود ہے۔ اسی نکتے پر اکثر لوگ
گمراہ ہو جاتے ہیں۔ ہر توحید پرست نے غیر اللہ کو معبود بنانے کی مخالفت
کی ہے۔ اصحاب کہف نے بھی یہی کہا تھا هَٰؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا
مِن دُونِهِ آلِهَةً (الکہف۔ ۱۵) یہ ہماری قوم کے لوگ ہیں
جنہوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں مگر ہم اس عقیدہ کو
نہیں مان سکتے۔ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے
اس کی ذات، صفات، افعال اور عبادت میں کوئی بھی شریک نہیں
لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (الشوریٰ۔ ۱۱) اس کی مثل کوئی چیز
نہیں۔ جو شخص خدا تعالیٰ کی کسی صفت خاصہ میں کسی دوسری ہستی کو شریک ٹھہرائے
گا۔ وہ کافر و مشرک ہو کر جہنم رسید ہوگا۔ کبھی کسی کو عبادت میں شریک
کرے یا کسی صفت میں یا اللہ کی صفت مخلوق میں مانے۔ غیر اللہ کو علم کل
تسلیم کرے، قدرت تامہ کا مالک سمجھے۔ حاجت روا اور مشکل کشا مانے اس
کے تقرب کی خاطر اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے نذر و نیاز پیش کرے،

سے نفع اور ضرر سمجھے، وہ شخص شرک میں مبتلا ہو گیا۔ عبادت انتہائی درجے کی تعظیم کو کہا جاتا ہے، یہ قولی بھی ہوتی ہے اور فعلی اور جسمانی بھی۔ جو کوئی آدمی کسی غیر اللہ کو متصرف اور نفع نقصان کا مالک سمجھ کر اس کی عبادت کرے گا وہ مشرک ہو گا۔

شرک کی مختلف قسمیں

اس وقت شرک کی بے شمار قسمیں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرنا، اس کے تقرب کے لیے جانور ذبح کرنا، اسے عالم الغیب سمجھنا سب شرک کی اقسام ہیں۔ خدا کے سوا غیر کی قسم اٹھانا اور دل میں اس کی تعظیم کرنا، کسی کے سامنے رکوع و سجود بجا لانا، غیر اللہ کی حد سے زیادہ تعظیم کرنا سب شرک میں داخل ہے۔ بچوں کے نام رکھنے میں بھی شرک ہوتا ہے، اگر کسی کو غیر اللہ کے ساتھ منسوب کر دیا تو یہ شرک ہو گا کیونکہ خالق صرف اللہ ہے۔ اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی زندگی میں تو ان کی بات پر عمل نہیں کرتے مگر مرنے کے بعد ان کی قبروں کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔ ہر نیا وزیر سب سے پہلے حضرت علی ہجویریؒ کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھاتا ہے تاکہ اس بزرگ کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کر سکے یہ بھی شرکیہ فعل ہے۔ چادر چڑھا کر سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے کوئی بہت بڑا سرانجام دے دیا ہے۔ بھائی۔ اس سے نہ تو اس بزرگ کو کچھ فائدہ ہے اور نہ مخلوق خدا کو۔ اگر ان بزرگوں سے محبت ہے تو ان کی تعلیمات پر عمل کرو اور ان کے لیے دعا کرو جو سنت طریقہ ہے۔ چادر چڑھانے کی رسم ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ بیرونی ممالک سے وفود آتے ہیں تو محمد علی جناح کی قبر پر پھولوں کی چادریں چڑھاتے ہیں۔ جواب میں ہمارے وفود بھی بیرون ملک جا کر چادریں چڑھاتے ہیں۔ خواہ وہ مشرکوں اور ملحدوں کی قبریں ہی کیوں نہ ہوں، یہ باتیں شرک ہیں یا بدعت ہیں اللہ نے خبردار کیا ہے کہ شرک کی وبا دنیا میں بہت زیادہ پھیل چکی ہے

اور لوگ ہیں کہ سمجھانے سے بھی نہیں سمجھتے۔

فرمایا میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود برحق صرف ایک ہی معبود ہے۔ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ پس جو کوئی مرنے کے بعد اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہے یا اس بات سے خوف کھاتا ہے کہ اس کے سامنے پیش ہو کر حساب کتاب دینا ہے فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا پس اُسے چاہیئے کہ وہ نیک اعمال انجام دے وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔ اصولِ نجات یہی ہے۔

شرکِ خفی

شرک کی جملہ اقسام میں سے ایک شرکِ خفی بھی ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ مجھے اپنی امت کے لوگوں سے شرکِ خفی کا بڑا ڈر ہے عرض کیا گیا، حضرت! وہ کیا ہے؟ فرمایا، ریا سے سارا عمل برباد ہو جاتا ہے۔ جو شخص دوسرے لوگوں کو سنانے کے لیے کوئی کام کرتا ہے، اللہ تعالے اُس کو رسوا کرے گا۔ اور جو کوئی لوگوں کو دکھانے کے لیے کوئی عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کو بھی رسوا کرے گا۔ جس شخص نے دوسروں کی خاطر کوئی کام کیا اور رضائے الٰہی کو پیشِ نظر نہ رکھا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا۔ اَنَا اَغْنَى الشُّرَكَآءِ بِشِرْكًا میں ان شریکوں کے شرک سے بے نیاز ہوں۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ جس نے غیر اللہ کی رضا کے لیے کوئی کام کیا، میں اس سے کہوں گا کہ اس عمل کا ثواب اسی سے طلب کر جس کی رضا کی نیت سے کیا تھا میں تو اس کا کوئی اجر نہیں دوں گا۔ غرضیکہ ریا شرکِ خفی یا شرکِ اصغر ہے جس سے اعلیٰ ترین عمل بھی باطل ہو جاتا ہے۔

قبولیتِ عبادت کی شرائط

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قبولیتِ عبادت کی دو شرطیں ہیں۔ پہلی شرط اخلاص ہے اور یہ توحیدِ خالص کے بغیر انسان میں پیدا نہیں ہوتا۔

اللہ کا فرمان ہے "فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" (المومن - ۶۵)
پس تم خالص اسی کی عبادت کرتے ہوئے اُس کو پکارو۔ نفاق سے بیزاری اور
ایمان سے اخلاص پیدا ہوتا ہے۔ فرمایا قبولیت عمل کی دوسری شرط یہ ہے
کہ عمل حضور علیہ السلام کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو۔ "مَنْ عَمِلَ عَمَلاً
لَيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ" جس شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جو ہمارے طریقے
کے مطابق نہیں ہے تو حضور کا فرمان ہے کہ ایسا عمل مردود ہے، قبول نہیں
ہوگا۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ لوگ عمل کرنے سے پہلے دریافت نہیں
کرتے کہ اس عمل کی کیا حیثیت ہے بلکہ اپنی من مانی کرتے ہیں۔ اگر لوگ
صحیح طریقہ معلوم کریں تو فلاح حاصل کر لیں۔

فضائل سورۃ

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورۃ الکہف کی بڑی فضیلت بیان فرمائی
ہے۔ اگر بروز جمعہ پوری سورۃ کی تلاوت کی جائے تو اس کا بہت بڑا اجر ہے
اگر یہ نہ ہو سکے تو دس آیات ابتدائی اور دس آیات آخری تلاوت کرنے والے
کو بڑی نورانیت حاصل ہوگی صرف ابتدائی دس آیتیں یا کم از کم تین ابتدائی آیتیں بھی
فتنہ دجال سے حفاظت کی ضامن ہوں گی۔ بہت سے دجالی فتنوں میں سے
سب سے بڑا فتنہ اُس وقت پیدا ہوگا جب دجال کا خروج ہوگا۔ حضرت عمرؓ کی
روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص سونے سے قبل سورۃ الکہف کی آخری آیت
تلاوت کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے سر سے لے کر پاؤں تک نورانیت عطا فرمائے
گا۔ اس روایت کو امام ابن کثیرؒ نے بھی بیان کیا ہے۔ امام شاہ ولی اللہ
محدث دہلویؒ نے اس روایت کو "ازالۃ الخفا" میں حضرت عمرؓ سے
روایت کیا ہے۔ بہر حال یہ سورۃ دجال اور دجالی فتنوں سے بچاؤ میں
خاص اثر رکھتی ہے۔ خاص طور پر دس ابتدائی اور دس آخری آیات۔ اگر
کوئی پوری سورۃ تلاوت کرے تو یہ اُس کے حق میں بہت بہتر ہوگا۔

سورۃ مریم
مکمل

قَالَ الَم ۱۶ — مریم ۱۹

درس اول ۱ — آیت ۱ تا ۴

سُوْرَةُ مَرْيَمَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانٌ وَّتِسْعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا سِتُّ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ مریم مکی ہے اور یہ اٹھانوے ۹۸ آیات اور اسمیں چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿١﴾ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ﴿٢﴾ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴿٣﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿٤﴾

ترجمہ :- كٓهٰيٰعٓصٓ ﴿١﴾ یہ ذکر ہے تیرے پروردگار کی رحمت کا جو اس نے اپنے بندے زکریا علیہ السلام پر کی ﴿٢﴾ جب کہ پکارا اس نے اپنے پروردگار کو پکارنا آہستہ آواز سے ﴿٣﴾ اس نے کہا، اے میرے پروردگار! بیشک میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں، اور بھڑک اٹھا ہے سر سفیدی سے، اور نہیں میں تجھ سے دعا کرنے میں محروم ﴿٤﴾

کوائف و زمانۂ نزول

اس سورۃ میں حضرت مریمؑ کا ذکر ہے، لہٰذا یہ سورۃ آپ ہی کے نام پر سورۃ مریم کے نام سے موسوم ہے۔ یہ سورۃ اٹھانوے آیات اور چھ رکوع پر مشتمل ہے۔ اس کے ۹۶۲ الفاظ اور ۳۸۰۲ حروف ہیں۔

یہ سورۃ مکی زندگی کے ابتدائی دور میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔

اس امر کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ سن پانچ اور چھ نبوی میں جب صحابہ کرام کی دو جماعتیں مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ پہنچیں تو وہاں کے بادشاہ نجاشی نے مسلمانوں کے حالات معلوم کرنا چاہے۔ چنانچہ حضرت جعفرؓ امیر قافلہ نے نجاشی کے سامنے نہ صرف حضور علیہ السلام اور مسلمانوں کے حالات بیان کیے بلکہ سورۃ مریم کی ابتدائی آیات کی تلاوت بھی کی جن میں حضرت مریمؑ اور اور مسیح علیہ السلام کی ولادت اور دیگر حیران کن واقعات مذکور ہیں۔

ہجرت حبشہ

جب مشرکین مکہ نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا اور انہیں طرح طرح کی تکالیف پہنچانے لگے تو حضور علیہ السلام نے صحابہؓ کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دے دیا۔ اُس وقت حبشہ میں نجاشی بادشاہ حکمران تھا جو کہ انصاف پسند تھا۔ لہٰذا آپ نے اس علاقہ کو مسلمانوں کے لیے زیادہ محفوظ تصور کیا۔ چنانچہ حبشہ کی طرف یکے بعد دیگرے مسلمانوں کی دو جماعتوں نے ہجرت کی۔ پہلی جماعت میں بارہ مرد اور چار عورتیں شامل تھیں جن میں حضرت عثمانؓ اور اُن کی بیوی حضور کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ بھی شامل تھیں۔ دوسری جماعت ۸۲ یا ۸۳ افراد پر مشتمل تھی جن میں ۱۸ عورتیں بھی شامل تھیں۔

مضامین سورۃ

اس سورۃ مبارکہ میں تین مرکزی مضامین بیان ہوئے ہیں یعنی (۱) توحید (۲) رسالت، اور (۳) جزائے عمل۔ اس کے علاوہ بہت سی ضمنی باتیں بھی آگئی ہیں۔ جس طرح گزشتہ سورۃ میں اللہ کے انبیاء اور اولیاء کا ذکر تھا، اسی طرح اس سورۃ مبارکہ میں بھی اللہ نے کئی نبیوں کا حال بیان فرمایا ہے۔ ابتداء میں حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر ہے، اس کے بعد حضرت یحییٰ علیہ السلام۔ پھر حضرت مریمؑ اور مسیح علیہ السلام کا تذکرہ ہے۔ آگے ابراہیم علیہ السلام اور پھر حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے واقعات بھی آئیں گے۔ یہ سارے نبی اپنی حاجتیں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں پیش کرتے تھے اسی کو وحدہٗ لاشریک اور متصرف فی الامور سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس کے سوا

نہ کوئی عالم الغیب ہے، نہ مشکل کشا اور حاجت روا۔ یہ تمام انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ہمیشہ امیدوار رہتے تھے۔ اس کے برخلاف ان انبیاء کے پیروکاروں نے انہی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنا شروع کر دیا۔ عیسائیوں نے مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہہ دیا اور اُن کی والدہ حضرت مریمؑ کو مادرِ خدا کا درجہ دے دیا (نعوذ باللہ) اور پھر انہیں متصرف فی الامور مان کر اُن سے حاجتیں طلب کرنے لگے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی دُعا کا ذکر ابتدائے سورۃ میں ہی ہے کہ انہوں نے اللہ سے اولاد کے لیے درخواست کی تھی۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا ذکر بھی ہے۔ اس طرح اللہ نے توحید کا مسئلہ سمجھایا ہے اور انبیاء کا ذکر کر کے اللہ نے نبوت و رسالت کا مسئلہ بھی واضح کر دیا ہے۔ تیسرا مسئلہ وقوعِ قیامت اور جزائے عمل کا ہے وہ بھی اس سورۃ میں بیان ہو گیا ہے

حروف مقطعات

اس سورۃ کی ابتداء حروفِ مقطعات سے ہوئی ہے کٓھٰیٰعٓصٓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ یہ اسماء اللہ میں سے اللہ کا ایک نام ہے۔ حضرت علیؓ کی بعض روایات سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے بعض فرماتے ہیں کہ جس طرح بعض سورتوں کے نام حروفِ مقطعات پر ہیں جیسے قٓ، صٓ، نٓ، یٰسٓ، طٰسٓمٓ اسی طرح کٓھٰیٰعٓصٓ بھی اسی سورۃ مبارکہ کا نام ہے بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ان حروف مقطعات کا ہر حرف اللہ تعالیٰ کے کسی اسم صفت کو ظاہر کرتا ہے جیسے کٓ سے کفایت کرنے والا کافی جو کہ اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے ھٰ سے ھادی۔ یٰ سے ید کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے یعنی خدا تعالیٰ کا ہاتھ تمام ہاتھوں پر غالب ہے اسی طرح حرف عٓ سے اسم علیم یا عظیم مراد ہے علیم کل اور عظمت الاصرف خداوند قدوس ہے۔ اور صٓ سے مراد صادق ہے یعنی سچائی کا منبع صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اس بات کی دلیل ہے

تو ثابت نہیں کیا جا سکتا ۔ البتہ بطور کشف اور ذوق اللہ نے مجھے یہ بات سمجھائی ہے کہ یہ حروف دراصل سورۃ کا اجمالی نام ہیں اور ان میں سورۃ کا خلاصہ بیان ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر فرماتے ہیں کہ بعض کلی نام ہوتے ہیں ۔ جن کے ساتھ ایک حقیقت وابستہ ہوتی ہے جیسے سلطان یا قاضی وغیرہ ۔ آج کل ڈگری کے ناموں ۔ بی اے ، ایم اے ، پی ایچ ڈی وغیرہ کے اندر بھی ایک پوری حقیقت ہوتی ہے ، اسی طرح حروف مقطعات بھی متعلقہ سورۃ کا اجمالی خلاصہ ہوتے ہیں ۔ چنانچہ کٓھٰیٰعٓصٓ کا اجمالی خلاصہ یہ ہے کہ نقش علوم اس مادی جہان میں آکر اس طرح متعین ہوتے ہیں کہ لوگوں کے ذہن میں رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والی بات آ سکے ۔

امام جلال الدین سیوطیؒ اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ اس معاملہ میں اسلم یعنی زیادہ سلامتی والی بات یہ ہے کہ انسان کا عقیدہ یہ ہو اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِمُرَادِہٖ بِذٰلِکَ یعنی ان حروف کی صحیح مراد کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے ۔ وہ مراد برحق ہے اور ہمارا اس پر پختہ یقین ہے ہم اس کے متعلق قطعی اور یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے ، ہمارا کام ایمان لانا اور تصدیق کرنا ہے ۔ یہ ساری باتیں تقریب ذہن کے لیے بیان ہوئی ہیں کیونکہ خود حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہؓ سے ان حروف کی تفصیل یا معانی منقول نہیں ہیں ۔

زکریا علیہ السلام کی شخصیت

سورۃ کی ابتدا حضرت زکریا علیہ السلام کے واقعہ سے ہوتی ہے ۔ ذِکْرُ رَحْمَتِ رَبِّکَ عَبْدَہٗ زَکَرِیَّا یہ ذکر ہے تیرے پروردگار کی رحمت کا جو اس نے اپنے جلیل القدر نبی زکریا علیہ السلام پر فرمائی ۔ آپ کی جائے سکونت یروشلم تھی جسے بیت المقدس بھی کہا جاتا ہے اور یہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے ۔ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ زکریا علیہ السلام بڑھئی کا کام کر کے اپنے ہاتھ سے رزق کماتے تھے ۔ کسی پیشے کو یا اس کو اختیار کرنے والے کو حقیر سمجھنا نہایت ہی نادانی کی بات ہے مگر اکثر لوگ اس

[1] جلالین صـ۲ (فیاض)

جہالت میں ملوث ہیں۔ کپڑا بننے والے کو حقیر سمجھنا، برتن بنانے والے یا کپڑا سینے والے کو کمتر خیال کرنا، بجائے خود ضلالت کی علامت ہے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ جو شخص حقارت سے آدم علیہ السلام کو جولاہا یا ادریس علیہ السلام کو درزی کہے گا، اس پر کفر لازم آئے گا۔ بعض دولت مند اور زمیندار لوگ دوسروں کو کمین سمجھتے ہیں تاکہ وہ ان کے سامنے دبے رہیں اور ان کے حلقۂ اثر سے باہر نہ نکل سکیں۔ دراصل ذلت و حقارت کسی پیشے کی وجہ سے نہیں بلکہ اخلاق کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جس شخص کا اخلاق اچھا نہیں اور جو معاصی و ممنوعات اور مکروہات میں ملوث ہے، شریعت اور احکام الٰہی کی پروا نہیں کرتا ہے۔ درحقیقت ذلیل اور حقیر تو وہ ہے۔ شریعت آدمی کوئی بھی جائز پیشہ اختیار کرے، اللہ کی نظروں میں وہ حقیر نہیں ہے۔ بہرحال فرمایا کہ یہ ذکر ہے تیرے پروردگار کی رحمت کا جو اس نے اپنے بندے زکریا علیہ السلام پر کی۔ گزشتہ سورۃ میں اصحاب کہف، حضرت موسیٰ اور خضر علیہ السلام اور سکندر ذوالقرنین کا حال بیان ہو چکا ہے کہ یہ سب لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے طلبگار تھے۔ یہ خود متصرف فی الامور نہیں تھے کہ ان سے حاجت براری کی جائے۔

حضرت زکریا علیہ السلام کا تعارف کرانے کے بعد فرمایا اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا جب کہ پکارا اس نے اپنے پروردگار کو آہستہ پکارنا۔ ندا کا عام فہم معنی تو پکارنا ہوتا ہے، تاہم یہاں پر اس سے دعا مراد ہے یعنی انہوں نے اپنے پروردگار کے حضور چپکے چپکے سے دعا کی۔ دعا اگرچہ بلند آواز سے بھی کی جا سکتی ہے تاہم آہستہ آواز سے کرنا زیادہ افضل ہے۔ امام ابوبکر جصاص نے اپنی تفسیر میں حضرت سعد بن ابی وقاص کی روایت نقل کی ہے۔ خَيْرُ الذِّكْرِ الْخَفِيُّ وَخَيْرُ الرِّزْقِ مَا يَكْفِيْ بہتر ذکر وہ ہے جو آہستہ ہو اور بہتر روزی وہ ہے جو انسان کے لیے کفایت

چپکے چپکے دعا

کر جائے۔ خود قرآن میں بھی موجود ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (الاعراف۔ ۵۵) اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور آہستگی سے پکارو کیونکہ وہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ آہستگی میں بہتری یہ ہے کہ انسان ریا سے بچ جاتا ہے، تاہم اگر کسی دوسرے کے معاملہ میں خلل اندازی نہ ہوتی ہو تو ذکر بلند آواز سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر آپ کا بلند آواز سے صلوٰۃ وسلام پڑھنا خلل کا باعث ہو تو فقہائے کرام کے نزدیک ایسا کرنا مکروہ ہوگا۔ اور ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ ایک دوسرے کے سامنے قرآن پاک بھی بلند آواز سے نہ پڑھو تاکہ خلل واقع نہ ہو۔ فرض کرو ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے اور دوسرا ذکر بالجہر کر رہا ہے تو یہ کوئی نیکی کی بات نہیں بلکہ نماز میں خلل اندازی ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا اور ذکر آہستہ آواز سے کرنا بلند آواز سے کرنے کی نسبت ستر گنا زیادہ افضل ہے۔ غرضیکہ نِدَاءً خَفِيًّا سے مراد آہستہ دعا کرنا ہے جیسا کہ دعا کے اگلے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے۔

عجز و انکساری کا اظہار

قَالَ تو زکریا علیہ السلام نے چپکے چپکے سے عرض کیا رَبِّ إِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ اے میرے پروردگار! بیشک میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں۔ وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا اور میرا سر سفیدی سے بھڑک اٹھا ہے۔ سر کے بال سفید ہو چکے ہیں، جسم کمزور پڑ گیا ہے، گویا مجھ پر بڑھاپا طاری ہوگیا ہے۔ یہ زکریا علیہ السلام کی طرف سے عاجزی، انکساری اور کمزوری کا اظہار ہو رہا ہے۔ دعا میں جس قدر انکساری پائی جاتی ہے دعا اسی قدر بارگاہ الٰہی میں شنوائی کے قابل ہوتی ہے۔ دعا میں جس قدر اخلاص، نیازمندی اور حضورِ قلب ہوگا۔ دعا اسی قدر مقبول ہوگی۔ زکریا علیہ السلام نے اپنے بڑھاپے کا ذکر اللہ تعالیٰ کا رحم اور مہربانی حاصل کرنے کیلئے

گیا۔ سعدی صاحب نے بھی گلستان میں کہا ہے۔

رسم است کہ مالکان تحریر

آزاد کنند بندۂ پیر

یعنی دستور یہ ہے کہ غلاموں کے آقا اپنے بوڑھے غلاموں کو آزاد کر دیتے ہیں۔ جب خدمت کرنے کے قابل نہ رہا تو پھر آزاد کر دیا۔ شیخ سعدی نے بھی اسی اصول کے تحت اللہ تعالیٰ کی طرف سے جذبہ ترحم پیدا کرنے کے لیے اپنے بڑھاپے کا ذکر کیا ہے کہ اس عمر میں اللہ مجھے معاف فرمائے۔ تو حضرت زکریا علیہ السلام نے بھی دعا کی قبولیت کے لیے اپنے بڑھاپے اور کمزوری کا ذکر کیا۔ اور پھر عرض کیا۔ پروردگار! وَلَمْ أَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا اور میرے پروردگار! نہیں ہوں میں تجھ سے دعا کرنے میں محروم۔ مطلب یہ کہ مجھے امید ہے کہ اس عمر میں اور عاجزی کی حالت میں تو میری اس دعا کو رد نہیں کرے گا۔ بعض مفسرین یہ معنی بھی کرتے ہیں کہ اے پروردگار! میں تیری دعوت پر کبھی بدبخت ثابت نہیں ہوا۔ تو نے جب بھی مجھے بلایا ہے، میں نے تیرے حکم کی تعمیل میں کوشش کی ہے اور کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ اب بوڑھا ہو کر تیری بارگاہ میں درخواست کر رہا ہوں، مجھے امید ہے کہ تو مجھے اس دعا سے محروم نہیں کرے گا۔ اس دعا کا متن اگلی آیات میں آرہا ہے۔

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ﴿۵﴾ یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ﴿۶﴾

ترجمہ :- اور تحقیق میں خوف کھاتا ہوں اپنے بھائی بندوں سے اپنے پیچھے اور میری عورت بانجھ ہے ۔ پس مجھے عطا کر اپنی طرف سے جانشین ﴿۵﴾ جو میرا وارث ہو اور آل یعقوب کا وارث ہو ، اور بنا دے اس کو اے پروردگار ! پسندیدہ ﴿۶﴾

حضرت زکریا کی دعا

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے نہایت عاجزی کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں ہاتھ پھیلائے تھے کہ مولا کریم ! میری ہڈیاں کمزور ہو چکی ہیں اور سر سفید ہو گیا ہے ۔ میں قبولیت دعا سے کبھی محروم نہیں رہا ، لہٰذا میں امید رکھتا ہوں کہ تو میری دعا کو ضرور شرف قبولیت بخشے گا ۔ آپ کی یہ دعا اولاد کے لیے تھی ۔ عرض کیا ، پروردگار وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ بیشک میں اپنے پیچھے اپنے بھائی بندوں سے خوف کھاتا ہوں ۔

موالی جمع ہے مولیٰ کی ۔ یہ لفظ عربی زبان میں بہت سے معانی میں استعمال ہوتا ہے ۔ صاحب قاموس نے اس لفظ کے پچیس معنی لکھے ہیں جن میں غلام ، آزاد شدہ غلام ، غلام آزاد کرنے والا ، رفیق ، ساتھی ، آقا اور چچا زاد بھائی وغیرہ شامل ہیں ۔ یہ مشترک لفظ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ، آنحضرت کے لیے اور حقیر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ تاہم اس مقام پر موالی سے مراد چچا زاد بھائی ہیں ۔

زکریا علیہ السلام نے عرض کیا کہ میں اپنے بھائی بندوں یعنی قرابت داروں سے خوف

کھاتا ہوں کہ میرے بعد وہ میرے دینی مشن کو صحیح طریقے سے آگے نہیں بڑھا
سکیں گے۔ وہ نالائق ہیں اور میری نیابت کا کما حقہٗ حق ادا نہیں کر سکیں گے
اور دوسری بات یہ ہے وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا اور میری عورت
بانجھ ہے، وہ بچہ پیدا کرنے کے قابل ہی نہیں جس کی وجہ سے میں ساری عمر
اولاد سے محروم رہا ہوں۔ میری التجا ہے فَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ
وَلِيًّا کہ مجھے اپنی طرف سے جانشین عطا فرما۔ ولی کا معنیٰ کارساز بھی ہوتا
ہے اور قرابت دار بھی، تاہم یہاں پر جانشین مراد ہے جو میرے بعد
میرا فرضِ دین ادا کر سکے۔ يَرِثُنِي جو میرا وارث ہو وَيَرِثُ
مِنْ آلِ يَعْقُوبَ اور تمام آلِ یعقوب کا وارث ہو۔ یَرِثُ کا معنیٰ
مورث کے مال پر قابض ہوتا ہے۔ اللہ نے سورۃ النساء میں وراثت
کا تفصیلی قانون بیان فرمایا ہے کہ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا ہے تو
اس کے ترکہ کے وارث کون کون عزیز و اقارب ہوتے ہیں۔

مسئلہ وراثت اور شیعہ حضرات

تمام اہلِ سنت کے نزدیک نبی اور امتی کی وراثت میں فرق ہے۔ ہر
امتی جو بھی کوئی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد چھوڑ کر فوت ہو جاتا ہے، اس کے
وارث بمطابق احکاماتِ الٰہیہ اس کی اولاد اور دیگر عزیز و اقارب ہوتے ہیں
جب کہ نبی کی فوتیدگی کے بعد اس کے مال کے وارث اس کے عزیز
نہیں ہوتے، بلکہ اگر کوئی مال موجود ہو تو وہ صدقہ ہوتا ہے۔ برخلاف اس
کے رافضی اور شیعہ وراثت کے معاملہ میں نبی اور امتی میں کوئی فرق نہیں سمجھتے
بلکہ امتیوں کے قانونِ وراثت کو نبی کی وراثت پر بھی نافذ العمل سمجھتے ہیں
وہ اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر قرآن پاک کی تین آیات پیش کرتے
ہیں ایک آیت تو یہی ہے جو زیرِ درس ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام
نے دعا کی کہ مولا کریم! مجھے ایک جانشین عطا فرما جو میرا اور آلِ یعقوب
کا وارث ہو۔ دوسری آیت "وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ" (النمل - ۱۶)

ہے جس کا معنیٰ ہے کہ سلیمان علیہ السلام، داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے۔
شیعہ حضرات تیسری آیت سورۃ النساء کی پیش کرتے ہیں "یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْۤ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ" (آیت ۱۱)
اولاد کے بارے میں اللہ تعالیٰ انہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ وراثت اسی طرح تقسیم کرو کہ ہر لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہو۔ کہتے ہیں کہ ان آیات سے انبیاء کی وراثت ثابت ہوتی ہے اور اسی بناء پر حضرت فاطمہؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے حضور علیہ السلام کی وراثت کا مطالبہ کیا تھا۔ مگر آپ نے انکار کر دیا۔ شیعہ حضرات کی طرف سے صحابہ کرامؓ کو برا بھلا کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

صحیح صورت حال

اس مسئلہ کی صحیح صورت حال یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی مال و دولت میں وراثت نہیں ہوتی جس کا ثبوت خود حضور علیہ السلام کا یہ فرمان ہے۔
نَحْنُ مَعْشَرَ الْاَنْبِیَاءِ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَکْنَا صَدَقَۃٌ
ہم گروہ انبیاء کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے بلکہ جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ اس حدیث کو صحابہ کی کثیر جماعت نے نقل کیا ہے۔ جس میں خلفائے راشدینؓ اور عشرہ مبشرہؓ شامل ہیں۔ اس روایت کے راویوں میں حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ بھی شامل ہیں جو کہ اہل بیت میں سے ہیں حضرت عمرؓ نے ان دو بزرگوں سے خدا تعالیٰ کی قسم دے کر پوچھا کہ کیا تم اس حدیث مبارک کو جانتے ہو تو انہوں نے کہا کہ ہاں! ہم نے یہ حدیث حضور علیہ السلام کی زبان مبارک سے سنی ہے۔ اس سے معلوم ہوا شیعہ حضرات کا استدلال سورۃ نساء کی مذکورہ آیت سے درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس سورۃ میں بیان کردہ وراثت کا پورا قانون امت کے لیے ہے اور نبی کی ذات اس سے مستثنیٰ ہے۔ پیغمبر علیہ السلام کے بعض احکام سے استثناء کی بعض دوسری مثالیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً سورۃ نساء کی

آیت ۳ میں فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ مسلمانوں مردوں کو دو دو، تین تین اور چار چار عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ بظاہر یہ حکم عام ہے اور اس میں نبی اور امتی سب شامل ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ نبی کی ذات اس حکم سے مستثنیٰ ہے جیسا کہ سورۃ احزاب سے ظاہر ہے۔ حضور علیہ السلام نے زندگی میں کل گیارہ عورتوں سے نکاح کیا۔

حضرت فاطمہؓ نے ایک موقع پر حضرت ابوبکرؓ سے اپنے باپ کی وراثت کا مسئلہ پیش کیا تھا۔ انہوں نے حضرت صدیق اکبرؓ سے پوچھا کہ آپ کے بعد آپ کا وارث کون ہوگا۔ آپ نے فرمایا میری اولاد۔ اس پر حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ پھر میرے باپ کی وراثت مجھے ملنی چاہیئے۔ اس کے جواب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وہی حدیث پیش کی جس میں آپ کا فرمان ہے کہ ہم نبیوں کا گروہ کسی کو وارث نہیں بناتے بلکہ ہمارا جو مال بچ جائے وہ صدقہ ہوتا ہے۔ اس پر حضرت فاطمہؓ نے کہا فَاَنْتَ اَعْلَمُ مَا سَمِعْتَ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یعنی جو بات آپ نے حضور علیہ السلام کی زبان اقدس سے سنی ہے اس کو آپ بہتر جانتے ہیں۔ یہ کہہ کر آپ خاموش ہوگئیں اور اس کے بعد وراثت کا مطالبہ نہیں کیا۔

مسئلہ یہی ہے کہ نبی خود تو وارث ہوتا ہے مگر کسی دوسرے کو اپنا وارث نہیں بناتا۔ خود حضور علیہ السلام کو اپنے باپ کی وراثت سے ایک خچر، ایک لونڈی ام ایمن اور کچھ دوسرا سامان ملا تھا جس کا ذکر صاحب طبقات ابن سعد اور دیگر سیرت نگار حضرات نے کیا ہے۔ حدیث میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں[1] کہ گروہ انبیاء لَمْ یُوَرِّثُوْا دِرْھَمًا وَّلَا دِیْنَارًا بیٹے بیٹے کو وارث نہیں بنایا کرتے۔ اِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ بلکہ وہ علم کا وارث بناتے ہیں فَمَنْ اَخَذَہٗ اَخَذَ بِحَظٍّ وَّافِرٍ جس نے یہ

[1] ترمذی صفحہ ۹۸ ج ۲ (فیاض)

بجز بے بی اُس نے وراثت کا بڑا حصہ حاصل کر لیا۔ گویا نبی کا مال و اسباب تو صدقہ ہوتا ہے، البتہ علم کی وراثت میں جو کوئی جتنا چاہے حصہ حاصل کر لے۔

جہاں تک آیت زیرِ درس میں زکریا علیہ السلام کی دُعا کا تعلق ہے کہ آپ نے درخواست کی کہ مولا کریم! مجھے جانشین عطا فرما جو میرا اور آلِ یعقوب کا وارث ہو، تو اس سے بھی جائداد کی وراثت مراد نہیں بلکہ علمی نیابت مراد ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ زکریا علیہ السلام مزدور پیشہ آدمی تھے بڑھئی کا کام کر کے بمشکل زندگی میں گزر اوقات کرتے تھے۔ وہ کوئی لمبی چوڑی جائداد کے مالک نہیں تھے جس کی انہیں فکر ہوتی کہ اُن کے بعد اس کو کون سنبھالے گا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کوئی ایسا جانشین عطا فرما جو اُن کے بعد تبلیغ دین کا کام کر سکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پوری آلِ یعقوب کا وارث ایک شخص تو نہیں ہو سکتا۔ مال و دولت کا وارث تو قریبی عزیز ہی ہو سکتا ہے نہ کہ کوئی ایک شخص جس کے لیے زکریا علیہ السلام دُعا کر رہے ہیں۔ یہ بھی قرینہ ہے کہ زکریا علیہ السلام کی مراد جائداد کی وراثت نہیں تھی بلکہ پوری آلِ یعقوب کی علمی وراثت مراد تھی۔

سورۃ نمل کی جس آیت میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث بنے تو اس سے بھی علمی وراثت مراد ہے نہ کہ مال و دولت اگر اس سے مادی وراثت مراد ہو تو حضرت داؤد علیہ السلام کے حضرت سلیمان علیہ السلام کے علاوہ اٹھارہ بیٹے اور بھی تھے۔ اس معاملہ میں حضرت ایک بیٹے کو وارث بنانا اور باقی اٹھارہ کو محروم کر دینا تو کسی طرح قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ اصل بات یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے علاوہ حضرت داؤد علیہ السلام کے باقی بیٹے اس قابل نہیں تھے کہ وہ آپ کی علمی وراثت کے وارث بنتے۔ اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا اور وہ بارِ خلافت اٹھانے کے قابل تھے۔ چنانچہ باپ کی وفات

کے بعد صرف تیرہ سال کی عمر میں آپ اپنے باپ کے جانشین بنے۔ آپ نبی اور صاحب صحیفہ رسول تھے۔ اللہ نے آپ کو بے مثال سلطنت عطا فرمائی۔ یہ بھی اس بات کا قرینہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی وراثت علمی تھی نہ کہ مالی۔

قرآن پاک میں وراثت کا لفظ کتاب کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جیسے "وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْکِتٰبَ" (الشوریٰ - ۱۴) یعنی وہ لوگ جو کتاب کے وارث بنے۔ دوسری جگہ ہے "ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ" (فاطر - ۳۲) پھر ہم نے لوگوں کو کتاب کا وارث بنایا جن کے آگے تین گروہ بن گئے، ایک گروہ صادقین کا، دوسرا میانہ روی والا اور تیسرا ظلم کرنے والوں کا۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، اے لوگو! قُوْمُوْا عَلٰی مَشَاعِرِکُمْ فَاِنَّکُمْ عَلٰی اِرْثٍ مِّنْ اِرْثِ اَبِیْکُمْ اِبْرٰھِیْمَ حج کے شعائر پر کھڑے ہو جاؤ کیونکہ تم اپنے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وراثت پر ہو۔ ابراہیم علیہ السلام حج کے لیے منیٰ، مزدلفہ اور عرفات میں گئے، انہوں نے قربانی کی اور طواف کیا۔ چونکہ تم اُن کی وراثت پر ہو، لہٰذا تم بھی یہی کام کرو۔ یہاں پر وراثت سے مراد مال و دولت کی وراثت نہیں بلکہ دینی اور ملی وراثت ہے۔ عربوں کے محاورے میں وراثت کا لفظ بزرگی پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے عرب کہتے ہیں وَرِثْنَا الْمَجْدَ یعنی ہم اپنے آباؤ اجداد کی بزرگی کے وارث بنے ہیں۔ مقصد یہ کہ وراثت کا اطلاق مال کے علاوہ دوسری چیزوں پر بھی ہوتا ہے اور آیت زیر درس میں زکریا علیہ السلام کی وراثت سے مراد اُن کی دینی خلافت ہے نہ کہ مال و دولت۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ زکریا علیہ السلام جب بڑے عالم تھے تو اس مقام پر اُس کی ضرورت اور غنیمت

کی جانشینی مراد ہے ۔ ان تمام قرائن کی موجودگی میں شیعہ کا وراثت سے متعلق استدلال درست نہیں ہے ۔

زکریا علیہ السلام نے دعا میں یہ بھی عرض کیا وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا اے پروردگار! میرے جانشین کو پسندیدہ بھی بنا دے کیونکہ اچھے اخلاق کے حامل لوگ ہی دنیا میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور اپنے مشن کو آگے چلا سکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے خود حضور علیہ السلام کو بلند ترین اخلاق کا حامل قرار دیا وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (القلم - ۴) بیشک آپ خلق عظیم پر ہیں۔ نبیوں کا اخلاق ہمیشہ معیاری ہوتا ہے ۔ اُن کا قول، فعل اور عمل ہر لحاظ سے پسندیدہ ہوتا ہے تو زکریا علیہ السلام نے اپنے جانشین کے لیے بھی اعلیٰ اخلاق کی دعا کی ۔

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝٧ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝٨ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ۝٩ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝١٠ فَخَرَجَ عَلٰي قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِـيًّا ۝١١

ترجمہ: (اللہ نے فرمایا) اے زکریا علیہ السلام! ہم خوشخبری دیتے ہیں تمہیں لڑکے کی جس کا نام یحیٰی ہو گا۔ نہیں بنایا ہم نے اس کے لیے اس سے پہلے کوئی ہم نام ⑦ کہا (زکریا نے) اے پروردگار! کیسے ہو گا میرے لئے لڑکا، اور میری عورت بانجھ ہے، اور بیشک میں پہنچ چکا ہوں بڑھاپے سے انتہائی درجہ کو ⑧ فرمایا (اللہ تعالیٰ نے) اسی طرح ہوگا یہ۔ فرمایا تیرے پروردگار نے یہ بات مجھ پر آسان ہے اور تحقیق میں نے پیدا کیا ہے تجھے اس سے پہلے

اور نہیں تھا تو کوئی چیز ⑨ عرض کیا (زکریا علیہ السلام نے) اے پروردگار بنا دے میرے لیے کوئی نشانی ۔ فرمایا تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو نہ کلام کرے گا لوگوں کے ساتھ تین رات تک صحیح سلامت ⑩ پس نکلے وہ اپنی قوم کے سامنے اپنے حجرے سے ۔ پس اشارہ کیا انہوں نے اُن کی طرف یہ کہ تسبیح بیان کرو صبح اور پچھلے پہر ⑪

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں حضرت زکریا علیہ السلام کی دُعا کا ذکر ہو چکا ہے ۔ اُن کی قوم اور خاندان کے لوگ ناپسندیدہ اخلاق کے حامل تھے ۔ اُن کی حالت کو دیکھتے ہوئے زکریا علیہ السلام کو سخت تشویش تھی کہ اُن کے بعد دین کی خدمت اور احکامِ الٰہی کی تبلیغ کا کام کون انجام دے گا ۔ چنانچہ انہوں نے بڑھاپے کی عمر میں اللہ رب العزت کے سامنے اولاد کے لیے درخواست پیش کی ۔ عرض کیا ، پروردگار ! مجھے ایسا پسندیدہ بیٹا عطا فرما جو میرے بعد میرا جانشین ہو اور پورے خاندانِ یعقوب کا بھی وارث ہو ۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ ایسا بیٹا عطا فرما جو میری علمی نیابت کا فریضہ انجام دے سکے ۔

سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے زکریا علیہ السلام کی اس دُعا کا داعیہ بھی بیان فرمایا ہے انہوں نے حضرت مریم کے پاس بے موسم پھل دیکھے تو پوچھا یٰمَرْیَمُ اَنّٰی لَکِ ھٰذَا (آل عمران ۳۷) اے مریم ! تیرے پاس یہ پھل کہاں سے آ گئے تو اس نے کہا ھُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ کہ یہ تو اللہ کی عطا ہے ۔ ھُنَالِکَ دَعَا زَکَرِیَّا رَبَّہٗ (آل عمران ۳۸) اس مقام پر زکریا علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے پاکیزہ اور پسندیدہ اولاد کی دُعا کی ۔ مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ دُعا کے وقت حضرت زکریا علیہ السلام کی عمر ۱۲۰ سال اور آپ کی بیوی کی عمر ۹۸ سال ہو چکی تھی اور ساری عمر اُن کے اولاد بھی نہیں ہوئی تھی ۔ ماہرین طب کہتے ہیں کہ اگر انسان کو کوئی بیماری یا کوئی خارجی حادثہ پیش نہ آئے تو اس کی طبعی عمر یہی ہے جس کو حضرت زکریا علیہ السلام پہنچ چکے تھے ۔ اگرچہ

عمر کم و بیش بھی ہو سکتی ہے تاہم عموماً ایک سو بیس تک پہنچ کر انسانی اعضاء کی میعاد ختم ہو جاتی ہے اور وہ کام کاج کے قابل نہیں رہتے۔ تو اس عمر میں زکریا علیہ السلام نے اپنے لیے نیک بیٹے کی دعا کی۔

مسلم شریف، کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت حکیم ابن حزامؓ نے بھی ۱۲۰ سال عمر پائی تھی۔ آپ کا تعلق حضرت خدیجہؓ کے خاندان سے تھا۔ شریف الطبع آدمی تھے۔ آپ نے فتح مکہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا۔ آپ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح حضرت علیؓ کی ولادت خانہ کعبہ میں ہوئی تھی، اسی طرح ان کی پیدائش بھی خانہ کعبہ میں ہوئی بعض اوقات اتفاق ہو جاتا ہے کہ کسی بچے کی پیدائش دوران سفر گاڑی، بحری جہاز یا ہوائی جہاز میں ہونے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ اسی طرح ان کی ولادت خانہ کعبہ میں ہوئی۔ آپ کی والدہ طواف وغیرہ کے لیے وہاں گئی ہوں گی کہ پیدائش کا وقت آ گیا۔ بہر حال زکریا علیہ السلام نے ۱۲۰ سال کی عمر میں اولاد کے لیے دعا کی۔

غرضیکہ زکریا علیہ السلام کی عاجزانہ دعا کے جواب میں اللہ نے فرمایا یٰزَكَرِيَّآ اے زکریا علیہ السلام! اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ تمہیں ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں اِسْمُهٗ يَحْيٰى جس کا نام نامی یحییٰ ہو گا۔ اور یہ ایک ایسا نام ہے لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا کہ ہم نے اس سے پہلے یہ نام رکھا ہی نہیں۔ یحییٰ کا معنی حیات والا بچہ ہے۔ آپ اس لحاظ سے اسم با مسمیٰ تھے کہ آپ کی وجہ سے لوگوں کو دینی حیات نصیب ہوئی۔ حیات سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اللہ نے آپ کی بانجھ والدہ کے رحم کو زندہ کر دیا۔ رحم قوت تولید کھو چکا تھا مگر اللہ نے پھر اس میں زندگی کے آثار پیدا کر دیے۔

سَمِيًّا کا ایک معنی تو ہم نام ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ

نے خود ہی فرمایا ہے کہ اس سے پہلے ہم نے کسی کا یہ نام رکھا ہی نہیں
لہذا آپ کا ہم نام کوئی نہیں تھا۔ سمیا کا دوسرا معنی مثل بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ
آگے اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی آرہا ہے هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا
(آیت ۶۵) کیا تم اللہ تعالیٰ کی کوئی مثل جانتے ہو؟ ہرگز نہیں، کیونکہ
اللہ تعالیٰ کی مثل موجود ہی نہیں ہے لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (الشوریٰ)
بہرحال یحییٰ کا معنی حیات والا ہے اور جیسا کہ صاحب کشاف نے لکھا
ہے اس کے مقابلے میں میرت نام بھی آتا ہے جس کی مثال یموت ابن
المزرہ ہے۔

یحییٰ علیہ السلام بلاشبہ بے مثل تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ
میں بعض ایسے خواص رکھ دیے تھے جو دوسرے انبیاء علیہم السلام میں بھی
نہیں تھے۔ آپ میں رقت اور گریہ زاری بہت زیادہ پائی جاتی تھی۔ اکثر
رقت گریہ زاری میں گزرتا۔ اس کے علاوہ آپ کے متعلق اللہ نے فرمایا
ہے سَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِنَ الصَّالِحِينَ (آل عمران-۳۹)
آپ اللہ کے نبی تھے اور حصور یعنی خواہشات نفسانیہ سے بالکل بری
تھے۔ آپ نے ساری عمر شادی بھی نہیں کی۔ بہرحال حضرت یحییٰ علیہ السلام
کی بعض خصوصیات تھیں۔ حضرت ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور آخر میں خود
خاتم النبیین بھی گزرے ہیں۔ آپ کے درجات یقیناً سب سے بلند تر ہیں۔
باقی انبیاء میں سے بھی بڑے بڑے جلیل القدر نبی گزرے ہیں۔ تاہم
یحییٰ علیہ السلام کو بعض خصوصیات کی وجہ سے باقی انبیاء سے جزوی طور پر
امتیاز حاصل تھا۔ اس کی مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کہ اللہ نے آپ
کو اور آپ کی والدہ کو بعض معاملات میں تمام نوع انسانی میں منفرد بنایا تھا
جیسا کہ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو شیطان اس
کو چوکا دیتا ہے یعنی اس پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ مگر حضرت مریمؑ اور

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وہ اپنا اثر نہیں ڈال سکا۔ کیونکہ حضرت مریمؑ کی والدہ نے اللہ کی ذات سے پہلے ہی پناہ مانگ لی تھی "اِنِّیۡۤ اُعِیۡذُهَا بِكَ وَ ذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ" (آل عمران ۳۶) یعنی میں آپ کے لیے اور آپ کی اولاد کے لیے شیطان مردود سے خدا تعالیٰ کی پناہ طلب کرتی ہوں۔ اللہ نے اُن کی یہ دُعا قبول فرمائی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شیطان چوکا نہیں لگا سکا۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا کہ شیطان کی وسوسہ اندازی آپ پر بھی ہوتی ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ہاں شیطان وسوسہ اندازی تو کرتا ہے مگر میری خصوصیت یہ ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ اس وسوسہ اندازی سے محفوظ رکھتا ہے اور مجھ پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نماز میں مشغول تھے کہ ابلیس آگ کا شعلہ لیکر آپ پر پھینکنے کے لیے آیا مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا اور اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو سلامتی میں رکھا۔ بہر حال اسی طرح یحییٰ علیہ السلام بھی بعض خواص کی وجہ سے ممتاز تھے

حضرت زکریا کی حیرانگی

جب اللہ تعالیٰ نے زکریا علیہ السلام کو بیٹے کی خوشخبری دی تو آپ حیران ہو گئے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ غُلٰمٌ کہنے لگے پروردگار! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا۔ وَّكَانَتِ امۡرَاَتِىۡ عَاقِرًا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے وَّقَدۡ بَلَـغۡتُ مِنَ الۡـكِبَرِ عِتِيًّا اور میں بڑھاپے کی وجہ سے کمزوری کی حالت میں پہنچ چکا ہوں۔ اس سوال کی وجہ زکریا علیہ السلام کا ذاتِ باری پر کوئی شک و تردد نہیں تھا بلکہ آپ استعجاب کر رہے تھے کہ اس عمر میں بچہ پیدا ہونے کی کیا کیفیت ہوگی کیا میں اور میری بیوی دوبارہ جوان ہو جائیں گے اور اس قابل ہو جائیں گے کہ بچہ پیدا ہو سکے؟ آپ تو پہلے بھی اس بات کا

اظہار کر چکے تھے کہ میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں اور بال سفید ہو چکے ہیں۔ بڑھاپے کی وجہ سے جسم لاغر ہو چکا ہے۔ اب بچہ پیدا ہونے کی کیفیت کیا ہوگی؟

بڑھاپے کا اثر ہر خاص و عام پر ہوتا ہے کہ یہ تکوینی امر ہے خود حضور علیہ السلام نے بھی بڑھاپے کے اثرات قبول کیے۔ چنانچہ آپ زندگی کے آخری ایک یا دو سال نوافل بیٹھ کر پڑھنے لگے۔ طبیعت میں ضعف پیدا ہو چکا تھا اگرچہ آپ کے زیادہ بال سفید نہیں ہوئے تھے حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے سر مبارک اور داڑھی مبارک میں کم و بیش صرف بیس سفید بال آئے تھے، تاہم آپ میں کمزوری پیدا ہو گئی تھی۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی

حضرت زکریا علیہ السلام کے استفسار کے جواب میں قَالَ كَذٰلِكَ اللہ نے فرمایا، اسی طرح ہوگا۔ خدا تعالیٰ کی مشیت پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ وہ جس قسم کے چاہے حالات پیدا کر کے اپنی مشیت کو پورا کرنے پر قادر ہے۔ قَالَ رَبُّكَ تیرے پروردگار نے فرمایا هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ یہ کام میرے لیے آسان ہے۔ بڑھاپے کی عمر میں بچے کی پیدائش کوئی مشکل کام نہیں۔ ذرا اپنی پیدائش میں غور کرو وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ اس سے پہلے میں نے تمہیں بھی پیدا کیا، تمہیں وجود بخشا حالانکہ ظاہری اسباب معدوم تھے وَلَمْ تَكُ شَيْئًا اور تو کوئی چیز نہیں تھا۔ عام انسان کے متعلق بھی اللہ نے فرمایا ہے کیا انسان پر ایک ایسا وقت نہیں آیا لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (الدھر-۱) جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے آگے کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ وہ جب چاہتے اور جس طرح چاہے اپنی مشیت کی تکمیل کر لے۔ وہ چاہے تو کسی کو جوانی میں اولاد سے محروم رکھے اور اس کی منشا ہو تو بڑھاپے میں بھی بچہ پیدا کر دے۔ اللہ تعالیٰ

نے یہ کہہ کر زکریا علیہ السلام کو مطمئن کر دیا۔

زکریا علیہ السلام خوشی سے لبریز تھے اور وہ بچے کی پیدائش کے متعلق کوئی نشانی چاہتے تھے قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً پھر عرض کیا پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی بنا دے جس سے اندازہ ہو جائے کہ میری بیوی کو واقعی حمل قرار پا گیا ہے۔ تاکہ میاں بیوی کو مزید خوشی حاصل ہو جائے قَالَ اٰيَتُكَ اللہ نے فرمایا، نشانی یہ ہے کہ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ تو لوگوں سے تین دن رات تک کوئی کلام نہیں کر سکے گا۔ سَوِيًّا حالانکہ تو بالکل صحیح سلامت ہوگا۔ بعض اوقات انسان کسی بیماری یا ذہنی خرابی کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لیے بولنے چالنے سے محروم ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات زبان میں لکنت پیدا ہو جاتی ہے یا کوئی شخص گونگا ہوتا ہے اور کلام نہیں کر سکتا مگر اللہ تعالیٰ نے زکریا علیہ السلام کو فرمایا کہ آپ بالکل تندرست اور صحیح سلامت ہونے کے باوجود کلام کرنے پر قادر نہیں ہوں گے۔ البتہ آپ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور تسبیح وتہلیل انجام دیتے رہیں گے۔ فرمایا یہ نشانی ہے، جب آپ کی حالت ایسی ہو جائے تو سمجھ لینا کہ آپ کی بیوی کو حمل قرار پا گیا ہے اور اب بچہ ہونے والا ہے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ زکریا علیہ السلام بولنے چالنے سے عاجز آ گئے۔ اس حالت میں فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ زکریا علیہ السلام اپنے لوگوں کے پاس آئے اپنے حجرۂ عبادت سے نکلے اور قوم کے پاس آئے فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ آپ نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ بول تو سکتے نہیں تھے، صرف اشارے سے بات سمجھائی کہ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا صبح اور پچھلے پہر اپنے پروردگار کی پاکی بیان کرو۔ گویا اس حالت میں زکریا علیہ السلام نے

حق تبلیغ ادا کیا اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف راغب کیا۔ یہ نشانی ایک معجزہ تھی جو اللہ نے یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کے ضمن میں ظاہر فرمائی تھی۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿١٢﴾ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ﴿١٣﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿١٤﴾ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿١٥﴾

ترجمہ:۔ اے یحییٰ! پکڑو کتاب کو مضبوطی کے ساتھ اور دیا ہم نے اُن کو حکم بچپن میں (١٢) اور شفقت اپنی طرف سے اور پاکیزگی اور تھا وہ متقی (١٣) اور نیکی کرنے والا اپنے والدین کے ساتھ اور نہیں تھا وہ سرکش اور نافرمان (١٤) پس سلامتی ہے اس پر جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ مرے گا اور جس دن دوبارہ اٹھایا جائے گا (١٥)

ربطِ آیات گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کا ذکر فرمایا کہ انہوں نے بڑھاپے میں ایک ایسے بیٹے کی درخواست کی جو اُن کی علمی جانشینی کا حق ادا کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمایا اور زکریا علیہ السلام کی خوشی اور سرور کے لیے استقرارِ حمل کی نشانی بھی بتلائی کہ آپ تین دن رات تک سوائے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تسبیح و تحمید کے کوئی کلام نہیں کر سکیں گے۔ یہ نشانی بھی ظاہر ہوئی اور پھر اللہ نے بانجھ بیوی سے زکریا علیہ السلام کو ایک عظیم الشان فرزند عطا فرمایا۔ یہ بھی اللہ کا نبی تھا اور اس کا نام بھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی تبلا دیا تھا اور یہ بھی کہ اس سے پہلے اس نام کا کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔

تمسک بالکتاب

جب یہ بچہ سن شعور کو پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے یوں خطاب فرمایا
يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ اے یحییٰ علیہ السلام اس کتاب کو مضبوطی
کے ساتھ پکڑ لو۔ یحییٰ علیہ السلام کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ
علیہ السلام کا درمیانی دور تھا اور اس دور میں اللہ کی کتاب تورات ہی نافذ العمل
تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اسی کتاب کے ساتھ تمسک کا حکم دیا کہ اس کے
احکام کو سیکھو، خود ان پر عمل کرو اور پھر اس کی تبلیغ کا حق ادا کرتے ہوئے
دوسروں سے اس پر عمل کراؤ۔ اگرچہ بعض انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے صحائف بھی
عطا فرمائے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے تمام انبیاء اسی تورات
کی تبلیغ و اشاعت پر مامور تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یحییٰ علیہ السلام کو بھی اسی
بات کا حکم دیا۔ بنی اسرائیل کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کا یہی حکم تھا۔ "خُذُوْا مَآ
اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ"
(البقرۃ - ۶۳) جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑ لو،
اس کو سیکھو سکھلاؤ، خود عمل پیرا ہو جاؤ اور اسے آگے بھی چلاؤ۔ اللہ نے یہ
بھی فرمایا وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ
اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ (الاعراف - ۱۷۰) جو لوگ کتاب کو
مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں تو ہم مصلحین کی نیکی کو ضائع
نہیں کرتے۔ بہرحال تمسک بالکتاب تمام انبیاء علیہم السلام کی مشترکہ تعلیم ہے

قرآن و سنت پر استقامت

اس آخری امت کے لیے بھی یہی حکم ہے کہ وہ اللہ کی آخری کتاب
اور آخری نبی کی سنت کو مضبوطی سے تھام لیں۔ حجۃ الوداع سے واپسی کے
سفر کے دوران حضور علیہ السلام نے امت کے لیے دو چیزوں کی وصیت فرمائی
تھی، ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے حضور کے اہل بیت، کتاب اللہ
کی تاکید اس لیے کہ دین کی اساسی تعلیم اسی کتاب میں ہے، اور اہل بیت
کی تاکید اس لیے کہ اس کتاب کی تعلیم کا قریبی ذریعہ حضور علیہ السلام کا خاندان

ہی ہے سورۃ احزاب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ" اللہ نے جو کچھ تمہارے گھروں میں نازل کیا ہے اس کو یاد کرتی رہو۔ یہ ازواج مطہرات سے خطاب ہے اور نازل ہونے والی چیز کتاب و سنت ہی تو ہے جس میں ہدایت اور روشنی ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِيْ یعنی میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں اگر ان کو مضبوطی سے پکڑ رکھو گے تو گمراہ نہیں ہو گے۔ یہ دو چیزیں اللہ کی کتاب اور میرا دستور العمل ہے مضبوطی سے پکڑنے کا مطلب پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ احکام الٰہی کو سیکھا جائے۔ ان پر عمل کیا جائے اور ان کو آگے دوسروں تک پہنچایا جائے۔ اگر کتاب کے متن کو نہ پڑھا جائے نہ سمجھا جائے، نہ اس پر عمل کیا جائے اور نہ اس کی تبلیغ کی جائے تو کتاب اپنی جگہ پڑی رہے گی اور اس سے کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوگا اسی لیے اللہ نے کتاب الٰہی کے بارے میں جگہ جگہ فرمایا ہے "فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ" (المرسلت - ۵۰) اگر اللہ کی آخری کتاب پر ایمان نہیں لاؤ گے تو پھر اور کون سی کتاب آئے گی جس پر عمل کرو گے۔ اللہ تعالیٰ کا آخری پروگرام تو یہی ہے جو ہمیشہ کے لیے قابل عمل ہے۔ اللہ نے فرمایا اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا" (محمد - ۲۴) تم قرآن پاک میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے، اس کو خیط کر کے اس پر عمل کیوں نہیں کرتے، کیا تمہارے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟ سورۃ ص میں فرمایا "كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ" یہ ایک مبارک کتاب ہے جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے تاکہ اس کی آیتوں میں غور و فکر کرو۔

وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (آیت ۔ ۲۹) تاکہ صاحبِ عقل حضرات اس سے نصیحت حاصل کریں۔ خود سیکھیں، اس کے مطابق اپنا عقیدہ بنائیں اور اپنے اخلاق اور عمل کو اس کے مطابق بنانے کی کوشش کریں۔ جو لوگ ایسا کریں گے، اللہ تعالیٰ کی رحمت اُن کے شاملِ حال ہوگی۔

یحییٰ علیہ السلام کا علم و دانش

آگے اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام پر کیے گئے بعض انعامات کا ذکر کیا ہے۔ فرمایا وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا اور ہم نے اُن کو بچپن ہی میں حکم یعنی علم و دانش عطا کیا۔ عام طور پر انبیاء علیہم السلام کو نبوت چالیس سال کی عمر میں ملتی رہی ہے مگر دو شخصیتیں ایسی ہیں، جنہیں یہ شرف بچپن میں ہی حاصل ہوگیا۔ ایک یحییٰ علیہ السلام اور دوسرے عیسیٰ علیہ السلام۔ یہ دونوں انبیاء بچپن ہی میں کتاب اللہ کی نشرو اشاعت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے والد حضرت زکریا علیہ السلام ضعیف ہو چکے تھے۔ آپ بھی اللہ کے عظیم المرتبت نبی تھے اور اپنی جانشینی کے لیے اللہ سے مانگ کر بیٹا لیا تھا۔ اللہ نے اسے بچپن میں ہی کمال درجے کا شعور عطا فرمایا اور آپ نے تبلیغ دین کا فریضہ انجام دینا شروع کر دیا۔ اور اس طرح آپ اپنے والدِ گرامی کے صحیح جانشین ثابت ہوئے۔ تو فرمایا ہم نے اُنہیں بچپن میں ہی علم و دانش عطا فرمایا جو کہ اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی تھی۔

یحییٰ علیہ السلام کی شفقت اور پاکیزگی

اللہ نے یحییٰ علیہ السلام کو علم و دانش دیا اور ساتھ فرمایا وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ہم نے اپنی طرف سے انہیں شفقت اور پاکیزگی بھی عطا فرمائی۔ اللہ نے یحییٰ علیہ السلام میں کمال درجے کی رقت رکھی تھی۔ مفسرین بیان کرتے ہیں کہ ہر وقت آپ کے آنسو جاری رہتے تھے۔ آپ کثرت سے گریہ وزاری کرتے تھے۔ بہرحال حنان شفقت، رأفت اور مہربانی کو کہتے ہیں۔ اس کی مثالیں پرانے شعراء کے کلام میں بھی ملتی ہیں۔ جیسے ؎

اَبَا مُنْذِرٍ اَفْنَيْتَ فَاسْتَبْقِ بَعْضَنَا   حَنَانَيْكَ بَعْضُ الشَّرِّ اَهْوَنُ مِنْ بَعْضٍ

اے ابوالمنذر! تم نے تو سب کو فنا کر دیا ہے، بعض کو تو رہنے دو، ہم تو تمہاری شفقت کے طلبگار ہیں۔

الحنان اللہ تعالیٰ کا اسم پاک بھی ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض جہنمی دوزخ میں یا حنان یا حنان پکاریں گے وہ ہزار سال تک شفقت کرنے والے خدا تعالیٰ کو پکارتے رہیں گے پھر اس کے بعد ان کو جواب ملے گا تو مایوس ہو جائیں گے کیونکہ یہ لوگ ابدی سزا کے مستحق ہوں گے اور رہائی کی کوئی صورت باقی نہیں ہوگی۔ بہرحال حنان کا معنی شفقت اور رأفت ہوتا ہے جنہیں شوق کہہ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یحییٰ علیہ السلام کو آخرت کا شوق بھی عطا فرمایا تھا، اور آپ کے اندر رأفت اور نرمی بھی پائی جاتی ہے تو فرمایا ہم نے اپنی طرف سے انہیں شفقت عطا فرمائی۔

زکوٰۃ کا معنی پاکیزگی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت بھی یحییٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی تھی۔ ابوداؤد شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ نے تم پر زکوٰۃ اس لیے فرض کی ہے کہ تمہارا باقی ماندہ مال پاک ہو جائے۔ جب تک مال سے زکوٰۃ نہ نکالی جائے وہ ناپاک ہی رہتا ہے۔ زکوٰۃ کو زکوٰۃ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ مال کو پاکیزہ بناتی ہے جس طرح ناپاک جسم یا ناپاک کپڑا دھوئے بغیر پاک نہیں ہوتا، اسی طرح زکوٰۃ نکالے بغیر مال پاک نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب تک دیگر مالی حقوق ادا نہ کیے جائیں مال ناپاک رہتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے کہ اگر مستجاب الدعوات بننا چاہتے ہو تو خوراک کو پاک بناؤ، پاکیزہ خوراک کھاؤ گے تو عبادت زیادہ نصیب اور نماز بھی قبول ہوگی، ورنہ نہیں۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ پاکیزہ خوراک کھائے بغیر پاکیزہ خون پیدا نہیں ہوگا، اور اگر خون ناپاک ہوگا۔ تو اخلاق بھی ناپاک ہوں گے اور انسان کمال حاصل نہیں کر سکے

گا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے یحییٰ علیہ السلام کو کمال درجے کی پاکیزگی عطا فرمائی تھی۔

یحییٰ علیہ السلام کا تقویٰ

فرمایا وَكَانَ تَقِيًّا اور یحییٰ علیہ السلام بڑے متقی تھے۔ امام شاہ ولی اللہؒ تقویٰ کا معنی یوں کرتے ہیں "محافظت بر حدود شرع" یعنی شریعت کی حدود کی حفاظت کرنا تقویٰ ہے۔[1] اس کا معنی ڈرنا اور بچنا بھی ہے۔ کفر، شرک، نفاق، بدعقیدگی اور کبائر سے بچنا اور پھر درجہ بدرجہ مشکوک چیزوں سے پرہیز کرنے کا نام تقویٰ ہے۔ سورۃ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی سات صفات ذکر کی ہیں جن میں آخری صفت یہی ہے۔ "وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ" (آیت - ۱۱۲) وہ اللہ کی حدود کی حفاظت کرتے ہیں نہ کہ ان کو توڑتے ہیں۔ سورۃ البقرہ میں فرمایا "تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا" (آیت - ۲۲۹) یہ اللہ کی حدیں ہیں۔ ان سے تجاوز نہ کرو۔ "وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" (آیت - ۲۲۹) جو اللہ کی حدود سے آگے نکلے گا، وہ ظالموں میں شمار ہوگا۔ بہرحال حدود اللہ کی حفاظت کرنے کا نام تقویٰ ہے۔ تو فرمایا حضرت یحییٰ علیہ السلام کمال درجے کے متقی تھے۔

والدین کے محسن

اللہ نے یحییٰ علیہ السلام کی ایک یہ صفت بھی بیان فرمائی ہے وَبَرًّاۢ بِوَالِدَيْهِ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرنے والے تھے۔ یہ حکم عام ہے اور ہر شخص کا فرض ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے۔ اور اگر ماں باپ بوڑھے ہو چکے ہیں تو زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔ اگر والدین کفر یا شرک کی طرف راغب کریں۔ تو پھر ان کی اطاعت ساقط ہو جاتی ہے۔ البتہ فرمایا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا (لقمان - ۱۵) کہ دنیا میں دستور کے مطابق ان کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کرو۔ اور اگر والدین مومن ہیں تو پھر ان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرو اور کوئی ایسا کام نہ کرو جو ان کی اذیت کا باعث ہو۔

---

[1] الطاف القدس مترجم صفحہ ۹ (فیاضی)

انسانی حقوق میں اولین حق والدین کا ہے اور اس کے بعد قرابتداروں کا نمبر آتا ہے۔ فرمایا وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ (بنی اسرائیل۔ ۲۶) قرابت داروں کے بعد مساکین اور مسافروں کے حقوق بھی ادا کرو بلکہ فرمایا وَاٰتِ كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهٗ ہر حقدار کو اس کا حق ادا کر دو۔ جب تک تمام حقوق ادا نہیں کر دو گے، تم میں کمال اخلاق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور مخلوق کے حقوق سے پہلے اللہ کا حق بھی ہے " وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (بنی اسرائیل۔ ۲۳) اللہ تعالیٰ خالق اور مالک ہے اس کا حق مقدم ہے اور وہ یہ کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور پھر والدین کے ساتھ احسان کرو۔ مطلب یہ کہ انسان متقی اس وقت ہوگا جب وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی بجا آوری کرے گا۔ یہ تمام خوبیاں حضرت یحیٰ علیہ السلام میں اللہ نے ڈال دی تھیں۔

فرمایا وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا "یحیٰ علیہ السلام نہ تو سرکش تھے اور نہ نافرمان۔ جبر کا معنی سرکشی کرنا، ظلم کرنا یا کسی کو ناحق ستانا ہوتا ہے۔ اکثر حکمران اور طاقتور لوگ جبار ہوتے ہیں، فرعون، نمرود اور ابوجہل وغیرہ اسی خصلت کے مالک تھے۔ جبار خدا تعالیٰ کا نام بھی ہے اس کے دو معنیٰ آتے ہیں، پہلا معنی بڑائی اور کسی چیز کا مالک ہونا ہے حقیقت میں جبار تو خدا تعالیٰ ہے۔ جو تمام بڑائیوں کا مالک ہے اور ہر چیز کا خالق اور مالک ہے۔ جباری اسی کی ذات کے ساتھ لائق ہے۔ عاجز مخلوق کے ساتھ جباریت مناسب نہیں۔ جبر کا دوسرا معنیٰ تلافی کرنا آتا ہے یعنی کسی کی شکستگی اور کمزور حالت کو درست کر دینا۔ کسی کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑ دینا۔ یہ صفات بھی اللہ تعالیٰ کی ہیں اور صحیح معنوں میں جبار کہلانے کا وہی حقدار ہے یحیٰ علیہ السلام مخلوق ہیں اس لیے فرمایا کہ وہ جبار نہیں تھے

اور نہ ہی نافرمان تھے بلکہ اللہ تعالیٰ اور اپنے والدین کے مکمل فرمانبردار تھے۔

یحییٰ علیہ السلام کے لیے سلامتی

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے یہ اوصاف بیان کرنے کے بعد اللہ نے ان کو خوشخبری بھی سنائی وَسَلٰمٌ عَلَیْہِ اور سلامتی ہے آپ پر یَوْمَ وُلِدَ جس دن آپ پیدا ہوئے وَیَوْمَ یَمُوْتُ اور جس دن آپ دنیا سے رخصت ہوں گے وَیَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا اور جس دن آپ کو دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے تینوں مواقع پر یحییٰ علیہ السلام کو آفات و بلیات سے محفوظ رکھا۔ پیدائش کے وقت بھی ہر قسم کی آفت خصوصاً دینی آفات سے سلامتی میں رکھا۔ اور پھر موت کا وقت تو بڑا نازک ہوتا ہے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ عِنْدَ الْمَوْتِ اے اللہ! میں موت کے وقت تیری ذات کے ساتھ پناہ پکڑتا ہوں۔ اس وقت شیطان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مرنے والا آدمی ایمان کے ساتھ رخصت نہ ہو۔ شیطان انسان کو دلیتے کی کوشش کرتا ہے اسی لیے حضور علیہ السلام نے اپنی امت کو یہ دعا سکھائی ہے تاکہ موت کے وقت شیطان کے شر سے محفوظ رہ سکیں اور پھر جب قیامت والے دن سب لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے تو وہ بھی بڑا نازک موقع ہوگا، ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوگی، ہر کوئی اپنے بچاؤ کا خواہشمند ہوگا۔ یحییٰ علیہ السلام پر اس دن بھی سلامتی ہوگی کہ وہ اللہ کے برگزیدہ بندے اور نبی تھے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ
اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿١٦﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ
حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا
سَوِيًّا ﴿١٧﴾ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ
كُنْتَ تَقِيًّا ﴿١٨﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ
لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿١٩﴾ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ
وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿٢٠﴾ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ
قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ
وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿٢١﴾

ترجمہ :- اور ذکر کریں آپ کتاب میں مریمؑ کا، جب کہ وہ جُدا
ہوئیں اپنے گھر والوں سے ایک مشرقی مکان میں (۱۶) پس
بنایا اُس نے اُن کے ورے ایک پردہ - پس بھیجا ہم نے
اُس کی طرف اپنا ایک فرشتہ۔ وہ متمثل ہوا اس کے سامنے
ایک پورے انسان کی شکل میں (۱۷) کہا مریمؑ نے ، تحقیق میں پناہ
لیتی ہوں رحمان کے ساتھ تجھ سے اگر تو ڈرنے والا ہے (۱۸)
اس نے کہا بیشک میں تو بھیجا ہوا ہوں تیرے رب کی طرف
سے تاکہ میں دوں تجھے ایک لڑکا پاکیزہ (۱۹) وہ کہنے لگی

کہاں سے ہو گا میرے لیے لڑکا، اور نہیں چھوا مجھے کسی انسان نے اور نہیں ہوں میں بدکار (۲۰) اُس نے کہا، اسی طرح ہو گا، فرمایا ہے تیرے پروردگار نے کہ یہ مجھ پر آسان ہے۔ اور تاکہ ہم بنا دیں اس کو ایک نشانی لوگوں کے لیے اور مہربانی اپنی طرف سے۔ اور تھا یہ معاملہ فیصلہ کیا ہوا (۲۱)

ربطِ آیات

پہلے رکوع میں حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر ہوا۔ انہوں نے حضرت مریمؑ کے پاس بے موسم پھل دیکھے تو اللہ کی بارگاہ میں اولاد کے لیے درخواست کی حالانکہ وہ جس بڑھاپے کو پہنچ چکے تھے وہاں عادۃً اولاد ہونے کا امکان نہیں ہوتا۔ اللہ نے آپ کی دعا قبول فرمائی۔ اور یحییٰ علیہ السلام جیسا عظیم الشان فرزند عطا کیا جس کا نام بھی اللہ نے خود تجویز فرمایا اور اس نام کا پہلے کوئی بچہ نہیں تھا۔ آپ کی پیدائش اللہ کی قدرت کا عظیم نمونہ تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی تھی جو اُس نے اپنے برگزیدہ بندے زکریا علیہ السلام پر کی۔ اس کے بعد اللہ نے یحییٰ علیہ السلام کی حیثیت اور اُن کی فضیلت کا ذکر کیا۔ اللہ نے آپ کو بچپن میں ہی علم و دانش کی دولت عطا فرمائی آپ اللہ کے اطاعت گزار بندے اور اخلاقِ عالیہ کے حامل تھے۔ انہوں نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پورے طریقے سے ادا کیا۔ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کا بہترین نمونہ تھے پھر اللہ نے انہیں بشارت سنائی کہ اُن پر پیدائش کے وقت، موت کے وقت اور دوبارہ جی اُٹھنے کے موقع پر اللہ کی طرف سے سلامتی ہے۔

حیرت انگیز واقعات

گذشتہ سورۃ میں اصحابِ کہف، موسیٰ و خضر علیہما السلام اور سکندر ذوالقرنین کے حیرت انگیز واقعات کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ واقعات اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے معمولی چیزیں ہیں کیونکہ وہ قادرِ مطلق ہے اور کوئی بھی کام کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ ان واقعات میں اللہ تعالیٰ کی مہربانی بھی ساتھ رہی ہے۔ اصحابِ کہف نے بھی اللہ کی رحمت کا ذکر کیا۔ پھر خضر علیہ السلام کے ہاتھ پر جو محیر العقول واقعات پیش آئے تھے آپ نے انہیں بھی اللہ تعالیٰ کی مہربانی پر محمول کیا۔ اس کے بعد سکندر ذوالقرنین نے جو سد تعمیر کی اُسے بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت

کے ساتھ منسلک کیا۔ اب اس سورۃ میں حضرت زکریا علیہ السلام، یحییٰ علیہ السلام، حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حیرت انگیز واقعات کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ یہ واقعات بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی کا نمونہ ہیں۔

ان واقعات کی تفصیل بیان کر کے دراصل اللہ تعالیٰ نے عقیدہ ابنیت کا رد فرمایا ہے اور مسئلہ توحید سمجھایا ہے۔ شرک کی بدترین قسم خدا تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کرنے کی خاص طور پر نفی کی ہے۔ آگے حضرت مریمؑ کا واقعہ بیان ہو رہا ہے جو کہ دراصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی تمہید ہے یہ واقعات بعض دوسری سورتوں میں بھی بیان ہوئے ہیں، خاص طور پر سورۃ آل عمران تو حضرت مریمؑ کے والد عمران کے نام پر ہی موسوم ہے جس میں اللہ نے خاندانِ عمران اور مسیح علیہ السلام کے متعلق تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔

حضرت مریمؑ کا تذکرہ

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی آخر الزمان سے خطاب کر کے فرمایا ہے وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ آپ کتاب میں حضرت مریمؑ کا ذکر کریں۔ کتاب سے مراد یہاں قرآن پاک ہے جو کہ حضور علیہ السلام پر نازل ہو رہا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اسی کتاب میں حضرت مریمؑ کا واقعہ نازل فرمایا اور اپنے نبی کو اس کا ذکر کرنے کے لیے کہا۔ اس سے پہلے یحییٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بھی کتاب کا ذکر آچکا ہے " يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ " یعنی اے یحییٰ علیہ السلام اس کتاب کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ وہاں پر کتاب سے مراد تورات تھی کیونکہ اُس دور میں تورات ہی کے احکام نافذ العمل تھے اور حضرت زکریا اور یحییٰ علیہما السلام اسی کی تبلیغ و اشاعت پر مامور من اللہ تھے۔ تاہم اللہ کی آخری کتاب قرآن حکیم میں باقی کتب سماویہ کی نسبت علوم و معارف کے زیادہ خزانے موجود ہیں

یہ کتاب ہر قسم کے تغیر و تبدل سے محفوظ ہے کیونکہ اسکی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اٹھا رکھی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جامع ترین کتاب ہے۔ اللہ نے اس کتاب میں حضرت مریمؑ کا ذکر فرمایا ہے۔

مریم کا معنی خادمہ ہوتا ہے۔ آپ کی والدہ نے منت مانی تھی کہ اللہ تعالیٰ اُسے بیٹا عطا کرے تو وہ اُسے بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے بیٹے کی بجائے بیٹی عطا فرمائی تو عمران کی بیوی نے کہا کہ میرے ہاں تو بیٹی پیدا ہوئی ہے "وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ" اور بیٹا اور بیٹی برابر تو نہیں ہوتے "وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ" (آل عمران - ۳۶) اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اُس نے جو بزرگی، کرامت اور شرف اس لڑکی کو بخشا وہ عام لڑکوں کو بھی کم نصیب ہوتا ہے۔ بہرحال اللہ نے فرمایا کہ آپ کتاب میں حضرت مریمؑ کا تذکرہ کریں۔

حضرت مریمؑ کی علیحدگی

ارشاد ہوتا ہے إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا جب مریمؑ علیحدہ ہوئیں اپنے گھر والوں سے ایک مشرقی مکان میں۔ یہ واقعہ یروشلم شہر میں ہی پیش آیا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت مریمؑ کی عمر ۱۳ یا ۱۵ سال کی تھی۔ جب آپ کو پہلی دفعہ حیض آیا۔ آپ کو بڑی تشویش لاحق ہوئی۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے ان کے لیے بیت المقدس میں الگ کمرہ مخصوص کر رکھا تھا۔ جہاں وہ عبادت و ریاضت میں مصروف رہتیں۔ جب انہیں حیض کی شکایت پیدا ہوئی تو ان کو وہاں رہنا ممکن نہ رہا چنانچہ وہ بیت المقدس سے مشرقی جانب بیت اللحم میں منتقل ہو گئیں جہاں مسیح علیہ السلام کی ولادت ہوئی تھی۔ یہ وہی جگہ ہے جس کی طرف رُخ کر کے عیسائی نماز پڑھتے ہیں۔

مشرقی مکان کی مختلف تاویلات کی گئی ہیں۔ اس سے بیت المقدس

بھی مراد ہو سکتا ہے کہ یہ حضرت مریم کے اپنے گھر سے مشرقی جانب تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بیت المقدس ہی میں مشرق ہی کے کسی کمرے میں چلی گئی ہوں۔ یا پھر بیت المقدس سے باہر ذرا فاصلے پر بھی مشرق کی طرف کوئی جگہ ہو سکتی ہے جہاں حضرت مریم چلی گئیں کیونکہ انہیں ایام ماہواری شروع ہو چکے تھے اور انہوں نے غسل بھی کرنا تھا۔

پھر کیا ہوا؟ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا انہوں نے گھر والوں سے ورے ایک پردہ لگا لیا تاکہ غسل کر سکیں۔ قرآن میں تو صرف گھر والوں سے علیحدگی ہی کا ذکر ہے تاہم مفسرین فرماتے ہیں کہ انہوں نے غسل کرنے کے لیے پردہ لگا لیا۔

تنہائی میں فرشتے کی آمد

جب حضرت مریمؑ بالکل تنہائی میں چلی گئیں تو اللہ نے فرمایا فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا ہم نے ان کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا۔ روح سے مراد فرشتہ ہے اور روح الامین جبرائیل علیہ السلام کا لقب ہے جیسے فرمایا نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (الشعراء آیت ۱۹۳) قرآن روح الامین کی وساطت سے نازل ہوا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو حضرت مریمؑ کے پاس بھیجا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا پس وہ ایک مکمل انسان کی شکل و صورت میں حضرت مریمؓ کے سامنے آکھڑا ہوا۔ سَوِيًّا سے مراد یہ ہے کہ وہ شکل و صورت، رنگ ڈھنگ غرضیکہ ہر لحاظ سے ایک خوبصورت انسانی شکل میں وارد ہوئے۔

جس طرح جنات کو اللہ نے یہ طاقت دی ہے کہ وہ جس شکل میں چاہیں متشکل ہو سکتے ہیں اسی طرح فرشتے بھی جس صورت میں چاہیں اپنے آپ کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ احادیث میں کثرت سے آتا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام

اکثر آپ کے پاس آپ کے ایک صحابی حضرت دحیہ ابن خلیفہ کلبیؓ کی شکل میں آتے تھے۔ حضرت دحیہؓ قبیلہ کلب کے سردار تھے، بڑے لمبے چوڑے قد کاٹھ کے وجیہ انسان تھے۔ حضور علیہ السلام نے آپ کو قیصر روم کے پاس اپنا نامہ مبارک دے کر بھیجا تھا۔ بہر حال حضرت جبرائیل علیہ السلام دحیہ کلبیؓ کی شکل میں متشکل ہو کر حضور علیہ السلام کے پاس آتے تھے۔ لوگ سمجھتے تھے دحیہ کلبیؓ بیٹھے ہیں مگر اُن کے جانے کے بعد پتہ چلتا کہ وہ تو جبرائیل علیہ السلام تھے اور فلاں آیات نازل ہوئی ہیں۔ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا بلکہ بعض اوقات جبرائیل علیہ السلام کسی اجنبی شخص کی شکل و صورت میں بھی آتے تھے۔ چنانچہ ارکانِ اسلام والی مشہور حدیث میں آتا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام ایک خوبصورت وجیہ شکل انسان کی شکل میں آئے۔ اُن کے کپڑے بالکل سفید اور بال بالکل سیاہ تھے۔ اجنبی ہونے کے باوجود اُن پر سفر کے آثار نظر نہیں آتے تھے انہوں نے صحابہ کی مجلس میں حضور علیہ السلام سے گفت و شنید کی اور پھر چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد آپ علیہ السلام نے بتلایا کہ وہ جبرائیل علیہ السلام تھے اور تمہیں دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔

محدث عبدالغنی نابلسیؒ اور بعض دیگر علماء فرماتے ہیں کہ جبرائیل علیہ السلام حضرت مریمؑ کے سامنے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں آئے تھے اُن کا استدلال یہ ہے کہ سویًّا سے ایسی شخصیت مراد ہے جو پوری نوع انسانی میں ہر لحاظ سے معتدل ہو اور یہ صفت صرف حضور علیہ السلام میں پائی جاتی ہے کہ آپ اعدل البشر ہیں۔ آپ اپنے قویٰ و اعضاء اور شکل و صورت میں سب سے زیادہ معتدل ہیں۔ شیخ ابن سینا کا بھی یہی قول ہے کہ پوری کائنات میں اپنے جسم اور قویٰ کے اعتبار سے معتدل ترین شخصیت حضور علیہ السلام کی ہے۔ ہر انسان کے قویٰ کم و بیش ہوتے ہیں۔ کسی میں بلغم کی زیادتی ہوتی ہے اور کسی میں خشکی کی۔ کسی میں سودا کا مادہ زیادہ ہوتا ہے

تو کسی میں صفرا کا، مگر حضور علیہ السلام کے تمام اخلاط معتدل تھے اور اللہ نے آپ کو بہترین شکل و صورت اور معتدل ترین اخلاط پر پیدا فرمایا تھا۔

حضرت مریمؑ سے گفتگو

جب حضرت مریمؑ نے اس تنہائی میں ایک شخص کو اپنے سامنے موجود پایا تو سخت گھبرا گئیں۔ یہ ان کے لیے بڑی آزمائش کا وقت تھا اور آپ کو اپنی عفت و پاکدامنی کا پاس تھا۔ قَالَتْ فوراً بولیں اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ میں تجھ سے خدائے رحمان کی پناہ میں آتی ہوں اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا اگر تو متقی ہے۔ یہ محاورہ ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی کہتا ہے کہ یہ کام نہ کر اگر تو مومن ہے۔ تو مریمؑ نے بھی یہی کہا کہ اگر تو متقی ہے تو میں اللہ تعالیٰ کی پناہ لیتی ہوں۔ بھلا تو اس تنہائی میں کیسے یہاں آگیا؟ بعض فرماتے ہیں کہ اِنْ كُنْتَ میں اِنْ نافیہ ہے اور اصل میں یہ ہے مَا كُنْتَ تَقِيًّا یعنی تو متقی معلوم نہیں ہوتا جو اس تنہائی میں آ وارد ہوا۔ بہرحال نفی کا معنی ہو یا اثبات کا مطلب ایک ہی ہے کہ اگر تیرے دل میں خوف خدا ہے تو فوراً یہاں سے چلا جا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی امان میں رکھے۔ حضرت مریمؑ پر گھبراہٹ کا عالم تھا اور اسی حالت میں ان کی زبان سے یہ کلمات ادا ہوئے۔

اس کے جواب میں قَالَ فرشتے نے کہا، اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ گھبراؤ نہیں، میں تو تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں۔ میں انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہوں۔ اور میرے یہاں آنے کا مقصد یہ ہے لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا تاکہ میں تجھے ایک پاکیزہ بچہ عطا کروں۔ مجھے اللہ نے اس کام پر مامور کیا ہے۔ اس پر حضرت مریمؑ کو سخت استعجاب ہوا۔ قَالَتْ کہنے لگیں۔ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ کہاں سے ہوگا بچہ میرے لیے وَلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ کیونکہ مجھے تو آج تک کسی مرد نے نہیں چھوا وَلَمْ اَكُ بَغِيًّا اور نہ ہی میں بدکار ہوں۔ بچہ پیدا

ہونے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ کہ یا تو عورت کسی مرد کی منکوحہ ہو اور پھر دونوں کے ملاپ کے نتیجے میں حمل قرار پائے یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ یہ بدکاری کا نتیجہ ہو۔ مگر مریمؑ تو دونوں چیزوں سے پاک تھیں۔ لہٰذا انہیں بچے کی بشارت پر سخت حیرانگی ہوئی کہ میرے ہاں کیسے بچہ پیدا ہوگا۔ جب کہ اس کے لیے ظاہری اسباب تو موجود ہی نہیں ہیں۔ تب، فرشتے نے جواب دیا قَالَ كَذٰلِكِ کہا یونہی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی منشا یہی ہے کہ بغیر ظاہری اسباب کے ہی تمہیں بچہ عطا کرے۔ قَالَ رَبُّكِ تیرے پروردگار نے فرمایا ہے هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ کہ ایسا کرنا میرے لیے بالکل آسان ہے۔ میری قدرت تامہ اور حکمت بالغہ سے کوئی چیز بعید نہیں۔ میں ہر چیز کرنے پر قادر ہوں، لہٰذا بغیر ظاہری اسباب کے بچہ عطا کر سکتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت تامہ

سورۃ آل عمران میں یہ ذکر آچکا ہے اِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ (آل عمران - ۵۹) اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال حضرت آدم علیہ السلام کی سی ہے۔ جنہیں اللہ نے محض مٹی سے پیدا کیا۔ جب کہ وہاں انسان کی پیدائش کے لیے روایتی اسباب نہیں تھے۔ اللہ نے فرمایا کہ تم عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے پیدائش پر تعجب کرتے ہو مگر آدم علیہ السلام کی پیدائش پر تعجب نہیں کرتے عیسیٰ علیہ السلام تو پھر بھی ماں کے بطن سے پیدا ہوئے مگر آدم علیہ السلام کے لیے تو یہ ذریعہ بھی موجود نہیں تھا۔ نہ ماں، نہ باپ بلکہ مٹی کا مجسمہ بنا کر اللہ نے اس میں روح پھونکی اور آدم علیہ السلام کو وجود بخشا۔ انسان کی اصل خاکی ہے اور خاک میں عجز و نیاز مندی کا عنصر غالب ہے لہٰذا انسان کو غرور و تکبر میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے۔ انسان کا انسان ہونا ہی اس کے لیے بہت بڑی بات ہے۔ ؎

میرے مالک نے میرے حق میں یہ احسان کیا
خاکِ ناچیز تھا، سو مجھے انسان کیا

اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ ملاحظہ کیجئے، اللہ نے آدم علیہ السلام کو بغیر ماں اور باپ کے پیدا کیا، پھر حضرت حوا کو آدم علیہ السلام کی پسلی سے ماں کے واسطہ کے بغیر پیدا فرمایا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا اور نسلِ انسانی کی بقاء کا عام اصول یہ ہے کہ یہ نسل ماں باپ دونوں کے توسط سے آگے بڑھتی ہے۔ خدا قادرِ مطلق ہے اس نے زکریا علیہ السلام کو ایک سو بیس سال کی عمر میں فرزند عطا کیا حالانکہ ان کی بیوی بھی بانجھ تھی۔ یہ بھی خدا کی قدرت کا ایک نمونہ اور اس کی رحمت کی ایک نشانی ہے تو جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ اے مریمؑ! بغیر کسی مرد کے ہاتھ لگائے تجھے بچہ عطا کر دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے

نشانِ قدرت

فرمایا، بچہ عطا کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِّلنَّاسِ تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دیں۔ سورۃ مومنون میں اللہ نے فرمایا وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً (آیت ۵۰) ہم نے عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو تمام جہان کے لیے ایک نشانی بنا دیا ان دونوں کی پوری زندگی کے حالات ہی ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی قدرت کی نشانی کے طور پر قائم کر دیا تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ تامہ پر ایمان لائیں۔ فرمایا یہ صرف نشانی نہیں بلکہ وَرَحْمَةً مِّنَّا ہماری جانب سے مہربانی بھی شاملِ حال ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی تھی کہ انہیں برگزیدہ بنایا اور ان پر طرح طرح کے انعامات کیے۔ اللہ نے خود مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ میں بھی کمال درجے کا مادہ ترحم ودیعت فرمایا تھا۔ وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا اور یہ ایک طے شدہ فیصلہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت میں یہ طے شدہ بات تھی کہ حضرت مریمؑ کو اس

طریقے سے بغیر باپ کے بیٹا عطا کرتا ہے جو کہ اللہ کا جلیل القدر صاحبِ کتاب رسول ہوگا۔ اب اگلی آیات میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پیدائش اور دیگر حالات بیان ہو رہے ہیں۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ فَاَجَآءَهَا
الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ
قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ
تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِىْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾
وَهُزِّىْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا
جَنِيًّا ﴿۲۵﴾ فَكُلِىْ وَاشْرَبِىْ وَقَرِّىْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ
مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِىْٓ اِنِّىْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا
فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾

ترجمہ:- پس حاملہ ہوئی وہ (مریمؑ) اُس بچے کے ساتھ۔ پھر
اُس کو لے کر چلی گئی ایک دور مکان میں ﴿۲۲﴾ پھر مجبور کیا اُس
کو درد زِہ نے کھجور کے ایک تنے کی طرف۔ تو کہنے لگی
کاش کہ میں مر جاتی اس سے پہلے، اور ہوتی میں بھولی
بھلائی ہوئی ﴿۲۳﴾ پس پکارا اُس کو اُس کے نیچے کی طرف
سے کہ نہ غمگین ہو تم، بیشک بنایا ہے تیرے پروردگار
نے تیرے نیچے ایک چشمہ ﴿۲۴﴾ اور ہلاؤ اپنی طرف کھجور کے تنے
کو تو گریں گے تم پر کھجور کے تازہ پھل ﴿۲۵﴾ پس کھاؤ اور
پیو اور اپنی آنکھ ٹھنڈی کرو۔ پس اگر دیکھو تم کسی ایک کو آدمیوں

ہیں سے تو کہو بیشک میں نے نذر مانی ہے رحمان کے
لیے روزہ رکھنے کی بس میں ہرگز کلام نہیں کروں گی آج
کے دن کسی انسان سے (۲۶)

ربطِ آیات

پہلے حضرت مریمؑ کی ولادت کا ذکر ہوا۔ پھر جب وہ جوان ہوگئیں تو اللہ کی طرف سے فرشتہ انسانی شکل میں متمثل ہو کر تنہائی میں ان کے سامنے آگیا۔ حضرت مریمؑ کو بڑا استعجاب ہوا۔ اور انہوں نے خدا تعالیٰ کی پناہ طلب کی۔ فرشتے نے کہا کہ میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں اور تجھے ایک بچہ عطا کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر حضرت مریمؑ کو مزید تعجب ہوا کہ نہ تو ان کا نکاح ہوا ہے اور نہ ہی مقاربت، وہ بدکار بھی نہیں ہیں، تو پھر بچہ کیسے ہوگا۔ اللہ کے فرشتے نے کہا کہ بچہ پیدا کرنا تیرے پروردگار کے لیے نہایت آسان ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے اور ہر چیز کام کرنے پر مکمل اختیار رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے لوگوں کے لیے ایک نشانی بنانا چاہتا ہے۔ یہ اس کی مہربانی سے ہوگا جو کہ فیصلہ شدہ امر ہے۔

استقرارِ حمل

اب آج کی ابتدائی آیت میں حضرت مریمؑ کے استقرارِ حمل کا ذکر ہے۔ البتہ درمیان میں ایک چیز محذوف ہے جس کا ذکر سورۃ الانبیاء میں اللہ نے اس طرح کیا ہے "فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا" (الانبیاء - ۹۱) ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی جس سے حمل قرار پا گیا یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی قدرتِ تامہ کا ظہور تھا کہ محض پھونک مارنے سے حمل ہوگیا۔ یہاں پر اسی بات کو بیان کیا گیا ہے فَحَمَلَتْهُ پس مریم حاملہ ہوگئیں۔ اب حمل کی مدت کے متعلق مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے، سات، آٹھ یا نو ماہ کا حمل عام طور پر ہوتا ہے اور عام مفسرین اسی بات کے قائل ہیں کہ حضرت مریمؑ نے حمل کی مدت معمول کے مطابق پوری کی۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ حمل کی مدت معمول سے بہت کم تھی۔ ان کی تحقیق کے مطابق نفخِ جبرائیلؑ سے حمل قرار پایا۔ اس کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کے پیٹ میں بچے کی تصویر بنائی اور چند گھنٹوں کے اندر اندر بچہ مکمل طور پر تیار ہو کر ولادت کے قابل ہوگیا امام جزریؒ نے اسد الغابہ میں اس بات کو پورے یقین کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حمل قرار پانے

کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ زچگی کی حالت طاری ہو گئی اور ولادت کا وقت قریب آگیا۔ اب حضرت مریمؑ کو طبعی طور پر پریشانی لاحق ہوئی۔ ایسی حالت میں انہوں نے اپنی جائے قیام پر رہنا پسند نہ کیا۔ لہٰذا وہ کسی دُور مکان میں چلی گئیں تاکہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔

زچگی کی حالت

اسی واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا حضرت مریم بچے کو پیٹ میں اٹھائے کسی دور مکان میں چلی گئیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ آپ بیت اللحم میں چلی گئیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ولادت اسی مقام پر ہوئی تھی اور یہ جگہ بیت المقدس سے آٹھ میل کی مسافت پر ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اپنے مکان سے کہیں دور کسی جنگل یا پہاڑ میں چلی گئیں۔ انہوں نے تنہائی کی جگہ تلاش کر لی جہاں کوئی مرد یا عورت نہیں تھی۔ اسی حالت میں فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ دردِ زہ نے انہیں کھجور کے ایک تنے کی طرف جانے پر مجبور کر دیا۔ مخض دراصل پیٹ میں بچے کی حرکت کو کہتے ہیں جب وہ ولادت کے قریب ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عورت کے لیے اضطراری حالت ہوتی ہے۔ اور اس حالت میں بعض اوقات عورت اپنے ہاتھوں یا پیشانی کے ساتھ کسی جگہ سے ٹیک لگاتی ہے کیونکہ بچے کی پیدائش کے وقت زور لگتا ہے۔ اس وقت عورت کو بڑی تکلیف ہوتی ہے جسے بعض عورتیں برداشت نہ کر کے موت کے منہ میں بھی چلی جاتی ہیں۔ اسی لیے حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ زچگی کی حالت میں وفات پانے والی ایماندار عورت شہادت کا درجہ پا لیتی ہے۔ بہرحال دردِ زہ نے حضرت مریمؑ کو مجبور کیا اور وہ خشک کھجور کے ایک تنے کے پاس چلی گئیں۔ آپ پر سخت اضطراری حالت تھی اور اسی حالت میں آپ نے کہا قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا کاش کہ یہ معاملہ پیش آنے سے پہلے

میں مر چکی ہوتی وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا اور میں بھولی بسری ہو جاتی یعنی میرا نام و نشان تک باقی نہ ہوتا۔

موت کی تمنا

حضرت مریمؑ کی طرف سے یہ موت کی تمنا تھی جو کہ عام حالات میں جائز نہیں ہے۔ اس ضمن میں حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی ؒ فرماتے ہیں کہ دنیاوی غم کی وجہ سے اضطراری حالت میں ایسی بات زبان سے نکل جانا عیب کی بات نہیں ہے۔ تاہم حضرت مریم رضی اللہ عنہا کے لیے باعثِ تشویش یہ امر تھا کہ لوگ طعنہ زنی کریں گے کہ کنواری مریمؑ کے ہاں بچہ کیسے پیدا ہو گیا۔ حضرت مریمؑ کا خیال تھا کہ وہ لوگوں کی طعنہ زنی پر صبر نہیں کر سکیں گی۔ اور بے صبری بجائے خود ایک مصیبت ہے لہٰذا اس مصیبت در مصیبت سے بہتر ہے کہ اسے موت ہی آ جائے کیونکہ موت واقع ہونے سے بظاہر ہر قسم کی تکالیف ختم ہو جاتی ہیں۔ اور انسان کسی بات کا مکلف نہیں رہتا۔ امام ابو بکر جصاصؒ اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت مریمؑ کو اپنی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ اور نہ وہ اس وجہ سے موت مانگ رہی تھیں۔ انہیں تو خدا تعالیٰ کا پیغام فرشتے کے ذریعے پہنچ چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس طریقے سے بیٹا عطا کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور تقدیر پر راضی تھیں اور وہ سمجھتی تھیں کہ ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ٹھیک ہے۔ البتہ انہیں فکر اس بات کی تھی کہ لوگ ان پر بلاوجہ طعنہ زنی کر کے گناہ میں مبتلا ہوں گے اور آپ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ لوگوں کے لیے گناہ کا باعث بنیں۔ اس بات کی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں بھی ملتی ہے۔ انہوں نے بتوں کے متعلق اللہ کے حضور دعا کی تھی۔ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ اے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے۔ حالانکہ بت تو بے جان

ڈھالتے تھے، وہ بھلا کسی کو کیا گمراہ کرتے۔ دراصل لوگ خود بتوں کی پوجا کر کے اور ان کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر گمراہی میں پڑتے تھے، تاہم اس گمراہی کا سبب تو یہی بت تھے۔ اسی لیے ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا "وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ" (ابراہیم۔ ۳۵) اے اللہ! مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پوجا سے محفوظ رکھ۔ بہرحال مقصد یہ ہے کہ جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو گمراہی کا سبب قرار دیا، اسی طرح حضرت مریمؑ نے بلانکاح بچے کی پیدائش کو لوگوں کے گناہ میں مبتلا ہونے پر محمول کیا، اور اس واسطے موت کی تمنا کی تاکہ گناہ میں آلودگی کا سبب ہی ختم ہو جائے۔

حضرت مریمؑ کے لیے تسلی

حضرت مریمؑ کی اس پریشانی کے عالم میں "فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَا" پس پکارا اس کو نیچے کی جانب سے۔ بعض فرماتے ہیں کہ پکارنے والا وہی فرشتہ تھا جس نے پہلے بچے کی ولادت کی خوشخبری سنائی تھی۔ مگر اب زچگی کی حالت میں وہ حضرت مریمؑ کے سامنے نہیں آیا تھا، بلکہ نیچے اوٹ میں رہ کر اس نے حضرت مریمؑ کو آواز دی "أَلَّا تَحْزَنِي" کہ اے مریم! غمگین نہ ہو۔ زچگی کی اس حالت میں تمہیں پریشانی ضرور ہے ایسے موقع پر عورتیں پاس ہوتی ہیں جو ضرورت کی اشیاء مہیا کرتی ہیں اور زچہ کی ڈھارس بندھاتی ہیں، مگر تو یہاں بالکل اکیلی ہے۔ اس لیے تشویش پیدا ہونا ایک طبعی امر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس تکلیف کے وقت میں تمہارے پاس خورد و نوش کا بھی کوئی سامان نہیں ہے، لہٰذا تمہاری تکلیف بجا ہے، مگر تسلی رکھو اور خوف نہ کھاؤ۔ جس خدا تعالیٰ نے تمہیں بغیر شادی کے بچہ عطا کیا ہے، وہ تمہاری دیگر ضروریات کا بھی ضرور انتظام کرے گا۔ لہٰذا پریشانی کی بات اپنے ذہن سے نکال دو اور غم نہ کھاؤ۔ بعض فرماتے ہیں کہ آواز دینے والا فرشتہ نہیں بلکہ گود سے بیٹے اللہ نے خود مسیح علیہ السلام

گویا اُن کو تسلی کا سامان پیدا کر دیا تھا۔

خورد و نوش کا سامان

فرمایا غم نہ کھاؤ فَقَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا تحقیق تیرے پروردگار نے تیرے نیچے ایک چشمہ بنا دیا ہے۔ اُس مقام پر بظاہر پانی نہیں تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے قریب ہی ایک خصوصی چشمہ جاری کر دیا تاکہ وہ پانی کی ضروریات وہاں سے پوری کر سکیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ تَحْتِهَا میں ھا کی ضمیر کھجور کی طرف لوٹتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ فرشتے نے کھجور کی نچلی طرف سے آواز دی کہ اللہ نے چشمہ جاری کر کے پانی کا انتظام کر دیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سریا کا لفظ چشمہ کے لیے بھی آتا ہے اور سردار کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اگر یہ معنی لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے تمہارے پیٹ سے ایک سردار یعنی مسیح علیہ السلام کو نکالا ہے لہذا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم اس مقام پر چونکہ سامانِ خورد و نوش کی ضرورت تھی اس لیے سریا کا معنی چشمہ ہی زیادہ مناسب حال ہے۔

پھر فرشتے نے یہ بھی آواز دی وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ اور اپنی طرف کھجور کے اس تنے کو ہلاؤ۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا تمہاری طرف تازہ اور پکی ہوئی کھجوریں گریں گی۔ جنیا اُس پھل کو کہتے ہیں جو پک کر برداشت کے قابل ہو جاتا ہے تو فرشتے نے کہا کہ ذرا اس کھجور کے تنے کو ہلاؤ، اللہ نے تمہاری خوراک کا بندوبست کر دیا ہے، کھجوریں خود بخود تمہارے پاس آ کر گریں گی۔ اللہ نے کھجور جیسی خوش ذائقہ اور مقوی جسم بہترین غذا بھی مہیا فرما دی۔

حرکت میں برکت

اس مقام پر قابلِ غور یہ امر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کھجور کے تنے کو ہلانے کا حکم کیوں دیا؟ حالانکہ جو پروردگار معجزانہ طور پر پانی کا چشمہ جاری کر سکتا تھا وہ کھجوریں بھی خود بخود حضرت مریمؑ کے قریب اتار سکتا تھا، مگر ہلانے کا

حکمت سے کہ اللہ نے یہ بات سمجھائی کہ حرکت میں برکت ہے۔ تم تھوڑی سی کوشش کرو تو اللہ تعالیٰ تمہاری خورد نی ضروریات پوری کر دے گا اس سے یہ قانون بھی سمجھایا گیا ہے کہ کسی آدمی کو بیکار نہیں رہنا چاہیئے بلکہ گزر اوقات کے لیے حتی المقدور کوئی نہ کوئی کام کرنا چاہیئے۔ عالم اسباب میں بیکار محض بیٹھ رہنا درست نہیں ہے۔

فرمایا تنے کو ہلانے سے کھجوریں گریں گی فَكُلِي ان کو کھاؤ وَاشْرَبِي اور اس چشمے کا پانی پیو تاکہ تمہاری جسمانی قوت بحال ہو نیز وَقَرِّي عَيْنًا اس بچے کو دیکھ کر محبت سے اپنی آنکھیں بھی ٹھنڈی کرو تمہیں خوشی ہونی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت تامہ سے کمال درجے کا بچہ عطا کیا ہے جو بے مثال اور خدا کا نبی اور رسول ہے۔

چپ کا روزہ

آگے اللہ نے لوگوں کی طعن و تشنیع سے بچنے کی ایک ترکیب بھی بتائی۔ فرمایا فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا اگر تم آدمیوں میں سے کسی کو دیکھو اور اس سے کوئی بات نہ کرنا فَقُولِي بلکہ یوں کہنا إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا کہ میں نے خدائے رحمان کے لیے چپ کا روزہ رکھنے کی نذر مانی ہوئی ہے فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا لہٰذا آج میں کسی سے بات نہیں کروں گی۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں پر روزے کی نذر ماننے کا تو ذکر موجود ہے مگر بذات خود روزے کی نیت کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ فرماتے ہیں کہ نذر ماننے کے حکم میں روزے کی نیت کرنے کا حکم بھی شامل ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے مریمؑ! تم چپ کے روزے کی نیت کر لو۔ اور پھر کہہ دینا کہ میں آج کسی سے بات نہیں کروں گی کیونکہ میں نے چپ کا روزہ رکھا ہوا ہے صبح سے شام تک یہ روزہ رکھنا۔ پھر زچگی کی تکلیف کسی حد تک رفع ہو جائیگی، جسم میں قوت آنے گی تو پھر اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرنا۔

چپ کا روزہ پہلی شریعت میں جائز تھا، مگر جیسا کہ ابوداؤد شریف
مسند امام ابوحنیفہؒ اور بعض دوسری کتب حدیث میں یہ حدیث موجود ہے،
ہماری شریعت میں چپ کا روزہ روا نہیں ہے۔ اسی طرح صوم وصال
یعنی مسلسل کئی کئی دن کا روزہ بھی ہماری شریعت میں جائز نہیں بلکہ ہر روزے
کے لیے سحری اور افطاری ضروری ہے۔ ابوداؤد شریف کی روایت
میں یہ بھی ہے لَا يُتْمَ بَعْدَ بُلُوْغٍ یعنی بالغ ہوجانے کے بعد
یتیمی کا حکم باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح ہماری شریعت میں چپ کا روزہ
بھی جائز نہیں ہے۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۚ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ﴿٢٧﴾ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿٢٨﴾ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۖ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿٢٩﴾ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۗ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿٣٠﴾ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۖ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿٣١﴾ وَّبَرًّا ۢ بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿٣٢﴾ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿٣٣﴾

ترجمہ:- پس لائی وہ بچے کو اپنی قوم کے پاس، اس کو اٹھا رہی تھی (اپنی گود میں) تو انہوں نے کہا، اے مریمؑ! البتہ تحقیق لائی ہے تو ایک چیز اُوپری ﴿٢٧﴾ اے ہارون کی بہن! تیرا باپ کوئی بُرا آدمی نہیں تھا اور نہ تیری ماں بدکار تھی ﴿٢٨﴾ پس اُس (مریم) نے اشارہ کیا اُس (بچے) کی طرف۔ وہ کہنے لگے ہم کیسے کلام کریں اس (بچے) کے ساتھ جو گہوارے میں ہے ﴿٢٩﴾ وہ (بچہ) بولا، بیشک میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اُس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے

نبی بنایا ہے ﴿۳۰﴾ اور مجھے برکت والا بنایا ہے۔ جہاں بھی میں ہوں۔ اور اُس نے مجھے تاکید کی ہے نماز کی اور زکوٰۃ کی جب تک کہ میں زندہ رہوں ﴿۳۱﴾ اور نیکی کرنے والا اپنی والدہ کے ساتھ۔ اور نہیں بنایا مجھ کو سرکش اور بدبخت ﴿۳۲﴾ اور سلامتی ہے مجھ پر جس دن کہ میں پیدا ہوا، اور جس دن میں مروں گا اور جس دن میں دوبارہ زندہ کھڑا کیا جاؤں گا ﴿۳۳﴾

ربط آیات

گزشتہ آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا ذکر ہوا۔ اللہ نے حضرت مریمؑ کی پریشانی کا حال ذکر کیا اور پھر اُن کو تسلی بھی دی جنگل یا پہاڑی غار میں اُن کو کھانے پینے کی اشیاء اپنی قدرت تامہ سے مہیا کیں۔ پھر یہ بھی فرمایا کہ اے مریمؑ! اگر کسی شخص سے ملاقات ہو جائے تو کہنا کہ آج کے دن میں نے چپ کا روزہ رکھا ہوا ہے، لہٰذا کسی سے کلام نہیں کروں گی۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کے مع بچے قوم کے پاس آنے اور مسیح علیہ السلام کی طرف سے اپنی ماں کی صفائی بیان کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔

حضرت مریمؑ قوم کے پاس

ارشاد ہوتا ہے فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ پس آئی مریمؑ اپنی قوم کے پاس اپنے بچے کو گود میں اُٹھائے ہوئے۔ یہاں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ حضرت مریمؑ ولادت مسیح کے بعد کتنا عرصہ تک جائے ولادت پر مقیم رہیں۔ البتہ بعض تفسیری روایات میں چالیس دن کا ذکر آتا ہے۔ تفسیری روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بعد حضرت مریمؑ کی ملاقات سب سے پہلے اپنے چچازاد بھائی یوسف نجار سے ہوئی۔ یہ بھی بیت المقدس کے خادم اور صالح آدمی تھے۔ انہوں نے بھی بچے کی پیدائش پر بڑا تعجب کیا اور حضرت مریمؑ سے سوال کیا کہ کیا کوئی پودا یا اناج بغیر بیج کے پیدا ہوتا ہے اسی طرح کسی عورت کے ہاں بغیر مرد کے بچہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ حضرت مریمؑ نے اس کا جواب یہ دیا کہ تمہارا دعوےٰ درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے وہ جو چاہے اور جس طرح چاہے پیدا کرنے پر

قادر ہے۔ آخر اس نے دنیا میں پہلا پودا یا پہلا دانہ بھی تو بغیر بیج کے پیدا کیا تھا۔ اسی طرح پہلا انسان بھی بغیر ماں باپ کے پیدا ہوا۔ تو اب اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کونسی مشکل بات ہے کہ وہ چیز بغیر ظاہری وسیلہ کے پیدا فرماتے۔ بہرحال اس جواب سے یوسف نجار کی تسلی ہو گئی۔

جب حضرت مریمؑ بچے کو گود میں اٹھائے اپنے خاندان یا قوم کے پاس آئی تو وہ دیکھ کر سخت پریشان ہو گئے اور سب نے بیک زبان کہا قَالُوا يَا مَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا اے مریمؑ! تو تو ایک اوپری یعنی نادر چیز لے آئی ہے۔ کہنے لگے ابھی تک تیرا نکاح تو کسی سے ہوا نہیں، پھر تو بچہ کہاں سے لے آئی۔ انہوں نے حضرت مریمؑ کی سخت الفاظ میں مذمت کی اور کہا يَا أُخْتَ هَارُونَ اے ہارون کی بہن! مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ تیرا باپ کوئی برا آدمی تو نہیں تھا۔ وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا اور تیری ماں بھی کوئی بدکار عورت نہیں تھی، مگر تو نے یہ کیا گل کھلایا۔ تیرے والدین تو نہایت پارسا تھے، ان کی نیکی کا ہر طرف چرچا تھا مگر تو نے بدکاری کا ارتکاب کر کے اپنے نیک نام والدین کو بھی بدنام کر دیا۔ حضرت مریمؑ کے والد عمران بیت المقدس کے امام اور نہایت صالح آدمی تھے، وہ اگرچہ نبی نہیں تھے مگر ان کی نیکی لوگوں میں مسلم تھی۔ ان کی والدہ بھی صاحب کرامت تھیں تو لوگوں نے ان نیک ماں باپ کا ذکر کر کے حضرت مریمؑ کو ملامت کی

ہارون کون تھے؟

یہاں پر حضرت مریمؑ کو ہارون کی بہن کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہارون کون ہیں؟ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ یمن گئے تو وہاں کے لوگوں نے آپ سے کہا کہ تمہارے قرآن میں ہارون کو مریمؑ کی بہن کہا گیا ہے حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت مریمؑ کے درمیان تو ایک ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ اس وقت

حضرت مغیرہؓ کو اس کا جواب چونکہ معلوم نہیں تھا، اس لیے انہوں نے کہا کہ اس کا جواب حضور علیہ السلام سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ صحیح روایت میں آتا ہے کہ جب اس بات کا ذکر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس ہوا تو آپ نے فرمایا اِنَّهُمْ يُسَمُّوْنَ بِاَنْبِيَائِهِمْ وَالصَّالِحِيْنَ قَبْلَهُمْ یعنی لوگ اس وقت اپنے انبیاء اور پہلے نیک بزرگوں کے نام رکھتے تھے۔ مطلب یہ کہ حضرت مریمؑ کے بھائی ہارون وہ نہیں تھے جو حضرت موسیٰؑ کے بڑے بھائی اور نبی تھے بلکہ یہ کوئی دوسرے ہارون تھے جن کا نام حضرت ہارون علیہ السلام کے نام پر رکھا گیا ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ مریمؑ کے والد کا تعلق حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے تھا اور دستور یہ ہے کہ کسی سے تعارف کراتے وقت یا ویسے ہی شخص بہ انداز میں خاندان کے کسی بڑے آدمی کے نام پر موسوم کیا جاتا ہے، اس لیے لوگوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کی خاندانی نسبت سے حضرت مریمؑ کو ہارون کی بہن کہا۔ اس کی مثال قرآن پاک میں دوسری جگہ موجود ہے "وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا (ھود - ۵۰) ہم نے عاد کی طرف اُن کے بھائی ہود علیہ السلام کو مبعوث کیا"۔ اس قوم کا بڑا آدمی تھا جو ہود علیہ السلام سے ہزاروں سال پہلے گزر چکا تھا مگر اس کی طرف نسبت کر کے آپ کو عاد کا بھائی کہا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اسی طرح حضرت مریمؓ کو حضرت ہارون کی بہن کہا گیا ہو۔ قوم کا مطلب یہ تھا کہ تم اللہ کے جلیل القدر نبی ہارون علیہ السلام کی بہن یعنی اس کی اولاد سے ہو مگر تم نے یہ کیا غضب ڈھایا کہ کنواری ہو کر بچہ لے آئی؟

بعض تاریخی محققین اور بائیبل کے عالم ایک دوسری توجیہہ بھی کرتے ہیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام اگرچہ عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے مگر مرتبہ چھوٹے بھائی کا زیادہ ہے کہ اللہ نے انہیں کتاب تورات عطا فرمائی اور ہارون علیہ السلام بمنزلہ وزیر کے تھے۔ خلافت کا کام حضرت

ا؎ قرطبی ج ۱۱ (فیاض)

موسیٰ علیہ السلام کے سپرد تھا اور آپ کے بعد بھی آپ ہی کی نسل میں جاری رہا البتہ مذہبی رسومات اور عبادات کی پیشوائی حضرت ہارون کے سپرد تھی اور ان کے بعد بھی آپ کی نسل میں منتقل ہوتی رہی۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔ اور بطور قبولیت توبہ کے لیے ان کے قتل کا حکم اللہ نے دیا تو اُس وقت پوجا نہ کرنے والوں کے ہاتھوں پوجا کرنے والوں کے قتل کی نگرانی بھی حضرت ہارون علیہ السلام کے سپرد تھی مطلب یہ کہ عبادات اور مذہبی رسوم کی ادائیگی حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل میں چلی آرہی تھی اور اُس زمانے میں یہ کام حضرت مریمؓ کے والد عمران کے سپرد تھا جو کہ بیت المقدس کے امام تھے، اس لحاظ سے بھی حضرت مریمؓ کو ہارون کی بہن کا خطاب درست معلوم ہوتا ہے۔

ماحول
سوسائٹی

ماہرین نفسیات بیان کرتے ہیں کہ انسان میں خاندان اور ماحول کے اثرات کسی نہ کسی حد تک ضرور پائے جاتے ہیں۔ خاندان اور برادری یا اردگرد کا ماحول انسان کو ضرور متاثر کرتا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1] اِنَّمَا الْاَخْلَاقُ بِالْاَحْوَالِ لَا بِالتَّعَلُّمِ یعنی اخلاق ماحول سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ تعلیم سے جن گھروں میں یا گلی محلوں میں گالی گلوچ کی آوازیں آتی ہوں گی۔ وہاں کے بچے بھی یہی کچھ سیکھیں گے۔ اسی لیے اسلام نے سوسائٹی کو پاک رکھنے کا تاکیدی حکم دیا ہے۔ جب تک ہمارا ماحول پاک نہیں ہوگا ہمارے اخلاق نہیں سنور سکتے۔ لہٰذا سوسائٹی کا اچھا ہونا بڑا ضروری ہے۔ سورۃ الفجر کے آخر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ ۔ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ پہلے میرے بندوں میں شامل ہو جاؤ۔ پھر جنت میں داخلہ ملے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک سوسائٹی اچھے اور نیک لوگوں کی نصیب نہیں ہوگی، اس وقت تک کامیابی ممکن نہیں تو لوگوں نے حضرت مریمؓ کو طعن کیا کہ تمہارا خاندان اور سوسائٹی تو اچھی تھی مگر تم نے یہ غلط کام کیوں کیا۔

[1] بدور بازغہ صلا؟ (فیاض)

بچے کی شہادت

مفسرین بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت مریمؑ بچے کو لے کر مقام زچگی سے گھر کی طرف آ رہی تھیں تو وہ لوگوں کے طعن و تشنیع سے سخت خائف تھیں۔ اس دوران میں اللہ تعالیٰ نے بچے کو قوت گویائی عطا فرمائی اور اس نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ گھبراؤ نہیں جس اللہ نے مجھے نبی بنایا ہے وہ تمہارے دامن پر بھی دھبہ نہیں آنے دیگا۔ چنانچہ انھیں تسلی تھی کہ اللہ تعالیٰ کوئی بہتر راستہ نکالے گا۔ پھر جب قوم کے لوگوں نے سختی سے باز پرس کی فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ تو مریمؑ نے اس بچے کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ سارا معاملہ مجھ سے پوچھنے کی بجائے اس بچے سے ہی دریافت کر لو۔ اس پر لوگ مزید بھڑکے کہ یہ ہمیں بے وقوف بنا رہی ہے۔ قَالُوا کہنے لگے كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا بھلا ہم گہوارے یعنی گود میں پڑے ہوئے بچے سے کیسے گفتگو کر سکتے ہیں، جسے ابھی تک اپنے آپ کا بھی شعور نہیں ہے۔

ابھی یہ بات چیت ہو رہی تھی قَالَ بچہ خود بخود بول اٹھا اور کہا اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ گویا مسیح علیہ السلام نے ماں کی گود میں پہلے ہی جملہ میں توحید باری تعالیٰ کا اعلان کر کے یہود و نصاریٰ کے منہ بند کر دیے۔ مسیح علیہ السلام کے بارے میں بعد میں دو انتہائی گروہ معرض وجود میں آئے۔ یہودیوں نے تو مسیح علیہ السلام کو زانیہ کا بیٹا تک کہہ دیا اور اس طرح اُن کی توہین کی۔ دوسری طرف نصاریٰ کا گروہ تھا جنہوں نے آپ کو خدا کا بیٹا تجویز کر کے الوہیت کے درجے پر پہنچا دیا۔ اور اس طرح دونوں گروہ گمراہی کا شکار ہو گئے، حالانکہ اگر غور کرتے تو مسیح علیہ السلام کی زبان سے نکلا ہوا پہلا جملہ ہی حقیقت حال کی وضاحت کے لیے کافی تھا۔ وہ اللہ کے مقرب بندے اور نبی تھے۔ نہ تو وہ بدبخت تھے کہ زانیہ کے شکم سے پیدا ہوتے اور نہ وہ الوہیت کے مرتبے پر فائز تھے، بلکہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے

وہ باعزت تھے ۔ نہ کہ حقیر۔

پھر فرمایا اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب یعنی انجیل عطا فرمائی ہے وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا اور مجھے نبی بنایا ہے اگرچہ نبوت سا ظہور اپنے مقررہ وقت پہ جاکر ہوگا۔ کتاب بھی اللہ نے اسی وقت آپ کو نہیں دے دی تھی مگر نبوت اور کتاب کا فیصلہ مشیت ایزدی میں ہو چکا تھا جس کو اللہ نے بچپن میں ہی مسیح علیہ السلام کی زبان سے کہلوا دیا اللہ کے دو نبی ایسے ہوئے ہیں۔ جنہیں بچپن میں نبوۃ عطا ہوئی۔ ایک یحییٰ علیہ السلام جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور دوسرے مسیح علیہ السلام۔

بابرکت مسیح علیہ السلام

اس موقع پر آپ نے چوتھی بات یہ فرمائی وَجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اللہ نے مجھے برکت والا بنایا ہے۔ برکت میں تقدس کی زیادتی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اور مبارک سے مراد ایسی ہستی ہے جس سے اللہ کی مخلوق کو بہت زیادہ فائدہ پہنچے۔ وہ مُعَلِّمُ الْخَیْرِ یعنی خیر کی تعلیم دینے والا ہو اور نَفَّاعٌ یعنی بہت زیادہ نفع پہنچانے والا ہو، صاحب کرامت و معجزات ہو۔ یہ سب چیزیں برکت میں داخل ہیں۔ اصل میں برکت دہندہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جیسے فرمایا تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ" (الملک - ۱) بابرکت ہے وہ ذات جس کے قبضہ میں بادشاہی ہے نیز فرمایا فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ (مومنون ۱۴) بابرکت ہے اللہ کی ذات جو سب سے بہتر پیدا کرنے والا ہے بہرحال مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے بابرکت بنایا ہے اَیْنَ مَا کُنْتُ میں جہاں کہیں بھی ہوں، اللہ تعالیٰ کے فضل سے برکت والا ہوں

نماز اور زکوٰۃ کی تاکید

پانچویں بات اللہ تعالیٰ نے بچے کی زبان سے یہ کہلوائی وَاَوْصٰنِیْ

بالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ اللہ نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی تاکید فرمائی ہے
نماز اور زکوٰۃ دونوں عبادتیں ہیں، ایک بدنی ہے اور دوسری مالی۔ نماز سے
تعلق باللہ قائم ہوتا ہے اور زکوٰۃ مخلوقِ خدا کے ساتھ ہمدردی کا ذریعہ ہے
ہے۔ جب تک انسان بقیدِ حیات ہے اُسے نماز معاف نہیں البتہ زکوٰۃ
اُس وقت فرض ہوتی ہے جب کوئی شخص مالدار ہو اور اس کا مال نصاب
کو پہنچ جائے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے تو عمر بھر مکان نہیں بنایا نہ اُن
کے پاس مال واسباب تھا، لہذا آن کے زکوٰۃ ادا کرنے کا تو امکان نہیں تھا
البتہ زکوٰۃ ادا کرنے کی تعلیم آگے دی جاسکتی ہے تاکہ صاحبانِ نصاب
اس کو ہر سال باقاعدگی سے ادا کرتے رہیں۔ آگے حضرت اسماعیل علیہ السلام
کے متعلق بھی آتا ہے وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ
وَالزَّكٰوةِ (مریم - ٥٥) وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے
تھے۔ تو اس جملے سے مسیح علیہ السلام کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ میں زکوٰۃ کی ادائیگی
کی تلقین کرتا رہوں گا۔ اس کے علاوہ نماز خود بھی پڑھوں گا اور دوسروں کو بھی
پڑھنے کا حکم دوں گا۔ زکوٰۃ کا لغوی معنیٰ طہارت اور پاکیزگی بھی ہوتا ہے
اس لحاظ سے عیسٰی علیہ السلام کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے
نماز پڑھنے اور پاکیزگی اختیار کرنے کی تاکید کی ہے۔ اور میں یہ فریضہ بجالاتا
رہوں گا مَا دُمْتُ حَيًّا جب تک زندہ ہوں۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

عیسٰی علیہ السلام نے بچپنے میں چھٹی بات یہ فرمائی وَبَرًّا بِوَالِدَتِي
میں اپنی والدہ کے ساتھ نیکی کرنے والا ہوں۔ پہلے یحیٰی علیہ السلام کے واقعہ
میں گزر چکا ہے وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ (آیت - ١٤) کہ وہ اپنے ماں باپ
دونوں کے ساتھ نیکی کرنے والے تھے۔ اور یہاں پر صرف والدہ کا ذکر ہے
کیونکہ عیسٰی علیہ السلام کا باپ ہی نہیں تھا۔ چنانچہ یہ آیت اس بات پر واضح طور
دلالت کرتی ہے کہ اللہ نے عیسٰی علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا فرمایا۔ اس

کے باوجود بعض گمراہ لوگ مثلاً سرسید، پرویز اور حافظ وزیر آبادی وغیرہ مسیح علیہ السلام کا باپ ثابت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی، اس لیے محض اپنے ڈھکوسلے چلاتے رہتے ہیں۔

طبی لحاظ سے بھی کسی شخص کی باپ کے بغیر پیدائش ناممکن نہیں۔ ماہرین طب کہتے ہیں کہ مرد اور عورت دونوں کے مادہ منویہ میں مثبت اور منفی دونوں قسم کے مواد پائے جاتے ہیں اور یہی چیز پیدا ہونے والے بچے میں جنس کی تفریق کرتی ہے۔ اگر مرد کی منفی صفت عورت کی مثبت صفت کے ساتھ مل جائے تو بچی پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر عورت کی منفی صفت مرد کی مثبت صفت کے ساتھ مل جائے تو بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ عورت کی مثبت قوت میں اضافہ کر دے تو بغیر مرد کے ملے بھی بچہ پیدا ہو سکتا ہے۔ گویا طبی طور پر بھی بغیر باپ کے بچے کی پیدائش عقل سے بعید نہیں۔

پھر اگلی بات مسیح علیہ السلام نے یہ فرمائی وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا اور اللہ نے مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا۔ میں ایسا شخص نہیں ہوں جو قول یا فعل سے والدین کی دل آزاری کروں۔ ان کے ساتھ تلخ کلامی یا گالی گلوچ پر اتر آؤں۔ اس کے برخلاف انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے۔ حقوق العباد میں سب سے پہلا حق والدین کا ہے کہ ان سے حسن سلوک کیا جائے۔ گزشتہ سورۃ بنی اسرائیل میں گزر چکا ہے تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (آیت۔ ۲۳) اور والدین کے ساتھ احسان کرو۔

جدید تہذیب اور والدین

کتنے افسوس کی بات ہے کہ جدید تہذیب میں والدین کے حقوق بالکل فراموش کر دیے گئے ہیں۔ اب تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ بچے کی پیدائش کا موقع ہے تو عورت کو ہسپتال میں داخل کر دو اور والدین بوڑھے ہو گئے تو انہیں دارالامان میں داخل کر دو۔ اب اولاد والدین کی

ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ بات انسانی قدروں کے خلاف ہے جس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ والدین اور اولاد کے درمیان شفقت و محبت کا رشتہ ختم ہو رہا ہے۔ والدین کی خدمت کرنے سے انسان میں اعلیٰ اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ اللہ نے والدین کے قدموں کے نیچے جنت رکھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جدید تہذیب نے بعض اچھے کام بھی کیے ہیں اور برے بھی، مگر پاکیزہ اخلاق و جذبات کا تو جنازہ نکل چکا ہے۔ اس تہذیب میں بوڑھے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی قدریں ختم ہو چکی ہیں حالانکہ اللہ نے اپنی وحدانیت کے بعد اسی بات کا حکم دیا ہے۔

مسیح علیہ السلام کے لیے سلامتی

مسیح علیہ السلام نے اپنی ماں کی گود میں یہ بھی کہا وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ اور سلامتی ہے مجھ پر جس دن کہ میں پیدا ہوا وَیَوْمَ اَمُوْتُ اور جس دن میں دنیا سے رخصت ہوں گا وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا اور جس دن میں دوبارہ کھڑا کیا جاؤں گا۔ انبیاء اور صالحین کے بارے میں سلامتی کا ذکر ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ ہر اچھے کام کی ابتداء میں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی کہہ کر اللہ کی تعریف کی جاتی ہے اور اللہ کے برگزیدہ بندوں کے لیے سلامتی کی دعا مانگی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی ہستیوں کے دین اور ایمان کو ہر قسم کی آلودگی سے محفوظ رکھتا ہے۔ اگرچہ اللہ کے بندوں کو جسمانی تکالیف ضرور آتی ہیں مگر دینی اعتبار سے وہ ہمیشہ سلامتی میں رہتے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس آخری امت کا اولین حصہ سلامتی والا ہے۔ ابتدائے اسلام میں اگرچہ اہل ایمان کو بے حد تکلیف برداشت کرنا پڑیں۔ مگر ان کا دین مکمل طور پر سلامت رہا۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ فتنے ابھرتے رہے، اخلاق بگڑ گئے، عقیدہ خراب ہو گیا، سوسائٹی گندی ہو گئی اور پورا ماحول بد سے بدتر ہوتا

چلا گیا۔ غرضیکہ حضورؐ کے فرمان کے مطابق سلامتی کے اعتبار سے امت کا اوّل حصہ ہی بہتر تھا۔ وہ کون سی تکلیف ہے جو اہل ایمان نے اسلام کے اولین دور کی زندگی میں برداشت نہیں کی، انہیں ایک لمحہ کے لیے بھی سکون نصیب نہ ہوا مگر دینی لحاظ سے انہیں خوش نصیب سلامتی حاصل تھی۔

ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿٣٤﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ ۖ سُبْحٰنَهُ ۚ إِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٣٥﴾ وَإِنَّ اللّٰهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿٣٦﴾ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ مَشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٣٧﴾ أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصِرْ يَوْمَ يَأْتُونَنَا ۖ لٰكِنِ الظّٰلِمُونَ الْيَوْمَ فِي ضَلٰلٍ مُبِينٍ ﴿٣٨﴾ وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ ۘ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٩﴾ إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿٤٠﴾ ع

وقف لازم

ترجمہ:- یہ ہے عیسیٰ مریمؑ کا بیٹا۔ یہ سچی بات جس میں یہ لوگ جھگڑا کرتے ہیں (٣٤) نہیں ہے اللہ تعالیٰ کے لیے لائق کہ وہ بنائے کوئی اولاد۔ پاک ہے اُس کی ذات۔ جب وہ فیصلہ کرتا ہے کسی کام کا، تو بیشک وہ کہتا ہے اس کے لیے ہو جا، پس وہ ہو جاتا ہے (٣٥) اور بیشک اللہ تعالیٰ ہی میرا رب ہے اور تمہارا رب بھی۔ اُسی کی عبادت کرو، اور

یہی ہے سیدھا راستہ (۳۶) پس اختلاف کیا گروہوں نے اپنے درمیان ۔ پس ہلاکت ہے اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا اُن کے بڑے دن کی حاضری کے وقت (۳۷) کیا خوب سنتے ہوں گے وہ اور کیا خوب دیکھتے ہوں گے جس دن کہ ہمارے پاس آئیں گے ، لیکن ظالم لوگ آج کے دن کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں (۳۸) اور ڈرا دیجئے اِن کو حسرت کے دِن سے جب کہ فیصلہ کیا جائے گا معاملے کا ، اور یہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ایمان نہیں لاتے (۳۹) بیشک ہم ہی وارث ہیں زمین کے ، اور جو کچھ اس کے اُوپر ہے اور ہماری طرف ہی یہ سب لوٹائے جائیں گے (۴۰)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں حضرت مریمؑ کا ذکر ہوا اور پھر عیسٰے علیہ السلام کی غیر معمولی طریقے سے ولادت کا بیان آیا۔ اس ضمن میں حضرت مریمؑ کی پریشانی کا حال بھی بیان ہو چکا ہے ۔ پھر وہ اپنے بچے کو اٹھائے اپنی قوم کے پاس آئیں تو انہوں نے سخت طعن ملامت کی کہ تیرے والدین تو بڑے صالح لوگ تھے تم یہ بغیر نکاح کے بچہ کیسے لے آئی ۔ حضرت مریمؑ نے خود جواب دینے کی بجائے بچے کی طرف اشارہ کیا کہ سارا معاملہ خود اسی سے پوچھ لو۔ اللہ نے بچے کو قوتِ گویائی عطا فرمائی تو بچے نے بول کر کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ مجھے اللہ نے کتاب دی ہے اور نبی بنا کر بھیجا ہے ۔ مجھے نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کی گئی ہے ۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ نیکی کرنے والا ہوں ۔ مجھ پر سلامتی ہے پیدائش کے دن ، موت کے دِن اور دوبارہ اٹھائے جانے کے دن ۔

عیسٰی ابن مریمؑ

یہاں تک عیسٰی علیہ السلام کا کلام تھا ۔ اب اگلی دو آیات میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی شخصیت پر خود اللہ تعالیٰ نے تبصرہ کیا ہے اور اس کے بعد پھر عیسٰی علیہ السلام کا بیان ہے ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے " ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ " یہ ہیں عیسٰی ابن مریم علیہ السلام جنہوں نے

گذشتہ آیات میں اپنا تعارف خود کرایا ہے کہ وہ عیسیٰ ابن مریم ہیں۔ آپ کے ابتدائی دور میں بھی لوگ آپ کو اسی نام سے پکارتے تھے۔ اس کی مثال سورۃ مائدہ میں موجود ہے کہ آپ کے حواریوں نے آپ کو اسی طرح خطاب کیا "اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ" (آیت-١٢٠) اور قیامت کو بھی آپ کو اسی نام سے پکارا جائے گا۔ "وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ" (آیت-١١٦) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو اللہ کے سوا معبود بنا لو؟ وجہ یہی ہے کہ آپ کی پیدائش میں والد کا توسط نہیں ہے اور آپ صرف حضرت مریمؑ کے بیٹے ہیں۔ اللہ نے فرمایا قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ کی بات یہی ہے جس میں لوگ جھگڑا کرتے ہیں۔ جھگڑا کرنے والے انتہائی درجے کے دو گروہ پیدا ہو گئے۔ یہودیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو اور حضرت مریمؑ کو متہم کیا۔ انہیں دجال، کذاب اور مفتری تک کہا۔ اس کے برخلاف نصاریٰ نے آپ کی تعریف میں مبالغہ کر کے الوہیت کے درجے تک پہنچا دیا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں گروہ گمراہ ہو کر جہنم واصل ہوئے۔ اللہ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ تو جالب ملامت ہیں اور نہ وہ خود خدا ہیں بلکہ حق بات یہ ہے کہ وہ مریمؑ کے بیٹے اور اللہ کے بندے ہیں جیسا کہ انہوں نے خود اقرار کیا "اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ" کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ خود اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کو یہی خطاب دیا۔ "اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ" (الزخرف-٥٩) وہ ایک بندے تھے جن پر ہم نے انعام کیا۔ غرضیکہ مسیح علیہ السلام کی صحیح حیثیت یہی ہے کہ وہ اللہ کے بندے تھے۔ اس سے ان دونوں انتہا پسند فرقوں کا رد بھی ہو گیا۔

اولاد سے پاک اللہ

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا "مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ

وَلَدٍ اللہ کے لیے لائق نہیں ہے کہ وہ کوئی اولاد بنائے۔ اُس کی ذات ایسی کمزوریوں سے پاک ہے۔ اللہ کی نہ تو حقیقی اولاد ہے اور نہ مجازی۔ حقیقی اولاد جنس سے ہوتی ہے۔ اگر خدا کی اولاد مانی جائے تو پھر خدا کی جنس بھی ماننی پڑے گی (العیاذ باللہ) اس طرح خدا تعالیٰ قدیم نہیں رہے گا۔ بلکہ مرکب ہو کر حادث بن جائے گا۔ حالانکہ خدا تو غیر مرئی ہے۔ قدیم اور ازلی ہے اور اس کی کوئی جنس نہیں تو گویا خدا کی حقیقی اولاد نہیں تسلیم کی جا سکتی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مجازی اولاد بھی نہیں مانی جا سکتی۔ مجازی اولاد کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے اور اُس کو تصرف کا اختیار دے دیا ہے۔ اب اس کو اختیار ہے کہ لوگوں کی مشکل کشائی اور حاجت روائی کرتا پھرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے کسی کو متصرف فی الامور نہیں بنایا۔ تمام امور کا تصرف وہ خود کرتا ہے۔ وہ خود مدبر کنندہ ہے کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام ہو یا بڑی سے بڑی سکیم وہ ہر کام براہ راست خود کرتا ہے۔ لہٰذا یہ مجازی اولاد اور تصرف والا عقیدہ بھی مشرکانہ عقیدہ ہے۔

یہ غلطی لوگوں کو اس وجہ سے ہوئی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کر لیا۔ دنیا کے حکام اعلیٰ، صدر یا بادشاہ انتظامی امور کے لیے اپنے گورنر یا نائب مقرر کر کے انہیں بعض اختیارات تفویض کر دیتے ہیں تاکہ امور سلطنت خوش اسلوبی سے انجام دیے جا سکیں۔ برخلاف اس کے اللہ تعالیٰ قادر مطلق، مختار ازلی، قدیم اور بے مثل ہے وہ ہر کمزوری اور عیب سے پاک ہے اُسے کسی کام کے انجام دینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی، لہٰذا وہ احتیاج سے بھی پاک ہے تو ایسی صورت میں اُسے اپنا نائب بنانے اور اختیارات تفویض کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اولاد بقائے نسل کے لیے ہوتی ہے انسان

میں فطرتی طور پر یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ اس کے بعد اس کی نسل قائم رہے مگر اللہ تعالیٰ کو نہ تو کوئی احتیاج ہے اور نہ اُسے بقائے نسل کی ضرورت ہے۔ وہ خود ازلی اور ابدی ہے۔ نہ اُس پر فنا ہے اور نہ اُسے بقائے نسل کی ضرورت ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کی اولاد تجویز کرنا لاحاصل ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اولاد ضعف، بڑھاپے اور بیماری میں خدمت کرتی ہے۔ انسان اس بات کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ مشکل وقت میں اُس کی اعانت کرنے والا کوئی ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ ان تمام نقائص سے مبرا ہے۔ نہ اُس پر ضعف طاری ہوتا ہے، نہ بڑھاپا اور نہ وہ نعوذ باللہ بیمار ہوتا ہے لہٰذا ان کاموں کے لیے نہ وہ محتاج ہے اور نہ ہی اُسے اولاد کی کوئی ضرورت ہے۔ وہ تو خود غنی ہے جب کہ باقی ساری مخلوق اُس کی محتاج ہے۔ "وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ" (محمد - ۳۸) سُبْحٰنَهٗ اُس کی ذات پاک ہے وہ بے نیاز ہے اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ جب وہ کوئی کام کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کو کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ ہر کام اس کے قبضے اور اختیار میں ہے تو جب چاہے اور جیسے چاہے اُسے انجام دے۔ اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی۔ وہ قدرت رکھتا ہے کہ بغیر باپ کے بیٹا پیدا کر دے اور اُس نے عیسیٰ علیہ السلام کو ایسے ہی پیدا فرمایا۔

صراطِ مستقیم

اگلی آیت پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام ہے جس میں آپ نے صراطِ مستقیم کی تشریح کی ہے۔ ارشاد ہے وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ بیشک میرا اور تمہارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہی ہے فَاعْبُدُوْهُ پس اسی کی عبادت کرو هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ سیدھا راستہ یہی ہے۔ اسی مضمون کو اللہ نے سورۃ مائدہ میں عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے کہلوایا ہے۔ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ

إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ (آیت ۔ ۷۲) اے بنی اسرائیل ! میرے اور تمہارے پروردگار صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ کیونکہ جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا دوزخ میں ہوگا۔ مسیح علیہ السلام تو جب تک دنیا میں رہے یہی تعلیم دیتے رہے۔ اللہ وحدہٗ لاشریک کی طرف دعوت دیتے رہے شرک سے منع کرتے رہے مگر تم نے انہی کو اللہ کا شریک بنا دیا اور انہیں الوہیت کے درجے پر پہنچا دیا۔

بعض فرماتے ہیں کہ اس آیت کا تعلق حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہے۔ سورۃ کی ابتدا میں اللہ نے حضرت زکریا علیہ السلام پر اپنی مہربانی کا ذکر فرمایا۔ اس سے پہلے سورۃ کہف میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف، حضرت خضر علیہ السلام اور سکندر ذوالقرنین پر اپنی مہربانی کا تذکرہ کیا وہاں پر نزول قرآن کا ایک مقصد یہ بھی بیان کیا گیا تھا۔ وَيُنْذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا (آیت ۔ ۴) تاکہ ان لوگوں کو ڈرایا جائے جنہوں نے خدا تعالیٰ کے لیے اولاد کا عقیدہ ایجاد کیا ہے۔ تو اسی سلسلے کے ساتھ یہ بات بھی مربوط ہے کہ اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے۔ نہ اس کی کوئی حقیقی اولاد ہے اور نہ مجازی۔ اس کو اولاد کی ضرورت بھی نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ میرا اور تمہارا سب کا پروردگار اللہ وحدہٗ لاشریک ہے لہٰذا عبادت بھی اسی کی کرو، اور یہی سیدھا راستہ ہے۔ یہی بات تمام انبیاء علیہم السلام کہتے رہے اور یہی تعلیم آسمانی کتب اور صحائف نے دی۔

باہمی اختلافات

آگے پھر مسیح علیہ السلام کے تذکرے میں فرمایا کہ ان کے رفع الی السماء کے بعد فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ کئی گروہ اور فرقے بن گئے جنہوں نے آپس میں مسیح علیہ السلام کی ذات اور حیثیت

کے بارے میں اختلاف کیا۔ چار فرقے تو بڑے مشہور ہیں جن کا ذکر اکثر مفسرین کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت فرقے معرض وجود میں آئے۔ فرمایا

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِن مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ پس

ہلاکت ہے کفر کرنے والوں کے لیے بڑے دن کی حاضری کے وقت

بڑے دن سے مراد قیامت کا دن ہے جب کافروں کا بہت بُرا حال ہوگا۔

جن مختلف فرقوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے اکثر گمراہ فرقے ہوئے جنہوں نے مسیح علیہ السلام کی محبت میں غلو کر کے پہلے خدا کا بیٹا اور پھر تینوں میں سے تیسرا کہہ دیا۔ تاہم ان میں حق کے ساتھ مشابہت رکھنے والے لوگ بھی موجود تھے۔ توحید اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق صحیح عقیدے کی بات صحیحین میں حضرت عبادہ بن صامتؓ سے منقول ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَنَّ عِيْسٰى عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَّالنَّارُ حَقٌّ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلٰى مَا كَانَ مِنَ الْعَمَلِ

جس شخص نے یہ گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ وحدہٗ لاشریک ہے اور یہ کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اور اس کا حکم ہیں۔ جو اللہ نے مریمؑ کی طرف ڈالا۔ اور اس (اللہ) کی طرف سے روح ہیں نیز جنت برحق ہے اور دوزخ بھی برحق ہے۔ فرمایا ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ بہرحال جنت میں داخل کرے گا اگرچہ اس کے اعمال کیسے ہی ہوں۔

غرضیکہ اللہ کے تمام انبیاء اور رسول اس کے بندے ہیں۔ نہ تو ان کی حیثیت کو کم کرنا چاہیے جیسا کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر الزام تراشی کی اور نہ ان کو ان کی حیثیت سے بڑھانا چاہیے جیسا کہ نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کا بیٹا بنا دیا۔ خود حضور علیہ السلام کا بھی ارشاد مبارک ہے لَا تُطْرُوْنِیْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارٰی عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ إِنَّمَا أَنَا عَبْدٌ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ۔ لوگو! میرے بارے میں غلو سے کام نہ لینا جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق غلو کیا تھا۔ میں تو اللہ کا بندہ ہوں لہٰذا مجھے اللہ کا بندہ اور رسول ہی کہو۔ بہرحال ہمارے لیے ضروری ہے کہ اپنے آخری نبی اور رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہی عقیدہ رکھیں کہ آپ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ یہی کلمات ہر نماز کی تشہد میں شامل ہیں أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ظاہر ہے ان کلمات کی ادائیگی کے بغیر نماز ہی مکمل نہیں ہوتی، لہٰذا ہر شخص کا یہی عقیدہ ہونا چاہیے اور یہی صراط مستقیم ہے۔

سماعت و بصارت سے عاری

فرمایا بڑے دن کی حاضری میں تباہی اور بربادی ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ... فرمایا أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصِرْ يَوْمَ يَأْتُوْنَنَا یہ لوگ خوب سننے اور خوب دیکھنے ہوں گے جس دن ہمارے پاس آئیں گے قیامت والے دن ان پر ہر چیز واضح ہو جائے گی مگر اب ان کی حالت یہ ہے کہ نہ تو خدا تعالیٰ کی نشانیوں کو دیکھتے ہیں اور نہ کوئی صحیح کلام سنتے ہیں۔ آج یہ سماعت و بصارت دونوں چیزوں سے عاری ہیں اور انہوں نے غلط عقیدے بنا لیے ہیں۔ کوئی ابنیت والا عقیدہ رکھتا اور کوئی تینوں میں سے تیسرا کہتا ہے۔ کسی نے شرک اور تشبیہ والا عقیدہ بنا رکھا ہے۔ اللہ نے فرمایا آج تو یہ حق بات کو سننے اور دیکھنے سے عاری ہیں مگر بڑی حاضری

کے دن سب کچھ سنیں گے اور دیکھیں گے۔ اس دن ان پر ہر چیز عیاں ہو جائے گی۔ فرمایا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ آج کے دن لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوں گے۔ ظالم ان میں ظاہر ہے کہ سب سے بڑا ظلم کفر اور شرک ہے جیسا اللہ کا فرمان ہے وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ - ۲۵۴) کفر کرنے والے ظالم ہیں نیز یہ بھی فرمایا اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان رکوع ۱) شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔ اب پوری دنیا میں دیکھ لیں پانچ ارب کی آبادی میں سے کم و بیش ہزار۔۔۔ انسان کفر و شرک میں مبتلا ہیں۔ اس وقت نہ کوئی بات سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں۔ نہ تو عقلی دلیل کو مانتے ہیں اور نہ نقلی کو، بلکہ اپنے باطل عقائد میں ہی مگن ہیں

یوم حسرت

اللہ نے فرمایا اے پیغمبر! وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ آپ ان کو حسرت کے دن سے ڈرا دیں جس دن کہ معاملے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ وہ حسرت کا دن قیامت کا دن ہوگا۔ اس دن حساب کتاب ہونے کے بعد اہل ایمان جنت میں جائیں گے اور کافر و مشرک جہنم واصل ہوں گے۔ پھر گنہگار مگر اہل ایمان اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر جنت میں آجائیں گے اور ابدی دوزخی وہیں رہ جائیں گے۔ پھر اس وقت جیسا کہ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے، يُؤْتٰى بِالْمَوْتِ موت کو ایک جانور کی شکل میں لایا جائے گا۔ اسے دوزخ اور جنت کے درمیان نمایاں جگہ پر کھڑا کیا جائے گا جہاں سے جنتی اور دوزخی اسے دیکھ سکیں گے پھر ان سے پوچھا جائے گا کہ یہ کیا ہے؟ سب کہیں گے، موت ہے۔ پھر اس جانور یعنی موت کو ذبح کر دیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اہل جنت سے فرمائے گا کہ موت کو موت آچکی، اب خُلُوْدٌ وَّلَا مَوْتَ اب تم ہمیشہ یہیں رہو گے اور کسی کو موت نہیں آئے گی۔ پھر اہل دوزخ سے بھی اسی طرح

خطاب کیا جائے گا۔ یہی وہ دن ہے جسے حسرت کا دن کہا گیا ہے۔ حقیقتاً افسوس اس دن ہوگا۔ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا ہوگا۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ انھیں یوم حسرت سے ڈرا دیں۔ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ یہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ اور ایمان قبول نہیں کرتے۔ ان کو خبردار کر دیں کہ آگے حسرت کا دن آنے والا ہے۔ اس دن کی حسرت سے بچنے کے لیے آج اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو قبول کر لو۔

طبرانی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ لَيْسَتْ حَسْرَةٌ عَلَى أَهْلِ الْجَنَّةِ إِلَّا عَلَى سَاعَةٍ مَرَّتْ بِهِمْ وَلَمْ يَذْكُرُوا اللهَ فِيهَا اہل جنت کے لیے اس سے زیادہ حسرت کسی بات پر نہیں ہوگی کہ انھوں نے فلاں وقت پر اللہ تعالیٰ کا ذکر کیوں نہ کیا۔ اگر فارغ وقت میں اللہ تعالیٰ کا مزید ذکر کرتے تو آج مزید درجات بلند ہوتے۔ ایک روایت میں حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ہر مرنے والا آدمی نادم ہوگا، خواہ نیک ہو یا بد۔ عرض کیا مَا تِلْكَ نَدَامَةٌ حضور! ندامت کس وجہ سے ہوگی؟ فرمایا نیک آدمی کو اس وجہ سے ندامت ہوگی کہ اس نے اور زیادہ نیکیاں کیوں نہ حاصل کر لیں۔ اور برا اس وجہ سے نادم ہوگا کہ اس نے زندگی میں برائیوں سے بچنے کی کوشش کیوں نہ کی۔ چونکہ اس دن ہر آدمی حسرت کرے گا۔ اس لیے بھی اس دن کو حسرت کا دن کہا گیا ہے۔

فرمایا إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا ہم ہی وارث ہیں پوری زمین کے اور جو کچھ اس کے اوپر موجود ہے۔ یہ دنیا چند دن کا کھیل ہے۔ یہاں کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ پھر یہاں پر نہ کوئی انسان ہوگا۔ اور نہ کوئی اور چیز۔ اس وقت ساری زمین اللہ کی ملکیت ہوگی۔ وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ اور سب ہماری

طرف ہی لوٹائے جائیں گے ۔ نیک و بد سب میدانِ حشر میں جمع کیے جائیں گے ۔ اور ہم ہر ایک کے ساتھ اس کی فکر، اعتقاد اور عمل کے مطابق سلوک کریں گے ۔

درس نهم ۹ — آیت ۴۱ تا ۴۵

وَاذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيۡقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ اِذۡ قَالَ لِاَبِيۡهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعۡبُدُ مَا لَا يَسۡمَعُ وَلَا يُبۡصِرُ وَلَا يُغۡنِىۡ عَنۡكَ شَيۡـًٔا ﴿۴۲﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّىۡ قَدۡ جَآءَنِىۡ مِنَ الۡعِلۡمِ مَا لَمۡ يَاۡتِكَ فَاتَّبِعۡنِىۡۤ اَهۡدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾ يٰۤاَبَتِ لَا تَعۡبُدِ الشَّيۡطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ كَانَ لِلرَّحۡمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾ يٰۤاَبَتِ اِنِّىۡۤ اَخَافُ اَنۡ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ فَتَكُوۡنَ لِلشَّيۡطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾

ترجمہ :- اور آپ ذکر کریں کتاب (قرآن) میں ابراہیم علیہ السلام کا بیشک تھے وہ بہت بڑے راست باز اور اللہ کے نبی ﴿۴۱﴾ جب کہا انہوں نے اپنے باپ سے ، اے میرے باپ ! تو کیوں عبادت کرتا ہے اُس کی جو نہیں سنتا اور نہ دیکھتا ہے اور وہ نہیں کام آسکتا تجھ سے کسی بات میں ﴿۴۲﴾ اے میرے باپ ! بیشک آیا ہے میرے پاس علم جو نہیں آیا تیرے پاس ۔ پس تو میری پیروی کر میں دکھاؤں گا تجھے سیدھا راستہ ﴿۴۳﴾ اے میرے باپ ! نہ عبادت کر تو شیطان کی ، بیشک شیطان ہے رحمان کے لیے نافرمان ﴿۴۴﴾ اے میرے باپ ! بیشک میں خوف کھاتا ہوں کہ کہیں پہنچے تجھے عذاب رحمان کی طرف

سے۔ پس ہو جائے گا تو شیطان کا ساتھی ﴿۴۵﴾

ربط آیات

دوسرے رکوع کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کا ذکر بھی اسی طرح کیا تھا "وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ" وہاں پر اللہ نے آں پر کی گئی اپنی خاص مہربانی کا تذکرہ فرمایا۔ یہ واقعہ بطور تمہید تھا۔ پھر اللہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا ذکر کر کے مسئلہ توحید سمجھایا اور شرک کا رد کیا۔ درمیان میں فرمایا "مَا كَانَ لِلَّهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ سُبْحَانَهُ" (آیت۔ ۳۵) اللہ تعالیٰ کی ذات اپنے لیے بیٹا بنانے سے پاک ہے۔ مسیح علیہ السلام نے بھی قوم کو یہی تعلیم دی "وَإِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ" (آیت۔ ۳۶) میرا اور تمہارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے، اسی کی عبادت کرو۔ اور یہی سیدھا راستہ ہے۔ اس طرح اللہ نے نصاریٰ کے عقیدہ ولدیت کی نفی فرما دی۔

ملتِ ابراہیمی میں بگاڑ

عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرے کے بعد آگے بعض دیگر انبیاء کا ذکر بھی آرہا ہے جن میں سرفہرست حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ آپ کی عزت و توقیر نہ صرف مسلمان کرتے ہیں بلکہ یہود و نصاریٰ بھی آپ کی عظمت کے قائل ہیں۔ خاص طور پر مشرکین عرب کو تو اس بات پر فخر تھا کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ مگر بڑے افسوس کا مقام ہے کہ یہ تمام گروہ آپ کی تعلیمات پر قائم نہ رہے بلکہ آپ کے دین اور ملت کو ہی بگاڑ دیا۔ یہودی کہتے تھے کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر ہیں۔ نصاریٰ بھی یہی دعویٰ کرتے تھے اور مشرکین عرب تو خاص طور پر ملتِ ابراہیمی پر ہونے کے دعویدار تھے۔ اب اسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کر کے ثابت کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کے خود بھی قائل تھے اور دوسروں کو بھی توحید کی دعوت دیتے تھے۔ آپ شرک اور بت پرستی کے سخت خلاف تھے اور ہر موقع پر اس کی مذمت کرتے تھے۔ خلیفیت کا

دور آپ ہی سے شروع ہوا۔ اس لیے آپ تمام آئمۂ حنیفیت کے امام تھے آپ کی حنیفیت کی گواہی خود قرآن پاک نے جگہ جگہ دی ہے۔ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (النحل - ۱۲۰) حضرت ابراہیم علیہ السلام پیشوا اور اللہ کی اطاعت کرنے والے اور ایک طرف لگنے والے تھے۔ اور مشرکوں میں سے نہیں تھے۔ سورۃ آل عمران میں ہے مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (آیت - ۶۷) حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ ایک طرف لگنے والے حنیف تھے، اور مشرکوں میں سے نہیں تھے۔ اب یہود، نصاریٰ اور اور مشرکین کو سوچنا چاہیے کہ وہ کس بنا پر اپنی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے ہیں۔ اللہ کے فرمان کے مطابق ان تینوں میں سے کوئی گروہ بھی آپ کے طریقے پر نہیں ہے۔ ان سب نے غلط عقائد وضع کیے اور عجیب شرک میں مبتلا ہو گئے۔

ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ اس طرح کیا ہے وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اے پیغمبر! آپ اس کتاب یعنی قرآن پاک میں ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کریں جو کہ موحدین کے پیشوا اور تمام حنفا کے امام تھے۔ آپ کی حیثیت اور مرتبے کے متعلق اللہ نے فرمایا۔ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا بیشک آپ بڑے راست باز اور اللہ کے نبی تھے۔ اللہ نے آپ کو اپنا خلیل بنایا جیسا کہ سورۃ النساء میں موجود ہے وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا (آیت - ۱۲۵) اللہ نے آپ کو بہت سی آزمائشوں میں ڈالا، اور ہر امتحان میں کامیاب ہوئے چنانچہ اللہ نے آپ کو عمومی امامت بھی عطا فرمائی اِنِّيْ جَاعِلُكَ

لِلنَّاسِ إِمَامًا" (البقرہ - ۱۲۴) میں تمہیں تمام لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صدیقیت کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ صدیق مبالغے کا صیغہ ہے یعنی بہت زیادہ راست باز۔ اس کے ساتھ اللہ نے آپ کو نبی بھی بنایا ہے اس بات کی وضاحت اس لیے ضروری تھی کہ ہر نبی صدیق تو ہوتا ہے۔ مگر ہر صدیق نبی نہیں ہوتا کیونکہ صدیقیت کا درجہ نبی سے کم ہے۔ صدیق سے مراد وہ شخص ہے۔ جو عقیدے، عمل، اخلاق، معاملے اور نیت میں سچائی اختیار کرے۔ اللہ کے نبیوں میں تو یہ صفت لازمی طور پر ہوتی ہے۔ پھر آپ کے بعد آپ کے صحابہؓ درجہ بدرجہ صدیقیت کے درجے پر فائز ہیں۔ اگرچہ حضور علیہ السلام کے تمام صحابہ کرام صدیق ہیں۔ تاہم ان میں سے خلفائے راشدینؓ انبیاء کے بعد سب سے بڑے صدیق ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کو حضور علیہ السلام نے اپنی زبانِ مبارک سے صدیق کا لقب عطا فرمایا۔ آپ کی بیٹیؓ اور حضور کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہؓ بھی صدیقہ ہیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا أَنَا صِدِّيقُ الْأَكْبَرُ لَا يَقُولُهَا بَعْدِي إِلَّا كَذَّابٌ یعنی میں صدیق اکبر ہوں۔ میرے بعد جو بھی صدیق اکبر ہونے کا دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ خلفائے راشدینؓ کے درجات بھی متفاوت ہیں۔ پہلے نمبر پر حضرت ابوبکرؓ صدیق اکبر ہیں، پھر عمر فاروقؓ پھر عثمان غنیؓ اور چوتھے نمبر پر حضرت علیؓ صدیق اکبر ہیں۔ اس کے بعد جو شخص صدیق اکبر ہونے کا دعویدار ہوگا، وہ واقعی جھوٹا ہوگا۔ کیونکہ یہ مرتبہ خلفائے راشدین پر ختم ہو چکا ہے۔

صابیت اور حنفیت کا دور

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے صابیت کا دور تھا۔ یہ دور آدم علیہ السلام کے فرزند شیث علیہ السلام یا ادریس علیہ السلام سے شروع

ہوا۔ اس دور میں بابل بڑا مشہور شہر تھا جو کہ ساڑھے پانچ میل میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ شہر آشوری اور کلدانی تہذیبوں کا مرکز رہا ہے مگر اب ٹیکسلا کی طرح کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا ہے۔ بغداد سے ساٹھ ستر میل دور اس شہر کے مکین صابی لوگ تھے۔ امام جلال الدین سیوطیؒ اپنی کتاب "حُسنُ المُحَاضَرَۃ فِی اَحْوَالِ المِصْرِ وَالقَاہِرَۃ" میں لکھتے ہیں کہ صابیت کے چار اصول مسلم تھے یعنی توحید، طہارت، صوم اور صلوٰۃ مگر آہستہ آہستہ یہ اصول ختم ہو گئے۔ یہ لوگ زیادہ تر بت پرستی اور ستارہ پرستی میں مبتلا تھے ستاروں میں الوہیت کا کرشمہ مانتے تھے۔ انہوں نے ستاروں کے نام پہ عبادت خانے بنا رکھے تھے۔ چنانچہ رومی، یونانی، برصغیر کے ہندو اور پرانے چینی بدھ وغیرہ صابی تھے مگر انہوں نے صابی ملت کے اصل اصولوں کو بگاڑ دیا۔

پھر مسیح علیہ السلام سے ۲۱۶۰ سال قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کے ساتھ دورِ حنیفیت شروع ہوا۔ آپ نے شرک کی بیخ کنی کی اور لوگوں کو توحید سے روشناس کرایا۔ آپ نے ۱۷۵ برس عمر پائی اور اس دوران میں بڑے بڑے انقلاب دیکھے۔ آپ پر بڑی آزمائشیں آئیں اور آپ ہر آزمائش میں کامیاب ہوئے آپ کے ہاتھوں لگایا ہوا توحید کا پودا آہستہ آہستہ کملانے لگا، حتیٰ کہ آپ کو ماننے والے خود یہود و نصاریٰ نے حنیفیت میں خرابیاں پیدا کر دیں اور ان میں توحید کی بجائے شرک در آیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا جنہوں نے ملتِ ابراہیمی کو دوبارہ زندہ کیا اور لوگوں کو ایک خدا کی طرف متوجہ کیا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پھر خرابیاں شروع ہو گئیں مسلمانوں میں بھی گمراہ فرقے پیدا ہو گئے۔ اور خالص توحید میں شرک کی پھر ملاوٹ ہونے لگی۔

ارشاد ہوتا ہے "اِذْ قَالَ لِاَبِیْہِ" جب ابراہیم علیہ السلام نے

اپنے باپ سے کہا۔ یہاں پر باپ کے نام کی تصریح تو نہیں ہے تاہم
سورۃ انعام میں موجود ہے ﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ﴾ (آیت ۔ ۷۴) کہ جب
ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ کیا تم بتوں کو اپنا معبود بناتے ہو۔ میں
تو تمہیں کھلی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔ شیعہ اور بعض دوسرے حضرات کہتے
ہیں آزر ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں بلکہ چچا تھا اور آپ کے باپ کا
نام تارخ تھا۔ اُن کا استدلال یہ ہے کہ آزر تو بہت بڑا مشرک تھا جب
کہ حضرت ابراہیم کے تمام آباؤ اجداد مومن تھے، لہٰذا آزر آپ کا باپ
نہیں ہے۔ ان حضرات کا یہ نظریہ بلا دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان
ہے ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ
الْحَيِّ﴾ (الانعام ۔ ۹۵) یعنی اللہ تعالیٰ مردوں سے زندہ اور زندوں سے
مردہ نکالتا ہے۔ مقصد یہی ہے کہ کافروں سے موحد اور مومنوں سے کافر
پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا ابراہیم علیہ السلام جیسے عظیم پیغمبر کا مشرک باپ سے پیدا ہونا
کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزر اور تارخ ایک
ہی شخص کے دو نام ہیں۔ اصل نام تارخ ہی ہے مگر بت پرستوں کے
پروہت ہونے کی بنا پر آزر لقب تھا۔

باپ سے خطاب

تو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا یَا اَبَتِ اے میرے باپ!
عربی محاورے میں یہ لفظ محبت کے انداز میں استعمال ہوتا ہے جیسے
یٰبُنَیَّ یعنی اے میرے بیٹے۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو اسی لفظ سے
خطاب کر کے کہا کہ اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا کہ یہ ظلم عظیم ہے۔ خود
حضور علیہ السلام حضرت انسؓ کو یٰبُنَیَّ کہہ کر خطاب فرماتے تھے۔ حضرت
مغیرہ ابن شعبہؓ حضور سے بار بار پوچھتے کہ حضور! دجال کے فتنے میں کیا
بنے گا۔ تو آپ نے فرمایا یٰبُنَیَّ اے میرے بیٹے! خوف نہ کھاؤ۔
دجال تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ بہرصورت یٰبُنَیَّ کی طرح یَا اَبَتِ

ہیں بھی محبت والفت پائی جاتی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی جیسے اُردو میں اباجی
کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے یوں کہا
لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْئًا
آپ ان کی کیوں عبادت کرتے ہیں۔ جو نہ دیکھتے ہیں، نہ سنتے ہیں اور نہ
آپ کے کسی کام آسکتے ہیں؟ ان بتوں کو تو خود آپ ایک جگہ سے
اٹھا کر دوسری جگہ رکھتے ہیں۔ یہ تو اپنے آپ چل پھر بھی نہیں سکتے۔
بھلا یہ آپ کے کس کام آئیں گے۔ یہ تو بڑی بے عقلی کی بات ہے کہ
خود اپنے ہاتھوں سے تراش کر انہیں کو معبود بنالیں اور ان سے حاجتیں
طلب کرنے لگیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی سننے اور دیکھنے والا بھی معبود
نہیں بن سکتا۔ فرشتے اللہ کی مقرب مخلوق ہیں۔ جو دیکھتے اور سنتے ہیں۔
اور اللہ نے انہیں کسی حد تک اختیار بھی دے رکھا ہے مگر معبود وہ
بھی نہیں بن سکتے کیونکہ معبود ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ خالق
ہو، ازلی اور ابدی ہو اور کسی کا محتاج نہ ہو۔

ساری مخلوق محتاج ہے

مگر امر واقع یہ ہے کہ ساری کی ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے
يَسْأَلُهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (الرحمٰن - ۲۹)
آسمان و زمین کی ہر چیز اسی مالک الملک کے در کی سوالی ہے۔ سب محتاج ہیں
اور اسی سے اپنی حاجتیں طلب کرتے ہیں۔ کوئی زبانِ حال سے مانگ
رہا ہے اور کوئی زبانِ قال سے۔ درختوں کی زبانِ حال سرسبزی اور
شادابی طلب کر رہی ہے، پتھر، ہوا اور پانی سب اپنی ضروریات طلب
کرتے ہیں۔ جانور، چرند اور پرند سب اسی کے سامنے دامن پھیلائے
ہوئے ہیں اور انسان تو ہیں ہی محتاج۔ دینے والا صرف ایک ہے
اور وہی بہتر جانتا ہے کہ کس کو کس چیز کی ضرورت ہے اور کتنی ضرورت
ہے۔ اس کا فرمان ہے وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ

لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاءُ (الشوریٰ - ۲۷) اگر اللہ تعالیٰ رزق کے دروازے سب پر یکساں کھول دے تو سب سرکش ہو جائیں۔ وہ ایک خاص اندازے کے مطابق رزق نازل فرماتا ہے۔ اس کی مصلحت کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اللہ نے یہ بھی فرمایا "يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ" (السجدۃ - ۵) آسمان کی بلندیوں سے لے کر زمین کی پستیوں تک ہر کام کی تدبیر وہ خود کرتا ہے۔ اس نے کسی کو اختیار نہیں دیا کہ فلاں کام تم کر لیا کرو اور فلاں میں انجام دے لوں گا۔ ہمیں تو یہی دعا سکھلائی گئی ہے يَا مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا إِلٰى طَاعَتِكَ اے دلوں کے پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔ ایمان اور اخلاص کی طرف پھیرنا بھی تیرا ہی کام ہے[1]۔ لہٰذا تو اپنی رحمت سے ہمیں نیکی پر مستحکم رکھ۔

صنم اور وثن

اس آیت کریمہ میں ابراہیم نے اپنے باپ کو اُن بتوں کی پوجا سے منع کیا جو نہ دیکھتے ہیں، نہ سنتے ہیں اور نہ کسی کام آسکتے ہیں۔ یہ بت دو قسم کے ہوتے تھے۔ ایک قسم کے بت صنم کہلاتے تھے۔ جو پتھروں یا لکڑی کو تراش کر کسی خاص شکل میں بنائے جاتے تھے۔ اور وثن ان بتوں کو کہتے تھے جو ان گھڑے ہوتے تھے اور کسی خاص شکل پر متشکل نہیں ہوتے تھے کسی وضع قطع کے پتھر یا لکڑی کو معبود تسلیم کر کے اُس کی پوجا شروع کر دی۔ پھر اُن کی نذر و نیاز بھی کرتے تھے۔ ان کے آگے کھانا مٹھائی اور دودھ وغیرہ رکھتے تھے اور ان کی تعظیم کرتے تھے۔ اُنہی بتوں کی پوجا سے ابراہیم علیہ السلام نے روکا۔

حدیث شریف میں صلیب کے نشان کو بھی وثن سے تعبیر کیا گیا ہے جب عدی بن حاتم طائی حضور کی خدمت میں پہلی دفعہ پیش ہوئے تو اُن کے گلے

---

[1] حصن حصین ص ۳۳۴ (فیاض)

ہیں صلیب لٹک رہی تھی۔ آپ نے فرمایا: اِلْقِ عَنْكَ هٰذَا الْوَثَنَ یہ
وثن یعنی بت اپنے گلے سے اتار دو۔ عیسائی صلیب کی تعظیم کرتے ہیں۔
جب مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جنگ ہوتی ہے تو مسلمان اللہ تعالیٰ
کی عظمت کی خاطر لڑتے ہیں جب کہ عیسائیوں کے ہاں فتح کا معیار صلیب
ہوتا ہے، وہ صلیب کی بلندی چاہتے ہیں لہٰذا یہ اُن کا معبود ہے اور
یہ صریح شرک ہے۔

بعض لوگ زندہ ہستیوں کی پرستش کرتے ہیں اور بعض اصحاب قبور
کو پوجتے ہیں۔ لوگوں میں خدا کے انبیاء، ملائکہ، جنات اور شیاطین کے
پجاری بھی موجود ہیں۔ بہرحال یہاں پر شرک کی جس قسم کا ذکر ہے وہ پتھر یا
لکڑی کے مجسمے ہیں۔

قطعی علم بذریعہ وحی

ابراہیم علیہ السلام نے پہلی بات تو یہ کی کہ باپ کو بتوں کی پوجا سے منع
کیا اور دوسری بات یہ کی یٰٓاَبَتِ اے میرے باپ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ
مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ تحقیق میرے پاس ایک ایسا علم آیا
ہے جو تیرے پاس نہیں ہے لہٰذا میں تجھے کہتا ہوں فَاتَّبِعْنِیْٓ اَهْدِكَ
صِرَاطًا سَوِیًّا کہ میری اطاعت کر میں تجھے سیدھا راستہ دکھاؤں گا
اس سے پہلی بات یہ معلوم ہوئی کہ تبلیغ دین کے لیے نہایت ہی نرم رویہ
بلکہ محبت کا سا انداز اختیار کرنا چاہیئے۔ تمام انبیاء علیہم السلام نے یہی طریقہ
اختیار کیا، اور اگر کہیں سخت رویہ اختیار کیا ہے تو بالکل ناگزیر حالات میں۔
حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے واقعہ میں بھی ہے کہ اللہ نے دونوں
کو فرعون کے پاس تبلیغ کے لیے بھیجا اور ساتھ نصیحت کی فَقُوْلَا
لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا (طٰہٰ ۔ ۴۴) اور اس سے نرم لہجے میں بات کرنا
بہرحال تبلیغ دین کے لیے نرم رویے کی ضرورت ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ انبیاء علیہم السلام کے پاس قطعی اور

یقینی علم ہوتا ہے جو باقی مخلوق کے پاس نہیں ہوتا۔ اس سے مراد وحی الٰہی ہے۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح بخاری کی ابتداء ہی وحی الٰہی سے کر کے باب ہی اس طرح باندھا[1] ہے کَیْفَ کَانَ بَدْءُ الْوَحْیِ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی کی ابتداء کیسے ہوئی۔ مقصد یہ کہ وحی الٰہی ہی قطعی ذریعہ علم ہے۔ اس کے علاوہ باقی تمام ذرائع ظنی ہیں۔ علم سائنس مشاہدات پر مبنی ہونے کے باوجود خطا سے خالی نہیں۔ کوئی چیز ایک شخص کے مشاہدے میں کچھ آتی ہے جب کہ دوسرا شخص کچھ اور ہی کہتا ہے۔ اسی طرح کشف میں بھی غلطی کا امکان ہے غلطی سے مبرا صرف وحی الٰہی ہے۔ اس کو سمجھنے میں نبی کوئی غلطی نہیں کرتا اور نہ ہی اسے آگے بیان کرتے میں کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے۔ اسی لیے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا کہ میرے پاس ایک ایسا علم ہے جو تمہارے پاس تو نہیں ہے۔ لہٰذا آپ میری بات مانیں، میں آپ کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔

اہل علم کا اتباع

اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اہل علم کا اتباع ضروری ہے۔ سورۃ النحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" (آیت۔ ۴۳) جو چیز تم خود نہیں جانتے اسے جاننے والوں سے پوچھ لو۔ لہٰذا عوام کا فرض ہے کہ وہ اہل علم کا اتباع کریں۔ اس زمانے میں نام نہاد علماء گمراہی کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ بعض لوگ ہیں تھوڑی سی عربی پڑھ لی تو پرویز کی طرح عالم بن بیٹھے۔ ان کو تو علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ سلف نے حصول علم کے لیے مشقتیں برداشت کیں، ہزاروں اساتذہ سے فیض حاصل کیا۔ عمر کا طویل حصہ علم حاصل کرنے میں لگا دیا۔ ابوعلی قاری کا حال دیکھ لیں۔ صرف کے ایک صیغہ میں غلطی کر بیٹھے۔ استاد صاحب نے کہا بڑے افسوس کی بات ہے کہ اتنی سخت غلطی کی

[1] بخاری صا ج ۱ (فیاض)

اُٹھ کر چلے گئے اور زندگی کے مزید چالیس سال فن صرف پر لگا دیے۔ جب بالکل کامل ہو گئے تو پھر پڑھانے کے لیے بیٹھے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ میں نے دورانِ تعلیم سولہ سال تک رات بھر ایک گلاس پانی تک نہیں پیا کہ کہیں مطالعہ میں خلل نہ آجائے۔

شیطان کی عبادت

ابراہیم علیہ السلام نے مزید فرمایا یٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ اے میرے باپ! شیطان کی عبادت نہ کریں۔ عبادت صرف رکوع و سجدہ کا نام ہی نہیں بلکہ شیطان کا حکم ماننا اس کی عبادت کرنے کے مترادف ہے۔ اسی لیے اللہ نے بار بار فرمایا ہے لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ (البقرہ - ۱۶۸) شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ جو شخص خدا تعالیٰ کے قانون کو چھوڑ کر اپنی عقل یا خواہش پر چلتا ہے، وہ حقیقت میں شیطان کے نقش قدم پر ہی چلتا ہے۔ رسومات کی اتباع بھی شیطان کی پیروی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تجارت، سیاست اور معیشت کے تمام قوانین واضح کر دیے ہیں، جو بھی ان کی خلاف ورزی کرے گا، وہ شیطان کا متبع ہوگا۔

فرمایا، اے باپ! شیطان کی عبادت نہ کرنا کیونکہ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا شیطان تو رحمان کا نافرمان ہے۔ اُس نے تو روزِ اوّل سے کہہ دیا تھا "فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ" (الاعراف - ۱۶) تو نے مجھے گمراہ ٹھہرا ہی دیا ہے، تو اب میں بھی تیرے سیدھے راستے میں بیٹھ کر اُن کو گمراہ کروں گا۔ شیطان تو پہلے دن سے مردود قرار دیا جا چکا ہے۔ بقول حضرت یحییٰ منیریؒ شیطان نے سات لاکھ سال عبادت کی مگر ایک انکار کر کے راندۂ درگاہ ٹھہرا۔ اللہ نے فرمایا "فَاخْرُجْ فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ" (ص - ۷۷) یہاں سے نکل جا، تم مردود ہو۔ شیطان کے متعلق سورۃ الکہف میں بھی گزر چکا ہے

أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ (آیت ۵۰) کیا تم شیطان اور اس کی اولاد کو اپنا دوست سمجھتے ہو۔ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔ وہ ہر مقام پر وسوسہ اندازی کر کے تمہیں پھسلانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ شیطان تو رحمان کا نافرمان ہے، اس کی عبادت نہ کرو۔

عذاب الٰہی کا خوف

پھر فرمایا يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِنَ الرَّحْمَٰنِ اے میرے باپ! مجھے ڈر ہے کہ تمہیں خدائے رحمان کی کی طرف سے عذاب نہ پہنچ جائے فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا پس تم شیطان کے دوست بن کر رہ جاؤ گے اور خدائے رحمان سے کٹ جاؤ گے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ کے اسم رحمان کا ذکر کیا ہے، جبار اور قہار کا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ بلاشبہ بڑا رحم کرنیوالا ہے مگر جب کوئی شخص اس کی حکم عدولی کر کے توحید کو چھوڑ دیتا ہے اور شیطان کا اتباع کرنے لگتا ہے، تو پھر رحمان سزا بھی دیتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اے باپ! مجھے خطرہ ہے کہ تم کہیں شیطان کے دوست نہ بن جاؤ۔ اب باپ کا جواب اور اس کی کارگزاری کا بیان اگلی آیات میں آرہا ہے۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰٓاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ﴿۴۶﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَیْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا ﴿۴۷﴾ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ ۖۗ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِیًّا ﴿۴۸﴾ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِیًّا ﴿۴۹﴾ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِیًّا ﴿۵۰﴾ ع ۳

ترجمہ:- کہا (ابراہیم کے والد نے) کیا تو اعراض کرنے والا ہے میرے معبودوں سے اے ابراہیم! اگر تو باز نہیں آئے گا تو میں تجھے سنگسار کردوں گا اور تو چھوڑ دے مجھے لمبے زمانے تک (۴۶) کہا (ابراہیم نے) سلام ہو تم پر۔ میں بخشش طلب کروں گا تیرے لیے اپنے پروردگار سے۔ بیشک وہ میرے ساتھ بہت مہربان ہے (۴۷) اور میں چھوڑتا ہوں تمہیں اور جن کی تم پرستش کرتے ہو اللہ کے سوا، اور پکارتا ہوں اپنے پروردگار کو۔ امید ہے کہ میں نہیں

ہوں گا اپنے پروردگار کو پکارنے کے ساتھ، بے محروم (۴۸) پھر جب ابراہیم علیہ السلام ان سے جدا ہو گئے اور اُن کے معبودوں سے بھی جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے تھے، تو بخشا ہم نے اُن کے لیے (فرزند) اسحاق اور (پوتا) یعقوب اور ہر ایک کو بنایا ہم نے نبی (۴۹) اور بخشا ہم نے اُن کے لیے اپنی رحمت سے اور بنائی ہم نے اُن کے لیے سچائی کی زبان بلند (۵۰)

ربطِ آیات

پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور ان کے عقیدے کا ذکر ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے شرک کی تردید فرمائی اور اس ضمن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بھی اختصار کے ساتھ بیان ہوا۔ آپ نے اپنے باپ کو نہایت نرم اور محبت آمیز لہجے میں سمجھایا کہ تم جن بتوں کی پوجا کرتے ہو یہ نہ سن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کسی کام آسکتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میرے پاس قطعی علم آچکا ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے، لہٰذا آپ میری بات مانیں، میں آپ کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔ اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر بیٹا اہلِ علم ہے تو باپ کو اس سے سیکھنے میں عار نہیں محسوس کرنی چاہیئے بلکہ یہ تو فضیلت کی بات ہے کہ باپ نے اپنے قابل بیٹے سے سیکھا۔ یہ چیز عقل کے عین مطابق ہے اور ایسا کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرنی چاہیئے۔

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو یہ بھی کہا خدا کے سچے قانون کو چھوڑ کر توحید کو ترک کرنا اور شرک کو اختیار کرنا شیطان کی عبادت کرنے کے مترادف ہے، لہٰذا آپ شیطان کی پرستش نہ کریں۔ شیطان تو خدائے رحمان کا نافرمان ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ اگر آپ نے شیطان کا اتباع ترک نہ کیا، تو سزا کے مستحق ہوں گے۔

باپ کا جواب

ابراہیم علیہ السلام کے اس [illegible]ت آمیز دعوت کا جواب آپ کے باپ نے یوں دیا۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰاِبْرٰهِیْمُ کہنے لگا اے ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے اعراض کرنے والا ہے؟ عربی زبان میں اگر رغبت کے بعد فی آئے تو اس کا معنیٰ ہوتا ہے کسی چیز میں رغبت کرنا اور اگر یہ لفظ عن کے ساتھ آئے تو اس کا معنیٰ اعراض کرنا ہو جاتا ہے جیسے "وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهِیْمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ" (البقرۃ - ۱۳۰) کون ہے جو ابراہیم علیہ السلام کی ملت سے اعراض کرے، مگر وہی جس نے اپنے نفس کو بیوقوف بنا لیا (یعنی ملت ابراہیمی کے خلاف وہی شخص ہوگا جو بے عقلی سے کام لے گا۔ صحیح الفطرت اور عقل سے کام لینے والا آدمی ملت ابراہیمی سے انحراف نہیں کر سکتا۔

سنگساری کی دھمکی

پھر باپ نے سختی کے ساتھ سرزنش کی اور کہنے لگا، تو میرے بتوں سے اعراض کرتا ہے اور اُن کی توہین کرتا ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ اگر تو اس حرکت سے باز نہیں آئے گا، میرے معبودوں کے خلاف بداعتقادی پھیلاتا رہے گا لَاَرْجُمَنَّكَ تو میں تجھے پتھر مار مار کر ہلاک کر دوں گا۔ امام ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں کہ لفظ رجم کا اطلاق زبانی سب و شتم پر بھی ہوتا ہے یعنی میں تجھے گالیاں دوں گا تاہم جمہور مفسرین کے نزدیک رجم کا معنیٰ سنگسار کرنا ہی ہے جو کہ ذلت ناک سزا تصور ہوتی ہے اور زانی محصن کو دی جاتی ہے جب کہ وہ زنا کا خود اقرار کرے یا چار گواہ چشم دید گواہی دیں۔ یہی سزا اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کو دی تھی اور اُن پر آسمان سے پتھر برسائے تھے۔

باپ نے یہ بھی کہا وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا مجھ سے دُور ہو جاؤ ایک زمانے تک، مطلب یہ کہ میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ عرصہ دراز کے لیے مجھ سے علیحدہ ہو جاؤ۔ عالم اور جاہل میں یہی فرق ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے

باپ کو نہایت نرمی اور محبت کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی جبکہ باپ نے
جواب میں نہایت سخت رویہ اختیار کیا۔ جاہل لوگ نرمی کی بات سے
متاثر نہیں ہوتے بلکہ وہ خود سب و دشنام اور مار دھاڑ پہ اُتر آتے ہیں۔

سلامتی اور مغفرت کی دُعا

آپ ابراہیم علیہ السلام نے گالی کا جواب دُعا کے ساتھ دیا قَالَ
سَلٰمٌ عَلَیْکَ کہنے لگے اے باپ! تجھ پر سلامتی ہو۔ اس کو سلام
متارکت کہتے ہیں۔ جیسے سورۃ فرقان میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک
بندوں کی یہ صفت بھی بیان کی ہے "وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ
قَالُوْا سَلٰمًا" (آیت ۔ ۶۳) کہ جب جاہل لوگ ان سے مخاطب
ہوتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر نکل جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ تم اپنے طریقے
پر رہو، ہم تم سے علیحدہ ہوتے ہیں کیونکہ جہالت کا جواب جہالت سے
دینے کی اجازت نہیں ہے۔ اور ساتھ ساتھ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے
باپ کے ساتھ ہمدردی کا پورا پورا حق بھی ادا کر دیا۔ کہنے لگے سَاَسْتَغْفِرُ
لَکَ رَبِّیْ میں اپنے پروردگار سے تیرے لیے بخشش کی دُعا کروں گا
کیونکہ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا میرا پروردگار میرے ساتھ بڑا مہربان
ہے۔ اور اُمید ہے کہ میری دُعا رائیگاں نہیں جائے گی۔

مشرک کے لیے بخشش کی دُعا کرنا درست نہیں ہے اللہ تعالیٰ
کا فرمان ہے مَا كَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ
یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِیْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِیْ قُرْبٰی مِنْۢ
بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ
(التوبۃ ۔ ۱۱۳) کسی نبی اور اہل ایمان کے لیے یہ بات مناسب
نہیں ہے کہ وہ مشرکوں کے لیے دعائے مغفرت کریں۔ اگرچہ وہ
قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں اس کے بعد کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ وہ
قطعی جہنمی ہیں۔ مگر ابراہیم علیہ السلام نے نہ صرف باپ کے لیے دُعا کا

وعدہ کیا تھا کہ فی الواقع دعا کریں گے بھی دی ”رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ“ (ابراہیم ۔ ۴۱) اے پروردگار ! مجھے بھی بخش دے اور میرے والدین کو بھی۔
اس بات کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرما دی ”وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ“ (التوبہ ۱۱۴)
ابراہیم علیہ السلام کی اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت ، ایک وعدے کی بنا پر تھی جو انہوں نے کر رکھا تھا۔ لیکن جب بعد میں واضح ہو گیا کہ وہ دشمن خدا ہے یعنی اس کا خاتمہ کفر پر ہی ہو گا۔ تو آپ نے بیزاری کا اظہار کر دیا۔
حضور علیہ السلام کے چچا ابو طالب آپ کے محسن اور مربی تھے وہ مشرکوں کے مقابلے میں آپ کی بڑی حمایت کرتے رہے ، مگر ایمان قبول نہیں کیا۔ جب اس کی وفات کفر کی حالت میں ہی ہو گئی تو حضور علیہ السلام کو بڑا صدمہ ہوا۔ آپ نے فرمایا ”سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ“ میں تیرے لیے اپنے پروردگار سے بخشش کی دعا کروں گا ، مگر فرمایا کہ پھر اللہ نے مجھے منع کر دیا کیونکہ مشرکوں کے لیے دعا جائز نہیں۔
بعض فرماتے ہیں کہ مشرکوں کی زندگی میں تو ان کے لیے دعائے مغفرت کی جا سکتی ہے اور اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایمان کی توفیق عطا کر کے مغفرت کا اہل بنا دے۔ مگر کفر و شرک کی حالت میں ہی مرنے کے بعد ان کے لیے دعا درست نہیں کیونکہ وہ ازلی جہنمی قرار پا گئے۔ یہاں پہ ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے والدین کافر اور مشرک تھے اور خود انہوں نے ایمان قبول کر لیا۔ اب وہ بھی ہر نماز میں والدین کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں ”رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ“ اے اللہ مجھے بھی معاف کر دے اور میرے والدین کو بھی بخش دے۔ اس ضمن میں صاحب کشاف بیان کرتے ہیں کہ

سے ایسے شخص کی دُعا کے مصداق اُن کے قریبی والدین نہیں ہوں گے بلکہ اِن کے مصداق پوری نسلِ انسانی کے والدین حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا ہوں گی جو کامل درجے کے مومن اور اولین والدین تھے۔

ابراہیم علیہ السلام کی علیحدگی

بہرحال ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے دُعا کا وعدہ کیا اور پھر اُن سے علیحدگی کا ارادہ بھی کر لیا۔ کہنے لگے وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ میں تمھیں بھی چھوڑتا ہوں اور تمھارے معبودوں کو بھی جن کی تم پوجا کرتے ہو۔ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ اور میں تو صرف اپنے پروردگار کو ہی پکارتا ہوں جو قادرِ مطلق، علیمِ کل، مختارِ کل، حاجت روا اور مشکل کشا ہے۔ وہ ہمہ دان، ہمہ بین اور ہمہ توان ہے۔ وہ خالق، مدبر اور متصرف ہے۔ میں تو صرف اسی کو پکارتا ہوں اور تمھارے معبودوں سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں۔ وہ اللہ کے دشمن ہیں وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (الممتحنۃ - ۴) اور ہمارے اور تمھارے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی ہے جب تک کہ تم اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان نہ لے آؤ۔ دوسری آیت میں ہے ابراہیم علیہ السلام نے کہا اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ (الصّٰفّٰت - ۹۹) میں تو اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوں۔ سورۃ العنکبوت میں یوں آتا ہے وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّیْ (آیت - ۲۶) یعنی میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کر کے جا رہا ہوں۔ جہاں میرے مالک کا حکم ہو گا وہاں چلا جاؤں اور تمھیں اور تمھارے معبودوں کو بہرحال چھوڑ رہا ہوں۔ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّیْ شَقِيًّا امید ہے کہ میں اپنے پروردگار کو پکارنے کی وجہ سے محروم نہیں ہوں گا۔

اُس زمانے میں عراق کا پورا علاقہ جس میں نمرود کی عملداری تھی، کفر و شرک میں ڈوبا ہوا تھا۔ بادشاہ سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ چپراسی تک مشرک تھے۔ اللہ کی وحدانیت پر ایمان لانے والے ابراہیم علیہ السلام کے

علاوہ آپ کے بھتیجے لوط علیہ السلام تھے۔ ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہؓ بھی مومنہ تھیں۔ البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ آپ کا نکاح اس ہجرت سے پہلے ہو چکا تھا یا ہجرت کے بعد شام پہنچ کر ہوا۔ بہر حال تین افراد پر مشتمل یہ قافلہ عراق سے چل کر مصر اور پھر شام و فلسطین پہنچا۔ راستے میں اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کو نبوت بھی عطا فرمائی اور وہ شرق اردن کے علاقے میں مامور ہوئے۔

انعام بصورت اسحاق اور یعقوب علیہما السلام

ارشاد ہوتا ہے فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ جب آپ قوم اور ان کے معبودوں کو چھوڑ کر چلے گئے تو اللہ نے آپ پر اولاد کی صورت میں انعام کیا وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام (بیٹا) اور یعقوب علیہ السلام (پوتا) عطا فرمایا۔ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا اللہ نے فرمایا کہ ہم نے نہ صرف یہ اولاد عطا فرمائی بلکہ ہر ایک کو نبی بھی بنایا۔ پھر ان کے بعد یعقوب علیہ السلام کے بیٹے یوسف علیہ السلام بھی اللہ کے نبی ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے چار پشتوں میں نبی پیدا کئے اَلْكَرِيمُ ابْنُ الْكَرِيمِ ابْنُ الْكَرِيمِ ابْنُ الْكَرِيمِ یعنی یوسف ابن یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم سارے کے سارے اللہ کے برگزیدہ بندے اور نبی ہوئے۔ حضرت ابراہیم کو اللہ نے دو فرزند عطا کیے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام دونوں اللہ کے نبی ہوئے مگر اس مقام پر صرف اسحاق علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر اگلے رکوع میں مستقل عنوان کے تحت آرہا ہے اس مقام پر چونکہ صرف یہود و نصاریٰ کا رد مطلوب تھا اس لیے یہاں پر ان کے جد امجد حضرت اسحاق اور یعقوب علیہما السلام کا ذکر کیا۔ اور آگے جہاں مشرکین عرب کا رد مقصود ہے وہاں ان کے جد امجد حضرت

ا[illegible] سلام کا ذکر آ رہا ہے ۔

فرمایا ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب عطا فرمائے وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا اور ہم نے اپنی خاص مہربانی بھی ان کے شامل حال کی ۔ وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا اور ہم نے ان کے لیے سچائی کی بلند زبان بھی بنائی ۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور آپ کی اولاد کے لیے ہمیشہ رحمت کی دعائیں ہوتی رہتی ہیں ہم ہر نماز میں پڑھتے ہیں اے اللہ! رحمت بھیج حضرت محمد پر اور آپ کی آل پر كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى آلِ اِبْرٰهِيْمَ جیسا کہ تو نے رحمت بھیجی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی اولاد پر ۔ اس سے زیادہ سچی اور بلند شہرت کیا ہو سکتی ہے اللہ تعالیٰ نے یہ شنائے جمیل، ذکر جمیل، شہرت اور مہربانی خاص طور پر حضرت ابراہیم اور آپ کی اولاد کو عطا فرمائی ۔ ان کو نبی اور رسول بنایا ۔ قوم تو ان کو برداشت نہ کر سکی مگر اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہمیشہ ان کے شامل حال رہی ۔

درس یازدہم ١١ — آیت ٥١ تا ٥٧

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿٥١﴾ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿٥٢﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿٥٣﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿٥٤﴾ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿٥٥﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿٥٦﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿٥٧﴾

ترجمہ :- (اے پیغمبر!) آپ ذکر کریں کتاب (قرآن) میں موسیٰ علیہ السلام کا ۔ بیشک وہ تھے چُنے ہوئے اور تھے اللہ کے رسول اور نبی ﴿٥١﴾ اور ہم نے پکارا اُن کو طُور پر داہنی جانب سے ۔ اور ہم نے قریب کیا اُن کو سرگوشی میں ﴿٥٢﴾ اور بخشا ہم نے اُن کے لیے اپنی رحمت سے اُن کا بھائی ہارون علیہ السلام نبی ﴿٥٣﴾ اور ذکر کریں آپ کتاب میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ۔ بیشک وہ تھے سچے وعدے والے اور اللہ کے رسول اور نبی ﴿٥٤﴾ اور وہ حکم دیتے تھے اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا ، اور تھے وہ اپنے پروردگار کے پاس پسندیدہ ﴿٥٥﴾ اور ذکر

کریں آپ کتاب میں ادریس علیہ السلام کا ، بیشک وہ تھے صدیق اور نبی (۵۶) اور ہم نے بلند کیا ان کا مقام بہت ہی اونچا (۵۷)

ربط آیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے انکے اور ان کے والد کے درمیان مکالمے کا ذکر کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہایت نرم طریقے سے اپنے باپ کو توحید کی دعوت دی مگر والد نے بڑی سختی سے ڈانٹ دیا۔ اور کہا کہ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ تمہیں سنگسار کر دوں گا۔ چنانچہ آپ اپنے آبائی وطن سے ہجرت کر گئے۔ اس دوران میں اللہ تعالیٰ کی مہربانی آپ کے شامل حال ہوئی۔ اللہ نے آپ کو حضرت اسحاق جیسا بیٹا اور حضرت یعقوب جیسا عظیم المرتبت پوتا عطا فرمایا۔ یہ دونوں اللہ کے برگزیدہ نبی تھے اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا درس دیتے تھے، کفر و شرک کی تردید کرتے تھے اور لوگوں کو ان سے باز رہنے کی تعلیم دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا بڑا مرتبہ ہے۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی اقوام اُن کی تعریف کرتی ہیں اور ان کا ذکر خیر نیکی کے ساتھ ہوتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی اولاد کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ کیا ہے۔ آپ انبیائے بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی اور رسول تھے۔ آپ بھی توحید کے قائل تھے اور اللہ تعالیٰ ہی سے اپنی حاجتیں طلب کرتے تھے اور اُسی کی رحمت پر بھروسہ رکھتے تھے۔ آپ کوئی مشکل کشا اور حاجت روا نہیں تھے کہ آپ کو ہی معبود بنا لیا جائے۔ آگے بعض دوسرے انبیاء کا بھی مجموعی طور پر ذکر آرہا ہے جن کے حالات پر اللہ تعالیٰ نے تبصرہ فرمایا ہے اور اُن کے مشن کا ذکر کیا ہے۔

تو یہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوسٰى اے پیغمبر! آپ کتاب یعنی قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کریں اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا بیشک آپ منتخب شدہ برگزیدہ تھے۔ سورۃ الاعراف میں اللہ نے یہ بات اس طرح بیان کی ہے يٰمُوسٰى اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِي وَبِكَلَامِي (آیت ۱۴۴) اے موسیٰ علیہ السلام! بیشک میں

نے تجھے اپنی رسالت اور کلام کے ساتھ منتخب کیا ہے۔ اللہ نے
آپ کو شرف تکلم بخشا، اور فرمایا کہ آپ اسی انعام پر اکتفا کریں اور
بالمشافہ دیکھنے کی خواہش نہ کریں۔

مخلصًا کی دو قراتیں ہیں۔ اگر مُخْلِصًا پڑھا جائے تو یہ فاعل
کا صیغہ بنتا ہے اور اس کا معنیٰ ہوگا نہایت اخلاص کے ساتھ اللہ
کی عبادت کرنے والے۔ آپ کی عبادت بالکل خالص تھی اور اس
میں شرک یا ریا کا شائبہ تک نہیں تھا کیونکہ اخلاص اور برگزیدگی تبھی
پیدا ہوتی ہے جب یہ چیزیں نہ ہوں۔ سورۃ المؤمن میں اللہ کا فرمان ہے
"فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" (آیت - ۶۵) تم خالص
اسی کی عبادت کرتے ہوئے اُس اللہ تعالیٰ کو پکارو۔ اس لفظ کی دوسری
قرأت مُخْلَصًا ہے۔ جس کا معنیٰ منتخب شدہ برگزیدہ اور یہ
مفعول کا صیغہ ہے۔

نبی اور رسول میں فرق

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور نبوت کی گواہی
بھی دی وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا اور آپ اللہ کے رسول اور نبی تھے
رسول وہ ہوتا ہے جسے اللہ نے مستقل شریعت، کتاب یا صحیفہ عطا
کیا ہو۔ اور نبی وہ ہوتا ہے جس کے لیے مستقل شریعت نازل نہیں ہوتی
بلکہ وہ سابقہ شریعت ہی کی تبلیغ کرتا ہے۔ بنی اسرائیل کے ہزاروں
انبیاء صرف تورات کی تعلیم دیتے رہے۔ تاہم وحی الٰہی نبی اور رسول ہر دو
پر نازل ہوتی ہے۔

رسول اور نبی میں ایک اور امتیاز یہ ہے کہ رسول کا اطلاق انسانوں
کے علاوہ ملائکہ پر بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ملائکہ کو بھی رسول بنا کر بھیجتا
ہے۔ "اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ
النَّاسِ" (الحج - ۷۵) اللہ تعالیٰ فرشتوں اور لوگوں میں سے

سے اپنے رسول منتخب فرماتا ہے۔ البتہ نبی کا اطلاق صرف انسانوں پر ہوتا ہے اور وہ بھی اللہ کا پیغام لاتے ہیں۔ علم کلام والے نبی کی تعریف یوں کرتے ہیں اِنْسَانٌ بَعَثَہُ اللّٰہُ لِتَبْلِیْغِ مَا اُوْحِیَ اِلَیْہِ یعنی نبی وہ ہوتا ہے جس کی طرف وحی کی جاتی ہے ایک صورت میں رسول عام ہے کہ اس کا اطلاق فرشتوں اور انسانوں دونوں انواع پر ہوتا ہے۔ اور نبی خاص ہے کہ یہ صرف انسانوں میں سے ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں نبی عام ہے کہ اس کا اطلاق نبی اور رسول دونوں پر ہوتا ہے جس کی طرف وحی کی جاتی ہے اور رسول خاص ہے کہ یہ لفظ صرف صاحب کتاب اور صاحب شریعت کے لیے استعمال ہوتا ہے اور سابقہ کتب کی تبلیغ کرنے والے انبیاء پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔

اللہ نے فرمایا وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو پکارا کوہ طور پر ان کی دائیں جانب سے یہاں پر لفظ ایمن کا تعلق موسیٰ علیہ السلام سے ہے، نہ کہ پہاڑ سے کیونکہ پہاڑ کا تو دایاں بایاں پہلو نہیں ہوتا۔ تو جملے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی دائیں طرف سے آواز دی۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب آپ مدین سے واپس مصر آ رہے تھے۔ اس کی تفصیلات اگلی سورۃ میں تفسیری روایات کے حوالے سے آئیں گی۔ تو فرمایا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو پکارا وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا اور ہم نے انہیں قریب کیا سرگوشی کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے درمیان والے بہت سے حجابات اٹھا کر موسیٰ علیہ السلام کو اپنے اتنا قریب کر لیا کہ آپ عالم بالا میں قضا و قدر کے دفتر میں ملائکہ کے قلموں کے چلنے کی آواز سن رہے تھے یہ موسیٰ علیہ السلام کا انتہائی عروج تھا۔ اور پھر کیا ہوا "وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا" (النساء - ۱۶۴) اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے براہ راست کلام کیا

جب کہ درمیان میں کوئی واسطہ نہیں تھا۔

آگے ارشاد ہوتا ہے وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ہم نے اپنی رحمت خاصہ سے موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون علیہ السلام کو بھی نبی بنایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے خود اللہ تعالےٰ سے درخواست کی تھی وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِي (طٰہٰ - ۲۹-۳۰) میرے بھائی ہارون کو میرا معاون بنا دے کیونکہ وہ زبان میں مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔ تو اللہ تعالےٰ نے ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت عطا کی اور پھر ان دونوں کو فرعون اور اس کے حواریوں کی طرف مامور کیا کہ جا کر انہیں خدا کا پیغام سنائیں۔ دونوں بھائی اپنی قوم بنی اسرائیل کی طرف بھی نبی تھے اور ان کی تعلیم و تربیت بھی انہی کے ذمے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو بڑی بزرگی اور شان عطا فرمائی یہ بھی لوگوں کو اللہ کی توحید کی طرف دعوت دیتے تھے اور کفر و شرک کی مذمت بیان کر کے لوگوں کو باز رہنے کی تلقین کرتے تھے۔

پہلے ابراہیم علیہ السلام، اسحاق اور یعقوب علیہما السلام کا ذکر گذشتہ رکوع میں ہو چکا ہے۔ اب بیان یہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کا "تذکرہ" مستقل عنوان کے تحت کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اور آپ کتاب یعنی قرآن حکیم میں اسماعیل علیہ السلام کا تذکرہ بھی کریں۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے متعلق بیان ہو چکا ہے کہ آپ حضرت ابراہیم کی بڑی بیوی حضرت سارہ کے بطن سے تھے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ہاجرہ تھیں۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ہجرت کر کے مصر پہنچے تو مصر کے بادشاہ نے حضرت ہاجرہ بطور لونڈی حضرت سارہ کو خدمت کے لیے دی تھی۔ آپ نے یہ لونڈی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بخش دی جنہوں نے

اُن سے نکاح کر لیا اور اللہ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام علیہا عظیم فرزند عطا کیا۔ البتہ حضرت اسماعیل علیہ السلام پہلے پیدا ہوئے اور حضرت اسحاق علیہ السلام اس کے چودہ سال بعد تولد ہوئے۔ پھر آگے اللہ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے اتنی کثیر اولاد پیدا کی کہ پورا عرب و عجم اُن سے بھر گیا۔ عرب کے لوگ حضرت اسماعیل کی اولاد ہونے پر فخر کرتے تھے۔ اللہ نے آپ کا تذکرہ کر کے مشرکین عرب کو تنبیہ کی کہ دیکھو تمہارے آباؤ اجداد ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام تو اللہ کی توحید کی دعوت دیتے تھے مگر تم شرک میں کیسے مبتلا ہو چکے ہو؟

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کی یہ صفت بیان کی ہے اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ بیشک آپ بڑے سچے وعدے والے تھے۔ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا اور آپ اللہ کے رسول اور نبی تھے انبیاء علیہم السلام تو بلاشبہ وعدے کے سچے ہوتے ہیں مگر عام مومنوں میں بھی صفت پائی جانی چاہیئے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے اَلْعِدَةُ دَيْنٌ یعنی وعدہ ایک قرض ہوتا ہے جس کا چکانا ضروری ہے۔ وعدہ کر کے خلاف ورزی کرنا منافق کی نشانی ہے کیونکہ منافق کی ایک نشانی یہ ہے اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ جب وہ وعدہ کرتا ہے تو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے مفسرین بیان کرتے ہیں کہ کسی شخص نے اسماعیل علیہ السلام سے کسی مقام پر ملنے کا وعدہ کیا۔ آپ وہاں پہنچ گئے مگر وہ شخص نہ آیا حتیٰ کہ مختلف روایات کے مطابق آپ کو وہاں پر تین دن، ایک ماہ یا سال بھر انتظار کرنا پڑا۔ پابندیٔ عہد کی یہ عمدہ مثال ہے۔

ابوداؤد شریف میں یہ روایت بھی آتی ہے کہ قبل از نبوت حضور علیہ السلام کی لین دین کے معاملہ میں عبداللہ ابن ابوالحمساء نامی شخص سے بات چیت ہو گئی۔ اس نے کہا کہ آپ یہیں ٹھہریں میں ابھی فلاں چیز لے کر آتا ہوں۔

اتفاق کی بات کہ وہ شخص اپنا وعدہ بھول گیا۔ تین دن کے بعد اُسے وعدہ
یاد آیا اور وہاں پہنچا تو حضور علیہ السلام کو اپنا منتظر پایا۔ آپ نے فرمایا،
اے نوجوان! تم نے ہمیں مشقت میں ڈال دیا۔ اسی طرح اسماعیل علیہ السلام
بھی وعدے کے بڑے پکے اور سچے تھے۔

وعدہ اللہ سے کیا ہو یا مخلوق سے اُس کا ایفا ضروری ہے تاجروں
کو اپنے وعدے کا ضرور پاس کرنا چاہیئے۔ اور یہی ذمہ داری کاربرداران
حکومت پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اندرونی اور بیرونی معاہدات پر عمل درآمد
کریں۔ اخلاق کا دارومدار ایفائے عہد پر ہے اور یہی کامیابی کی ضمانت
ہے۔ وعدہ خلافی کرنے والا منافق ہمیشہ ذلیل وخوار ہی ہوتا ہے۔ تو
اللہ نے فرمایا کہ اسماعیل علیہ السلام سچے وعدے والے اور اللہ کے رسول
اور نبی تھے۔

فرمایا وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ
اور اسماعیل علیہ السلام اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتے تھے
اہل سے مراد پوری قوم بھی ہو سکتی ہے کہ سب کو نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا
کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ یہ دونوں بنیادی عبادات ہیں۔ نماز کے
ذریعے تعلق باللہ استوار ہوتا ہے اور زکوٰۃ کے ذریعے مخلوق خدا کے
ساتھ تعلقات کی استواری ہوتی ہے اور یہ نفس کی اصلاح کا ذریعہ بھی ہے
ایک مومن اور غیر مومن کے درمیان یہی عبادات علامات فارقہ بھی ہیں
سورۃ التوبہ میں ہے "فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ
وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ" (آیت - ۱۱)
کفار، مشرکین اور منافقین کے متعلق فرمایا کہ اگر وہ تائب ہو کر نماز پڑھنے
لگیں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں تو وہ تمہارے دینی بھائی بن گئے۔ اب
جھگڑے ختم ہو گئے۔ اُن سے جنگ کرنے کی ضرورت نہیں مطلب

یہ کہ جو شخص ان دو عبادت نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی شروع کر دے۔ وہ جماعت المسلمین کا ممبر بن گیا۔ اگر یہ عبادات انجام نہیں دیتا تو پھر دین کے ساتھ اس کی وفاداری مشکوک ہے۔

وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا اور اسماعیل علیہ السلام اپنے پروردگار کے ہاں پسندیدہ شخصیت تھے۔ ظاہر ہے کہ آپ اللہ کے نبی اور رسول تھے، وعدے کے سچے اور اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے۔ صرف خدا کی عبادت کرتے تھے اور لوگوں کو بھی توحید کی دعوت دیتے تھے۔ نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کی تعلیم دیتے تھے۔ یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا ذریعہ ہیں گویا آپ اللہ تعالیٰ کے منظور نظر تھے۔ مراد یہ ہے کہ عربوں کو بھی لازم ہے کہ وہ انہی کا طریقہ اختیار کریں جن کی وہ اولاد ہیں۔ کفر و شرک کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو اپنا لیں۔ کتنی بڑی بات ہے کہ اپنی نسبت تو ان پاک ہستیوں کی طرف کرتے ہیں مگر ان کے طریقے کے سراسر خلاف چلتے ہیں۔

اب اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریس علیہ السلام کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اور آپ کتاب یعنی قرآن میں ادریس علیہ السلام کا ذکر کریں۔ ادریس علیہ السلام کے بارے میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ آپ نوح علیہ السلام سے پہلے تھے یا انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہوئے ہیں۔ بائیبل میں آپ کا لقب اخنوخ بیان کیا گیا ہے، صاحب مدارکؒ اور امام بغویؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ ادریس علیہ السلام اللہ کے نبی تھے اور آپ پر کئی صحیفے بھی نازل ہوئے۔ یہ وہ ہستی ہیں جنہوں نے بنی نوع انسان کی سہولت کے لیے کئی چیزیں ایجاد کیں۔ مثلاً سب سے پہلے قلم کے ساتھ لکھنا انہوں نے شروع کیا۔ کپڑے سینے کی سوئی اور جنتری اور زائچی کی ایجاد ہے۔ انہوں نے ترازو بھی بنایا۔ آپ علم فلکیات میں

بھی دسترس رکھتے تھے۔ دنیا میں ریاضی کا نظام بھی اللہ نے آپ ہی کے ذریعے جاری کیا۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا بیشک وہ صدیق اور نبی تھے۔

وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ہم نے ادریس علیہ السلام کو بڑا بلند مقام عطا فرمایا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ مَكَانًا عَلِيًّا سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ ہی آسمان پر اٹھا لیا تھا۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ شب معراج میں چوتھے آسمان پر حضور علیہ السلام کی ملاقات ادریس علیہ السلام سے بھی ہوئی تھی۔ اسرائیلی روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ ادریس علیہ السلام کی کسی فرشتے کے ساتھ دوستی ہو گئی تھی اور فرشتہ انہیں اپنے پروں میں چھپا کر آسمانوں پر لے گیا۔ پھر جب ان کی وفات کا وقت آیا تو ملک الموت آپ کو زمین پر تلاش کرنے لگا مگر اس میں ناکام ہوا۔ پھر اس کی ملاقات اس فرشتے سے ہو گئی۔ فرشتے نے ملک الموت سے دریافت کیا کہ ادریس علیہ السلام کی زندگی کا کتنا حصہ باقی ہے تو اس نے کہا کہ میں تو انہی کی تلاش میں ہوں کیونکہ ان کا وقت قریب آچکا ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان کی روح چوتھے آسمان پر قبض کروں۔ فرشتے نے اپنے پر کھولے تو ادریس علیہ السلام وہاں موجود تھے، چنانچہ ان کی روح وہیں قبض کی گئی۔ اس روایت کو کعب احبار نے بیان کیا ہے مگر یہ یقینی بات نہیں ہے۔ صرف آپ کا چوتھے آسمان پر ہونا صحیح حدیث سے ثابت ہے۔

مَكَانًا عَلِيًّا سے شرف اور بزرگی بھی مراد ہو سکتی ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرمائی جو نوع انسانی میں بلند ترین مرتبہ ہے۔ آپ پر صحیفے بھی نازل ہوئے، تو گویا آپ عالی مرتبت ہیں۔ اس آیت میں ادریس علیہ السلام کا اجمالی بیان ہے، تاہم آپ کا مجموعی تذکرہ جس میں آپ کی تبلیغ اور مشن کا تذکرہ ہے بعد میں آئے گا۔

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّنَ
مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَّمِن
ذُرِّيَّةِ إِبْرٰهِيمَ وَإِسْرَٰٓءِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا
إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ءَايٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا
وَّبُكِيًّا ۩ ﴿٥٨﴾ فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا
الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾
إِلَّا مَن تَابَ وَءَامَنَ وَعَمِلَ صٰلِحًا فَأُولَٰٓئِكَ يَدْخُلُونَ
الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْـًٔا ﴿٦٠﴾ جَنّٰتِ عَدْنٍ الَّتِي
وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهُۥ بِالْغَيْبِ إِنَّهُۥ كَانَ وَعْدُهُۥ
مَأْتِيًّا ﴿٦١﴾ لَّا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلٰمًا وَلَهُمْ
رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿٦٢﴾

سجدہ ۵

ترجمہ:- یہ وہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے
نبیوں میں سے، آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے اور ان میں
سے جن کو ہم نے سوار کیا نوح علیہ السلام کے ساتھ۔
اور ابراہیم اور اسرائیل علیہما السلام کی اولاد سے اور ان میں
سے جن کو ہم نے ہدایت دی ہے اور جن کو ہم نے
پسند کیا ہے۔ جب پڑھی جاتی ہیں ان پر رحمان کی آیتیں تو

گر پڑتے ہیں وہ سجدے میں اور روتے ہیں (۵۸) پھر ان کے بعد آئے ایسے ناخلف جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کی پیروی کی پس عنقریب پائیں گے وہ گمراہی کا نتیجہ (۵۹) لیکن وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی اور ایمان لائے اور اچھا عمل کیا، پس یہی لوگ ہیں جو داخل ہوں گے جنت میں اور نہ ظلم کیا جائے گا اُن پر کچھ بھی (۶۰) ایسے جنت جو رہائش کے قابل ہیں۔ خدائے رحمان نے وعدہ کیا ہے اپنے بندوں سے غیب کے ساتھ۔ بیشک اُس کا وعدہ آنے والا ہے (۶۱) نہ سنیں گے وہ اس (جنت) میں کوئی بیہودہ بات مگر سلام۔ اور اُن کے لیے روزی ہو گی اس (جنت) میں صبح اور شام (۶۲)

گزشتہ دروس میں بعض انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ اللہ نے فرمایا ہے۔ پہلے ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے فرزند اسحاق علیہ السلام اور پوتے یعقوب علیہ السلام کا ذکر ہوا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کا خاص طور پر اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کا ضمناً ذکر آیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے صادق الوعد ہونے کا ذکر کیا۔ آپ کو نبی اور رسول بھی کہا گیا ہے۔ رسول وہ ہوتا ہے جس پر مستقل کتاب یا شریعت نازل ہو، مگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق مفسرین کرام عام طور پر کسی کتاب کا ذکر نہیں کرتے، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کو رسول کس بنا پر کہا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں مفسر قرآن حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی بیان کرتے ہیں کہ رسالت کے لیے جدید شریعت یا کتاب ہونا ضروری ہے۔ جدید شریعت یا تو نبی کے لحاظ سے ہوتی ہے یا پھر امت کے لحاظ سے۔ نبوت کے لحاظ سے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کو جدید شریعت نہیں ملی بلکہ آپ اپنے باپ اور عظیم رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کی ہی تبلیغ کرتے تھے، تاہم آپ کے مخاطبین ضرور جدید لوگ تھے یعنی جرہم کے

لوگ تھے جو اصلاً یمن کے باشندے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور آپ کی والدہ کو موجودہ مکہ مکرمہ کے مقام پر چھوڑ گئے تھے جہاں آب زمزم کا چشمہ بھی جاری ہو چکا تھا۔ عرب کی سرزمین میں پانی کی سخت قلت ہے۔ قوم بنی جرہم کا ایک تجارتی قافلہ اس مقام کے قریب سے گزرا تو انہیں یہاں پانی کا احساس ہوا جب انہوں نے حضرت ہاجرہ سے وہاں آباد ہونے کی درخواست کی تو آپ نے قبول کر لی اور یہ لوگ آباد ہو گئے اور اسی خاندان میں حضرت اسماعیل کی شادی بھی ہوئی۔ چونکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اپنی جرہم لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے اس لیے آپ رسول بھی ہیں اور نبی بھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں کے علاوہ بھی حضرت اسماعیل کی طرف کچھ صحیفے نازل ہوئے ہوں جن سے ہم مطلع نہیں بہر حال اللہ نے آپ کو نبی اور رسول کہا ہے۔

گزشتہ درس میں حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق گزر چکا ہے وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا اس سے آپ کا درجہ اور شرافت مراد ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت کے بلند درجے پر فائز فرمایا۔ عربی زبان میں ان الفاظ کا درجے اور مرتبے کے لیے استعمال ہونا پرانی شاعری میں بھی ملتا ہے حضور علیہ السلام کے صحابی اور شاعر نابغہ جعدیؓ نے اپنے خاندان کی شرافت اور بزرگی کا تذکرہ اس شعر میں کیا ہے۔

بَلَغْنَا السَّمَاءَ مَجْدُنَا وَسَنَاؤُنَا
وَاِنَّا لَنَرْجُوْا فَوْقَ ذٰلِكَ مَظْهَرًا

ہم تو آسمان کی بلندیوں تک پہنچ چکے ہیں۔ اپنی بزرگی اور رونق کی وجہ سے اور ہم اس سے آگے کے مظہر یعنی جلوہ گاہ کے بھی امیدوار ہیں۔ یہ شعر سن کر حضور علیہ السلام نے فرمایا، اے ابولیلیٰ! آین المظهر وہ مظہر کہاں ہے جس کے تم امیدوار ہو، تو انہوں نے عرض کیا کہ وہ جنت ہے

جس کے ہم طالب ہیں۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا۔ اگر اللہ نے چاہا تو تم وہاں تک بھی پہنچ جاؤ گے۔ بہر حال یہ درجہ اور مرتبے کی بلندی ہے جو حضرت ادریس علیہ السلام کے حصے میں آئی۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آپ پر تیس صحیفے نازل ہوئے۔ آپ حضرت نوح علیہ السلام کے اجداد میں سے تھے۔ جب حضرت ادریس علیہ السلام کی عمر ساٹھ برس ہوئی تو آپ کے ہاں فرزند پیدا ہوا جس کا نام متوشلخ تھا۔ یہ نوح علیہ السلام کے دادا تھے اس کے بعد ادریس علیہ السلام مزید تین سو سال تک بقید حیات رہے۔ اس طرح انہوں نے تین سو ساٹھ سال کی عمر پائی۔ پھر یا تو انہیں آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا اور وہیں اُن کی وفات ہوئی اور یا پھر زمین پر ہی فوت ہوئے

ان چند انبیاء کا ذکر کرنے اور اُن کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد اللہ نے فرمایا ہے أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم یہ وہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ یہ لوگ آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے انبیاء علیہم السلام میں سے تھے۔ یعنی سب کے سب حضرات زکریا، یحییٰ، ابراہیم، اسحاق، یعقوب، اسماعیل، موسیٰ، ہارون اور ادریس علیہم السلام اللہ کے برگزیدہ نبی تھے۔ اور پھر اس سورۃ کے آخری حصے میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی آئے گا۔ فرمایا یہ سارے انبیاء آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ انسان اور بشر تھے۔ اور یہ اُن میں سے بھی تھے وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ جن کو ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار کیا۔ اس وقت روئے زمین پر تمام نافرمان نابود کر دیے گئے اور صرف وہی بچے، جو کشتی نوح پر سوار ہو گئے۔ پھر آگے دنیا کی آبادی کشتی میں سوار نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں سام، حام اور یافث سے ہوئی۔ ابراہیم علیہ السلام اور سارے عرب سام کی اولاد میں سے تھے

انعام یافتہ انبیاء

غرضیکہ فرمایا کہ یہ نبی ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار کیا۔

اور بعض ان میں سے بہت سے وَمِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ حضرات ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے جن سے آگے بارہ قبیلے بنے اور شام و فلسطین میں پھیل گئے۔ اُدھر اسماعیل علیہ السلام کے بھی بارہ بیٹے تھے آپ کی نسل پورے عرب میں پھیل گئی۔ ان سب انبیاء کے متعلق فرمایا وَمِمَّنْ هَدَيْنَا کہ یہ اُن لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کی وَاجْتَبَيْنَا جن کو ہم نے پسند کیا اور برگزیدہ بنایا۔ فرمایا ان سب کی حالت یہ تھی۔ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ کہ جب ان کو خدائے رحمان کی آیتیں پڑھ کر سنائی جائیں خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا تو روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے تھے۔

ان تمام مذکورہ انبیاء میں سے کوئی بھی الٰہ نہیں تھا۔ نہ انہوں نے اللہ کے سوا کسی دوسری ذات کی الوہیت کا درس دیا۔ بلکہ وہ سب کے سب اللہ وحدہٗ لاشریک کے سامنے سجدہ ریز ہونے والے تھے اور اپنی اپنی اقوام کو یہی درس دیتے رہے مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ ان کے بعد لوگوں نے انہی کو معبود بنا لیا۔ عیسائیوں نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو الوہیت کا درجہ دے دیا۔ یہودیوں نے عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا اور ابراہیم علیہ السلام کو تمام اختیار سونپ دیئے۔ کہنے لگے کہ آپ دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہو جائیں گے۔ اور کسی ختنہ شدہ یہودی کو دوزخ میں نہیں گرنے دیں گے۔ انہوں نے اللہ کی صفات میں ان انبیاء کو شریک کر لیا حالانکہ وہ سب اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہونے

والے تھے اور اُس کے سامنے عاجزی کا اظہار کرتے تھے۔ اللہ تعالٰی نے حضرت زکریا علیہ السلام کو بڑھاپے میں اولاد عطا فرمائی اور عیسٰی علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا۔ اللہ نے ابراہیم اور اسمٰعیل علیہ السلام کو بچپن سے ہی بڑی بڑی آزمائشوں میں ڈالا اور پھر ان کو سرخرو کیا۔ یہ ساری بات اللہ نے شرک کی تردید کے سلسلے میں بیان فرمائی ہے۔

نالائق جانشین

آگے اللہ تعالٰی نے وہ وجہ بیان کی ہے جس کی بنا پر لوگوں نے اللہ کے برگزیدہ انبیاء کو الوہیت کے منصب پر فائز کر دیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ پھر ان انبیاء کے بعد ایسے نالائق لوگ آگئے۔ خَلۡفٌ نالائق کو کہتے ہیں جو جانشینی کا حق ادا نہ کر سکے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہندی میں لائق بیٹے کو سپوت اور نالائق کو کپوت کہا جاتا ہے۔ تو ان کے بعد نالائق آئے اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا، اور وہ ایسی عبادت کو چھوڑ بیٹھے جس کے ذریعے تعلق باللہ استوار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ انہوں نے خواہشات کی پیروی کی اور اچھے بُرے میں تمیز نہ کی۔ آج کل پوری دنیا میں یہ بیماری عام ہے ہر کوئی کھیل تماشے، لہو و لعب، زیب و زینت اور آرام و آسائش کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ کافر تو پہلے ہی محاسبہ اعمال کو تسلیم نہیں کرتے، اب مسلمان بھی اُن کی دیکھا دیکھی اسی روش پر چل نکلے ہیں۔ بہت قلیل نمازی رہ گئے ہیں، ورنہ اکثریت بے نمازوں کی ہے۔ تو اللہ نے فرمایا کہ پھر ایسے نالائق لوگ آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات کے پیچھے چل پڑے۔ فرمایا فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا یہ لوگ عنقریب گمراہی کے نتیجے کو پہنچیں گے۔ غَيٌّ جہنم کی ایک وادی کا نام بھی ہے اگر یہ معنی کیا جائے تو مطلب ہو گا کہ ایسے نالائق جہنم کی وادی غی میں۔

پہنچیں گے جو اللہ نے گمراہوں کے لیے مقرر کر رکھی ہے غرضیکہ گمراہی کا نتیجہ یقیناً ان کے سامنے آنے والا ہے۔

نیک لوگوں کے لیے جنت

البتہ گمراہی سے بچ نکلنے والے نیک لوگ بھی ہوں گے اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ ہاں، وہ جو تائب ہو گئے اور اللہ کی وحدانیت پر ایمان لے آئے۔ وَعَمِلَ صَالِحًا اور کچھ نیک اعمال بھی انجام دیے فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ یہی لوگ ہیں جو یقیناً جنت میں داخل ہوں گے۔ ایسے باغات جو رہائش کے قابل ہوں گے۔ ان میں نہریں بہتی ہوں گی اور آرام و آسائش کی تمام سہولتیں میسر ہوں گی۔ نیک لوگ ان میں داخل ہوں گے وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا اور ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی جائیگی بلکہ ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ فرمایا جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ان جنتوں کا اللہ نے اپنے بندوں کے ساتھ بغیر دیکھے وعدہ کر رکھا ہے۔ لوگوں نے مذکورہ جنت کو دیکھا نہیں مگر انہوں نے جنت اور دوزخ کو برحق تسلیم کیا ہے، لہٰذا انہیں یہ انعام ضرور ملیگا۔ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا بیشک تیرے پروردگار کا یہ وعدہ سامنے آنے والا ہے۔ یعنی یہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔

فرمایا ان بہشتوں کی کیفیت یہ ہوگی لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا کہ یہاں کے رہنے والے یہاں کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے۔ اِلَّا سَلٰمًا وہاں تو سلامتی ہی سلامتی کی آوازیں آئیں گی۔ فرشتے بھی سلام کریں گے اور جنتی بھی ایک دوسرے کو سلام کریں گے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی سلام ہوگا۔ "سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ" (یٰسین) کسی نے جنت کی تعریف یوں کی ہے۔

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد　کسے را با کسے کارے نہ باشد

وہاں ہر شخص مطمئن ہوگا، ہر شخص باعزت ہوگا۔ کسی کی تحقیر و تذلیل نہیں ہوگی نہ کوئی ذہنی کوفت ہوگی اور نہ جسمانی اذیت پہنچے گی۔

فرمایا وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا

اہل جنت کے لیے صبح و شام بہترین روزی کا انتظام ہوگا۔ عام طور پر لوگ دنیا میں بھی صبح اور شام کھانا کھاتے ہیں، تو بہشت میں بھی نیک آدمیوں کو انہی اوقات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بغیر محنت و مشقت بہترین روزی میسر ہوگی۔ دنیا میں تو گزر اوقات کے لیے ہزار جتن کرنے پڑتے ہیں۔ پریشانیاں اٹھانا پڑتی ہیں اور پھر کہیں دو وقت کی روٹی میسر آتی ہے مگر جنت میں اللہ تعالیٰ بغیر محنت کے باعزت، روزی عطا فرمائیگا۔ اہل جنت کی خواہش کا احترام کیا جائے گا، اور ان کی من پسند مہمان نوازی کی جائیگی۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿۶۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۭ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿۶۵﴾ ع

ترجمہ:- یہ وہ جنت ہے کہ ہم وارث بنائیں گے اپنے بندوں میں سے جو پرہیزگار ہوں گے ﴿۶۳﴾ اور ہم نہیں اترتے مگر تیرے رب کے حکم سے۔ اُسی کے لیے ہے جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے۔ اور نہیں ہے تیرا پروردگار بھولنے والا ﴿۶۴﴾ وہ پروردگار ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے۔ پس آپ اُسی کی عبادت کریں اور قائم رہیں اُس کی عبادت پر۔ کیا تم جانتے ہو اس کے لیے کوئی ہمنام (یا کوئی مثال) ﴿۶۵﴾

ربط آیات

حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق عقیدۂ الوہیت کے ابطال کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا اور پھر آخر میں اُن سب کا مشترکہ مسلک بیان فرمایا۔

یہ سب اللہ تعالیٰ کے ہدایت یافتہ اور برگزیدہ بندے تھے۔ ابتداء میں حضرت زکریا اور یحییٰ علیہما السلام کا ذکر ہوا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کا تذکرہ ہوا۔ ان سب پر تبصرہ کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا کہ خدائے رحمان کے ان برگزیدہ بندوں کے سامنے جب اللہ تعالیٰ کی آیات تلاوت کی جائیں تو یہ سنتے ہی سجدہ میں گر پڑتے۔ یہ تمام حضرات اللہ کے سامنے عاجزی کرتے تھے اور اسی کو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے تھے۔ یہ لوگ شرک سے بیزار تھے اور لوگوں کو بھی توحید کی دعوت دیتے تھے۔ پھر بعد میں آنے والوں نے مسیح علیہ السلام کو الٰہ بنا لیا اور ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کو بھی اللہ کی صفت الوہیت میں شریک کر لیا۔ اللہ نے فرمایا کہ پہلے لوگ تو اچھے تھے مگر بعد میں آنے والے لوگ نالائق ثابت ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا۔ اور نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ گئے۔ پھر اللہ نے ایمان لانے کے بعد نیک اعمال انجام دینے والوں کے بدلے اور ان کے مقام کا ذکر بھی کیا۔

سجدۂ تلاوت

گزشتہ درس میں یہ آیت گزر چکی ہے کہ رحمان کے بندوں کے سامنے اللہ کی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ سجدہ اللہ تعالیٰ کے سامنے انتہائی عاجزی، نیازمندی، انکساری، خشوع و خضوع کا اظہار ہوتا ہے۔ امام ابوبکر جصاص لکھتے ہیں کہ اس آیت سے سجدۂ تلاوت کے وجوب کی دلیل ملتی ہے۔ قرآن پاک کے کل چودہ مقامات سجدہ میں سے ایک یہ بھی ہے۔ آیات سجدہ کو پڑھنے اور سننے والوں پر سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔ قاری تو فوراً سجدہ کرے گا اور سامع اگر طہارت سے نہیں تو بعد میں طہارت کر کے سجدہ کرے کیونکہ یہ اس کے ذمے واجب ہے۔ امام مالکؒ اور دوسرے ائمہ کرام کے نزدیک سجدہ تلاوت واجب نہیں بلکہ سنت مؤکدہ ہے۔

جنت متقین کے لیے ہے

آج کی پہلی آیت بھی جنتیوں کے استحقاق کے متعلق ہے۔ ارشاد ہوتا ہے تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا
یہ وہ جنت ہے کہ جس کا ہم وارث بنائیں گے اپنے بندوں میں سے۔ اور بندے وہ ہوں گے مَنْ كَانَ تَقِيًّا جو پرہیزگار ہوں گے۔
حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور دوسرے مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ متقی سے مراد ایسا شخص ہے جو کفر و شرک سے بچنے والا ہو۔ اس درجے کا اتقاء ہر شخص کے لیے لازم ہے ورنہ جنت کا داخلہ ممکن نہیں ہوگا۔ اس کے بعد کبائر و صغائر اور شکوک و شبہات سے بچنا اعلیٰ درجہ اور کامل الایمان ہونے کی دلیل ہے۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تقویٰ کی تعریف یوں کرتے ہیں "محافظت بر حدود شرع" یعنی اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کی حفاظت کا نام تقویٰ ہے۔ ان حدود سے مراد عقیدے، اعمال، اخلاق اور شریعت کی تمام حدود ہیں۔ ان کی حفاظت کا نام ہی تقویٰ ہے اور اللہ تعالیٰ نے جنت کا وارث متقین کو بنایا ہے۔

جنت کی وراثت کا فلسفہ

مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ جنت کی وراثت دو وجوہ سے ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جنت تمام نسل انسانی کے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کی وراثت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد آپ کو اور آپ کی زوجہ کو جنت کی سکونت عطا کی اور فرمایا وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا تم دونوں اس میں رہ کر جہاں سے چاہو خوب کھاؤ پیو، البتہ ایک درخت کے قریب نہ جانا۔ آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو جنت تو مل گئی مگر حکمت خداوندی تھی ان سے ایک لغزش ہوگئی جس کی بنا پر انہیں جنت سے نکلنا پڑا۔ اللہ نے فرمایا "قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا" تم یہاں سے نکل جاؤ۔ آدم اور شیطان کو بھی جنت سے نکال دیا۔ پھر آدم علیہ السلام کی اولاد سے فرمایا

"فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" (البقرہ - ۳۸) پھر جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت یعنی رسول اور کتابیں آئیں تو جو کوئی اُن کی اتباع کرے گا۔ اُس کے لیے کوئی خوف و غم نہیں ہوگا۔ اللہ نے یہ بھی بتلا دیا کہ اے اولادِ آدم "وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ" (آیت - ۲۶) تمہیں اس زمین پر ٹھہرنا ہوگا۔ اور ایک خاص مدت تک فائدہ اٹھانا ہوگا۔ اس کے بعد پھر اللہ کے دربار میں پیش ہو جاؤ گے۔ اب تمہارے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام کی وراثت کا مستحق وہی شخص ہوگا جس نے میری ہدایت کو اختیار کر کے میری توحید کو تسلیم کیا اور نیک اعمال انجام دیے۔ گویا جنت کی وراثت اس شرط کے ساتھ مشروط کر دی تھی۔

جنت کی وراثت سے متعلق حدیث شریف میں دوسری بات یہ آتی ہے کہ ہر شخص کے لیے دو ٹھکانے ہیں ایک جنت میں اور دوسرا دوزخ میں۔ جب کوئی شخص جنت میں جائے گا تو اس کا جہنم والا ٹھکانا کافروں کو مل جائے گا جو کہ اُن کی وراثت سمجھا جائے گا۔ اور جب کوئی شخص جہنم میں جائیگا تو اُس کا جنت والا ٹھکانا اہلِ ایمان کو مل جائے گا اور یہ اُن کی وراثت ہوگا۔ غرضیکہ جنت کی وراثت کا یہ مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے اور یہ اُسے حاصل ہوگی جو متقی ہوگا۔

نزولِ ملائکہ کا اشتیاق

آگے ارشاد ہوتا ہے۔ "وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ" اور ہم نہیں اترتے مگر تیرے پروردگار کے حکم سے۔ گذشتہ آیت میں اللہ تعالے کا فرمان تھا کہ ہم صرف متقیوں کو ہی جنت کا وارث بناتے ہیں۔ اب

تفصیلاً یہ فرما دیا کہ ہم تیرے رب کے حکم کے بغیر نہیں اترتے اس سے
اشکال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ آیت بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یا یہ کسی
اور کی طرف منسوب ہے، امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات
قرآن پاک کے سیاق و سباق کو سمجھنا اس لیے دشوار ہو جاتا ہے کہ لوگ
کلام کے مرجع کو نہیں سمجھ پاتے۔ یہاں بھی ایسا ہی معاملہ ہے حقیقت
یہ ہے کہ یہ بات براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں بلکہ اللہ
نے فرشتوں کی زبان سے کہلوایا ہے کہ ہم تیرے پروردگار کے حکم کے
بغیر نازل نہیں ہوتے۔

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کو حضرت جبرائیل
علیہ السلام کی آمد کا بڑا شوق رہتا تھا اور جب کبھی ان کے آنے میں دیر
ہو جاتی تو آپ کا اشتیاق مزید بڑھ جاتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا
تھا کہ کسی نے سوال کیا جس کا جواب آپ کو وحی الٰہی کے ذریعے مطلوب ہوتا
تو جب بھی آپ جبرائیل کے منتظر رہتے۔ چنانچہ گذشتہ سورۃ میں بیان ہو چکا
ہے کہ مشرکین مکہ نے یہودیوں کے ساتھ ساز باز کر کے آپ علیہ السلام سے
اصحاب کہف، روح اور ذوالقرنین کے متعلق سوالات کیے تھے جن کے
جوابات اللہ تعالیٰ نے سورۃ بنی اسرائیل اور سورۃ کہف کے ذریعے دیے
ایسے مواقع پر جب جبرائیل کی آمد معمول سے مؤخر ہو جاتی تو حضور علیہ السلام
پریشان ہو جاتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر آپ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام
سے کہا اَلَا تَزُوْرُنَا اَکْثَرَ مِمَّا تَزُوْرُنَا اے جبرائیل! آپ
عام معمول سے زیادہ کیوں نہیں نازل ہوتے؟ تو اس کے جواب میں
اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی کہ حضرت جبرائیل اور دیگر فرشتوں
کا یہ جواب ارسال کیا کہ ہم نہیں اترتے مگر تیرے پروردگار کے حکم سے
مطلب یہ کہ ہم اپنی مرضی سے نازل نہیں ہوتے بلکہ جب اللہ کا حکم ہوتا

ہے تو اس کا پیغام لے کر حاضر ہو جاتے ہیں۔

اس قسم کی مثال سورۃ الصّٰفّٰت میں یوں ملتی ہے ۔ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۙ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۙ (آیت ۱۶۴، ۱۶۵)

اللہ نے فرشتوں کی طرف سے یہ کلام پہنچایا کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک کا مقام مقرر ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کے حضور صف بستہ حاضر رہتے ہیں ہم عبادت الٰہی اور تفویض شدہ ڈیوٹی میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتے اور اللہ کے حکم کے منتظر رہتے ہیں۔

اس سے ملائکہ کو معبود سمجھنے والوں کا رد بھی ہو گیا۔ جو فرشتے خود اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں وہ معبود کیسے ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا جو کوئی فرشتوں کو الٰہ مان کر ان سے حاجت طلب کریگا۔ وہ مشرک بن جائے گا۔ آگے ارشاد ہوتا ہے۔ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا سب کچھ اسی اللہ تعالیٰ کا ہے جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے۔ وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ اور جو کچھ درمیان میں ہے گویا ہر طرح کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ سامنے سے مراد مستقبل، پیچھے سے مراد ماضی اور درمیان سے مراد زمانہ حال بھی ہو سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ ہمارے ماضی، حال اور مستقبل اور ہمارے تمام اطراف کے اختیارات صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ وہ اپنے اختیارات کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ ہم سارے فرشتے اللہ کے حکم کے مطیع ہیں اور اسی کے حکم سے نازل ہوتے اور وحی لاتے ہیں، لہٰذا جلدی یا بدیر آنے میں ہمارا کوئی بس نہیں ہے۔ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا اور ساتھ یہ حقیقت بھی ہے کہ تیرا پروردگار بھولنے والا نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کو کسی حکم کا انتظار ہو اور اللہ تعالیٰ پیغام دینا ہی بھول جائے۔ بلکہ وہ اپنی حکمت اور مصلحت کے مطابق جب چاہتا ہے تبھی پیغام دیتا ہے کہ آپ جا کی

طرف کھینچ رہا ہے۔

فرمایا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا

اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں، زمین اور درمیانی فضا کا تربیت کنندہ ہے۔ ہر [ہر شے تدریجاً ارتقائی]
چیز کو حد کمال تک پہنچانا اسی کے اختیار میں ہے۔ آپ کا کام یہ ہے پر استقامت
فَاعْبُدْهُ کہ عبادت اسی کی کریں۔ جب وہ لاشریک ہے تو پھر
عبادت کا مستحق بھی وہی ہے رہا۔ تو یہ بھی فرمایا وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ
آپ اسی کی عبادت پر قائم رہیں یعنی خدا کے سوا کسی دوسرے کی عبادت
نہ کریں۔ اگر ایسا کریں گے تو یقیناً گرفت ہو کر سزا ہوگی۔ تمام فرشتے اور
تمام انبیاء اسی ذات کی عبادت کرنے والے ہیں لہٰذا آپ بھی اسی پر قائم
رہیں۔ اس سے عبادت پر صبر کرنا بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عبادت کے
لیے بھی مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ نماز کے لیے سردی گرمی میں وضو کرنا
قیام، رکوع اور سجود کرنا، وقت کی پابندی کو ملحوظ خاطر رکھنا مشقت طلب
امور ہیں۔ اسی طرح روزے میں بھوک پیاس برداشت کرنا، حج کے سفر میں
مشکلات سے دوچار ہونا اور مال خرچ کرنے میں بڑی تکالیف اٹھانا پڑتی
ہیں۔ جن پر صبر کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا عبادت پر صبر کی تلقین بھی
مناسب حال ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جنت کے ارد گرد
ناگواریوں اور مشکلات کی باڑ لگا دی گئی ہے۔ لہٰذا ان دشواریوں کو عبور
کر کے ہی انسان جنت میں پہنچ سکتا ہے۔ یہ بھی ایک مشکل کام ہے
جس پر استقامت اور صبر کے لیے کہا گیا ہے۔

آگے اللہ رب العزت کی صفت بیان کی گئی ہے هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ
سَمِيًّا کیا تو اس کا کوئی ہم نام جانتا ہے۔ سمیا کا معنی ہم نام بھی ہو تو
یحییٰ علیہ السلام کے ضمن میں پہلے بھی گزر چکا ہے کہ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ
قَبْلُ سَمِيًّا اللہ نے یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کی خبر دی اور [illegible]

فرمایا کہ اس نام کا پہلے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ اور سمیا کا معنیٰ ہم مثل بھی ہوتا ہے۔ اس طرح معنیٰ یہ ہوگا۔ کیا خدا تعالیٰ کا کوئی ہم مثل ہے؟ یقیناً نہیں ہے اللہ تعالیٰ تو ہر لحاظ سے بے مثل و بے مثال ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (الشوریٰ۔ ۱۱) اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات میں بے مثل ہے۔ اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ لہٰذا اس کی عبادت میں بھی کسی کو شریک نہیں کرنا چاہیئے۔ لہٰذا اُسی کی عبادت پہ قائم رہیں۔

وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ ءَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾ وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا ﴿٧١﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ﴿٧٢﴾

ترجمہ:۔ اور کہتا ہے انسان کیا جب میں مرجاؤں گا تو کیا پھر دوبارہ زندہ نکالا جاؤں گا (٦٦) کیا نہیں یاد کرتا انسان اس بات کو کہ بیشک ہم نے اس کو پیدا کیا تھا اس سے پہلے اور وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا (٦٧) تیرے پروردگار کی قسم ہم ضرور ان کو اکٹھا کریں گے اور شیطانوں کو پھر ہم حاضر کریں گے ان کو جہنم کے گرد گھٹنوں کے بل (٦٨) پھر ہم نکالیں گے ہر ایک گروہ سے جو ان میں سے زیادہ سرکش ہے رحمان کے سامنے (٦٩) بعد

خوب جانتے ہیں اُن کو جو زیادہ لائق ہیں جہنم کے اندر داخل ہونے کے (۷۰) اور نہیں ہے تم میں سے کوئی بھی مگر یہ کہ وہ اس (جہنم) پر وارد ہونے والا ہے۔ ہے یہ بات تیرے پروردگار پر قطعی طور پر فیصلہ کی ہوئی (۷۱) پھر ہم نجات دیں گے اُن لوگوں کو جو ڈرتے ہیں اور چھوڑ دیں گے ظالموں کو اس کے اندر اوندھے منہ گرنے والے (۷۲)

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے نافرمانوں کا ذکر کرنے کے بعد ایمان لانے اور نیک اعمال انجام دینے والوں کے انعام کا ذکر کیا کہ وہ بہشتوں میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان بہشتوں کی خوبی اور فضیلت بھی بیان فرمائی۔ یہ بہشت اُن لوگوں کو ملے گی جو متقی یعنی کفر، شرک، نفاق، بد اعتقادی اور گناہوں سے بچنے والے ہوں گے۔

پھر اللہ نے فرشتوں کے متعلق فرمایا کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم اپنی مرضی سے نازل نہیں ہوتے بلکہ پروردگار کے حکم کے مطابق ہی ہمارا نزول ہوتا ہے اور ہم اللہ کی طرف سے مفوضہ کام پورا کرتے ہیں۔ وہی پروردگار جو ارض و سما اور تمام چیزوں کا رب ہے اسی کی عبادت پر قائم رہنا چاہیئے، وہ بے مثل اور بے مثال ہے۔

بعث بعد الموت

آگے اللہ تعالیٰ نے نافرمان لوگوں کے نظریہ بعث بعد الموت کو بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَيَقُولُ الْإِنسَانُ اور انسان کہتا ہے۔ یہاں پر انسان سے مراد کافر اور مشرک انسان ہیں۔ وہ کہتے ہیں ءَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا کیا جب میں مر جاؤں گا تو پھر دوبارہ زندہ نکالا جاؤں گا؟ یہ تو ناممکن ہے۔ دراصل ایسا شخص وقوعِ قیامت کا انکار کرتا ہے اور محاسبے کے عمل پر یقین نہیں رکھتا۔ سورۃ السجدۃ میں اس مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایسے لوگ کہتے ہیں ”ءَإِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ ءَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ“ (آیت - ۱۰) کیا جب ہم مر کر مٹی میں رل مل جائیں گے، تو کیا پھر دوبارہ زندہ ہوں گے؟ یہ بات تو عقل سے بعید معلوم ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص

محاسبے پر یقین نہیں رکھتا تو پھر وہ آزاد ہو کر کفر اور شرک کرنے لگتا ہے۔ اللہ نے ایسے لوگوں کا رد فرمایا ہے اور پھر بعث بعد الموت کو ایک دلیل کے ذریعے سمجھایا ہے أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنسَانُ کیا انسان اس بات کو یاد نہیں رکھتا أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ کہ ہم نے اس سے پہلے بھی اسے پیدا کیا وَلَمْ يَكُ شَيْئًا اور وہ کوئی (قابل ذکر) چیز نہ تھا۔
کیا انسان اس حقیقت پر غور نہیں کرتا کہ جس اللہ نے اسے نیستی سے ہستی میں وجود بخشا جب کہ اس سے پہلے وہ کچھ نہیں تھا تو اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا کونسا امر محال ہے اگر اللہ تعالیٰ کے لیے تخلیق کرنا مشکل ہوتا تو پہلی دفعہ ہوتا وہ تو قادر مطلق ہے اس کے لیے نہ پہلی دفعہ پیدا کرنا مشکل تھا اور نہ اس کا اعادہ کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم اپنی تخلیق کو تسلیم کرتے ہو تو اب دوبارہ پیدا کرنا کیسے محال ہو گا۔ جب کہ اس کا نقش پہلے سے موجود ہے۔

اس میں مادے کو ابدی ماننے والوں کا رد بھی ہو گیا۔ ان کا یہ نظریہ غلط ثابت ہو گیا ہے کہ وہ مادہ ازل سے موجود ہے اور اس کے ساتھ تصویر آ کر مل جاتی ہے تو انسان بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرت تامہ اور حکمت بالغہ سے انسان کو پیدا کیا ہے۔ وہ جب چاہے گا اس کا اعادہ بھی کر دے گا۔

محاسبہ اعمال

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وقوع قیامت اور محاسبہ اعمال کی بات کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ تیرے پروردگار کی قسم ہم ضرور ان کو یعنی انسانوں اور شیطانوں کو اکٹھا کریں گے۔ شیطان ہی انسانوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا تھا کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے، ہماری ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی تو پھر کون ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ اس لیے فرمایا کہ ہم

انسانوں اور شیاطین دونوں گروہوں کو جمع کر لیں گے۔ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ پھر ہم ان کو حاضر کریں گے حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا جہنم کے گرد اس حالت میں کہ وہ گھٹنے ٹیکنے والے ہوں گے۔ مطلب یہ کہ وہ ذلیل وخوار ہو کر مجرموں کی حیثیت میں پیش ہوں گے۔ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ پھر ہم ہر گروہ میں سے ایسے لوگوں کو الگ کر لیں گے أَيُّهُمْ أَشَدُّ عَلَى الرَّحْمَٰنِ عِتِيًّا جو خدائے رحمان کے سامنے زیادہ سرکشی اور اکڑ دکھاتے تھے۔ مجرموں کی درجہ بندی ہوگی اور ہر ہر قسم کے مجرمین کو الگ الگ گروہوں میں پیش کیا جائے گا۔ پھر جو بدترین مجرم ہوں گے۔ ان کی سزا بھی سخت ترین ہوگی۔ ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا پھر ہم خوب جانتے ہیں ان لوگوں کو جو جہنم میں داخل ہونے کے زیادہ لائق ہیں۔ چنانچہ ہم ان کے ساتھ حسب حال سلوک کریں گے۔

جہنم میں ورود

درمیان میں اللہ تعالیٰ نے ایک خاص منزل کا ذکر بھی فرمایا ہے وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا اور تم میں کوئی بھی نہیں مگر وہ جہنم میں داخل ہونے والا ہے یعنی ہر شخص کو ایک دفعہ جہنم میں ضرور جانا ہوگا۔ آج کی پہلی آیت وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ میں انسان سے مراد صرف نافرمان انسان ہیں مگر یہاں پہ اِنْ مِنْكُمْ یعنی نفی اور اثبات لا کر ہر نیک و بد انسان کا احاطہ کیا گیا ہے۔ سب کے سب جہنم میں وارد ہونے والے ہیں۔ فرمایا یہ کوئی کچی بات نہیں ہے بلکہ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا یہ بات تیرے پروردگار پر قطعی طور پہ فیصلہ کی ہوئی ہے۔ مفسرین کرام تمام لوگوں کے ورود جہنم کی تفسیر دو طریقے سے کرتے ہیں ایک تفسیر تو یہ ہے کہ سب لوگ بعینہٖ جہنم میں داخل ہوں گے۔ کافر، مشرک اور نافرمان تو وہاں سزا پائیں گے لیکن اہل ایمان جہنم کے شر سے محفوظ رہیں گے۔ انکی

مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے کہ جب وہ آگ میں ڈالے گئے تو اللہ نے
اُن کے لیے آگ کو ٹھنڈا اور سلامتی والا بنا دیا۔ اسی طرح مومن بھی جہنم میں جائیں
گے تو ضرور مگر آگ انہیں کوئی ضرر نہ پہنچا سکے گی اور پھر وہ اس سے نکل جائیں گے

پلصراط کی منزل

دوسری تفسیر کے مطابق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس ورود سے مراد
داخلہ نہیں بلکہ اس پر سے گزر جانا ہے۔ اور جملے کا پورا مطلب یہ ہے کہ
جنت میں جانے والے دوزخ پر سے گزر کر جنت میں جائیں گے اور
یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت میں طے ہو چکی ہے۔ اس بات کی تفصیل پلصراط
والی احادیث میں موجود ہے۔ پلصراط کا ذکر تو مرفوع حدیث میں موجود ہے
مگر اس کی تفصیلات مرفوع روایات میں نہیں ملتیں۔ مسلم شریف میں حضرت
ابو سعید خدریؓ کا قول ہے کہ پلصراط تلوار سے تیز اور بال سے باریک ہوگی۔
حضور علیہ السلام نے اس پر سے گزرنے والوں کی کیفیت بھی بیان کی ہے
کہ بعض لوگ بجلی کی چمک کی سی تیزی سے گزر جائیں گے۔ بعض تیز ہوا کی
طرح جائیں گے، بعض تیز گھڑ سوار کی طرح، بعض اونٹ سوار کی مانند، بعض
کم تیز سواریوں کی رفتار سے اور بعض پیدل کی چال چل کر پلصراط کو عبور کریں
گے۔ تفصیلات میں یہ بھی آتا ہے کہ پل صراط کے نیچے جہنم کے کناروں پر
الٹے سیدھے چمٹے لگے ہوں گے، جو گزرنے والوں کو اپنی طرف کھینچیں گے
پھر اُن میں سے جو لوگ اپنے عقیدے اور عمل میں کمزور ہوں گے، وہ نیچے
گر پڑیں گے اور ابدی سزا پائیں گے۔ اور جو اہل ایمان گناہگار ہوں گے
وہ گریں گے تو ضرور مگر پاک ہو کر نکل آئیں گے۔ اور بعض ایسے بھی ہوں گے
جو گرتے پڑتے زخمی ہو کر پلصراط کو عبور کر لیں گے۔ یہ سارا عمل ہر شخص کے
کے عقیدہ ایمان اور عمل کی کیفیت و کمیت کے مطابق ہوگا۔ مختصر یہ کہ اس
آیت میں مذکور ورود سے جہنم کا داخلہ مراد نہیں بلکہ اس پر سے گزر جانا
مقصود ہے۔ یہ بڑی تشویشناک منزل ہے جس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے

قطعی طور پر کمزور کہا ہے۔

جہنم سے خروج

حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ جو اہلِ ایمان جہنم میں گر جائیں گے ان کے حق میں مومن لوگ سفارش کریں گے۔ پہلے درجے میں تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شفاعت ہوگی، پھر تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں کے لیے سفارش کریں گے۔ شہداء اور پھر ان کے بعد عام اہلِ ایمان بھی اللہ کے حضور سفارش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہر سفارش کنندہ کو اجازت دیں گے کہ اتنی تعداد میں وہاں سے لوگوں کو نکال لاؤ۔ یہ ایسے لوگ ہوں گے جو جہنم کی آگ سے محفوظ ہوں گے۔ پھر سب سفارشی اپنے اپنے بھائیوں، دوستوں اور عزیز و اقارب کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال لیں گے۔

حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ قربِ قیامت میں دین پر قائم رہنا اتنا مشکل ہوگا جتنا جلتے ہوئے کوئلوں کو ہاتھ میں پکڑنا۔ پورا ماحول خراب ہو جائے گا۔ ہر طرف خرابی ہی خرابی ہوگی اور صراطِ مستقیم پر چلنا دشوار ہو جائے گا۔ البتہ گمراہی کے اسباب عام ہوں گے۔ بعض لوگ بعض کے ساتھ تعلقات کی بنا پر گمراہ ہو جائیں گے اور بعض حرص لالچ اور اقتدار کی وجہ سے گمراہ ہوں گے۔ اور کوئی بہکانے کی وجہ سے دین سے دور ہو جائیں گے غرضیکہ ہر طرف کانٹے ہی کانٹے بچھے ہوں گے۔ کفر، شرک، بدعات، اور معاصی عام ہوں گے۔ ترغیبِ گناہ کی چیزیں قدم قدم پر ملیں گی۔ جو ان تمام چیزوں سے بچ کر نکل جائے گا۔ وہ پلصراط سے بھی آسانی کے ساتھ گزر جائے گا۔

آخرت کی فکر مندی

حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اکابر صحابہ میں سے ہیں۔ آپ کا تعلق انصارِ مدینہ سے تھا، شاعر بھی تھے۔ آپ غزوہ موتہ میں شہید ہوئے۔ ان کے متعلق آتا ہے کہ جب سونے کے لیے چارپائی پر آتے تو رونے لگتے۔ بیوی نے رونے کی وجہ پوچھی تو کہا کہ مجھے اس بات کی فکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اطلاع

خبر دی ہے کہ تم میں سے ہر ایک جہنم میں وارد ہوگا۔ مگر وہاں سے نکلنے کے متعلق کچھ پتہ نہیں۔ مفسر قرآن قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے ایک بزرگ ابن میسرہؒ کا ذکر کیا کہ وہ بڑی سخت متفکر رہتے تھے۔ کہا کرتے تھے لیت امی لم تلدنی کاش کہ میری ماں نے مجھے جنا ہی نہ ہوتا۔ بیوی نے پوچھا اس طرح کیوں کہتے ہو تو کہنے لگے کہ جہنم میں وارد ہونے کا ذکر تو مجھے مل گیا ہے مگر وہاں سے نکلنے کا ذکر کہاں ہے؟ اسی قسم کی فکر مندی حضرت ابوذر غفاریؓ سے منقول ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اسی فکر کی وجہ سے کہا کرتے تھے کاش میں گھاس کا ایک تنکا ہوتا۔ جسے جانور کھا کر ختم کر ڈالتے۔ پتہ نہیں میں آخرت کی منزل میں کامیاب ہوتا ہوں یا نہیں۔ حضرت عمرؓ جب سورۃ الدھر کی ابتدائی آیت تلاوت فرماتے هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا تو کہتے لَيْتَهَا تَمَّتْ مطلب یہ کہ جب وہ اللہ کے اس فرمان پر غور کرتے تھے کہ انسان پر ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے۔ جب وہ کوئی چیز نہ تھا۔ تو حضرت عمرؓ یوں کہتے کاش یہ بات پوری ہو جاتی اور میری کوئی حیثیت نہ ہوتی اور میں معدوم ہی رہتا۔ اب جب کہ اللہ نے وجود بخش دیا ہے تو پتہ نہیں ہم اس زندگی کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں گے یا نہیں۔ میر تقی میرؔ نے اس بات کو اس طرح بیان کیا ہے۔

خوشا حال اُس کا جو معدوم ہے
کہ احوال اپنا تو معلوم ہے

نامعلوم ہمارا کیا حال ہوگا۔ اور ہم کس منزل میں ہوں گے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ ہم عدم سے وجود میں نہ آتے اور معدوم ہی رہتے۔

اللہ نے یہ فرمایا ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوا پھر ہم نجات

دیں گے اُن لوگوں کو جو خدا سے ڈرتے رہے اور کفر، شرک، بدعات اور معاصی سے بچتے رہے۔ وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا اور ظالموں کو اسی دوزخ میں چھوڑ دیں گے اوندھے منہ گرنے والے۔ اگر کفر و شرک کی وجہ سے ظالم بنے ہیں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں ہی رہیں گے۔ اور اس سے کم تر گناہ میں ملوث رہے تو پاک ہو کر جہنم سے نکال لیے جائیں گے۔ انہیں بہت سی منزلیں طے کر کے ہی اللہ کی رحمت کے مقام میں پہنچنا ہو گا۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا
وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿٧٣﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ
قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿٧٤﴾ قُلْ مَنْ كَانَ
فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا
رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ
مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ﴿٧٥﴾ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ
الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ
عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿٧٦﴾

ترجمہ :- اور جس وقت پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ان لوگوں
کو ہماری آیتیں واضح ، تو کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر
کیا ایمان والوں سے کہ دونوں فریقوں (ہم اور تم) میں سے
کون بہتر ہے مکان کے اعتبار سے اور کون اچھا ہے
مجلس کے اعتبار سے ﴿٧٣﴾ اور ہم نے اس سے پہلے بہت
سی قومیں ہلاک کیں جو زیادہ اچھی تھیں سامان (فرنیچر) میں اور
منظر میں ﴿٧٤﴾ (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے ، جو شخص گمراہی کے
اندر ہو ، پس دراز کرے گا اس کے لیے خدا نے

ڈھان دراز کرنا یہاں تک کہ جب وہ دیکھیں گے اُس چیز کو
جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے، پھر یا تو عذاب ہو
گا۔ اور یا قیامت۔ پس جان لیں گے یہ کہ کون ہے زیادہ
بُرا مکان کے اعتبار سے اور کون ہے زیادہ کمزور فوج کے
اعتبار سے (۷۵) اور زیادہ کرتا ہے اللہ اُن لوگوں کے
لیے ہدایت جنہوں نے ہدایت پائی۔ اور باقی رہنے والی
نیکیاں بہتر ہیں تیرے رب کے پاس ثواب کے اعتبار
سے اور انجام کے اعتبار سے (۷۶)

ربط آیات

گذشتہ درس میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ جو لوگ ایمان قبول نہیں کرتے اعزور و تکبر کا اظہار کرتے ہیں، قیامت اور محاسبہ اعمال کے متعلق شک کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ایسے سرکشوں اور اُن کو گمراہ کرنے والے شیاطین کو اکٹھا کرے گا۔ پھر تمام نافرمانوں کو جہنم میں داخل کرے گا۔ اللہ تعالیٰ سب کے حالات کو بہتر جانتا ہے اور اس نے یہ قطعی فیصلہ کر رکھا ہے کہ تمام انسان جہنم پر سے گزریں گے۔ مشرک اور کافر تو جہنم میں گر جائیں گے، لیکن اہل ایمان اسے عبور کر کے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ اب آج کی آیات بھی گذشتہ آیات کے ساتھ ہی مربوط ہیں۔ ان آیات میں بھی کفار و مشرکین اور ان کے جزائے عمل کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ نے وقوع قیامت اور محاسبہ اعمال کو دلائل کے ساتھ واضح کیا ہے۔ منکرین اور اہل ایمان کا تقابل کر کے ایمان والوں کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔

معیارِ فضیلت

اب اللہ تعالیٰ نے کفار کا ذکر کر کے فرمایا ہے وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ جب ہماری واضح واضح آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَيُّ الْفَرِيقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَأَحْسَنُ نَدِيًّا تو کفر کرنے والے ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ دونوں فریقوں میں مکان کے لحاظ سے کون بہتر ہے، اور مجلس کے اعتبار سے کون اچھا ہے۔ اس آیت کریمہ

پہلی بات تو یہ فرمائی گئی ہے کہ ان کو واضح آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ ان آیات سے مراد اللہ تعالیٰ کے احکام، اللہ کی قدرت کے دلائل، معجزات، اصول اور مسائل ہیں۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جو حق و باطل کو بالکل واضح کرتی ہیں۔ ان آیات سے اہل ایمان کی سچائی اور کفار کا بطلان بھی ثابت ہوتا ہے۔ تو ایسی آیات سن کر کافر لوگ اہل ایمان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگر تم واقعی اللہ کے پسندیدہ لوگ ہو تو پھر دنیا میں تمہاری حالت اس قدر خراب کیوں ہے۔ پھر وہ اپنی خوشحالی اور اہل ایمان کی غربت کا تذکرہ کر کے کہتے ہیں کہ اگر ہم ایسے ہی برے ہیں تو پھر اللہ نے ہمیں اتنی نعمتیں کیوں دے رکھی ہیں۔

ان لوگوں نے اپنے زعم باطل کے مطابق اللہ کے ہاں کامیابی کے لیے دو چیزوں کو معیار بنایا ہے، ایک اچھا مکان اور دوسری اچھی مجلس ہے۔ ظاہر ہے کہ کفار میں بڑے بڑے دولت مند لوگ تھے۔ جو عالیشان مکانوں میں رہتے تھے، ان کے پاس نوکر چاکر تھے۔ ان کے مکانات تمام ضروریات زندگی سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کے برخلاف اہل ایمان کی اکثریت غریب لوگوں پر مشتمل تھی جن میں سے بعض کو معمولی جھونپڑی بھی نصیب نہیں تھی۔ چنانچہ کافر لوگ اپنے مکانوں پر فخر کرتے تھے۔ اسی طرح ان کی مجلسیں بھی پُر رونق ہوتی تھیں۔ وہاں ہر طرح کا سامان موجود تھا۔ مشرکین مکہ نے قصی ابن کلاب کے مکان کو اپنا پارلیمنٹ ہاؤس بنا رکھا تھا جہاں مجلسیں جمتی تھیں اور مشورے ہوتے تھے۔ وہاں پر قالین تھے، کرسیاں اور صوفہ سیٹ تھے اور وہ وہاں تکیے لگا کر بیٹھتے تھے۔ ایمان والے بھی اپنی مجالس مشاورت قائم کرتے تھے مگر ان کے پاس نہ تو کوئی اچھا مکان تھا اور نہ اس میں اشیائے ضرورت تھیں۔ مجلس میں بیٹھنے کے لیے کھجور کے پتوں کی چٹائیاں ہوتی تھیں، قالین اور کرسی کا نام تک

نہ تھا۔ اگر کوئی چارپائی ہے تو اس پر دری تک نہ ہوتی۔ کافر لوگ انہی چیزوں کا اندازہ کر کے ایمان والوں سے کہتے تھے کہ ذرا بتاؤ تو سہی کہ تم اور ہم میں کون سا فریق مکان اور مجلس کے لحاظ سے بہتر ہے ؟

اہلِ ایمان میں غریب غربا لوگ تھے، کچھ غلام تھے اور کچھ کمزور تھے جن کی دنیوی لحاظ سے کوئی وقعت نہیں تھی۔ چنانچہ بالدار کافر غریب مسلمانوں کی مجلس میں بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ گزشتہ سورۃ کہف میں گزر چکا ہے کہ مشرک لوگ کہتے تھے کہ ہم آپ کی مجلس میں اس وقت بیٹھیں گے جب آپ ان غریب لوگوں کو وہاں سے اٹھا دیں گے۔ وہ اہلِ ایمان مگر نادار لوگوں کی ہم نشینی کو اپنی توہین سمجھتے تھے۔ مگر اللہ نے حضور علیہ السلام کو ان کی بات ماننے سے منع فرما دیا "وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ" (الکہف۔ ۲۸) آپ اپنی نگاہِ شفقت ان غریب اہلِ ایمان سے نہ ہٹائیں آپ دنیا کی زندگی کی رونق چاہتے ہیں تو ایسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ ایسے لوگوں کی بات نہ مانیں جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل پایا ہے۔ اور وہ سرکشی میں مبتلا ہیں۔

بہرحال کفار نے ایک بات تو یہ کی کہ مکانیت اور مجلس کے لحاظ سے ہم اہلِ ایمان پر فوقیت رکھتے ہیں اور دوسری یہ کہ جب ہم اس دنیا میں تم سے اچھے ہیں تو اللہ کے نزدیک بھی ہماری حالت اچھی ہے۔ ہم اس کے محبوب ہیں وہ ہم پر خوش ہے جس کی وجہ سے وہ ہمیں نواز رہا ہے۔ دنیوی لوازمات پر فخر کرنا سرکش لوگوں کا ہمیشہ سے وطیرہ رہا ہے فرعون اور نمرود نے بھی یہی کیا تھا اور آج کے دولت مند بھی اسی بیماری میں مبتلا ہیں۔ یہ لوگ نادار اور خصوصاً ایمان والوں کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔ وہ تمام صرف اپنے لیے مخصوص کرتے ہیں۔ ایماندار مگر کمزور لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دنیا کا مال و جاہ صرف اپنا حق سمجھتے ہیں

شیطان کا یہ داؤ آج بھی کارفرما ہے۔ دولت مندوں میں کوئی شاذ و نادر
ہی ہوگا جو غریب کو حقیر نہ سمجھتا ہو بلکہ انہیں قابلِ احترام سمجھتا ہو۔ پرانے زمانے
میں بھی لوگ نادار مگر اہلِ ایمان کا استہزا کرتے تھے۔ قرآن پاک میں موجود
ہے وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ (المطففین ۳۰)
جب اہلِ ایمان کے قریب سے گزرتے تو آنکھوں سے اشارے کرتے کہ
یہ دیکھو جنت کے والی اور حوروں کے خاوند جا رہے ہیں جن کے پاس نہ سینے
کو مکان اور نہ پہننے کو لباس ہے۔ دو وقت کی روٹی تک نصیب
نہیں مگر دنیا و آخرت میں کامیابی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

سابقہ اقوام کا انجام

بہرحال اللہ نے مشرکین کے باطل خیال کا حکیمانہ طریقے پر جواب
دیا ہے۔ کافر کہتے تھے کہ جب ہم دنیوی اعتبار سے اہلِ ایمان سے آسودہ حال
ہیں تو ہم اللہ کے بھی محبوب ہیں۔ تو اللہ نے فرمایا، ذرا غور تو کرو۔ وَكَمْ
اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ اور ہم نے اس سے پہلے بہت
سی قومیں ہلاک کیں۔ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا جو ساز و سامان
اور خوش منظری میں ان سے زیادہ اچھے تھے۔ مطلب یہ کہ تم اپنی خوشحالی،
مال و دولت اور جاہ و اقتدار پر اتراتے ہو۔ پہلی قوموں کے لوگ تم سے
زیادہ آسودہ حال تھے مگر ان کی نافرمانی کی وجہ سے اللہ نے انہیں تباہ و
برباد کر دیا۔ دوسری جگہ قرآن پاک میں ہے کہ یہ تو سابقہ اقوام کے عشرِ عشیر
بھی نہیں۔ دنیا میں قدیم مصریوں، آشوریوں اور کلدانی تہذیبوں، یونانیوں
اور ایرانیوں کو دنیا میں کتنا عروج حاصل ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ساز و سامان
اور لاؤ لشکر سمیت تباہ و برباد کر دیا۔ اگر فضیلت کا معیار یہی چیزیں ہوتیں
تو پرانی قومیں کیوں ہلاک ہوتیں؟ اس سے معلوم ہوا کہ یہ چیزیں اچھائی اور
خدا تعالیٰ کو پسندیدہ ہونے کا معیار نہیں ہیں۔ اللہ نے فرمایا فَجَعَلْنٰهُمْ
اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (سبا۔ ۱۹) ہم نے ان

کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اب وہ افسانوں کا حصہ بن چکے ہیں، اور تاریخ میں اُن کے حالات پڑھے جاتے ہیں۔ دنیا میں اُن کا وجود ختم ہو چکا ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں اچھائی کا معیار ایمان اور نیکی ہے خدا کے پسندیدہ لوگ وہی لوگ ہیں جو اس معیار پر پورا اترتے ہیں۔

گمراہی میں اضافہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے کافروں کے لیے پہلا جواب تو الزامی تھا۔ اور اب دوسرا جواب تحقیقی آرہا ہے۔ فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ ان لوگوں سے کہہ دیں مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ جو شخص گمراہی میں بھٹک رہا ہے فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا چاہیے کہ دراز کرے اُسے خدائے رحمان دراز کرنا۔ اس حصہ آیت میں اگرچہ امر کا صیغہ استعمال ہوا ہے مگر مراد اس سے خبر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص گمراہی میں پھنسا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس کو گمراہی میں دراز کرے گا اور اُسے مہلت دے گا۔ اُس کا قانون ہے کہ وہ دُنیا میں نافرنوں کو ترقی اور عروج دینے کو مہلت دیتا ہے، برائی کرنے والوں کو برائی میں بڑھاتا ہے اور انہیں سنگین سے سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے کا موقع دیتا ہے اور پھر ایسے جرائم کی سزا بھی ویسی ہی سخت دیتا ہے بعض اوقات دنیا میں بھی سزا مل جاتی ہے تاہم خدا تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اگر دنیا میں نہ بھی ملے تو آخرت کی سزا تو لازماً ملے گی۔

عذاب یا قیامت

فرمایا اللہ تعالیٰ انہیں گمراہی میں مزید بڑھائے گا۔ حَتّٰى إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ حتیٰ کہ جب وہ دیکھیں گے اُس چیز کو جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اور وہ چیز کیا ہے؟ إِمَّا الْعَذَابَ یا تو وہ عذاب ہوگا یعنی دنیا میں ہی محاسبے کا وقت آجائے گا۔ یہ ظاہری ساز و سامان نابود ہو جائے گا، اور ساری ترقی اور عروج زوال میں بدل جائے گا۔ صحت کی بجائے بیماری آجائے گی، اقتدار کی بجائے ماتحتی اور آزادی کی بجائے

تباہیاں بھیج دیے جائیں گے۔ یہ دنیا کی سزا کا نمونہ ہے جو انفرادی طور پر بھی آتا ہے اور پوری قوم بھی اس کا شکار ہو جاتی ہے۔

اگر اس دنیا میں سزا سے بچ بھی گئے تو پھر وَإِنَّ السَّاعَةَ قیامت تو ضرور آنے والی ہے۔ اس کے محاسبے سے تو کسی طرح نہیں بچ سکتے وہاں تو یقیناً سزا میں مبتلا ہوں گے۔ اس دنیا میں کیا ہوا۔ استہزا، تکبر، توحید کی مخالفت، شرک اور کفر کی حمایت قیامت کو ضرور رنگ لائے گی اور اس کے نتیجے میں ضرور عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ فرمایا فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا پس وہاں پر یہ لوگ جان لیں گے کہ مکان کے اعتبار سے کون زیادہ برا ہے۔ وہاں پتہ چلے گا کہ مکانیت اور ساز و سامان کے لحاظ سے ایمان والے بڑے ہیں یا کافر زیادہ بڑے ہیں۔ اور وہاں یہ بھی پتہ چل جائے گا وَأَضْعَفُ جُندًا اور جتھے کے لحاظ سے کون کمزور ہے۔ اس دنیا میں تو غریبوں کا مذاق کرتے تھے کہ ان کے پاس نہ کوئی نوکر چاکر ہے، نہ باڈی گارڈ اور نہ کوئی فوج۔ مگر قیامت کے دن وہ جان لیں گے کہ آج کس کا لشکر کمزور ہے اور کس کا طاقتور۔ اس دن اہل ایمان یقیناً طاقتور ہوں گے اور کفار و مشرکین ذلیل و خوار ہو کر رہ جائیں گے۔ ان کی مدد کرنے والا کوئی نہیں ہوگا

ہدایت میں اضافہ

فرمایا اس کے برخلاف وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى اللہ تعالیٰ ہدایت یافتہ لوگوں کے لیے ہدایت کو زیادہ کرتا ہے اور ان کی کامیابی کے لیے ہدایت ہی واحد ذریعہ ہے۔ اگر انسان راہ راست پر گامزن ہو جائے گا۔ ہدایت چونکہ ترقی کی بنیاد ہے، اس لیے اہل ایمان کی ترقی ہمیشہ جاری و ساری رہتی ہے۔ اس کے برخلاف کفر کرنے والے تنزل کی طرف جاتے ہیں، وہ آج نہیں تو کل ضرور تباہی کے گڑھے میں گریں گے

اہل ایمان کی ترقی اس دنیا کے بعد عالم برزخ اور حشر تک مسلسل بڑھتی رہیگی اور وہ کامیابی کی منازل طے کرتے رہیں گے مولانا رومی نے کہا ہے۔

اے برادر بے نہایت درگہیست
ہر کہ بروے می رسی بروے مایست

یہ بے نہایت بارگاہ ہے۔ جہاں بھی پہنچو وہاں رکو نہیں بلکہ ہمیشہ آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ جس طرح خدا تعالیٰ کی صفات غیر متناہی ہیں۔ اسی طرح اس کے انعامات بھی غیر محدود ہیں۔ اہل ایمان کے انعام و اکرام میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔ اللہ نے سورۃ العنکبوت میں فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (آیت - ۶۹) جو شخص ہماری طرف آنا چاہتا ہے ہم اس کے لیے ہدایت کے راستے واضح کر دیتے ہیں۔ وہ ان راستوں پر چل کر ترقی کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہدایت یافتہ لوگوں کے لیے ہدایت میں اضافہ کرتا ہے۔

باقی رہنے والی نیکیاں

فرمایا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ اور باقی رہنے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک بہتر ہیں۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ باقی رہنے والی نیکیوں میں ایمان، اعمال صالحہ، عبادات اربعہ، تسبیح، ذکر، جہاد وغیرہ شامل ہیں۔ حضرت ابو الدرداءؓ اور ابو ذر غفاریؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا، اے ابو الدرداءؓ! جس طرح ہوا خشک پتوں کو گرا دیتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ انسان کی خطاؤں کو گرا دیتی ہیں۔ لہٰذا جب تک تمہیں موت نہ آجائے ان اوراد کو ترک نہ کرنا۔ ابو الدرداءؓ فرماتے تھے کہ میں حضور علیہ السلام کی اس نصیحت پر خود بھی عمل کروں گا اور دوسرے لوگوں کو بھی ان کی افادیت سے آگاہ

کروں گا۔ الغرض! نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، تلاوت، ذکر، درود شریف
سب باقیات الصالحات ہیں جن کو اختیار کرنا کامیابی کی ضمانت ہے۔
سورۃ الکہف میں بھی باقیات کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ "اَلْمَالُ
وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ
خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ" (آیت - ۴۶) مال اور اولاد تو دنیا کی زندگی کی
رونق ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے ہاں بہتر ہیں۔ اس
مقام پر باقیات الصالحات سے مراد انسان کی بیٹیاں ہیں جنہیں وہ ایمان
کے تقاضوں کے مطابق پالتا ہے اور جب جوان ہو جاتی ہیں تو اچھی جگہ ان
کا نکاح کر دیتا ہے۔ عرب کے اکثر لوگ بچیوں کو جیتے دبا جاتے تھے۔ آج
بعض لوگ بیٹی کی پیدائش پر یاس و حسرت کا نمونہ بن جاتے ہیں اور انہیں
اپنی معیشت پر بوجھ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ باقیات الصالحات ہیں۔ ان
کی اچھی تربیت کرو، تعلیم دلواؤ، ان سے پیار کرو کہ یہ تمہاری باقی رہنے والی
نیکیاں ہیں۔ فرمایا باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں تیرے پروردگار کے پاس
ثواب کے اعتبار سے "وَخَيْرٌ مَّرَدًّا" اور انجام کے اعتبار
سے مرد کا معنی لوٹ کر جانا ہے۔ اور مراد انجام ہے کہ انجام کے لحاظ
سے باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں۔ ان کا اجر عظیم حاصل ہوگا۔ اس کے برخلاف
کافروں اور مشرکوں کے لیے وہاں کچھ نہیں ہوگا۔ وہ اس دنیا میں رہ کر دنیا
کے ساز و سامان ہی کے دلدادہ تھے جو انہیں یہیں حاصل ہو گیا۔ اب
آخرت میں ان کے لیے کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

أَفَرَءَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتَيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا ﴿٧٧﴾ أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا ﴿٧٨﴾ كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿٧٩﴾ وَنَرِثُهُ مَا يَقُولُ وَيَأْتِينَا فَرْدًا ﴿٨٠﴾ وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لِيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾ كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾

ترجمہ :- کیا دیکھا آپ نے اُس شخص کو جس نے کفر کیا ہماری آیتوں کے ساتھ ، اور اُس نے کہا کہ البتہ دیا جاؤں گا میں مال اور اولاد ﴿٧٧﴾ کیا اُس نے جھانک کر دیکھ لیا ہے غیب کو یا اُس نے پکڑا ہے خدائے رحمان کے پاس کوئی عہد ﴿٧٨﴾ خبردار ! ہم ضرور لکھیں گے وہ جو کہتا ہے اور ہم بڑھائیں گے اس کے لیے عذاب کو بڑھانا ﴿٧٩﴾ اور ہم وارث ہوں گے اُس کے جو وہ کہتا ہے ۔ اور وہ آئے گا ہمارے پاس اکیلا ﴿٨٠﴾ اور بنا لیا انہوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو معبود تاکہ ہو جائیں وہ ان کے لیے عزت کا ذریعہ ﴿٨١﴾ خبردار ! عنقریب وہ انکار کریں گے اُن کی عبادت کا اور ہو جائیں گے اُن کے اوپر مخالف ﴿٨٢﴾

ربطِ آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کا رد فرمایا جو اہلِ ایمان کو طعن دیتے تھے اور ان کے ساتھ استہزاء کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ہمارے پاس زندگی کا سارا ساز و سامان ہے جب کہ مسلمانوں کے پاس کچھ نہیں۔ ہمارے گھر بہتر ہیں۔ اور ہماری مجلسیں اچھی ہیں۔ نوکر چاکر ہیں اور پشت پر دوست احباب ہیں۔ پھر وہ اہلِ ایمان سے کہتے کہ بتاؤ ہماری حالت اچھی ہے یا تمہاری۔ اللہ نے ایسے بیہودہ خیالات کا رد فرمایا اور اس کا الزامی اور حکیمانہ جواب بھی دیا۔ پھر اللہ نے ایمان والوں کے لیے ہدایت کے سامان کی زیادتی کا ذکر فرمایا۔ اور باقی رہنے والی نیکیوں کے اچھے بدلے کا تذکرہ فرمایا اب آج کی آیات میں کفار و مشرکین کے بیہودہ خیالات کا مزید رد فرمایا ہے۔

شانِ نزول

آج کی آیات کے شانِ نزول کے متعلق مفسرین کرام نے صحیحین کی حدیث کا حوالہ دیا ہے کہ حضور کے ایک صحابی خباب ابن ارتؓ غلامی سے آزاد ہوئے تھے۔ لوہار کا کام کرتے تھے اور تلواریں وغیرہ بناتے تھے۔ مالی حالت نہایت کمزور تھی۔ انہوں نے عاص ابن وائل کا کچھ کام کیا اور ان سے مزدوری لینے کے لیے گئے۔ یہ شخص قبیلہ سہم کا سردار تھا اور بڑا مغرور تھا۔ کہنے لگا کہ میں تمہاری مزدوری اس وقت دوں گا جب تم اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کر دو گے۔ یعنی تم دین اسلام سے مرتد ہو جاؤ۔ حضرت خبابؓ نے فرمایا کہ میں تو ایسے دین کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں اگرچہ تم مر کر دوبارہ زندہ ہو جاؤ۔ عاص نے کہا کہ تمہارا عقیدہ ہے کہ ہر شخص مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو گا اور پھر حساب کتاب کی منزل آئے گی۔ اچھا تو پھر جب میں قیامت دوبارہ زندہ ہوں گا تو تمہاری مزدوری اس وقت ادا کروں گا۔ اس طرح گویا اس نے عقیدہ بعث بعد الموت کے ساتھ استہزاء کیا۔ یہ آیات

اسی سلسلہ میں نازل ہوئیں۔

مال و اولاد پر فخر

ان آیات کا اطلاق صرف عاص بن وائل پر ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کا مصداق ہر وہ شخص ہے جو مال اور اولاد پر فخر کرتا ہے اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اللہ کے نبیوں کے مقابلے میں دولت مند لوگ ہمیشہ یہی کہتے ہیں "نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا" (سبا۔ ۲۵) ہمارے پاس مال اور اولاد زیادہ ہے۔ "وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ" (الشعراء ۱۳۸) بھلا ہمیں کون سزا دے سکتا ہے۔ چنانچہ عاص بن وائل نے یہی حضرت خبابؓ سے ازراہِ تمسخر کہا کہ اپنی مزدوری قیامت کے دن مجھ سے وصول کر لینا۔ اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا کیا آپ نے اس شخص کی طرف دیکھا جس نے ہماری آیتوں کا انکار کیا۔ وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا اور اس نے یوں کہا کہ میرے پاس قیامت والے دن مال بھی ہو گا اور میرے ساتھ میری اولاد بھی ہوگی لہٰذا تم اپنا حساب وہاں چکا لینا۔ اللہ نے فرمایا اَطَّلَعَ الْغَيْبَ کیا اس شخص نے غیب کو جھانک کر دیکھ لیا ہے کہ دوبارہ اٹھائے جانے پر اس کے پاس اسی طرح مال و دولت ہو گا جس طرح اس دنیا میں ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ غیب تو خدائے واحد و قہار کے ساتھ خاص ہے، اس کے سوا کوئی غیب دان نہیں مگر اس شخص نے غیب کی بات کیسے معلوم کر لی۔ مطلب یہ کہ اس شخص کا دعوےٰ غلط ہے کیا پتہ قیامت والے دن اس کی کیا حالت ہو گی۔

فرمایا کیا اس کو غیب کا علم ہے اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا یا اس نے خدائے رحمان کے ساتھ کوئی عہد کر رکھا ہے کہ وہ آخرت

میں بھی اُسے مال اور اولاد عطا کرے گا۔ فرمایا کَلَّا خبردار! یہ سب دعوے غلط ہیں۔ نہ تو اُس کے پاس علم ہے اور نہ وہ غیب کی بات جانتا ہے۔ علم تو وحی کے ذریعے اللہ کے نبیوں کو حاصل ہوتا ہے مگر یہ تو اللہ تعالےٰ کے نافرمان لوگ ہیں، ان کو غیب کا علم کہاں سے حاصل ہو گیا۔ فرمایا یہ شخص اپنے دعوے میں تو جھوٹا ہے۔ البتہ سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ ہم ضرور لکھ لیں گے جو کچھ وہ کہتا ہے۔ ہمارے فرشتے اس کی ہر حرکت اور قول کو نوٹ کر رہے ہیں۔ اس کو ایک تو نافرمانی کی سزا ملیگی اور دوسرا وہ غلط دعوے کی وجہ سے بھی مستحق سزا ٹھہریگا کہ اس نے ایسی بیہودہ بات کیوں کی۔ اتنی اکڑ دکھائی اور ایک مزدور کا حق مارا، بلکہ اُسے کفر کرنے پر مجبور کیا۔ اس نے اللہ کی توحید اور رسول کی رسالت کا بھی انکار کر دیا۔ تو اللہ نے فرمایا کہ ہمارے فرشتے اس کے نامۂ اعمال میں یہ سب کچھ ضرور درج کرینگے وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا اور ہم دراز کریں گے اس کے لیے سزا کو دراز کرنا۔ ایسا شخص ہماری سزا سے بچ نہیں سکے گا۔

ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا وَنَرِثُهُ مَا يَقُولُ اور جو کچھ وہ کہتا ہے اس کے وارث ہم ہوں گے۔ مطلب یہ کہ یہ شخص تو عنقریب مر جائے گا، پھر اس کے سارے مال و دولت کے وارث ہم ہوں گے جس پر آج یہ فخر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون ہی یہ ہے "وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ" (آل عمران۔ ۱۸۰) زمین و آسمان کی ساری وراثت اللہ تعالیٰ ہی کے قبضے میں ہے۔ انسان اس دنیا سے خالی ہاتھ جاتے ہیں۔ ان کا سارا ساز و سامان یہیں رہ جاتا ہے۔ ایمان اور اعمال صالحہ کے علاوہ انسان کے ساتھ کچھ نہیں جاتا۔ باقی چیزیں تو وبال جان بن جائیں گی۔ فرمایا وَيَأْتِينَا فَرْدًا اور ہمارے پاس یہ اکیلا ہی آئے گا۔ اس شخص کا مال اور اس کی اولاد ساتھ نہیں جائے گی جو کسی مشکل میں

بھی اس کی مدد کر سکیں۔ عاص ابن وائل کے دو بیٹے تھے جنہوں نے اسلام
قبول کر لیا اور اس لحاظ سے بھی یہ اکیلا رہ گیا۔ عاص بن وائل کی طرح بعض
دوسرے متکبر لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں اللہ نے ان سب کا رد فرمایا ہے

جبری سفارش

اگلی آیات میں پھر توحید کا بیان ہے اللہ نے شرک کا رد فرمایا ہے
اور ساتھ قیامت کا ذکر بھی کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَاتَّخَذُوْا مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً انہوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو معبود بنا لیا ہے
دون کا معنی سوا بھی ہوتا ہے اور نیچے بھی۔ گویا انہوں نے اللہ کے سوا
غیروں کو اپنا کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا بنا لیا ہے کہتے ہیں کہ بڑا
خدا تعالیٰ تو اپنی جگہ موجود ہے اور ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں، مگر اس کے ماتحت
کچھ چھوٹے چھوٹے معبود بھی ہیں جو سفارش کر کے اللہ تعالیٰ سے کام کروا
دیتے ہیں۔ کہتے تھے ہم خداوند تعالیٰ سے اپنا تعلق براہ راست نہیں جوڑ
سکتے لہٰذا درمیان میں یہ معبود ہمارا وسیلہ ہیں جو ہماری بات کو آگے پہنچاتے
ہیں۔ یہ جبری سفارش کا تعلق ہے جو بدترین قسم کا شرک ہے۔ وہ سمجھتے ہیں
کہ اللہ تعالیٰ کا نظام بھی دنیا کے بادشاہوں جیسا ہے اگر بادشاہ کسی سے
ناراض ہو جائے تو اسکے راضی کرنے کے لیے یا کسی مطلب براری کے لیے
کسی وزیر یا بادشاہ کے مقرب کی سفارش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح
خدا تعالیٰ کے سامنے بھی سفارشی کام آتے ہیں۔ خدا تعالیٰ راضی ہو یا ناراض
یہ اس کے سفارشی ضرور ہی اُسے منوا لیتے ہیں گویا اللہ تعالیٰ سفارش قبول
کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مگر نادان یہ نہیں سمجھتے کہ دنیا کے بادشاہ تو مجبور
ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنے امیروں، وزیروں یا مصاحبوں کی طرف سے بغاوت
کا خطرہ ہوتا ہے یا وہ کسی سازش کا شکار ہو جانے سے ڈرتے ہیں، اور
سفارش قبول کرنے پر مجبور ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ تو قادر مطلق اور ہر چیز کا
متصرف ہے۔ اُسے کسی کام کے لیے کسی دوسرے کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی

اُسے اپنی مخلوق کی طرف سے کسی بغاوت کا خطرہ نہیں، علاوہ کسی کی سفارش
قبول کرنے پر کیسے مجبور ہوگا۔ یہ تو مشرکین کی خام خیالی ہے۔ وہ اپنے شرکاء کے
متعلق کہتے تھے "هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ" (یونس-۱۸) یہ اللہ
کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا کہ تم اُن کی نذر و نیاز
کیوں دیتے ہو تو یہی جواب دیتے "مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا
اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى" (الزمر-۳) ہم تو اِن کی عبادت محض اس لیے
کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کا قرب دلا دیں گے۔ اس قسم کا عقیدہ یہود و
نصاریٰ میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہود کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہوں گے اور کسی ختنہ شدہ یہودی کو دوزخ
میں نہیں گرنے دیں گے بلکہ جنت میں پہنچا کر چھوڑیں گے۔ اسی طرح
عیسائی بھی یہی کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کو مان لو۔ اُن کے کفارہ
بن جانے کے عقیدہ کو تسلیم کر لو تو پھر تم جنت میں ضرور پہنچ جاؤ گے خواہ
کچھ بھی کرتے پھرو۔ اللہ تعالیٰ نے اس جبری سفارش کا رد فرمایا ہے
"مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ" (البقرہ-۲۵۵) کون
ہے جو اللہ تعالیٰ کے سامنے اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔
پوری کائنات میں اللہ کی مخلوق میں سے مقرب ترین ہستی حضور خاتم النبیین
صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، مگر آپ بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی
کی سفارش نہیں کر سکیں گے۔ روایات میں آتا ہے کہ قیامت والے دن
حضور علیہ السلام مقامِ محمود پر خدا کے سامنے دنیوی مدت کے اعتبار سے
دس سال تک سجدے میں پڑے رہیں گے، خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا کریں گے
تو اس کے بعد جا کر آپ کو سفارش کرنے کی اجازت ملے گی۔ مطلب یہ
کہ اُس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش بھی نہیں کر سکتا چہ جائیکہ جبری
سفارش کا عقیدہ تسلیم کر لیا جائے وہ قادرِ مطلق اور علیم کل ہے۔ مزید

چاہے سو کرے لَا رَآدَّ لِحُکْمِہٖ اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ سفارش بھی اسی کے حق میں قبول ہوگی جس کا عقیدہ پاک ہوگا۔ مشرک اور منافق کے حق میں سفارش نہیں ہوگی۔ اس معاملے میں اللہ کے نبی، فرشتے، اولیاء اور شہداء سب بے بس ہوں گے۔ سفارش اس کے حق میں ہوگی جو ایماندار ہوگا مگر اپنے گناہوں کی وجہ سے سزا کا مستحق ہوگا۔

شرک کا مزعومہ فائدہ

فرمایا ان لوگوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو معبود بنا لیا ہے جس سے ان کا مقصود یہ ہے لِیَکُوْنُوْا لَھُمْ عِزًّا تاکہ یہ شرکا ان کے لیے عزت کا باعث بن جائیں۔ مطلب یہ کہ انہیں ہر کام میں کامیابی حاصل ہو اور ان کی مرادیں پوری ہوتی رہیں۔ چنانچہ مشرکین نے مختلف امور کے لیے مختلف معبود بنا رکھے تھے۔ کہتے تھے فلاں بت کی نیاز دی جائے تو مقدمے میں بری ہو جاتے ہیں۔ فلاں معبود بیماری میں شفا دیتا ہے اور فلاں اولاد دلانے میں پیش پیش ہے۔ چنانچہ یہ لوگ ان معبودوں کی تعظیم کرتے، ان کے لیے نذر مانتے اور چڑھاوے چڑھاتے۔ کوئی اقتدار کی خاطر کسی معبود کے آگے جھک جاتا، کوئی محبت کا دیوتا سمجھ کر اس کی خدمت کرتا اور کوئی دشمن کو نقصان پہنچانے کے لیے نذر مانتا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کے پانچ مشہور بت ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر تھے ان کو مشرکوں نے خود ہی محکمے تفویض کر رکھے تھے کہ یہ اولاد دیتا ہے یہ جنگ میں کامیابی دلاتا ہے اور یہ فلاں حاجت پوری کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

قبر پرستوں کا بھی یہی معمول ہے۔ قبروں پہ سجدہ کرتے ہیں ان کی تعظیم کرتے اور ان کی نذر و نیاز دیتے ہیں۔ اب تو قبر پرستی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کی قبروں پہ بھی پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ حکومتوں کے درمیان یہ رواج بن چکا ہے کہ باہر سے کوئی بڑا آدمی آتا ہے تو وہ مسٹر جناح اور علامہ اقبال کی قبر پہ پھول چڑھاتا ہے

اور ہمارے اکابر بیرون ملک جاتے ہیں تو غیروں کے مجسموں پر پھول چڑھاتے ہیں۔ ہمارے صدر صاحب، آج کل رنگون گئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بدھ کے مجسمے پر پھولوں کی چادر چڑھائی۔ یہ اسلام کے داعی ہیں۔ اگر ایسا شرکیہ فعل نہ انجام دیں تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ ہر امیر، وزیر حضرت علی ہجویری کی قبر پر چادر چڑھانا ضروری سمجھتا ہے کہ مشرک لوگ خوش ہو جائیں کہ وزیر بھی ہمارا ہم مسلک ہے۔ غیر آدمی کوئی ایسا کام کرے تو شور مچ جاتا ہے مگر صدر صاحب کو کوئی نہیں پوچھتا کہ کیا کر رہے ہو۔ کیا یہی اسلام ہے۔ کیا یہ غیر اللہ کی تعظیم نہیں ہے؟ کیا اس فعل کے بغیر غیر ممالک سے دوستی نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ ایسا شرکیہ رواج قائم ہو گیا ہے جس سے بچنا محال ہو رہا ہے بہر حال اللہ نے فرمایا کہ یہ دوسروں کو اس لیے معبود بناتے ہیں تاکہ ان کی عزت کا سامان ہو اور ان کی مرادیں پوری ہوتی رہیں، حالانکہ ان کے پاس مراد پوری کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

معبودانِ باطلہ انکار کر دیں گے

فرمایا آج تو یہ لوگ دوسروں کو معبود بنا رہے ہیں مگر قیامت کے روز کیا ہوگا؟ كَلَّا خبردار! سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ یہ معبود مشرکین کی طرف سے عبادت کا انکار کر دیں گے۔ اللہ کے نیک بندے عرض کریں گے، مولا کریم! ہم نے تو انہیں نہیں کہا تھا کہ ہماری عبادت کریں۔ انہوں نے ہماری تعلیم کو پس پشت ڈال دیا۔ اور ہماری قبروں کو پختہ بنایا۔ ان پر چادریں چڑھائیں اور ان پر جانور ذبح کیے۔ اسی طرح فرشتے بھی اپنی عبادت سے انکار کر دیں گے اور کہیں گے کہ پروردگار! ہم تو تیرے سوا کسی کو کارساز اور مشکل کشا نہیں سمجھتے۔ ہم نے تو انہیں ہرگز نہیں کہا تھا کہ ہمیں حاجت روا سمجھ کر ہماری پرستش کرو، یہ سب ان کے اپنے ذہن کی خلفشار ہے۔ بلکہ وہ مٹی اور پتھر کے بت بھی انکار کر دیں گے جن کی یہ مشرکین پوجا کرتے رہے ہیں۔ مفسرین کرام

فرماتے ہیں کہ یہ مجسمے بھی اسی طرح کلام کریں گے جس طرح انسان کے ہاتھ
پاؤں قیامت کے روز گواہی دیں گے۔ یہ بت کہیں گے کہ خداوند کریم!
ہم تو بے جان اور بے اختیار تھے۔ ہم نے تو نہیں کہا کہ ہماری پوجا کرو
انہوں نے خود ہی ہماری نذر و نیاز دینا شروع کر دی اور مشکل میں ہمیں
پکارنا شروع کر دیا۔ یہ خود ہی اس قبیح حرکت کے ذمہ دار ہیں۔ فرمایا!
وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا قیامت کے دن معبودان
ان مشرکین کے مخالف ہو جائیں گے، ان کے خلاف گواہی دیں گے
اور یہ لعنت کے مستحق ٹھہریں گے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا ﴿٨٣﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿٨٤﴾ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾ وَنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿٨٦﴾ لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِندَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا ﴿٨٧﴾

وقف لازم — وقف لازم

ترجمہ:- کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بیشک ہم نے مسلط کیا ہے شیاطین کو کفر کرنے والوں پر، وہ ابھارتے ہیں ان کو ابھارنا ﴿٨٣﴾ پس آپ جلدی نہ کریں ان پر، بیشک ہم گنتے ہیں ان کے لیے گننا ﴿٨٤﴾ جس دن ہم اٹھائیں گے متقیوں کو رحمان کی طرف وفد کی شکل میں ﴿٨٥﴾ اور چلائیں گے ہم مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسے ﴿٨٦﴾ نہیں مالک ہوں گے شفاعت کے مگر وہ جس نے پکڑا ہے خدائے رحمان کے پاس عہد ﴿٨٧﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ نے کفر اور شرک کرنے والوں کا عقیدہ اور ان کی بیہودہ گفتگو کا رد فرمایا۔ اس کے علاوہ اللہ نے ان کا انجام بھی بیان فرمایا۔ اللہ نے واضح کیا کہ مشرکین اپنے جن معبودان کو باعث عزت سمجھتے تھے وہ ان کے مخالف بن جائیں گے اور ان کی عبادت سے انکار کر دیں گے۔ نیز مشرکین کو ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اب اللہ نے مشرکین اور کفار کی گمراہی کے اسباب کا تذکرہ کیا ہے اور بتلا دیا ہے کہ جملہ اسبابِ ضلالت میں سے سب سے بڑا سبب انسانوں پر شیطان کا تسلط ہے۔

شیاطین کا تسلط

ارشاد ہوتا ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ اے پیغمبر! کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ بیشک ہم نے کافروں پر شیطانوں کو مسلط کیا ہے۔ اَرْسَلْنَا کا عام فہم معنی تو بھیجنا ہوتا ہے تاہم اس مقام پر مسلط کرنا مراد ہے۔ اور پھر شیطانوں کا کافروں پر یہ اثر ہوتا ہے تَؤُزُّهُمْ اَزًّا کہ وہ ان کو اچھالتے رہتے ہیں یعنی کافروں کو کفر اور شرک پر اکساتے رہتے ہیں۔ وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں اور لوگ کفر، شرک، بدعات اور معاصی کو اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسے افعال کا ذکر گذشتہ آیات میں ہو چکا ہے کہ لوگ ضد، عناد اور تعصب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اہلِ ایمان کو حقیر سمجھتے ہیں کمزوروں کی تذلیل کرتے ہیں۔ قیامت کا انکار کرتے ہیں اور شرکیہ رسومات کو بڑے زور شور سے ادا کرتے ہیں اور اسے کارِ ثواب سمجھتے ہیں، یہ سب کچھ شیطان کے اغوا کی وجہ سے ہوتا ہے اللہ کا ارشاد ہے "وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ" (الزخرف - ۳۶) جو شخص خدائے رحمان کی یاد سے روگردانی کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ شیطان مقرر کر دیتا ہے جو اس کا ساتھی بن کر گمراہ کرتا رہتا ہے۔ لوگ زندگی کے آخری لمحات تک یہی سمجھتے ہیں کہ وہ بڑا اچھا اور کارِ ثواب کر رہے ہیں حالانکہ وہ غلط ہوتا ہے اور پھر مرنے کے بعد اس کا بڑا افسوس ہوگا۔ اللہ کی یاد سے غفلت کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

ذکر الرحمان سے خدا تعالیٰ کی یاد اور اس کا کلام یعنی قرآن پاک دونوں مراد ہیں۔ قرآن سے اعراض بھی شیطان کے تسلط کا ذریعہ بنتا ہے جب

انسان اپنی فطرت کو ترک کر کے اللہ کی یاد اور اس کے کلام سے اعراض کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس پر شیطان کو مسلط کر دیتا ہے۔ گویا گمراہی کے اسباب میں سے شیطان کا اغوا سب سے بڑا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کے متعلق فرمایا ہے۔ "اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ" (البقرہ۔ ۱۶۸) یہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ خطرناک بھی ہے کیونکہ "اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ" (الاعراف۔ ۲۷) وہ اور اس کا سارا قبیلہ تمہیں ایسی جگہ سے دیکھ رہا ہے، جہاں سے تم اُسے نہیں دیکھ سکتے"۔ وہ تمہاری نگاہوں سے چھپ کر تم پر حملہ آور ہو رہا ہے اور تمہیں کچھ خبر نہیں۔ آدم علیہ السلام کو روئے زمین پر اتارنے کے بعد اللہ نے فرمایا تھا کہ آدم "اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ" (طٰہٰ۔ ۱۱۷) شیطان تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے اس سے خبردار رہنا، کہیں تمہیں جنت سے نہ نکلوا دے۔ امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ "رُبَّ اَقَالِيْمَ اِسْتَوْلٰى عَلَيْهِ الشَّيْطَانُ" یعنی ملک ایسے ہوتے ہیں جن پر شیطان کا غلبہ ہوتا ہے۔ ساری کی ساری قوم شیطان کے اغوا اور تسویل میں مبتلا ہوتی ہے۔ اور سب اُس کے کہنے میں آکر کفر، شرک، بدعات اور معاصی میں غرق ہوتے ہیں۔ شیطان کے تسلط سے یہی مراد ہے، اسکے ذریعے وہ لوگوں کو غلط کاموں پر ابھارتا رہتا ہے۔

دیگر اسباب ضلالت

اسباب ضلالت میں سے انسان کا نفس امارہ بھی ایک بڑا سبب ہے جو انسان کو برائیوں کی طرف راغب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ قول بھی نقل کیا ہے "وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ" (یوسف۔ ۵۳) میں اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتا کیونکہ نفس برائی کی طرف آمادہ کرتا ہے۔ نفس آزادی چاہتا ہے مگر شریعت نے اس پر کنٹرول کرنے کے لیے مختلف احکام عائد

لیے بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ نفسِ امّارہ کی بجائے انسان کی
عقل و خرد اور وحیِ الٰہی غالب ہو تاکہ وہ نیکی کی طرف مائل ہو سکے۔ اور
برائی سے بچ سکے۔ بزرگانِ دین اسی نفس کے متعلق فرماتے ہیں۔ اِنَّ
عَدُوَّكَ الَّذِيْ بَيْنَ جَنْبَيْكَ تمہارا ایک بڑا دشمن وہ ہے
جو تمہارے پہلو میں بیٹھا ہے۔ تو گویا نفسِ امارہ بھی انسان کے لیے گمراہی
کے اسباب میں سے ہے۔ اس کے علاوہ زیب و زینت کے سامان
اور لہو و لعب کے ذرائع بھی اسبابِ ضلالت میں سے ہیں۔ عام طور پر لوگوں
کا رجحان نیکی کی طرف بہت کم ہوتا ہے۔ مگر کھیل تماشے اور برائیوں کی
طرف دوڑ کر جاتے ہیں۔ یہ بدعات بھی اسی قبیل سے ہیں جو انسان کے
نفس کو خوش کرتی ہیں مگر حقیقت میں وہ گمراہی کی طرف جا رہا ہوتا ہے
مال و دولت بھی انسان کی گمراہی کا سبب بنتا ہے۔ مالدار آدمی مغرور
ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ سے انصاف کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔
حکومت اور اقتدار بھی آدمی کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اقتدار کے نشے میں چور
آدمی حق و ناحق کی پہچان سے عاری ہو جاتا ہے اور پھر من مانی کرنے
پر اتر آتا ہے۔ پھر ظلم و جبر کا دور دورہ ہوتا ہے اور انسان خواہشات
کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ آج دنیا میں دیکھ لیں، بڑی بڑی سلطنتیں اپنی طاقت
کی وجہ سے شدید ترین گمراہیوں میں مبتلا ہیں۔ ہر حکومت کے ڈکٹیٹر اور عہدیدار
اقتدار کی وجہ سے ہی بے راہروی کا شکار ہو کر گمراہی کی اتھاہ گہرائیوں میں جا
گرتے ہیں۔

بہرحال اسبابِ ضلالت میں سے شیطان کا اغوا سب سے بڑا سبب
ہے جس کا ذکر اللہ نے اس آیت میں کر کے انسان کو اس سے بچنے کی
تلقین کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اغوا سے بچنے والے اللہ کے خاص
بندے ہی ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس کے ذکر

سے اعتراض نہیں کرتے ۔ ایسے لوگوں پر شیطان کا تسلط قائم نہیں ہوتا۔
ورنہ عام لوگوں کا معاملہ یہ ہے "زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ" (الانعام - ۴۳) شیطان ان کے بدترین اعمال کو بھی مزین کر کے دکھاتا ہے ۔ ان کے فوائد بتلاتا ہے اور کہتا ہے کہ اسی میں تمہاری عزت ، وقار اور نیک نامی ہے ۔ انسان اس کے کہنے میں آجاتے ہیں اور پھر کھیل تماشے ، کفر ، شرک اور بدعات کی طرف مائل ہو کر شیطان کے شکنجے میں جکڑے جاتے ہیں ۔

سزا میں جلدی کی خواہش

بعض اوقات حضور علیہ السلام کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ نافرمانوں کو جلدی سزا ملنی چاہیئے ، کیونکہ جب تک ان کو موقع ملتا رہے گا وہ دوسروں کو بھی گمراہ کرتے رہیں گے ۔ ایسے لوگوں کے لیے سزا کی خواہش کوئی بری بات نہیں بلکہ انصاف کے عین مطابق ہے ۔ مگر اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ آپ ان پر جلدی نہ کریں بلکہ برداشت کریں کیونکہ ہم نے بھی ان کے خلاف پروگرام بنا رکھا ہے ۔ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا بیشک ہم شمار کر رہے ہیں ان کے لیے شمار کرنا ۔ مطلب یہ کہ ایسے نافرمانوں کی زندگی کے دن ہم گن رہے ہیں حتیٰ کہ ان کے ایک ایک سانس کا حساب ہمارے پاس موجود ہے ۔ اس وقت ہم انہیں قانون امہال کے تحت مہلت دے رہے ہیں ۔ انکی ایک ایک حرکت کو جانتے ہیں ۔ جب ہماری مہلت پوری ہو جائے گی تو پھر ہم ان کی رسی کو کھینچ لیں گے ۔ لہٰذا آپ جلدی نہ کریں ، اور صبر سے کام لیں ۔

متقین کی عزت افزائی

اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے متقین اور مجرمین کے انجام کا ذکر کیا ہے کہ مرنے کے بعد جب دوبارہ اٹھیں گے تو ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائیگا ۔
پہلے متقیوں کا ذکر ہے يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ

وَفْدًا: جس دن ہم متقیوں کو رحمان کی طرف اکٹھا کریں گے۔ وفد کی صورت میں۔ وفد (REPRESENTATIVE) پریزینٹیٹو (کسی قوم، برادری یا حکومت کی طرف سے ہو، قابلِ احترام سمجھا جاتا ہے۔ وفد کے ارکان کسی خاص مقصد کے لیے آتے ہیں لہٰذا ان کا خیر مقدم کرنے والے ان کی عزت افزائی کرتے ہیں۔ ان کو اچھی جگہ اتارتے ہیں اور ان کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔ اسی طرح متقین بھی اللہ کے پاس وفد کی حیثیت سے جائیں گے اور عزت و اکرام پائیں گے صحیحین کی روایت میں آتا ہے کہ قیامت کے دن تین گروہ اللہ تعالیٰ بارگاہ میں پیش ہوں گے۔ پہلا گروہ راغبین اور راہبین کا ہوگا۔ یہ انبیاء اور مقربین کا گروہ ہوگا جو اللہ کی نعمتوں کی طرف رغبت رکھنے والے اور اس کے عذاب سے ڈرنے والے ہوں گے۔ دوسرا گروہ سواروں کا ہوگا۔ ایک ایک اونٹ پر ایک ایک، دو دو، تین تین آدمی سوار ہوں گے حتیٰ کہ دس تک کا ذکر بھی آتا ہے۔ پھر تیسرا گروہ ذلیل لوگوں کا ہوگا جو پیدل چل کر آئیں گے، یہ جہنم کی آگ کے سزاوار ہوں گے۔

خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی بیرونی وفود کی بڑی تکریم کیا کرتے تھے آپ نے اپنے آخری وقت میں یہ نصیحت فرمائی کہ باہر سے آنے والے وفود کے ساتھ اسی طرح حسنِ سلوک کرنا جس طرح میں کرتا ہوں۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ سنہ ۹ ہجری میں حضور علیہ السلام کی خدمت میں کم و بیش ۷۰ وفود آئے ان میں سے اکثر و بیشتر نے اسلام قبول کیا، بعض نے ہدایات حاصل کیں اور بعض محض زیارت کے لیے آئے۔ قطع نظر اس کے کہ کسی کا عقیدہ کیا ہے حضور علیہ السلام عرب کے مختلف گوشوں سے آنے والے وفود کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے اور حتی المقدور ان کی خدمت، تواضع کرتے۔ قبیلہ ثقیف کے مشرکین کا ایک وفد حاضر ہوا تو آپ نے حکم دیا کہ ان کا خیمہ مسجد کے صحن میں لگا دیا جائے۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضور یہ تو ناپاک لوگ ہیں، ان کا مسجد میں داخلہ کیسے ہوگا؟ آپ نے فرمایا

آعْنَاقِهِمْ عَلَىٰ اَنْفُسِهِمْ ان کی نجاست ان کے نفسوں میں بھری ہوئی ہے، یہ زمین پر تو نہیں گری کہ مسجد ناپاک ہوتی ہو۔ ان کو مسجد میں ٹھہرانے میں یہ مصلحت تھی کہ یہ لوگ یہاں رہ کر ہمارے حالات کو اچھی طرح جان لیں گے اور ان کو ہماری نماز کا طریقہ بھی معلوم ہو جائے گا اور پھر اس کے ظاہری فوائد سے بھی آگاہ ہوں گے، لہٰذا ان کو مسجد میں ٹھہرانا ہی بہتر ہے۔ آپ کے حسن سلوک کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ مسیلمہ کذاب کا وفد بھی آیا تو حضور نے اُن لوگوں سے کوئی بدسلوکی نہیں کی بلکہ اُن کے سوالات کے جوابات خندہ پیشانی سے دیئے۔ بہرحال فرمایا کہ متقین حشر کے میدان میں وفد کی شکل میں یعنی نہایت عزت و احترام کے ساتھ جائیں گے۔

شفاعت محروم مجرمین

اس کے برخلاف نافرمانوں کے متعلق فرمایا وَنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وِرْدًا اور ہم مجرم لوگوں کو جہنم کی طرف پیاسے جانوروں کی طرح چلائیں گے۔ جب جانور کئی دن سے پیاسے ہوں تو پھر انھیں ہانک کر جلدی جلدی پانی کے گھاٹ کی طرف لے جایا جاتا ہے مجرمین کو بھی اسی طرح ہانک کر میدان حشر میں لایا جائے گا۔ پھر حساب کتاب کی منزل آئیگی اور ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہی ہو گا۔ ایسے مجرموں کے متعلق فرمایا لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ یہ کسی قسم کی شفاعت کے مالک نہیں ہوں گے، کیونکہ کافر، مشرک اور منافق کی کوئی بھی سفارش کرنے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ میری شفاعت میری امت کے اُن لوگوں کے حصے میں آئیگی مَنْ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا جو اللہ کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتے یعنی جس کا ایمان صحیح اور عقیدہ پاک ہے۔ بدعقیدہ کو شفاعت حاصل نہیں ہوگی۔ اللہ نے شفاعت کا مرجع دو چیزوں کو قرار دیا ہے ایک یہ کہ اللہ کی مرضی کے بغیر کسی کی سفارش نہیں ہوگی۔ اور دوسری یہ کہ

سفارش انہی کے حق میں ہوگی جن کی بات اللہ کو پسند ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ
کو ایمان والی بات ہی پسند ہوگی، ایمان لاؤگے تو اللہ راضی ہوگا اور اگر نافرمانی کروگے تو
ناراض ہوگا۔ نہ تو کسی بدعقیدہ آدمی کی بات کو اللہ پسند کرے گا اور نہ اُن
کے حق میں سفارش قبول کرے گا۔ یہ بات اٹل ہے کہ اللہ کی مرضی اور
اُس کے اختیار سے ہی سفارش ہوگی۔ "قُل لِّلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا"
(الزمر ۴۴) شفاعت کا سارا اختیار اللہ کے پاس ہے۔ نبی، ملائکہ اور
اُس کے مقربین بھی اُس کی اجازت کے بغیر سفارش نہیں کریں گے۔ کیونکہ
اللہ کا واضح فرمان ہے "مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِندَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ"
کون ہے جو اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟ مگر یہود و نصاریٰ
اور دیگر پیر پرست جبری سفارش کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ رافضیوں کا عقیدہ ہے
کہ امام حسینؓ کا ماتم کر لینے سے ہی جنت کے حقدار ہو جائیں گے، باقی
کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ پیر پرست لوگ بیعت کر لینے اور عرس
میں شریک ہو جانے کو ہی ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔ مگر اس قسم کی جبری
سفارش کا اسلام میں کوئی مقام نہیں ہے۔

شفاعت کے حقدار

فرمایا مجرم تو شفاعت کے مستحق نہیں ہوں گے "إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ
عِندَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا" البتہ سفارش کا حقدار وہ ہوگا جس نے خدائے
رحمان کے پاس عہد قائم کر لیا۔ جو شخص توحید و رسالت کے عقیدے پر پختہ یقین
رکھے گا۔ خدا تعالیٰ اس کو ضرور جنت میں پہنچائے گا، یہی اس کا عہد ہے۔
اسی کے حق میں سفارش ہوگی۔ اور وہ نجات پائے گا۔ امام رازیؒ نے حضرت
عبداللہ بن مسعودؓ کے حوالے سے عہد نامے والی روایت نقل کی ہے۔ کہ
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایسا شخص ہے جو ہر
روز صبح شام خدا تعالیٰ کے ساتھ اس قسم کا عہد کرے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعْهَدُ اِلَیْكَ فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا اَنِّیْ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَحْدَكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُكَ وَرَسُوْلُكَ فَلَا تَكِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ فَاِنَّكَ اِنْ تَكِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَیْنٍ تُقَرِّبْنِیْ مِنَ الشَّرِّ وَتُبَاعِدْنِیْ مِنَ الْخَیْرِ وَاِنِّیْ لَا اَثِقُ اِلَّا بِرَحْمَتِكَ فَاجْعَلْ لِّیْ عِنْدَكَ عَهْدًا تُوَفِّیْنِیْهِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ

(قرطبی صفحہ ۱۵۴ ج ۱۱)

اے اللہ میں اس دنیا کی زندگی میں تجھ سے اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تیرا کوئی شریک نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ اللہ وسلم تیرے بندے اور تیرے رسول ہیں۔ پس تو مجھے میرے نفس کے سپرد نہ فرما کیونکہ اگر تو مجھے میرے نفس کے سپرد کر دے گا تو مجھے برائی سے قریب کر دے گا اور مجھے بھلائی سے دور کر دے گا۔ مجھے بس تیری رحمت پر ہی بھروسہ ہے پس میرے لیے اپنے ہاں (بخشش اور رحمت) کا عہد فرما اور اس کو قیامت کے دن پورا فرما۔ یقیناً تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

فرماتے ہیں کہ جب کوئی بندہ یہ عہد کرتا ہے تو اس کو مہر کر عرش کے نیچے رکھ دیا جاتا ہے۔ پھر قیامت کے دن اعلان ہوگا کہ جن کا عہد خدائے رحمان کے پاس موجود ہے، وہ سامنے آجائیں۔ ایسے ہی لوگوں کے حق میں سفارش مفید ہوگی اور مجرموں کے لیے کوئی سفارش نہیں ہوگی۔ ان کو پیاسے جانوروں کی طرح ہانک کر جہنم کی طرف لے جایا جائے گا اس کے برخلاف اہل ایمان کو عزت کے ساتھ وفد کی صورت میں خدا کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا اور آخر کار وہ اس کی رحمت کے مقام جنت میں پہنچ جائیں گے۔

قال الم ۱۶ — سورۃ مریم ۱۹

درس ہشتم ۱۸ — آیت ۸۸ تا ۹۵

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا ﴿٨٨﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ﴿٨٩﴾ تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾ وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَٰنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ﴿٩٢﴾ إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمَٰنِ عَبْدًا ﴿٩٣﴾ لَقَدْ أَحْصَاهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾ وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا ﴿٩٥﴾

ترجمہ:- اور کہا (کفار و مشرکین نے) کہ بنا لیا ہے خدائے رحمان نے بیٹا (۸۸) البتہ تحقیق لائے ہو تم ایک بڑی ناگوار بات (۸۹) قریب ہے کہ آسمان پھوٹ پڑیں اس سے اور زمین شق ہو جائے اور گر پڑیں پہاڑ ٹوٹ کر (۹۰) اس وجہ سے کہ پکارتے ہیں یہ لوگ رحمان کے لیے اولاد (۹۱) اور نہیں ہے لائق رحمان کے لیے کہ وہ بنائے اولاد (۹۲) جو کچھ بھی ہے آسمانوں اور زمین میں خدائے رحمان کے سامنے بندہ ہو کر آئے گا (۹۳) البتہ تحقیق ان کو گھیر رکھا ہے اور ان کو شمار کر رکھا ہے شمار کرنا (۹۴) اور ان میں سے ہر ایک آئے گا اس کے سامنے اکیلا (۹۵)

ربطِ آیات گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کا رد فرمایا اور پھر ان کا انجام بھی ذکر

کیا۔ اللہ نے قیامت کو پیش آنے والے حالات کا تذکرہ بھی فرمایا اور ساتھ ایمان والوں کا انجام بھی بیان فرمایا کہ وہ اللہ کے حضور میں وفد کی شکل میں باعزت طور پر پیش ہوں گے۔ برخلاف اس کے کافر اور مشرک مجرموں کو پیاسے جانوروں کی طرح ہانک کر لے جایا جائے گا اور اُن کی سخت تذلیل ہو گی۔

عقیدۂ ابنیت

آج کی آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے کفار و مشرکین کے عقیدہ ابنیت کی تردید فرمائی ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل کے آخر میں اور سورۃ کہف میں بھی یہی تذکرہ ہے۔ وہاں ارشاد ہوا ہے "لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِىٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا" (بنی اسرائیل۔ ۱۱۱) اللہ نے کسی کو اولاد نہیں بنایا، نہ حقیقی اور نہ مجازی اس کی نہ تو جنس سے کوئی اولاد ہے اور نہ اس نے کسی کو منہ بولا بیٹا بنایا ہے۔ حقیقی اولاد اس لیے نہیں کہ اُسے نسب باقی رکھنے کا شوق نہیں۔ اور مجازی اولاد اس لیے نہیں کہ اُس کو کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ وہ قادرِ مطلق اور تمام قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ وہ تمام نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے۔ لہٰذا اُسے کسی قسم کی اولاد کی بھی حاجت نہیں۔ یہ بات سورۃ کہف کی ابتدائی آیات میں بھی بیان ہوئی ہے۔ اللہ نے نزولِ قرآن کے مقاصد میں سے ایک یہ مقصد بھی بیان کیا ہے "وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا" (آیت۔ ۴) تاکہ یہ اُن لوگوں کو ڈرائے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے۔ پھر پیچھے اسی سورۃ میں بھی گزر چکا ہے "مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ" (آیت۔ ۳۶) خدا تعالیٰ کی ذات اس بات سے پاک ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ اس باطل عقیدے میں عیسائیوں کی اکثریت مبتلا ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کے

کا بیٹا بتلاتے ہیں۔ اسی طرح یہودیوں کا عزیری فرقہ حضرت عزیر علیہ السلام
کو خدا کا بیٹا کہتا ہے۔ یہ دونوں غلط ہیں۔ اللہ نے اس کی تردید فرمائی
ہے "ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ" (التوبۃ - ۳۰) یہ محض ان کے
مونہوں کی باتیں ہیں۔ ان میں حقیقت کچھ نہیں ہے۔ مشرکین عرب بھی
اس باطل عقیدہ میں ملوث تھے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں گزر چکا ہے کہ وہ
فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ یہ عقیدہ ہندوستان کے پرانے مشرکوں
میں بھی پایا جاتا تھا اور آج بھی ہے۔ دیوی دیوتا کا عقیدہ کم و بیش یہی ہے
کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ اللہ نے اس باطل عقیدے کا واضح طور پر رد
فرمایا ہے۔

حجاب سوءِ معرفت

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اکثر لوگ تین قسم کے حجابات
یعنی حجاب طبع، حجاب رسم اور حجاب سوءِ معرفت میں مبتلا رہتے ہیں۔
حجاب طبع یہ ہے کہ انسان مادیت میں ہی پھنس کر اپنے جسم کو ہی ملحوظ رکھنے
میں مصروف ہے۔ اس کے پیش نظر اور کچھ نہ ہو۔ حجاب رسم سے
مراد یہ ہے کہ انسان قوم، ملک، علاقہ، برادری وغیرہ کے رسم و رواج
کا بندہ ہو کر رہ جائے اور آخرت سے بالکل آنکھیں بند کر لے اس کی
فکر ہی نہ ہو۔ تیسرا حجاب سوءِ معرفت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ
انسان اللہ تعالیٰ کو پہچانتا ہے مگر غلط طریقے سے۔ اسے اللہ کی صحیح
معرفت نہیں ہے۔ مثلاً یہود و نصاریٰ، ہندو، سکھ وغیرہ سب اللہ تعالیٰ
کو کسی نہ کسی نام سے پہچانتے ہیں مگر ان کی پہچان صحیح نہیں ہے "وَمَا
قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ" (انعام - ۹۱) انہوں نے اللہ کو
اس طرح نہیں پہچانا جس طرح اس کو پہچاننے کا حق تھا۔ یہی حجاب
سوءِ معرفت ہے۔
یہ اسی حجاب کا نتیجہ ہے کہ انسان یا تو شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے

اور یا پھر عقیدہ تشبیہ میں پھنس جاتا ہے۔ شرک یہ ہے کہ اللہ کی کوئی خاص صفت
مخلوق میں تسلیم کی جائے۔ مثلاً خدا تعالیٰ علیم کل ہے۔ اگر یہ صفت کسی نبی،
ولی، فرشتے یا جن وغیرہ میں مانی جائے گی تو آدمی مشرک ہو جائے گا خدا
قادر مطلق ہے اگر یہی صفت مخلوق میں مان کر کوئی یہ کہے کہ فلاں دیوی
دیوتا، پیر یا بزرگ بھی مرادیں پوری کر سکتا ہے تو اس نے گویا خدا تعالیٰ
کی قدرت تامہ کی صفت مخلوق میں ثابت کی اور شرک میں مبتلا ہو گیا۔

حجاب سوءِ معرفت کی دوسری شاخ عقیدہ تشبیہ ہے۔ اس کا مطلب
یہ ہے کہ مخلوق کی کوئی صفت اللہ تعالیٰ میں ثابت کی جائے۔ مثلاً سلسلۂ نسب
کا قیام مخلوق کی صفت ہے۔ اگر یہی صفت اللہ میں مانی جائے کہ اُسے
بقائے نسب کے لیے اولاد کی ضرورت ہے تو یہ عقیدہ رکھنے والا آدمی مشرک
ہو جائے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت
معاذ بن جبلؓ کو یمن روانہ کرتے وقت اُن کے سپرد دو کام کیے۔ اُن کا
ایک فرض بطور حاکم تھا اور دوسرا بطور مبلغ دین۔ اسی تبلیغ کے متعلق
حضور علیہ السلام نے حضرت معاذؓ کو نصیحت فرمائی کہ یمن کے یہود و نصاریٰ
کو سب سے پہلے توحید و رسالت کی دعوت دینا۔ مسلم شریف کے الفاظ
ہیں فَإِذَا عَرَفُوا یعنی جب وہ اللہ تعالیٰ کو پہچان لیں تو پھر انہیں
بتلانا کہ اللہ نے ان پہ دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ سال بھر میں
ایک ماہ کے روزے ہیں۔ صاحب نصاب پر سال مکمل ہونے پر زکوٰۃ
واجب ہے اور زندگی بھر میں صاحب استطاعت پر ایک دفعہ بیت اللہ
کا حج فرض ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب بھی اللہ کو پہچانتے
ہیں مگر اُن کی پہچان درست نہیں ہے۔ انہوں نے خدا تعالیٰ کے لیے
اولاد تجویز کی تو کیا پہچانا؟ اللہ تعالیٰ تو ہر نقص، کمزوری، بیوی، اولاد اور
ایسی ہی دیگر چیزوں سے پاک ہے۔ اس قسم کے نجس عقیدہ رکھنے والے

کو نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔ کامیابی تو جب حاصل ہوگی جب انسان شرک اور تشبیہ سے پاک خالص توحید کا عقیدہ اختیار کرے گا۔

خدا اولاد سے پاک ہے

ارشاد ہوتا ہے وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ان مشرکوں نے کہا (ان میں یہود و نصاریٰ اور عرب کے مشرکین سب شامل ہیں) کہ خدائے رحمان نے اولاد بنالی ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کی نہ حقیقی اولاد ہو سکتی ہے اور نہ مجازی۔ حقیقی اس لیے نہیں کہ وہ ہم جنس ہوتی ہے۔ ہر بچہ اپنے والدین کا ہم جنس اور مرکب ہوتا ہے۔ اگر یہی تصور اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی کر لیا جائے تو پھر وہ بھی مخلوق کی طرح ہو کر بسیط نہیں رہے گا بلکہ حادث ہو جائے گا۔ اور ایسی ذات الٰہ ہونے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ لہذا خدا تعالیٰ کے لیے حقیقی اولاد کا عقیدہ رکھنا بالکل کافرانہ عقیدہ ہے۔

اسی طرح مجازی اولاد کا عقیدہ بھی باطل ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ اللہ نے مسیح علیہ السلام کو اپنا پیارا یعنی بیٹا بنا لیا ہے اور پھر اُس کو اختیار دے دیا ہے کہ جو چاہے کرے۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ اللہ کے نبی کو اللہ کا بندہ کہنے سے اُس کی توہین ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہ بھی بالکل غلط عقیدہ ہے۔ ہر نبی انسان ہوتا ہے جو کہ اللہ کی بہترین مخلوق ہے مگر اُس نے اپنی مخلوق میں کسی اعلیٰ و ادنیٰ کو کوئی اختیار نہیں دیا۔ وہ ہر کام اپنی مرضی اور ارادے سے کرتا ہے۔ سورۃ سجدہ میں موجود ہے يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ (آیت۔ ۵) آسمان کی بلندیوں سے لے کر انتہائی پستیوں تک ہر چیز کی تدبیر وہ خود کرتا ہے جو شخص تدبیر میں کسی مخلوق کو خدا کے ساتھ شریک کرتا ہے وہ مشرک یا کافر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے۔ وہ خالقیت، واجب الوجود ہونے، تدبیر اور عبادت میں یگانہ ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں خالق اور واجب الوجود ہونے کو تو مشرک بھی مانتے ہیں کہ یہ صفات صرف

اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ البتہ تدبیر اور عبادت میں یہ لوگ دوسروں کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اللہ نے ان کو بھی کچھ اختیارات دے رکھے ہیں جن کی بنا پر یہ لوگوں کی حاجتیں پوری کرتے ہیں۔ چنانچہ شرکاء کو خوش کرنے کے لیے ان کی تعظیم کی جاتی ہے اُن کو نذرانے پیش کیے جاتے ہیں اور اُن کو پکارا جاتا ہے۔ اس طرح گویا عبادت میں بھی دوسروں کو شریک کیا جاتا ہے اور مشرک ہونے کی یہی بنیاد ہے۔

بدترین کلمہ

انہوں نے کہا کہ خدا تعالیٰ نے بیٹا بنا لیا ہے۔ فرمایا لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا۔ یہ تم ایک نہایت ہی ناگوار بات لائے ہو۔ خدا کے لیے اولاد تجویز کرنا بڑی ہی مکروہ بات ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ صابر اور کوئی نہیں۔ دیکھیں! لوگ اس کے لیے اولاد جیسا گندا عقیدہ رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ انہیں فوری طور پر گرفت نہیں کرتا بلکہ مہلت دیتا رہتا ہے حالانکہ یہ سخت گستاخی کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ تو بے نیاز ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (فاطر-۱۵) وہ تو غنی ہے، صمد ہے باقی ساری مخلوق اس کی محتاج ہے۔ فرمایا خدا کے لیے اولاد تجویز کرنا اتنا بُرا کلمہ ہے تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ کہ قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائیں وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ اور زمین شق ہو جائے وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں۔ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدًا اس وجہ سے کہ یہ لوگ خدائے رحمان کے لیے اولاد پکارتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس قبیح کلمہ کا اتنا شدید اثر ہو سکتا ہے کہ اللہ کا غضب بھڑک اٹھے اور کائنات کی تمام چیزیں درہم برہم ہو جائیں۔

فرمایا حقیقت یہ ہے وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَٰنِ أَنْ

يَتَّخِذَ وَلَدًا (خدائے رحمان کے لیے یہ بات ہرگز لائق نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ نہ تو اُسے نسب کی ضرورت ہے اور نہ وہ (نعوذ باللہ) محتاج ہے کہ اُسے امداد کی حاجت ہو، لہٰذا اُس کے لیے اولاد ثابت کرنا کسی طور پر مناسب نہیں۔ تمام کائنات کی اللہ کے ساتھ نسبت باپ بیٹے کی نہیں بلکہ خالق اور مخلوق کی ہے۔ اللہ نے کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا)۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اس مقام پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے۔ سورۃ ابراہیم میں خبیث کلمہ کی ایک مثال بیان کی گئی ہے: "وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِن فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِن قَرَارٍ (آیت ۲۶) یعنی خبیث کلمے کی مثال خبیث درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین کے اوپر ہی ہوں اور اس درخت کو بیخ کنی حاصل نہ ہو، ایسا پودا یا درخت معمولی سی ٹھوکر یا آندھی وغیرہ سے اکھڑ جاتا ہے گویا خبیث کلمہ بالکل ناپائیدار ہوتا ہے مگر یہاں اس مقام پر اس کی شدت اس قدر بیان کی ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ اس تعارض کے متعلق امام محمد بن ابی بکر عبدالقادر رازیؒ اور دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سورۂ ابراہیم میں اللہ تعالیٰ نے کلمۂ توحید کے مقابلے میں کلمۂ شرک کو کلمۂ خبیثہ کہہ کر اس کا ضعف بیان کیا ہے کہ شرک کی بات بالکل ناپائیدار ہوتی ہے۔ اللہ نے ہر باطل بات کے متعلق فرمایا: إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (بنی اسرائیل ۸۱) باطل تو ایک کمزور اور مٹ جانے والی چیز ہے اور استحکام حق کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ البتہ اس سورۃ میں شرکیہ کلمہ کی شدت کو بیان کر کے درحقیقت اس کی قباحت کو بیان کیا ہے کہ خدا کے لیے اولاد تجویز کرنا اتنی بڑی بات ہے کہ اس سے کائنات کا نظام ہی درہم برہم ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ سورۂ ابراہیم میں کلمۂ خبیثہ کا ایک پہلو بیان کیا گیا ہے اور یہاں

پہ اس کا دوسرا پہلو بیان کیا گیا ہے ۔ لہٰذا دونوں آیات میں کوئی تعارض نہیں ہے
فرمایا اِنۡ كُلُّ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ
اٰتِى الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا جو کچھ بھی آسمان اور زمین میں ہے سب اللہ کے
سامنے عاجز بندہ ہو کر آئیں گے ۔ بیٹے اور غلام میں فرق ہے ۔ بیٹا مساوی
اور ہم جنس ہوتا ہے جبکہ غلام عاجز اور محتاج ہوتا ہے ۔ فرمایا اللہ اور
بندے کے درمیان عابد اور معبود کی نسبت ہے ۔ خدا معبود ہے باقی
سب عابد ہیں ۔ وہ قادر ہے یہ اس کے عاجز بندے ہیں ۔ اور اولاد
کا عقیدہ رکھنا اس تعلق کے منافی ہے ۔

ساری مخلوق عاجز ہے

فرمایا لَقَدۡ اَحۡصٰىهُمۡ ہم نے تمام مخلوق کو گھیر رکھا ہے ۔ اس
کا احاطہ کیا ہوا ہے وَعَدَّهُمۡ عَدًّا اور ہر ایک کو شمار کر رکھا ہے
مخلوق کا ہر فرد ، ہر چیز ، اس کا ہر عمل اور نقل و حرکت اللہ تعالیٰ کے علم میں
ہے اور اس نے شمار کر رکھا ہے ۔ جب قیامت کا دن آئے گا تو
سب خدائے رحمان کے حضور پیش ہو جائیں گے ۔ اور ساتھ یہ بھی وضاحت
فرما دی ۔ وَكُلُّهُمۡ اٰتِيۡهِ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَرۡدًا قیامت
کے دن ان میں سے ہر ایک خدا کے حضور تنہا پیش ہوگا ۔ اس دن نہ خاندان
ساتھ ہوگا ، نہ برادری ، نہ باڈی گارڈ ہوں گے اور نہ مصاحب ، بلکہ ہر شخص
اکیلا حاضر ہوگا ۔ اور یہ بھی ہے کہ اس دنیا کے لحاظ سے ہر اعلیٰ و ادنیٰ کی
پیشی برہنہ حالت میں ہوگی ۔ لباس تو آگے چل کر قسمت سے نصیب ہوگا ۔ وہاں
نفسا نفسی کا عالم ہوگا ، ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی ۔ اس وقت مسیح علیہ السلام
کو خدا کا بیٹا ماننے والے سخت پریشانی کے عالم میں ہوں گے ۔ بہر حال
عقیدہ ابنیت کی تردید اللہ نے مسلسل تین سورتوں میں بیان فرما دی ہے ۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾ فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا ﴿٩٧﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُم مِّنْ أَحَدٍ أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿٩٨﴾

ترجمہ:۔ بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنوں نے اچھے اعمال کیے، عنقریب بنا دے گا اُن کے لیے خدائے رحمان محبت کا سامان ﴿۹۶﴾ پس بیشک ہم نے آسان کیا ہے اس قرآن کو آپ کی زبان میں تاکہ آپ بشارت سنائیں متقیوں کو، اور ڈرائیں آپ اس قرآن کے ساتھ اُن لوگوں کو جو سخت جھگڑالو ہیں ﴿۹۷﴾ اور بہت سی قومیں کہ ہم نے ہلاک کیا اس سے پہلے، کیا تو محسوس کرتا ہے اُن میں سے کسی ایک کو یا سنتا ہے اُن کے لیے کوئی ہلکی سی آواز ﴿۹۸﴾

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے اولاد تجویز کرنے والوں کا رد فرمایا۔ کفر کی یہ بدترین صورت ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس قسم کا غلط عقیدہ رکھنے والوں کو ہم نے شمار کر رکھا پھر قیامت کے دن جب یہ تن تنہا اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوں گے تو

انہیں اس باطل عقیدے کی قباحت کا احساس ہوگا۔ اب آگے اللہ نے اہل ایمان کی فضیلت، اجر کبیر اور اُن کا انجام بیان فرمایا ہے۔ اس کے ساتھ بعض انعامات کا ذکر بھی کیا ہے جو اہل ایمان کو نصیب ہوتے ہیں۔

ایمان اصطلاح قرآن

ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے۔ جس طرح کفر، شرک، الحاد، نفاق وغیرہ قرآن پاک کی اصطلاحات ہیں اسی طرح ایمان بھی قرآن وسنت کی ایک اصطلاح ہے۔ ان سب اصطلاحات کے نیچے خاص معانی اور حقائق پائے جاتے ہیں۔ متکلمین، محدثین اور علماء کرام فرماتے ہیں کہ ایمان کسی ایسی چیز کی دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے جو قرآن وسنت سے قطعی طور پر ثابت ہے۔ جو چیز اجمالی طور پر ثابت ہے اس پر اجمالی طور پر ہی ایمان لانا ضروری ہے اور جو تفصیل کے ساتھ معلوم ہے اس کی تفصیلی تصدیق ضروری ہے۔ اسی کا نام ایمان ہے اور اس کے ارکان کا ذکر قرآن وحدیث میں موجود ہے۔

ارکانِ ایمان
(۱) توحید

ارکانِ ایمان میں سے اولین رکن اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا ہے۔ زبان سے اس کا اقرار اور دل سے تصدیق ضروری ہے۔ بعض ایسے گمراہ لوگ بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہی تسلیم نہیں کرتے۔ ان میں پرویز بھی شامل ہے۔ ایسے لوگ لفظ اللہ کا معنیٰ قانون کرتے ہیں حالانکہ یہ اسم ذاتی ہے اور اللہ کی ذات پر دال ہے۔ جس طرح اللہ کی ذات پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح اس کی صفات پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ بعض لوگ اور فرقے اسی نقطہ پر آکر گمراہ ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ تو موجود ہے مگر اُس کی صفت کوئی نہیں ہے۔ مگر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے تمام صفات کمال کو ثابت کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو تمام اچھی صفات سے متصف کرنا جزوِ ایمان ہے جب کہ وہ ذات تمام بری صفات سے پاک ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے
نہ تو اُس کی ذات میں کوئی شریک ہے۔ نہ اس کی عبادت میں اور نہ اُس
کی صفات میں کوئی دوسرا شریک ہے۔ اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ کے علاوہ
کسی دوسری ہستی کو بھی اُس کا ہم پلہ سمجھے یا اس کی صفات اور عبادت میں کسی
کو شریک سمجھے تو وہ ایمان سے خالی ہو گیا۔ اُس نے گویا ایمان کی اولین شرط
کو ہی پورا نہیں کیا۔

(۲) رسالت

ایمان کا دوسرا رکن رسالت پر ایمان لانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع
انسان کی ہدایت و راہنمائی کے لیے آدم علیہ السلام سے لے کر حضور خاتم
النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک بہت سے نبی اور رسول مبعوث فرمائے ہیں۔
یہ انسان ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو معصوم بناتا ہے۔ ان سے کوئی گناہ
سرزد نہیں ہونے دیتا۔ ان پر وحی کا نزول بہت بڑا اعزاز ہے۔ ہمارا ایمان
یہ ہے کہ "لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ" (البقرۃ - ۲۸۵)
ہم ان میں سے کسی میں بھی تفریق نہیں کرتے۔ ہمارا سب پر ایمان ہے
البتہ تفصیلی طور پر حضور نبی کریم علیہ السلام پر ایمان ہے کہ جن پر
سلسلہ نبوت ختم ہو چکا ہے آپ علیہ السلام نے فرمایا میں قصر نبوت کی
آخری اینٹ ہوں جس کے رکھنے سے قصر نبوت مکمل ہو گیا۔ آپ نے فرمایا
اِنْقَطَعَتِ النُّبُوَّةُ وَلَا رَسُوْلَ بَعْدِيْ۔ نبوت ختم ہو چکی ہے
اب میرے بعد اور کوئی رسول نہیں آئے گا۔ قرآن پاک میں بھی آپ کو
کو خَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ (الاحزاب - ۴۰) کا خطاب دیا گیا ہے۔ تو
رسالت پر ایمان لانا بھی ارکانِ ایمان میں سے ہے۔

(۳) ملائکہ

ملائکہ خدا تعالیٰ کی مجرد اور معصوم مخلوق ہے۔ خدا تعالیٰ اور مخلوق کے
درمیان ملائکہ کا توسط ہے۔ ان میں سے بعض کا مادہ تخلیق بہت لطیف
نور ہے اور بعض اس سے کم تر ہیں۔ فرشتوں کے مختلف طبقات
ہیں جیسے ملاءِ اعلیٰ کے فرشتے، علیین کے فرشتے، حاملین عرش،

حاملین حول العرش، پھر آسمانوں کے فرشتے اور پھر بحر و بر کے فرشتے۔ اس دنیا میں فرشتے نظر نہیں آتے، البتہ قیامت کو نظر آئیں گے۔ ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1] کہ اللہ نے ملائکہ کو بنی نوع انسان کی مصلحت کے لیے انسان کی پیدائش سے کروڑوں اور اربوں سال پہلے پیدا کیا۔ جبرائیل، میکائیل وغیرہ فرشتوں کی پیدائش کے متعلق ہم تحدید نہیں کر سکتے کہ یہ کب پیدا ہوئے۔ خدا تعالیٰ ازل میں جانتا تھا کہ نوع انسانی کی مصلحت فرشتوں پر موقوف ہے۔ فرشتے وجود رکھتے ہیں۔ ان میں روح بھی پائی جاتی ہے۔ ان میں کمال درجے کی عقل ہوتی ہے۔ سرسید، علامہ مشرقی، اسی نکتے پر آ کر گمراہ ہوئے۔ انہوں نے فرشتوں کے وجود کو ہی تسلیم نہیں کیا۔ کہتے ہیں کہ اچھی صفت کا نام فرشتہ اور بری صفت کا نام شیطان ہے۔

فرشتے ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت میں مصروف رہتے ہیں اور ایک لمحہ کے لیے بھی فرائض و عبادت سے غافل نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان کیا ہے "یُسَبِّحُونَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُونَ" (الانبیاء۔ ۲۰) وہ رات دن اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں مگر تھکتے نہیں۔ ان کے مقابلے میں اللہ نے انسان کو کمزور اور تھک جانے والا بنایا ہے۔ سورۃ النساء میں موجود ہے "وَخُلِقَ الْإِنسَانُ ضَعِيفًا" (آیت۔ ۲۸) بہر حال فرشتے اللہ کی معصوم مخلوق ہیں جن میں نہ معصیت کا مادہ ہے اور نہ شہوت کا۔ انسانوں کی طرح فرشتے بھی اللہ تعالیٰ کے احکام و اوامر کے طالب ہوتے ہیں۔ ان پر ایمان نہ لانے والا کافر شمار ہوگا۔

(۳) کتب سماویہ

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں پر چھوٹے صحیفے اور بڑی کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ امام شافعیؒ کے قول کے حوالے سے مفسرین بیان

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۲۲

(ص)

کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کُل چار بڑی کتابیں اور سو صحیفے نازل فرمائے ہیں۔
کتابوں میں زبور، تورات، انجیل اور قرآن حکیم ہیں۔ جب کہ قرآن میں ابراہیم
علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام کے صحائف
کا ذکر ملتا ہے۔ بہر حال اللہ نے ابتداء سے لیکر حضور خاتم النبیین تک
جتنی بھی کتب اور صحائف نازل فرمائے ہیں، سب پر ایمان لانا ضروری
ہے کہ وہ برحق ہیں اور اللہ نے انہیں انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل
فرمایا ہے۔ قرآن پاک کے علاوہ باقی کتب و صحائف پر اجمالی ایمان لانا کافی
ہے۔ جب کہ قرآن پاک کے ہر ہر لفظ اور ہر ہر کلمے کو ماننا ضروری ہے
ان میں سے کسی ایک لفظ یا کسی آیت حکم کا انکار کرنے سے ایمان سلب
ہو جائے گا۔

(۵) یوم آخرت

اس کے بعد قیامت کے دن پر ایمان لانا بھی ارکانِ ایمان میں
سے ہے۔ قرآن پاک میں اس کا ذکر بِالْيَوْمِ الْآخِرِ کے نام سے بار بار
آیا ہے۔ قیامت کا دن اس جہان کا آخری دن
(لاسٹ ڈے LAST DAY) ہوگا۔ جب ہم قیامت کے
دن کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں بہت سی چیزیں آجاتی ہیں، مثلاً مرنے کے
بعد دوبارہ جی اٹھنا، پل صراط پر سے گزرنا، حساب کتاب کی منزل، میزان
کا قیام وغیرہ۔ حدیث میں آتا ہے کہ ہر انسان کو مرحلے کے عمل سے
گزرنا ہوگا۔ اس کو نیکی اور بدی کا پھل ملے گا۔ جزا اور سزا کی جگہیں جنت
اور دوزخ برحق ہیں۔

اگرچہ آخرت کا دن بحیثیت مجموعی قیامت کا دن ہی ہے مگر انفرادی
طور پر آخرت کا سلسلہ انسان کی موت کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ حضور
علیہ السلام کا فرمان ہے[1] مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ
جو شخص مر گیا، اس کی قیامت تو برپا ہو گئی۔ عالم برزخ میں قبر حقیقی کی پہلی منزل

---
[1] مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ص ۲۳۴/۱۰۲ (فیاض)

ہے۔ آدمی کی موت کے ساتھ ہی مادی جہان ختم ہو کر دوسرا جہان شروع ہو
گیا۔ چنانچہ قبر کا عذاب بھی برحق ہے۔ مسلمہ عقیدے کی کتاب فقہ اکبر میں موجود
ہے عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ یعنی قبر کا عذاب برحق ہے جو گنہگاروں کو
ہوگا۔ ان سب چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ عذاب قبر کا انکار کرنے
والے معتزلہ اور دوسرے فرقے گمراہ ہیں۔

ایمان

خلاصہ ایمان یہ ہے کہ قرآن و سنت سے یقینی طور پر ثابت چیزوں
پر ایمان لانا ضروری ہے۔ گویا توحید، رسالت، ملائکہ، کتب سماویہ، یوم
آخرت، تمام فرائض اور شریعت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ایمان زبان
سے اقرار اور دل سے تصدیق کا نام ہے۔ کوئی شخص محض علم سے مومن نہیں
ہو سکتا۔ اس وقت دنیا میں بڑے بڑے سکالر موجود ہیں جو بے شمار چیزوں کو
جانتے ہیں مگر وہ مومن نہیں کیونکہ وہ ان کی تصدیق نہیں کرتے۔ اسی طرح
محض پہچاننے سے بھی آدمی مومن نہیں ہو سکتا۔ یہودی اللہ کے آخری نبی
کو اس کی نشانیوں سے پہچانتے ہیں جو ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔ وہ قرآن
کو بھی پہچانتے ہیں کہ یہ اللہ کی آخری کتاب ہے مگر ان کی تصدیق نہیں کرتے
لہذا یہ بھی مومن نہیں۔ تو ایمان قرآن کی اصطلاح ہے جو ان تمام چیزوں پر
حاوی ہے جن کا ہم نے اجمالاً ذکر کر دیا ہے۔

اعمال صالحہ

فرمایا بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
اور انہوں نے نیک اعمال انجام دیے۔ نیک اور اچھے اعمال وہ ہیں جن
کو قرآن اور شریعت اچھا کہتی ہے اور عقل سلیم جن کو مانتی ہے۔ مثلاً عبادات
میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اچھے اعمال ہیں۔ اس کے علاوہ جہاد فی سبیل اللہ
اسلام کی تبلیغ، بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی، صدقہ خیرات وغیرہ اچھے
امور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان لوگوں کی بڑی تعریف فرمائی ہے
جو غرباء و مساکین کی مشکلات حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اَلَّذِیْنَ

يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ" (آل عمران-۱۳۴) جو خوشحالی اور تنگدستی میں بھی خرچ کرتے رہتے ہیں علاوہ ازیں غلاموں کی آزادی بنی نوع انسان کو بد اخلاقی اور بد عقیدگی سے بچانا وغیرہ سب نیک کام ہیں۔ تاہم بنیادی طور پر عبادات اربعہ یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج اعمال صالحہ ہیں حضور کا فرمان ہے کہ ایمان کے بعد جو شخص یہ اعمال انجام دے گا وہ جنت میں داخلہ کا مستحق ہے "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ" (الانبیاء-۹۴) جو شخص نیک اعمال انجام دے گا بشرطیکہ وہ ایمان دار ہو، عقیدہ فاسد نہ ہو، کفر، شرک، نفاق، الحاد میں ملوث نہ ہو تو اس کے اعمال کی قدر کی جائے گی۔

محبت کا انعام

فرمایا جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دیے، ان کا انعام یہ ہے سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا" ان کے لیے خدائے رحمان عنقریب محبت کا سامان بنا دے گا۔ وُدّ کا معنی محبت ہے اور اسی لحاظ سے وَدُوْد خدا تعالیٰ کا صفاتی نام ہے یعنی محبت کرنے والا۔ اس کی تفسیر میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو ایسی چیزیں عطا کرے گا جن سے وہ محبت کرتے ہیں یعنی جو چیزیں انہیں پسند ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کے لیے دوسروں کے دلوں میں محبت ڈال دے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرائیل سے فرماتا ہے کہ میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں، تم بھی اس سے محبت کرو۔ چنانچہ جبرائیل علیہ السلام بھی اس شخص سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر وہ دوسرے فرشتوں کے سامنے اعلان کرتے ہیں تو وہ بھی ایسے شخص سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر وہی جذبہ زمین پر آتا ہے تو زمین پر موجود تمام باصلاحیت لوگ بھی ایسے شخص سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ بغض کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے جب

اللہ تعالیٰ کسی نافرمان کو مبغوض کھتا ہے تو جبرائیل علیہ السلام سے فرماتا ہے کہ میں اس شخص سے بغض رکھتا ہوں لہٰذا تم بھی اس سے بغض رکھو۔ پھر یہی چیز نیچے زمین پر آتی ہے تو تمام باصلاحیت لوگ بھی ایسے نافرمان سے بغض رکھتے ہیں۔

بہرحال محبت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں محبت ڈال دیتا ہے۔ اللہ کریم نے صحابہؓ کی محبت کس طرح لوگوں کے دلوں میں ڈالی ہے۔ صحابہؓ جب بیرونی سفر پر جاتے تھے تو عیسائی قومیں اُن کے لیے اپنے شہروں کے دروازے کھول دیتی تھیں مسلمانوں کی عبادت کا طور طریقہ اور اُن کا عدل و انصاف دیکھ کر غیر مسلم بھی اُن سے محبت کرتے تھے۔ جب مصر پر مسلمانوں کا حملہ ہوا تو انہوں نے آگے بڑھ کر استقبال کیا اور مسلمانوں سے کہا کہ ہم تم سے جنگ نہیں کریں گے۔ جب مسلمان کسی جگہ قیام کے بعد وہاں سے جاتے تو وہاں کے لوگ روتے تھے کہ ایسے اچھے لوگ ہم سے جدا ہو رہے ہیں۔ غرضیکہ اللہ نے ان کے دل میں صحابہؓ کی محبت ڈال دی تھی۔ اور جن کے دلوں میں خدا کی محبت پڑ جاتی ہے وہ بھی کمال درجے کے لوگ ہوتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آتا ہے کہ میں اور میری والدہ مسلمان ہونے کے بعد چار سال تک حضورؐ کی خدمت میں رہ کر تحصیلِ علم کرتے رہے۔ پھر آپ سے عرض کیا، حضورؐ! ہمارے حق میں دعا فرمائیں۔ آپ نے دعا فرمائی اے اللہ! مومنین کے دل میں ابوہریرہؓ کے لیے محبت ڈال دے۔ ابوہریرہؓ کا اپنا بیان ہے کہ حضور علیہ السلام کی دعا کی برکت سے جو مومن مجھے دیکھتا مجھ سے محبت کرتا۔ ہمارے لیے بھی حکم ہے کہ جب کسی بستی میں جائیں تو یوں دعا کریں اَللّٰھُمَّ حَبِّبْ صَالِحِیْھَا اِلَیْنَا وَحَبِّبْنَا اِلَیْھِمْ۔ اے اللہ! اس بستی کے نیک لوگوں کے لیے ہمارے دلوں

میں محبت ڈال دے اور ان کے دلوں میں ہمارے لیے محبت پیدا کر دے۔ اور محبت کا معیار یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں خدا تعالیٰ کی محبت ہو گی وہ ضرور نیک لوگوں سے محبت کریں گے۔ اور جو خدا کی محبت سے خالی ہوں گے وہ نیک لوگوں سے بغض رکھیں گے۔ کافر چونکہ خدا کی محبت سے محروم ہوتے ہیں اس لیے وہ انبیاء اور صالحین سے بغض رکھتے ہیں۔ بہرحال نیک لوگوں کے لیے محبت خدا تعالیٰ کی طرف سے انعام ہے

قرآن عربی زبان میں

اگلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ بیشک ہم نے اس قرآن پاک کو آپکی زبان میں آسان کر دیا ہے۔ حضور علیہ السلام عربوں میں پیدا ہوئے اور آپکی کی مادری زبان عربی تھی حضور علیہ السلام کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے عربی زبان اپنے عروج پر تھی۔ یہ انتہائی مختصر مگر فصیح زبان ہے جس میں دقیق سے دقیق مضمون بھی ادا کرنے کی صلاحیت موجود ہے اس میں بلند درجے کی شاعری پائی جاتی ہے۔ اللہ نے بھی اس زبان کو فوقیت عطا فرمائی ہے۔ یہ زبان ہمارے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اللہ نے اپنی آخری کتاب قرآن کریم اپنے آخری نبی کی مادری زبان عربی میں نازل فرمائی جس کو ہم صبح و شام پڑھتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ عربوں سے محبت کیا کرو کیونکہ میں بھی رسول عربی ہوں اور قرآن پاک بھی عربی زبان میں ہے۔

تبشیر و انذار

فرمایا قرآن پاک کو عربی زبان میں آسان کرنے کا مقصد یہ ہے لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ تاکہ آپ اس کے ذریعے متقین کو بشارت سنا دیں وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا اور آپ اس کے ذریعے جھگڑالو قوم کو ڈرا دیں۔ حضور علیہ السلام کے اولین مخاطبین عرب کے کفار و مشرکین جو سخت جھگڑالو قسم کے لوگ تھے۔ تاہم جھگڑالو قوم میں یہودی اور عیسائی بھی داخل ہیں۔ یہ بھی گذشتہ چودہ سو سال سے جھگڑا ہی کرتے چلے آ رہے ہیں جو مسیح علیہ السلام

کے نزول تک جاری رہے گا۔ بہر حال دنیا کی ہر جھگڑالو قوم کو قرآنی تعلیمات کے ذریعے انذار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

سابقہ اقوام کی ہلاکت

فرمایا یہ لوگ کس خیال میں پڑے ہوئے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی گرفت آتی ہے تو پھر نافرمان بچ نہیں سکتے۔ ذرا پرانی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ اِن سے پہلے ہم نے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا۔ یہ لوگ کفر و شرک میں پڑے ہوئے تھے اور عناد اور تکبر میں مبتلا تھے، لہٰذا ہماری گرفت سے بچ نہ سکے اور ہلاک ہوئے هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ أَحَدٍ کیا تم اُن میں سے کسی ایک کو بھی محسوس کرسکتے ہو؟ اُن کے صرف کھنڈرات باقی ہیں یا تاریخ میں اُن کا نام آتا ہے ورنہ اُن میں سے کوئی فردِ واحد بھی باقی نہیں رہا۔ اللہ نے سب کو ملیا میٹ کر دیا۔ سورۃ سبا میں ہے فَجَعَلْنٰهُمْ أَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (آیت - ۱۹) ہم نے اُن کے افسانے بنا دیے۔ قصے کہانیوں میں ان کا ذکر ملتا ہے اور بالکل ریزہ ریزہ کر دیا کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ یہ کلدانی، بابلی، قدیم مصری، قدیم چینی، ہڑپہ، موئنجودڑو اور ٹیکسلا والے، الورا اور اجنتا کی تہذیبوں والے سب تباہ و برباد ہوئے۔ فرمایا کیا آپ ایسے لوگوں کو ذرا بھی محسوس کرتے ہیں أَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا یا ان کی کوئی معمولی سی بھنک یا آواز بھی سنتے ہیں؟ ہم نے اس طرح فنا کر دیا ہے کہ اُن کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ جب اُن اقوام کا یہ حال ہوا تو عرب کے کفار و مشرکین کس کھاتے میں ہیں۔ اگر یہ بھی انکار پر اصرار کرتے رہے اور اہلِ ایمان کو ستاتے رہے، تبلیغ دین کے راستے میں روڑے اٹکاتے رہے تو ان کا حشر بھی سابقہ اقوام سے مختلف نہیں ہوگا۔

معالم العرفان — دروس القرآن

افادات

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی صاحب

زیر نگرانی

بلال احمد ناگی صاحب

مرتب

الحاج لعل دین صاحب (ایم۔ اے علوم اسلامیہ)

زیر اہتمام

انجمن محبان اشاعت قرآن

صدر انجمن

شیخ محمد یعقوب عاجز

[illegible]

بابو غلام حیدر صاحب

نائب صدر

محمود انور بٹ ایڈووکیٹ

ناظم مکتبہ (انتظامیہ)

محمد منیر صاحب Ph:221943

مکتبہ دروس القرآن گوجرانوالہ